مجلۂ طیلسانین

حیدرآباد دکن

مطبوعات جامعۂ عثمانیہ

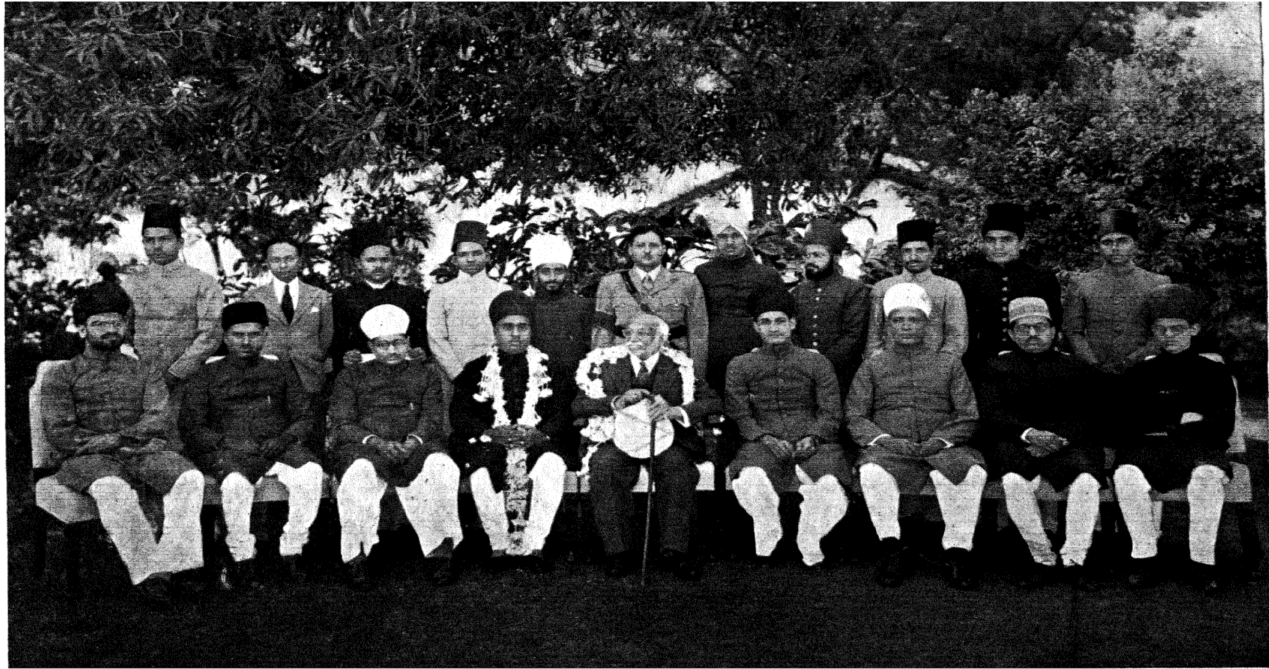
حیدرآباد دکن

سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے زیر اہتمام قدیم و جدید علوم و فنون میں دو سو بہتر (۲۷۲) اردو کتابیں بشکل تالیف و تراجم شایع ہو چکی ہیں، ان کے سوا بھی کتابیں تیار ہو رہی ہیں۔ فہرست مطبوعات فرمایش پر ارسال ہوتی ہے۔

محمد الیاس برنی

ناظم سررشتۂ تالیف و ترجمہ

حالیہ شایع شدہ کتابوں کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ (۱۴۲)



Group Photo Industrial Exhibition 1348 F. Economic Committee Hyderabad.

Sitting—Md. Farooq, Shankerjee, L. N. Gupta, Mir Mahmood Ali, Rt. Hon'able, Sir Akbar Hydari, Dr. Raziuddin Siddiqi, Mehira'i Fazil, Premjee, Sharfuddin.

Standing—Md. Ali Khan, Vazir Ali Khan, Shahabuddin Yadullahi, Salameen Bin Omar, Gulam Dastagir Rasheed, Capt K. Syed, Md. Adul Rahim K. Hameed Ahmed, Md. Ali, Abul Khair Siddiqi, Aleemullah Qadri.

جلد سوم
سنہ ۱۹۳۹ء

شمارۂ اول و دوم
سنہ ۱۳۴۸ف

مجلہ طیلسانین

انجمن طیلسانین عثمانیہ کا علمی و ادبی
سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت

مقاصد

۱۔ علمی وادبی مضامین، معیاری نظمیں اور جامعہ عثمانیہ کے ایم اے اور ایم ایس سی کی ڈگریوں کیلیے پیش شدہ تحقیقاتی مقالات بالاقساط شایع کرنا۔

۲۔ اُردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ شایع کرنا۔

۳۔ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی مختلف سرگرمیوں کی روداد کی اشاعت۔

۴۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گی۔

قواعد

۱۔ یہ رسالہ بہمن، اردی بہشت، امرداد، اور آبان مطابق جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوگا۔

۲۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم ایک سو صفحے ہوگی۔

۳۔ جواب طلب اُمور کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ کا آنا ضروری ہے۔

۴۔ خط وکتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

چندہ مجلہ طیلسانئین

خریداران حیدرآباد سے عال سالانہ، فی پرچہ ۸ر

خریداران بیرون حیدرآباد سے عال سالانہ فی پرچہ ۱۲ر ۱۲ر

مع محصول ڈاک

اراکین انجمن طیلسانئین عثمانیہ سے عہ سالانہ، علاوہ محصول ڈاک

نرخ اشتہارات

مقدار		سال بھر	فی اشاعت
پورا صفحہ	سرورق	عـہ	ے
	اندرونی	معہ	عال
آدھا صفحہ	سرورق	صہ	عصہ ۸ر
	اندرونی	ے	عصہ ۲ر
پاؤ صفحہ		۱۲ر عال	۱۰ر
فی سطر		۸ر	۳ر

فہرست مضامین

اداریہ

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو (غالبؔ) عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

نام خدا، یہ مجلہ طیلسانئین کی تیسری جلد کی پہلی اشاعت ہے۔ مالی مشکل اس کی بر وقت اشاعت کے لیے ہمیشہ رکاوٹ ثابت ہوئی۔ آس یاس سے بدلنے لگی تھی کہ مرکزی انجمن طیلسانئین نے بر وقت دستگیری کی۔ اسے اب مجلسِ علمیہ سے براہ راست اپنی نگرانی میں لے لیا ہے۔ کچھ مالی امداد کی اپیل کی جا رہی ہے۔ مختلف ذیلی کمیٹیوں مثلاً عثمانیہ بلدی جماعت اور معاشی کمیٹی وغیرہ نے بھی اب مجلہ طیلسانئین کو اپنی زبان اور اپنا ترجمان خیال کیا ہے۔ کم و بیش حسب استطاعت اس کی امداد پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ جہاں اتحاد و تعاون کی یہ روش جاری رہی تو کیا عجب ہے کہ آپ کا یہ مجلہ شایان شان درجہ اور عزت حاصل کرے۔

فرائض ادارت کی نگرانی اور اہتمام و انتظام کا نظام بھی بدل گیا ہے۔ یہ فالِ نیک ہے کہ مولوی عبد الرحیم صاحب بی اے (عثمانیہ) جیسے فرض شناس رکن مجلہ کی اشاعت کا اہتمام فرما رہے ہیں۔

اس مجلہ کو پروان چڑھانے کے لیے یہ کافی نہیں کہ اہتمام اور انتظام میں کچھ تبدیلی ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ارکانِ انجمن پوری خوش دلی کے ساتھ اس کے خریدار ہوں، اس کے لیے مضامین لکھیں، اس کو اپنے ذہنی اور اجتماعی ارتقا کا مظہر جانیں۔

۵

آجکل اجتماعی اداروں کی مسابقت اور ترقی میں "ترجمان" کو جس قدر اہمیت حاصل ہے اس کا احساس چاہیئے تو یہ تھا کہ ہم کو سب سے زیادہ ہوتا لیکن یہاں اس کی کمی ہے ہمارے طیلسانی بھائی جلد یہ سمجھ لیں کہ کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ ع

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

معاشی کمیٹی کو قایم ہوئے عرصہ ہوچکا تھا لیکن وہ سکون اور سکوت کا شکار تھی پچھلے سال طیلسانی کانفرنس کے موقعے پر یہ سکون اور سکوت جہد اور جہاد سے بدل گیا صنعتی نمایش کی کامیابی اور اس کے اثرات نمود و نمایش (کی) منزل سے بہت آگے بڑھ گئے اس کی دلچسپ اور سبق آموز داستان عدم گنجایش کے باعث مختصر طور پر اس اشاعت میں شامل کی گئی ہے اس کامیابی نے معاشی کمیٹی کے کارکنوں کے حوصلے بڑھا دیے اور ارادے بلند کردیے۔ وہ اس وقت "عمل پیہم" کی مختلف منزلوں سے گذر رہے ہیں پہلا کام نوڈائرکٹری کا درپیش ہے جہاں تک ہمیں علم ہوتا جاتا ہے حسنِ صنعت اور عزم سبقت دونوں کی اس باب میں کارفرمائی جاری ہے کیا عجب ہے کہ برکت اور نصرت ہمکنار ہو۔ اپنے اور بیگانے سب مبارکباد کے بعد ان کے آیندہ رفتار قدم پر آنکھیں لگائے ہوئے ہیں اگلے سال کی نمایش کا مرحلہ پھر درپیش ہے۔

اس سلسلے میں اولین فرض یہ ہے کہ مختلف کالجوں کے معاشیات کے طالب علم معاشی کمیٹی کے رکن بلا تاخیر بن جائیں۔ کارکن اس طرف توجہ کریں ملک کے دیگر تعلیم یافتہ حضرات اور معاشی فلاح و بہبود کے خواہاں جلد اس سے اپنا باقاعدہ ربط قایم کرلیں تاکہ یہ ملک کا بہترین معاشی ادارہ بن جائے۔ صرف باہر رہ کر تنقید اور تعریض تن آسانی کی علامت ہے۔ یوں تو تجاویز کی بڑی لمبی چوڑی فہرست سپرد قلم کی جاسکتی ہے لیکن کام کی پہلی بات ادارہ کی وسعت اور اس کا استحکام ہے۔

ہمیں صاحب استطاعت اُمرا اور ارکانِ دولت سے بھی قومی امید ہے کہ وہ معاشی کمیٹی کے فرائض میں پورے طور پر ہاتھ بٹائیں گے۔

پچھلے افکار اور گفتار کا غازی، شعر و ادب کا اقبالؒ ہم سے رخصت ہوا یہ زخم ابھی ہرا ہی تھا کہ اپنے عہد کا مجاہد اعظم، کردار کا غازی مصطفٰی کمالؒ بھی ہم سے جدا ہوا۔ غازی مرحوم کی ذات دُنیا کی ہر مغلوب محکوم اور محروم قوم کے لیے جوشِ عمل کا ایک سبق اور امید کی ایک شمع فروزاں تھی۔ ایک بے سہارا بے محافظ یتیم لڑکا اپنی زخم خوردہ بیوہ ماں کی دعا

اور اپنی انتھک دلیرانہ جد و جہد سے کس طرح ٹرکی کے مرد بیمار کا مسیحا اور محافظ بن گیا، یہ ایک حیرت انگیز اور عبرت خیز کردار ہے۔ سچ ہے کہ محبت اور عزت انسان کو کتنا قوی کرتی ہے۔ قوت اور نصرت ہم معنے ہیں ؎

بے جُراتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی

انجمن طیلسانیین کا نیا اقدام جماعت "اتحاد و ترقی" ہے، یہ نام ٹرکی کی مشہور قومی جماعت کے نام پر ہے۔ دیکھئے کہ اس کے اس نام اور اس کے کام میں کس قدر مناسبت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مُلک کے مشترکہ سیاسی اور تمدنی مقاصد کے لیے متحدہ سعی کی جائے۔ فرقہ پرستی کا کوئی مفروضہ اور مسلّمہ امر یہاں جگہ نہ پائے۔ فکر اور عمل کی صحت یہاں معیار بنے۔ یہ موجودہ پیچیدہ حالات میں جنم لے رہی ہے۔ تیزی سے تعمیر اور ترکیب کی ابتدائی منزلیں طے ہو رہی ہیں۔ اگر اس وقت خرابی کی کوئی صورت مضمر رہ گئی تو آگے بڑی الجھنیں پڑیں گی۔ دیکھیں کہ نظر بلند اور دل ہوشیار کس طرح کام کرتے ہیں۔

وہ سارے احباب جنھوں نے مجلہ کی اشاعت میں درہم، قدم اور قلم سے مدد فرمائی ہے ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

"س"

پیامِ توحید

توحید کا پیغام ہر اک شان میں آیا — توریت میں، انجیل میں، قرآن میں آیا

غنچے کے تبسّم میں کبھی رنگِ شفق میں — وہ نور کبھی گو ہرِ عمّان میں آیا

دھرتی کے سپوتوں کی وہی کرتا ہے رکھشا — بن باسیوں کے دُکھ بھرے رومان میں آیا

پورب ہو کہ پچھم وہی ان داتا ہے سب کا — ہر صاحبِ مذہب کے یہ ایمان میں آیا

شاید نظر آجائے تجھے دیدۂ باطن! — پرماتما ہر جان، ہر انسان میں آیا

گہہ نخل پہ گہہ طور پہ گہہ عرشِ بریں پر — قدرت کا وہ نقّاش عجب آن میں آیا

خورشید ہو، مہتاب ہو یا قطرۂ نیساں

ہر ایک ذکیؔ اس کی ضیا سے ہے درخشاں

محمد عبدالسلام ذکیؔ

اقبال کی دعائیں

اقبال کے کلام کا بہت بڑا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہے جن میں راست خدائے تعالیٰ سے خطاب ہے۔ ذاتِ باری سے مخاطب ہونے کا انھوں نے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے اور اس کو اس قدر مختلف پیرایوں میں باندھا ہے کہ اس کا جواب کسی دوسرے شاعر یا مصنف کے کلام میں نہیں ملتا، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ دعا کو انھوں نے ایک آرٹ کی حد تک پہنچا دیا ہے۔

اکثر موقعوں پر انسان بے اختیار خدا کو یاد کرتا ہے، اور اسی لیے ہر شخص چاہے وہ دُنیا دار ہو، یا دین دار، ہر وقت دعائیں کیا کرتا ہے۔ بعض لوگ اس دُنیا میں اپنی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے دعا مانگتے ہیں اور بعض آیندہ دُنیا میں اپنی نجات کے لیے سر بہ سجدہ ہوتے ہیں۔

اقبال پر عشقِ آلٰہی کا رنگ اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ وہ جدھر جاتے ہیں اُدھر اسی کی نشانی دیکھتے ہیں اور انھیں ہر راستہ خدا کی طرف ہی لے جاتا ہے:—

عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو برُد   بر تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برُد

عشقِ آلٰہی میں وہ اس قدر محو ہیں کہ ہر وقت اور ہر لمحہ اس کے ذکر میں منہمک رہتے ہیں چاہے وہ خدا کو حاضر سمجھ کر خطاب کریں یا غائبانہ اس کے ذکر میں مشغول رہیں۔ خدائے تعالیٰ سے اپنی بہبودی اور نجات کے لیے دعا مانگنا ایک فطری چیز ہے لیکن اقبال کی عظمت اور بے غرضی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ باوجود اس کثرت کے ساتھ خدا کو مخاطب کرنے کے انھوں نے کبھی نہ تو اس دُنیا میں اپنی بھلائی کے لیے دعا کی ہے اور نہ آخرت میں اپنی نجات کے لیے۔ وہ دعا کرنے میں تو اپنی قوم کی فلاح کے لیے یا اس لیے کہ ان کے کلام میں ایسی تاثیر ہو کہ جس سے وہ اُمتِ مرحوم کو زندہ کر سکیں۔

چنانچہ "ارمغان حجاز" میں وہ حضورِ حق میں ایک رباعی عرض کرتے ہیں :-

نخواہم ایں جہان و آنجہاں را مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوز و سرورش بوجد آرم زمین و آسماں را

وہ صرف حمد و ثنا پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک وضعدار عاشق کی طرح شوخیاں اور ناز و نیاز بھی کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ نہ صرف انسان خدا کا عاشق ہے بلکہ خود خدا بھی انسان کا عاشق اور انسان کی تلاش میں ہے۔ خدا سے وہ کبھی سوال وجواب کرتے ہیں اور کبھی آدم یا ابلیس یا لینن وغیرہ کی زبانی شکر و شکایت سناتے ہیں۔ وہ خدا کی درگاہ میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں لیکن اپنی ذات کا خیال یہاں بھی انھیں نہیں آتا۔

نماز ہو یا روزہ، حج ہو یا کسی اور قسم کی عبادت ان میں خدا کی طرف دھیان لگانے اور اس کو یاد کرنے کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ وہ عبادت ہی کیا جو محض ایک ضابطہ کی پابندی کے لیے کی جائے اور جس میں حضورِ قلب حاصل نہ ہو، چنانچہ اسی کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے :-

نمازِ بے حضور از من نمی آید نمی آید دلے آوردہ ام دیگر ازیں کافر چہ می خواہی

اسی طرح لکھتے ہیں :-

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

عبادت کے اسی فلسفے کو انھوں نے فلسفیانہ انداز میں اپنے لکچروں میں بیان کیا ہے جو تشکیل الٰہیات اسلامیہ پر دیے تھے اور شاعرانہ انداز میں اس دعا میں کہا ہے جو مسجد قرطبہ میں لکھی گئی تھی :-

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو میری نواؤں میں ہے خون جگر کا لہو
صحبتِ اہل صفا نور و حضور و سرور سرخوش و پرسوز ہے لالہ لبِ آبجو
راہ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق ساتھ میرے رہ گئی ایک مری آرزو
میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور تجھ سے میرے سینے میں آتشِ اللہ ھو
تجھ سے میری زندگی سوز و تب و درد و داغ تو ہی مری آرزو تو ہی مری جستجو
پاس اگر تو نہیں شہر ہیں ویراں تمام تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو

پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر کہ میں	ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو
چشمِ کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر	جلوتیوں کے سبو خلوتیوں کے کدو
تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ	اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا	حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

اس دعا کا آخری شعر قابل غور ہے! اس میں اقبال نے فلسفہ اور شعر دونوں کی حقیقت یہ بیان کی ہے کہ وہ آرزوئیں اور تمنائیں جو روبرو بیان نہیں کی جاسکتیں فلسفہ اور شاعری کے پیرایہ میں بیان کی جاتی ہیں۔

بعض ظاہر پرست زاہدوں کو یہ شکایت تھی کہ اقبال پانچ وقت کی نماز نہیں پڑھا کرتے لیکن انھوں نے نہیں دیکھا کہ اقبال کا دل ہر وقت خدا اور رسولؐ کی یاد سے لبریز ہے اور اس کے سوا ان کے دل میں کوئی دوسرا خیال نہیں، چنانچہ مسجد قرطبہ میں کھڑے رہ کر وہ اعلان کرتے ہیں کہ:۔

کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق	دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے	نغمۂ اللہ ھو مرے رگ و پے میں ہے

غرض کہ اقبال کا پورا کلام کسی نہ کسی پیرایہ میں خدا کی ہستی کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن اس مضمون میں ہم صرف ان اشعار پر بحث کریں گے جن میں انھوں نے خدا سے راست خطاب کیا ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے ہم ان اشعار کو لیتے ہیں جن میں عارفانہ انداز سے خدا کو مخاطب کیا گیا ہے۔ جب جرمنی میں اقبال نے فلسفۂ عجم پر اپنا مقالہ لکھا تھا تو ان دنوں میں اور اس کے بعد بھی صوفیانہ شاعری کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا، اور اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کے کلام پر اس کا معتدبہ اثر ہوتا۔ اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ یہ صوفیانہ شاعری بھی اقبال کے پاس آکر ان کے اپنے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور اس کا رنگ قدیم صوفیا کے رنگ سے مختلف ہے! اس فرق کو ایک جملہ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کے صوفیانہ اشعار سے بھی بجائے موت کے حیات کے آثار نمودار ہیں۔

وہ خدا کی تلاش میں پھرتے ہیں تو اس مطلب کو یوں ادا کرتے ہیں:۔

تو بروئے بے نوائے در آں جہاں کشادی	کہ ہنوز آرزویش نہ دمیدہ در ضمیرے
بہ نگاہ نارسایم چہ بہار جلوہ دادی	کہ بباغ و راغ عالم چو تذرو نو صفیرے

چہ شود اگر خرامی بسرائے کاروانے	کہ متاع نارسانش دلکے است پارہ پارہ

دل زندۂ کہ دادی بحجاب در نسازد　　نگہے بدہ بہ بند شررے بسنگ خارہ

وہ جب اس کو ایک نگاہ دیکھ لیتے ہیں تو تلاش میں نکل جاتے ہیں، لیکن دنیا اور آخرت میں جہاں کہیں وہ ڈھونڈتے ہیں انھیں انسان ہی کا پتا ملتا ہے خدا کا نشاں نہیں ملتا :۔

اے منِ از فیضِ تو پائندہ نشانِ تو کجاست　　ایں دو گیتی اثر ماست جہانِ تو کجاست

اس پر بھی جستجو کی لذت انھیں آوارہ رکھتی ہے بلکہ وہ تو زندگی کا مقصد بھی اسی جستجو کو سمجھتے ہیں :۔

سوز و گداز زندگی لذتِ جستجوئے تو　　راہ چو مار می گزد گر نروم بسوئے تو

من بتلاشِ تو روم یا بتلاشِ خود روم　　عقل و دل و نظر ہمہ گمشدگانِ کوئے تو

اس تلاش و جستجو میں بھی خدا کا خیال ان کے دل سے جدا نہیں ہوتا اس کے باوجود جب وہ دیدار سے محروم رہتے ہیں تو شکایت کرتے ہیں کہ :۔

چند بروئے خود کشی پردۂ صبح و شام را　　چہرہ کشا تمام کن جلوۂ نا تمام را

کبھی وہ خدا سے التجا کرتے ہیں اور اس کو اپنی حالت اور اپنے کارنامے سناتے ہیں :۔

اشک چکیدہ ام ببیں ہم بہ نگاہ خود نگر　　ریز بہ نیستانِ من برق و شرار ایں چنیں

بادِ بہار را بگو پے بخیالِ من برد　　وادی و دشت را دہد نقش و نگار ایں چنیں

زادۂ باغ و راغ را از نفسم طراوتے　　در چمن تو زیستم با گل و خار ایں چنیں

عالم آب و خاک را بر محک دلم بسائے　　روشن و تار خویش را گیر عیار ایں چنیں

دل بہ کسے نباختہ با دو جہاں نساختہ　　من بحضورِ تو رسم روزِ شمار ایں چنیں

جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا کا جلوہ ان کی نگاہوں کے ذریعے ان کے دل میں داخل ہو گیا ہے تو پھر ان کو اپنے دل میں اجالا نظر آتا ہے :۔

شبِ من سحر نمودی کہ بہ طلعت آفتابی　　تو بہ طلعت آفتابی سزد ایں کہ بے حجابی

تو بدردِ من رسیدی بضمیرم آرمیدی　　ز نگاہِ من رمیدی بچنیں گراں رکابی

تو عیارِ کم عیاراں تو قرارِ بے قراراں　　تو دوائے دل نگاراں مگر ایں کہ دیر یابی

بجلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم　　بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی

الملک للّٰہ کی تشریح کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کی ملکیت ہے :۔

مرغِ خوش لہجہ و شاہینِ شکاری از تست　　زندگی را روشِ نوری و ناری از تست

ہمہ افکار من از تست چہ در دل چہ بلب | گہر از بحر بر آری نہ بر آری از تست
من ہمان مشتِ غبارم کہ بجائے نرسد | لالہ از تست و نمِ ابر بہاری از تست
نقش پرداز توئی، ما قلم افشانیم | حاضر آرائی و آئندہ نگاری از تست

ہمہ اوست کی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب | گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ | ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود | فقر جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مُراد پا گئے | عقلِ غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

ذیل کے اشعار میں انھوں نے ساقیِ ازل کو خطاب کیا ہے :۔

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی | ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی | شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی | رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی
عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے | علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات | ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

خدا کا نُور جب اُن کے سینے میں جلوہ گر ہو جاتا ہے تو وہ اس کی روشنی میں ایک نئی زمین اور نیا آسمان بناتے ہیں :۔

اے خدائے مہر و مہ خاکِ پریشانے نگر | ذرۂ در خود فرو پیچد بیابانے نگر
حُسنِ بے پایاں درونِ سینۂ خلوت گرفت | آفتابِ خویش را زیر گریبانے نگر
بر دلِ آدم زدی عشقِ بلا انگیز را | آتشِ خود را بآغوشِ نیستانے نگر
شوید از دامانِ ہستی داغہائے کہنہ را | سخت کوشی ہائے ایں آلودہ دامانے نگر
خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے | ذرّۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

عشقِ نبیؐ میں وہ اس قدر ڈوب گئے تھے کہ قیامت کے دن خواجۂ دو عالمؐ کے سامنے اپنے اعمال کا حساب

لیا جانا بھی پسند نہیں کرتے کہ کہیں حضورؐ کے سامنے شرمندگی نہ ہو، اس لیے خدا سے التجا کرتے ہیں کہ محشر میں ان کا حساب نبی کریمؐ سے پوشیدہ طور پہ لیا جائے:۔

به پایاں چوں رسد ایں عالم پیر — شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ما را — حساب من ز چشم او نہاں گیر

حُبِّ نبیؐ کی انتہائی کیفیت "ارمغانِ حجاز" کی اس بے مثال رباعی میں بیان کرتے ہیں جس میں وہ حجاز کا روحانی سفر کرتے ہیں اور خدا سے کہتے ہیں کہ تو ہمیں کعبے میں رہ کر اپنے خاص بندوں سے مل لیکن مجھے تو منزلِ دوست کی تمنا ہے اور اس لیے میں مدینہ جا رہا ہوں:۔

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست — سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز — کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

اقبال کا دل دردِ انسانیت سے معمور تھا، اور چونکہ وہ نسلِ انسانی کی نجات اسلام میں دیکھتے اور انسانی مقاصد کی تکمیل کا واحد ذریعہ مسلمانوں کو سمجھتے تھے اس لیے لازم تھا کہ وہ اپنی قوم کی حالت پر غور کریں چنانچہ متعدد مرتبہ انھوں نے بارگاہ ایزدی اور دربارِ نبوی میں قوم کا حال بیان کیا ہے مثال کے طور پہ ہم یہاں مثنوی "مسافر" سے وہ مناجات درج کرتے ہیں جو انھوں نے شہرِ غزنی کے ویرانے میں کہی تھی اور جس میں دنیا اور بالخصوص مسلمانوں کی موجودہ حالت کی شکایت کی ہے:۔

اے خدا، اے نقش بندِ جان و تن — با تو ایں شوریدہ دارد یک سخن
فتنہ ہا بینم دریں دیرِ کہن — فتنہ ہا در خلوت و در انجمن
عالم از تقدیرِ تو آمد پدید — یا خدائے دیگرا و را آفرید
ظاہرش صلح و صفا باطن ستیز — اہلِ دل را شیشۂ دل ریز ریز
صدق و اخلاص و صفا باقی نماند — آں قدح بشکست و آں ساقی نماند
چشم تو بر لالہ رویانِ فرنگ — آدم از افسون شاں بے آب و رنگ
ایں مسلماں از پرستاران کیست؟ — در گریبانش یکے ہنگامہ نیست
سینہ اش بے سوز و جانش بے خروش — رو در افسیل است و سوزا خموش
قلب او ر ناحکم و جانش نژند — در جہاں کالائے رونا ارجمند

در مصافِ زندگانی بے ثبات — دارد اندر آستیں لات و منات
مرگ را چوں کاہ ارزاں داند ہلاک — آتشِ او کم بہا مانندِ خاک
شعلۂ از خاکِ او باز آفریں — آں طلب آں جستجو باز آفریں
باز جذبِ اندروں او را بدہ — آں جنونِ ذوفنوں او را بدہ
شرق را کن از وجودش استوار — صبحِ فردا از گریبانش برآر
بحرِ احمر را بچوبِ او شگاف — از شکوہش لرزہ افگن بر قاف

وہ دُنیا، اور مسلمانوں کی اس موجودہ روش سے بیزار ہو چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی حالت میں انقلاب ہو:—

یا مسلماں را بدہ فرماں کہ جاں برکف بنہ — یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں، یا چناں کن یا چنیں
یا برہمن را بفرما نو خداوندے تراش — یا خود اندر سینۂ زناریاں خلوت گزیں، یا چناں کن یا چنیں
یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک — یا دگر ابلیس بہر امتحانِ عقل و دیں، یا چناں کن یا چنیں
یا جہانے تازۂ یا امتحانے تازۂ — می کنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں، یا چناں کن یا چنیں
فقر بخشی یا شکوہِ خسرو پرویز بخش — یا عطا فرما خرد با فطرتِ روح الامینؑ، یا چناں کن یا چنیں
یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب — یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں، یا چناں کن یا چنیں

مسلمانوں کے لیے خدا سے جو کچھ وہ مانگتے ہیں وہ "بانگِ درا" کی اس مشہور دعا میں درج ہے:—

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرہ کو چمکا دے — پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے — دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل — اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر — اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو — وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر — خودداریِ ساحل دے آزادیِ دریا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا — امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

وہ بارگاہ ایزدی میں ان خداوندان مکتب کی شکایت کرتے ہیں جو شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق دے رہے ہیں۔ اس کے ردِ عمل کے لیے وہ خود اپنی قوم کے لیے خدا سے التجا کرتے ہیں:۔

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر | حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے | اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

جوانوں کو مری آہِ سحر دے | پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے | میرا نورِ بصیرت عام کر دے

جو دعا انھوں نے بالِ جبریلؑ کے ساقی نامے میں کی ہے وہ ایک الہامی کیفیت رکھتی ہے۔ میری رائے میں یہ ساقی نامہ دُنیائے شاعری کے چوٹی کے کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے:۔

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا | وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا | مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر | جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر
ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے | نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے | دلِ مرتضےٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر | تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر | زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے | مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر | یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات | کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں | مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز | مری خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مری آرزوئیں مری | اُمیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار | غزالانِ افکار کا مرغزار

مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ اقبال دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے بے نیاز ہیں اور ان چیزوں کے لیے بارگاہِ ایزدی میں دستِ طلب نہیں دراز کرتے۔ حضور باری تعالیٰ میں بھی ان کی نظر اپنی درماندہ قوم اور اس کے آگے نوعِ انسانی پر رہتی ہے اور اس لیے وہ خود اپنی ذات میں اور اپنے کلام میں ایسی صفات طلب کرتے ہیں جن کی مدد سے وہ تمام انسانوں کے کام آسکیں۔ اس قسم کی دعائیں انھوں نے اپنی مختلف تصنیفوں کی ابتدا میں درج کی ہیں۔ "پیامِ مشرق" میں رباعیوں کے بعد جب افکار کا حصہ شروع ہوتا ہے تو وہ اس طرح دعا کرتے ہیں:-

اے کہ از خمخانۂ فطرت بجامم ریختی — زآتشِ صہبائے من بگداز مینائے مرا
عشق را سرمایہ ساز از گرمیِ فریادِ من — شعلۂ بیباک گرداں خاکِ سینائے مرا
چوں بمیرم از غبارِ من چراغِ لالہ ساز — تازہ کن داغِ مرا سوزاں بصحرائے مرا

زبورِ عجم کی ابتدا اس دعا سے کرتے ہیں:-

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ — در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ
ایں بندہ را کہ با نفسِ دیگراں نزیست — یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ
سیلم مرا بجوئے تنکِ مایہ مپیچ — جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ
سازی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا — با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ
شاہینِ من بصیدِ پلنگاں گذاشتی — ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار — تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ
خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد بر فروز — ہر ذرۂ مرا پر و بالِ شرر بدہ

اور آگے چل کر ان کی درخواست یہ ہے:-

اے کہ زمن فزودۂ گرمیِ آہ و نالہ را — زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را
غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے — تازہ کن از نسیمِ من داغِ درونِ لالہ را
خواجۂ من نگاہ دار آبروئے گدائے خویش — آں کہ زجوئے دیگراں پر نہ کند پیالہ را

پھر کہتے ہیں:۔

بضمیرم آں جہاں کن کہ ز شعلہ نوائے ‏ ‏ دلِ خاکیاں فروزم دلِ نوریاں گدازم

اقبال ایسے دل سے بیزار ہیں جو اپنے آپ کو کھویا ہوا ہو، جو دوسرے کے دماغ سے سوچتا ہو، جو کم و بیش کی فکر میں لگا ہوا ہو۔ وہ ایسا دل مانگتے ہیں جو اپنی شراب سے آپ مست ہو اور جس میں ساری دنیا سے محبت ہو:۔

بدہ آں دل کہ مستی ہائے او از بادۂ خویش است ‏ ‏ بگیر ایں دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است

بدہ آں دل بدہ آں دل کہ گیتی را فرا گیرد ‏ ‏ بگیر ایں دل بگیر ایں دل کہ در بندِ کم و بیش است

مرا اے صید گیر از ترکشِ تقدیر بیروں کش ‏ ‏ جگر دوزی چہ می آید از آں تیرے کہ در کیش است

وہ چاہتے ہیں کہ ان کے دل میں گمان و ظن اور شک و شبہ کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو اور یقین سے لبریز ہو جس میں ان کو تقدیرِ عالم روشن تر نظر آسکے:۔

ایں دل کہ مرا دادی لبریزِ یقیں بادا ‏ ‏ ایں جامِ جہاں بینم روشن تر ازیں بادا

تلخے کہ فرو ریزد گردوں بسفالِ من ‏ ‏ در کامِ کہن رندے آنہم شکریں بادا

"انسان" کے تخیل کو انھوں نے اس قدر بلند کیا ہے اور اس کی عظمت کا احساس ان کو اس قدر ہے کہ جب وہ خدا کی راہ میں نکل جاتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ خدا کو ڈھونڈھتے پھریں، بلکہ وہ خود اپنی تلاش میں محو ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ انسان کی ہستی اور اس کی تقدیر ان پر نمایاں ہو جائے:۔

درونِ سینۂ ما دیگرے چہ بوالعجبی است ‏ ‏ کرا خبر کہ توئی یا کہ دو چار خودیم

کشائے پردہ ز تقدیرِ آدمِ خاکی ‏ ‏ کہ ما بہ رہ گذرِ تو در انتظارِ خودیم

ان کی ایک بہت موثر اور روح پرور مناجات وہ ہے جس سے "جاوید نامہ" کا آغاز ہوتا ہے اور جو ان کے سیرِ افلاک کا پیش خیمہ ہے:۔

اے ترا تیرے کہ ما را سینہ سفت ‏ ‏ حرفِ ادعونی کہ گفت و با کہ گفت؟

روئے تو ایمانِ من قرآنِ من ‏ ‏ جلوہ داری دریغ از جانِ من؟

از زیانِ صد شعاع آفتاب ‏ ‏ کم نمی گردد متاعِ آفتاب

عقلِ حاضر را خرد زنجیرِ پاست ‏ ‏ جانِ بے تابے کہ من دارم کجاست؟

عمرہا بر خویش می پیچید وجود
تا یکے بے تاب جاں آید فرود

گر نہ رنجی ایں زمینِ شورہ زار
نیست تخمِ آرزو را سازگار

از درونِ ایں گِلِ بے حاصلے
بس غنیمت داں اگر روید دلے

تو ہمی اندر شبستانم گذر
یک زماں بے نوریِ جانم نگر

شعلہ را پرہیز از خاشاک چیست
برق را از برفتادن باک چیست

زیستم تا زیستم اندر فراق
وانما آں سوئے ایں نیلی رواق

بستہ در ہا را برویم باز کن
خاک را با قدسیاں ہمراز کن

آتشے در سینۂ من برفروز
عود را بگذار و ہیزم را بسوز

باز آتش بنہ عودِ مرا
در جہاں آشفتہ کن دودِ مرا

آتشِ پیمانۂ من تیز کن
با تغافل یک نگہ آمیز کن

یا کشا ایں پردۂ اسرار را
یا بگیر ایں جانِ بے دیدار را

نخلِ فکرم نا امید از برگ و بر
یا تبر بفرست یا بادِ سحر

عقل دادی ہم جنونے دہ مرا
رہ بجذب اندرونے دہ مرا

علم در اندیشہ می گیرد مقام
عشق را کاشانہ قلبِ لانیام

علم تا از عشق برخوردار نیست
جز تماشاخانۂ افکار نیست

ایں تماشاخانہ سحرِ سامری است
علم بے روح القدس افسونگری است

بے تجلّی مردِ دانا رہ نبرد
از لکدکوبِ خیالِ خویش مرد

بے تجلّی زندگی رنجوری است
عقل مہجوری و دیں مجبوری است

ایں جہانِ کوہ و دشت و بحر و بر
تا نظر خواہیم او گوید خبر

منزلے بخش ایں دلِ آوارہ را
باز دہ با ماہ ایں مہ پارہ را

گرچہ از خاکم نروید جز کلام
حرفِ مہجوری نمی گردد تمام

زیرِ گردوں خویش را یابم غریب
ز آں سوئے گردوں بگو آئی قریب

تا مثالِ مہر و مہ گردد غروب
ایں جہات و ایں شمال و ایں جنوب

از طلسم دوش و فردا بگذرم
از مہ و مہر و ثریا بگذرم

تو فروغ جاوداں ما چوں شرار
یک دو دم داریم و آں ہم مستعار

اینم من جاودانی کن مرا
از زمینی آسمانی کن مرا

ضبط در گفتار و کردارے بدہ
جادہ ہا پیداست رفتارے بدہ

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است
ایں کتاب از آسمانے دیگر است

بحرم و از من کم آشوبی خطاست
آں کہ در قعرم فرو آید کجاست

یک جہاں بر ساحل من آرمید
از کراں غیر از رم موجم ندید

من کہ نومیدم ز پیران کہن
دارم از روزے کہ می آید سخن

بر جواناں سہل کن حرف مرا
بہر شاں پایاب کن ژرف مرا

"بال جبریل" کی تیسری نظم میں وہ خدائے تعالیٰ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:—

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر

نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

اسی طرح آگے چلکر کہتے ہیں:—

عطا اسلاف کا جذب دروں کر
شریک زمرۂ "لا یحزنون" کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

"اسرار خودی" کے آخر میں انھوں نے بڑے سوز و گداز کے ساتھ دعا کی ہے جس میں اپنی تنہائی کا اظہار کرکے خدا سے اپنے لیے ایک ہمدم مانگا ہے:—

اے چو جاں اندر وجود عالمی
جان ما باشی و از ما می رمی

نغمہ از فیضِ تو در عود حیات   موت در راہِ تو محسود حیات

باز تسکینِ دلِ ناشاد شو   باز اندر سینہ ہا آباد شو

باز از ما خواہ ننگ و نام را   پختہ تر کن عاشقانِ خام را

از مقدر شکوہ ہا داریم ما   نرخِ تو بالا و ناداریم ما

از تہی دستاں رُخِ زیبا مپوش   عشقِ سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش

چشمِ بے خواب و دلِ بے تاب دہ   باز ما را فطرتِ سیماب دہ

کوہ آتش خیز کن ایں کاہ را   ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را

رشتۂ وحدت چو قوم از دست داد   صد گرہ بر روئے کارِ ما فتاد

ما پریشاں در جہاں چوں اختریم   ہمدم و بیگانہ از یک دیگریم

باز ایں اوراق را شیرازہ کن   باز آئینِ محبت تازہ کن

باز ما را بر ہماں خدمت گمار   کارِ خود با عاشقانِ خود سپار

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش   قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

عشق را از شغلِ لا آگاہ کن   آشنائے رمزِ الا اللہ کن

منکہ بہرِ دیگراں سوزم چو شمع   بزمِ خود را گریہ آموزم چو شمع

یارب آں اشکے کہ باشد دلفروز   بیقرار و مضطر و آرام سوز

کارمش در باغ و روید آتشے   از قبائے لالہ شوید آتشے *

دل بدوش و دیدہ بر فرداستم   در میانِ انجمن تنہاستم

"ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من   از درونِ من نجست اسرارِ من" (رومی)

در جہاں یارب ندیمِ من کجاست   نخلِ سینایم کلیمِ من کجاست

سینۂ عصرِ من از دل خالی است   می تپد مجنوں کہ محمل خالی است

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست   آہ یک پروانۂ من اہل نیست

انتظارِ غمگسارے تا کجا   جستجوئے رازدارے تا کجا

اے ز رویت ماہ و انجم مستنیر   آتشِ خود را ز جانم باز گیر

این امانت بازگیر از سینہ ام | خار جوہر برکش از آئینہ ام
یا مرا یک ہمدم دیرینہ دہ | عشقِ عالم سوز را آئینہ دہ

یہاں اقبال نے مختلف چیزوں کا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا بیان کیا ہے اور پھر بعد میں اپنی تنہائی بیان کرتا ہے :-

موج در بحر است ہم پہلوئے موج | ہست با ہمدم تپیدن خوئے موج
بر فلک کوکب ندیم کوکب است | ماہ تاباں سر بزانوئے شب است
روز پہلوئے شب یلدا زند | خویش را امروز بر فردا زند
ہستیٔ جوئے بجوئے گم شود | موجۂ بادے ببوئے گم شود
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص | می کند دیوانہ با دیوانہ رقص
گرچہ تو در ذات خود یکتاستی | عالمے از بہر خویش آراستی
من مثالِ لالۂ صحراستم | در میانِ محفلے تنہاستم
خواہم از لطف تو یارے ہمدمے | از رموزِ فطرتِ من محرمے
ہمدمِ دیوانۂ فرزانۂ | از خیالِ این و آں بیگانۂ
تا بجان او سپارم ہوئے خویش | باز بینم در دل او روئے خویش
سازم از مشت گلِ خود پیکرش | ہم صنم او را شوم ہم آذرش

لیکن وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی بات کو سمجھنے والا کوئی نہیں، جو چنگاری ان کے دل میں پنہاں ہے اس کے لیے کہیں خس و خاشاک میسر نہیں ہوتا تو کہہ اُٹھتے ہیں :-

شرارا از خاکِ من خیزد کجا ریزم کرا سوزم | غلط کردی کہ در جانم فگندی سوز مشتاقی

شاید اسی دل شکنی کے عالم میں انھوں نے اپنی وہ نظم لکھی ہے جو "ایک آرزو" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں درج ہے اور جو اس طرح شروع ہوتی ہے :-

دُنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب | کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

اس نظم کا مقابلہ غالب کی اس مشہور نظم سے کیجئے جس کے دو شعر یہ ہیں :-

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو | ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہمزباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار　　　اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غالب کے اشعار ایک ایسے دل سے نکلے ہیں جو یاس اور نا امیدی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا ہے۔ اقبال چونکہ آیۂ "لاتقنطو" پر کامل ایمان رکھتے ہیں اس لیے تاریک اور گہرے بادلوں کے پیچھے بھی ان کو اُمید کی کرن نظر آتی ہے اور دل کے بجھ جانے اور انسانوں کی محفل سے اکتا جانے کے باوجود وہ بزمِ قدرت کی رنگینیوں سے محظوظ ہوتے ہیں اور بے نوحہ خواں مرنے کی تمنا کی بجائے کسی بے سروساماں، اور بھولے بھٹکے مسافر کے کام آنے کی آرزو کرتے ہیں کُنجِ تنہائی میں بھی وہ پناہ لیتے ہیں تو بے فکری کی موت کے لیے نہیں بلکہ خاموشی میں ناروں کو اپنے نالے سُنانے کے لیے۔

آخر دم تک اقبال کی یہی دعا تھی کہ ان کے کلام کے اثر سے مُردہ انسان بھی زندہ ہو جائیں اور زمین و آسمان کی قسمت بدل جائے چنانچہ "ارمغانِ حجاز" کی رباعیوں میں کہتے ہیں:—

زِ من ہنگامۂ دہ ایں جہاں را　　　دگرگوں کن زمین و آسماں را
زِ خاکِ ما دگر آدم برانگیز　　　بکُش ایں بندۂ سود و زیاں را

عطا کن شورِ رومی سوزِ خسرو　　　عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی
چناں با بندگی درساختم من　　　نگیرم گر مرا بخشی خدائی

جہانِ نست در دستِ خسے چند　　　کسانِ او نہ بند ما کسے چند
بزور در میانِ کارگاہاں　　　کشند خود را بہ عیش کرکسے چند

یکے اندازہ کن سود و زیاں را　　　چو جوہت جاودانی کن جہاں را
نمی بینی کہ ما خاکی نہاداں　　　چہ خوش آراستیم ایں خاکداں را

تو می دانی حیاتِ جاوداں چیست　　　نمی دانی کہ مرگِ ناگہاں چیست
زِ اوقاتِ تو یک دم کم نہ گردد　　　اگر من جاوداں باشم زیاں چیست

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ مارا
حسابِ من زِ چشمِ او نہاں گیر

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست
سوئے شہرے کہ در بطحا رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

چناں از خود بردل آوردۂ کیست
جمالش جلوۂ بے پردۂ کیست
مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن
بگو با من کہ او پردۂ کیست

دلِ بے قیدِ من در پیچ و تابیست
نصیبِ من عتابے یا خطابیست
دلِ ابلیس ہم نتوانم آزرد
گناہِ گاہ گاہِ من صوابیست

مئے من از تنک جاناں نگہ دار
شرابِ پختہ از خاماں نگہ دار
شراب از نیستانے دورتر نہ
بخاصاں بخش و از عاماں نگہ دار

ترا از کشمکش اندر طلب نیست
ترا ایں درد و داغ و تاب و تب نیست
از آں از لامکاں بگریختم من
کہ آں جا نالہ ہائے نیم شب نیست

نخواہم ایں جہان و آں جہاں را
مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوز و سرورش
بوجد آرم زمین و آسماں را

نگاہِ تو عتاب آلود تا چند	بتانِ حاضر و موجود تا چند
دریں بتخانۂ اولادِ براہیم	نمک پروردۂ نمرود تا چند

خدا سے شوخیاں اور ناز و نیاز کرنا، اور حُسنِ ادا سے شکایت کو شکر بنا دینا اقبال کا ایک لازوال کارنامہ ہے جس کا جواب مشرق و مغرب کی شاعری میں کہیں نہیں ملتا۔ اس قسم کی ایک مثال عمر خیام کی اس رباعی میں ملتی ہے جو اس نے اپنے پیالے کے گر کر ٹوٹ جانے پر کہی تھی:۔

ابریق مئے مرا شکستی ربی	بر من عیش را بہ بستی ربی
برخاک بریختی مئے ناب مرا	من مست و نیم و لے تو مستی ربی

لیکن اقبال کے ہاں اس کا کچھ اور ہی عالم ہے جس کی کیفیت چند نمونوں سے کافی طور پر واضح ہو جائے گی۔

اس کی سب سے پہلی اور شاید سب سے زیادہ اہم مثال اس لافانی مسدّس میں ملتی ہے جو "شکوہ" کے نام سے زبان زدِ خاص و عام ہے اور اس میں وہ کہتے ہیں:۔

جراٗت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو	شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سُن لے	خُوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سُن لے

اسی طرح دوسری جگہ وہ کہتے ہیں:۔

چُپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال	کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا	جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

اقبال کی اس شوخی پر جب فرشتوں کو بھی حیرت ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ:۔

غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں	شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں
اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے	تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے
عالمِ کیف ہے دانائے رموزِ کم ہے	ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے
ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو	بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

اس کا جواب اقبال کس لطیف پیرایہ میں دیتے ہیں :-

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بے باکی ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بے باک

اقبال کی یہ شوخی یا بے باکی ایک ناز ہے جو کبھی کبھی عاشق اپنے محبوب سے کرتے ہیں
اقبال جب اپنے کو کائنات میں اکیلا محسوس کرتے ہیں اور ہمدم کی تلاش میں زمین کے سمندر اور پہاڑ یا آسمان کے چاند اور ستاروں کو مخاطب کرتے ہیں اور ان سے کوئی جواب نہیں پاتے تو خدا کی بارگاہ میں فریاد لیکر آتے ہیں :-

شدم بہ حضرتِ یزداں گذشتم از مہ و مہر کہ در جہانِ تو یک ذرّہ آشنایم نیست
جہاں تہی ز دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل چمن خوش است ولے درخورِ نوایم نیست
تبسمے بہ لبِ او رسید و ہیچ نہ گفت

پھر کہتے ہیں کہ انسان میں سوز و ساز ہے خدا میں نہیں :-

تب و تابِ فطرتِ ما ز نیاز مندیٔ ما تو خدائے بے نیازی نرسی بسوز و سازم

اسی مضمون کو ارمغانِ حجاز کی رباعیوں میں اس طرح بیان کیا ہے :-

ترا ایں کشمکش اندر طلب نیست ترا ایں درد و داغ و تاب و تب نیست
از آں از لامکاں بگریختم من کہ آں جا نالہ ہائے نیم شب نیست

تو می دانی حیاتِ جاوداں چیست نمی دانی کہ مرگِ ناگہاں چیست
ز اوقاتِ تو یک دم کم نہ گردد اگر من جاوداں باشم زیاں چیست

خدا سے کہتے ہیں کہ تو خدائی کرتے کرتے تھک گیا ہے تھوڑی دیر میرے سینے میں آرام لے :-

در سینۂ من دمے بیاسائے از محنت و کلفتِ خدائی

ایک دوسری نظم میں وہ خدا سے اس طرح خطاب کرتے ہیں کہ اگر تو چاہتا ہے کہ میں تیرے نظارہ کے لیے اپنی خودی کھو بیٹھوں تو یہ سودا بہت مہنگا ہے ۔ میری خودی تیرے نظارہ سے زیادہ قیمت رکھتی ہے :-

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولی نگیرد با من ایں سودا بہا از بس گراں خواہی
نگاہِ بے ادب زد در خنہا در چرخِ مینائی دگر عالم بنا کن گر حجابے درمیاں خواہی

چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا　　شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر　　ز نوری سجدہ می خواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی

ایک اور موقع پر وہ خدا کی بے وفائی کی شکایت کرتے ہیں :-

آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی　　در بیابانِ جنوں بردی و رسوا ساختی

جرمِ ما از دانۂ تقصیرِ او از سجدۂ　　نے بآں بیچارہ می سازی نہ باما ساختی

صد جہاں می روید از کشتِ خیالِ ما چو گل　　یک جہاں و آں ہم از خونِ تمنا ساختی

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم　　ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

آخری شعر میں کہتے ہیں کہ یہ دُنیا ایک کھلونا ہے، خدا کی قدرت کا شایانِ شان نمونہ نہیں ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ یہ مٹی کا پتلا بنانا خدا کا کام نہیں ہے ایک پختہ تر آدم بنا :-

نقشِ دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار　　لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتے ہیں کہ یہ ساری دُنیا جب تک ہمارے معیار پر پوری نہ اُترے مکمل نہیں ہو سکتی :-

عالمِ آب و خاک را بر محکِ دلم بسائے　　روشن و تار خویش را گیر عیارِ ایں چنیں

کبھی وہ خدا سے کہتے ہیں کہ تو نے یہ کراماً کاتبین جو ہم پر مقرر کر رکھے ہیں اس سے کیا فائدہ۔ تو نے ہمیں اس دُنیا میں اتنی مہلت ہی کہاں دی ہے کہ ہم کچھ گناہ کر سکیں :-

گناہِ ما چہ نویسند کاتبانِ عمل　　نصیبِ ما ز جہانِ تو جز نگاہے نیست

انسانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ دُنیا میں اس طرح جیو کہ اگر ہماری موت دائم موت ہے تو خدا کو بھی شرم آئے کہ اس نے ایک ایسی بہترین مخلوق کو فنا ہونے دیا :-

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام　　خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

وہ کبھی خدا سے اس کے بخل کی شکایت کرتے ہیں :-

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے　　بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم　　بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

دُنیا اور مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت پر خدا کو اس طرح متنبہ کرتے ہیں :-

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟ — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی — خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر؟ — مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا، جبریلؑ بھی، قرآن بھی تیرا — مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے روشن جہاں تیرا — زوالِ آدمِ خاکی، زیاں تیرا ہے یا میرا؟

اسی طرح "بالِ جبریل" کی ایک دوسری نظم میں خدا سے فریاد کرتے ہیں :-

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد — نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد
یہ مشتِ خاک یہ صرصر یہ وسعتِ افلاک — کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد
ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل — یہی ہے فصلِ بہاری؟ یہی ہے بادِ مراد؟
قصوروار غریب الدیار ہوں لیکن — ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے — وہ دشتِ سادہ وہ تیرا جہانِ بے بنیاد
خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں — انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

اقبال اپنی اور خدا کی دنیا کا مقابلہ کرتے ہیں :-

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی — مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور — مری دنیا میں تیری بادشاہی

اسی طرح "ارمغانِ حجاز" میں خدا سے کہتے ہیں کہ تو اپنی جنت کا مقابلہ ہماری اس دنیا سے کر جس کو ہم آراستہ کیا ہے اور دیکھ کہ دونوں میں کون بہتر ہے، اس لیے مناسب یہی ہے کہ تو اس دنیا کو بھی جنت کی طرح جاودانی بنا دے :-

یکے اندازہ کن سود و زیاں را — چو جنت جاودانی کن جہاں را
نمی بینی کہ ما خاکی نہاداں — چہ خوش آراستیم ایں خاکداں را

جب وہ کونین پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دنیا و آخرت دونوں ان کو پسند نہیں آتے کیوں کہ :-

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا — یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

خدائی اور بندگی کا فرق بتلاتے ہیں :-

خدائی اہتمام خشک و تر ہے	خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی! استغفر اللہ	یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

اگر وہ شکایت کرتے ہیں تو خدا کو برا ماننے کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ اسی نے ان کو یہ تابِ سخن دی ہے:۔

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک	تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی
ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل	کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

ان کا جنون ایسا ہے کہ وہ قیامت کے دن بھی خدا سے نپٹ لے گا:۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا	یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

اپنی اور غیر قوموں کی حالت کا فرق خدا سے بیان کرتے ہیں:۔

یا رب یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن	کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ	دُنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
تو برگ گیاہے نہ دہی اہلِ خرد را	او کشتِ گل و لالہ بہ بخشد بہ خرے چند
حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں	مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر	تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا	افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

"ضربِ کلیم" میں شکر و شکایت ایک ساتھ کرتے ہیں:۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا	رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے جہاں کو	لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں	مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے	جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

آدم شیطان کے دھوکے میں آتے ہیں تو اقبال کس مدلل پیرایہ میں عذر داری پیش کرتے ہیں:۔

جہاں از خود بروں آوردۂ کیست	جمالش جلوۂ بے پردۂ کیست؟
مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن	بگو با من کہ او پروردۂ کیست؟

اقبال نے جابجا سوال و جواب کے پیرایہ میں خدائے تعالیٰ کو انسان کا ہم سخن بنایا ہے بلکہ ان کا تو اعتقاد تھا کہ انسان ہی کیا یہ جھاڑ اور پہاڑ بھی خدا سے باتیں کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تیری ــ شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

اسی بنا پر جب وہ "شکوہ" اور دوسری نظموں میں اپنی صدائے فریاد بلند کرتے ہیں تو ان کے نالے عرش سے جا کر ٹکراتے ہیں:۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ــ پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے ــ خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا

آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

پھر ناممکن تھا کہ یہ فغانِ نیم شبی بے اثر رہ جائے اور اس کا کوئی جواب نہ آئے، چنانچہ آخر کار جو پردے خالق و مخلوق میں حائل تھے وہ اٹھ جاتے ہیں:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر ــ کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

پھر سب سے پہلے جو آواز ان کے کانوں میں آتی ہے وہ "جوابِ شکوہ" میں درج ہے:...

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا ــ اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا

آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا ــ کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا

شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے

ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

"شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" اس صنف میں ان کی فن کاری کے بہترین نمونے ہیں، لیکن اسی قسم کی متعدد مثالیں ان کی دوسری تصنیفوں میں بھی ملتی ہیں، چنانچہ "پیامِ مشرق" میں خدا، اور انسان کا ایک مکالمہ درج کیا ہے جس میں خدا انسان کو ملزم ٹھہراتا ہے کہ تو نے میری دنیا کو تباہ کر دیا، انسان جواب دیتا ہے کہ نہیں میں نے تو تیری دُنیا کو دوزخ سے جنّت بنا دیا، خدا کہتا ہے:۔

جہاں را زِ یک آب و گِل آفریدم ــ تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

من از خاک پولادِ ناب آفریدم ــ تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہالِ چمن را

قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان جواب دیتا ہے:۔

تو شب آفریدی، من چراغ آفریدم ــ سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی ــ خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

کسی قدر مزاحیانہ انداز میں وہ خدا سے اس وقت مخاطب ہوتے ہیں جب ایک مُلّا کو جنت میں لے جانے کا حکم ملتا ہے :-

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا　　حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف　　خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول　　بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا　　اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

خدائے تعالیٰ سے سوال و جواب کی ایک بہترین مثال اقبال نے "جاوید نامہ" میں پیش کی ہے جس میں ان کے سارے فلسفۂ حیات کا نچوڑ موجود ہے۔ افلاک کی سیر کرتے ہوئے اور فردوس بریں سے گزر کر جب وہ حضور باری میں پہنچتے ہیں تو اس کرۂ خاکی کی موجودہ حالت کی طرف توجہ دلاتے ہیں :-

عشقِ جاں را لذتِ دیدار داد　　باز بانم جرأتِ گفتار داد
اے دو عالم از تو با نور و نظر　　اندکے آں خاکداں را نگر
بندۂ آزاد را نا سازگار　　بردمد از سنبل او نیش خار
از ملوکیت جہانِ تو خراب　　تیرہ شب در آستینِ آفتاب
دانشِ افرنگیاں غارت گری　　دیرہا خیبر شد از بے حیدری
آنکہ گوید لا الہ بیچارہ ایست　　فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست
چار مرگ اندر پے ایں دیر میر　　سود خوار و والی و مُلّا و پیر
ایں چنیں عالم کجا شایانِ تست　　آب و گِل داغ کہ بر دامانِ تست

اس کے جواب میں ذاتِ باری کی طرف سے ندائے جمال آتی ہے جس میں تخلیق عالم کی حقیقت بتلائی گئی ہے اور اپنی دُنیا آپ پیدا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے :-

کلکِ حق از نقش ہائے خوب و زشت　　ہر چہ مارا سازگار آمد نوشت
چیست بودن دانی اے مردِ نجیب　　از جمالِ ذاتِ حق بردن نصیب
آفریدن؟ جستجوئے دلبرے　　وا نمودن خویش را بر دیگرے
ایں ہمہ ہنگامہ ہائے ہست و بود　　بے جمالِ ما نیاید در وجود

زندگی ہم فانی و ہم باقی است | این ہمہ خلاقی و مشتاقی است
زندہ؟ مشتاق شو خلاق شو | ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو
در شکن آن را کہ ناید ساز گار | از ضمیر خود دگر عالم بیار
بندۂ آزاد را آید گراں | زیستن اندر جہانِ دیگراں
ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست | پیش ما جز کافر و زندیق نیست
از جمالِ ما نصیبِ خود نبرد | از نخیلِ زندگانی بر نخورد

مردِ حق برندہ چوں شمشیر باش
خود جہانِ خویش را تقدیر باش

اقبال پھر عرض کرتے ہیں کہ جو قوم ایک مرتبہ مُردہ ہو چکی وہ دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتی ہے:۔

چیست آئینِ جہانِ رنگ و بو | جز کہ آبِ رفتہ می ناید بجو
زندگانی را سرِ تکرار نیست | فطرتِ او خوگرِ تکرار نیست
زیرِ گردوں رجعت او را نا رواست | چوں ز پا افتاد قومے بر نخاست

ملتے چوں مرد کم خیزد ز قبر
چارۂ او چیست غیر از قبر و صبر

اس کا جواب دیتے ہوئے باری تعالیٰ کہتا ہے زندگی کا راز وحدتِ افکار و کردار میں پوشیدہ ہے:۔

زندگانی نیست تکرارِ نفس | اصل او از حی و قیوم است و بس
فرد از توحید لاہوتی شود | ملت از توحید جبروتی شود
بے تجلی نیست آدم را ثبات | جلوۂ ما فرد و ملت را حیات
ہر دو از توحید می گیرد کمال | زندگی این را جلال آں را جمال
چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ؟ | با ہزاراں چشم بودن یک نگہ
اہلِ حق را حجت و دعوے یکے ست | خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکے ست
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب | یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب
ملتے چوں می شود توحید مست | قوت و جبروت می آید بدست

روحِ ملت را وجود از انجمن | روحِ ملت نیست محتاجِ بدن
مردهٔ؟ از یک نگاہی زندہ شو | بگذر از بے مرکزی پایندہ شو
وحدتِ افکار و کردار آفریں | تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

پھر اقبال حقیقتِ عالم اور انسان کی مجبوری کے متعلق سوال کرتے ہیں :۔

من کیم؟ تو کیستی؟ عالم کجاست | درمیانِ ما و تو دوری چراست؟
من چرا در بندِ تقدیرم بگوئے | تو نہ میری من چرا میرم بگوئے؟

جواب ملتا ہے کہ مجبوری کا علاج انسان کی خودی میں ہے :۔

بودہٗ اندر جہانِ چارسو | ہر کہ گنجد اندرو میرد درو
زندگی خواہی خودی را پیش کن | چارسو را غرق اندر خویش کن

باز بینی من کیم تو کیستی
در جہاں چوں مردی و چوں زیستی

آخر میں اقبال مشرق و مغرب کی تقدیر معلوم کرنا چاہتے ہیں :۔

یورشِ ایں مردِ ناداں در پذیر | پردہ را از چہرۂ تقدیر گیر
انقلابِ روس و المان دیدہ ام | شور در جانِ مسلماں دیدہ ام

دیدہ ام تدبیرہائے غرب و شرق
وانما تقدیرہائے غرب و شرق

اس کے جواب میں اقبال نے باری تعالیٰ کا جو پیام منظوم کیا ہے وہ زبان، خیالات اور تغزل کے لحاظ سے فن کاری اور قادر الکلامی کا بہترین نمونہ ہے :۔

بگذر از خاور و افسونیٔ افرنگ مشو | کہ نیرزد بجوئے ایں ہمہ دیرینہ و نو
آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختۂ | ہم بجبریل امینے نتواں کرد گرو
زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است | اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو با ہمہ رو
تو فروزندہ تر از مہرِ منیر آمدۂ | آنچناں زی کہ بہر ذرہ رسانی پرتو
چوں پرِ کاہ کہ در رہ گذر باد افتاد | رفت اسکندر و دارا و قباد و خسرو

اے تنک جامی تو مے کدہ رسوا گردید
شیشہ گیر و حکیمانہ بیا شام و برو

حسن اور خدا کا جو مکالمہ "بانگِ درا" میں درج ہے اس کا شمار اقبال کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے:۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں تو نے مجھے کیوں نہ لازوال کیا!

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دُنیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دُنیا

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

آخر میں ہم اقبال کے اس کلام کا نمونہ پیش کریں گے جس میں ؎

"خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"

پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے بعض جگہ تخیل اور شاعرانہ قوت سے کام لے کر اپنے خیالات کو ذاتِ باری تعالیٰ کے روبرو ابلیس، آدم، لینن وغیرہ کی زبانی پیش کیا ہے اور ان میں ایسے ایسے لطیفے پیدا کیے ہیں جو تخلیقی آرٹ کی بہترین مثال ہیں۔

"پیامِ مشرق" کی ایک رباعی میں ایک برہمن خدا پر طعن کرتا ہے کہ بُت آدمی سے زیادہ دیرپا ہیں اور اگر تو نے انسان کو سجدہ کرایا تو میرا بُت کو سجدہ کرنا کیوں جُرم ہے:۔

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت
فروغِ زندگی تابِ شرر بود

ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم
صنم از آدمی پایندہ تر بود

خدا جب ابلیس کو حکم دیتا ہے کہ آدم کو سجدہ کر تو ابلیس کا انکار ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

نوری نادان نیم سجدہ بآدم برم
او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آذرم

می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات
من بہ دو صرصرم، من بہ غو تندرم

رابطۂ سالمات، ضابطۂ امہات
سوزم و سازے دہم آتشِ مینا گرم

پیکرِ انجم زِ تو، گردشِ انجم زِ من
جاں بجہاں اندرم، زندگیِ مضمرم

تو بہ بدن جاں دہی، شور بجاں من دہم
تو بہ سکوں رہزنی من بہ تپش رہبرم

آدمِ خاکی نہاد، دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوشِ تو پیر شود در برم

قیامت کے دن آدم حضور باری میں عذر داری پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے جنت میں جو قصور کیا تھا وہ ایک مصلحت پر مبنی تھا، اور یہ کہ انسان نے دُنیا کی ساری قوتوں کو مسخر کیا، اور آخر میں اہرمن کو سجدہ کرا کر ہی چھوڑا:۔

اے کہ زِخورشیدِ تو کوکب جاں مستنیر
از دلم افروختی شمع جہانِ ضمیر

ریخت ہنرہائے من بحر بیک نائے آب
تیشۂ من آورد از جگر خارہ شیر

زہرہ گرفتارِ من، ماہ پرستارِ من
عقلِ کلاں کارِ من، بہرِ جہان دار وگیر

من بہ زمیں در شدم، من بہ فلک بر شدم
بستۂ جادوئے من ذرّہ و مہرِ منیر

گرچہ فسونش مرا بُرد زِ راہِ صواب
از غلطم درگذر، عذرِ گناہم پذیر

رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم
جز بکمندِ نیاز، ناز نہ گردد اسیر

تا شود از آہِ گرم ایں بتِ سنگیں گداز
بستن زنّارِ او بود مرا ناگزیر

عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

ایک مردِ نکتہ بیں مرنے کے بعد خدا کے پاس فریاد لے آتا ہے کہ ملک الموت کو جان لینے کا فن نہیں آتا اس کو مُلک فرنگ روانہ کر تاکہ اس فن کو اچھی طرح سیکھ کر آئے:۔

تفنگش بہ کشتن چناں تیز دست
کہ افرشتۂ مرگ را دم گسست

فرست ایں کہن ابلہ را در فرنگ
کہ گیرد فنِ کشتن بے درنگ

ابلیس بارگاہِ ایزدی میں نالہ کرتے ہوئے آتا ہے کہ ابنِ آدم کا شکار کرنے میں مجھے کوئی لطف نہیں آتا اور بغیر مزاحمت اور مقابلے کے فتح کرتے کرتے بیزار ہوگیا ہوں، کوئی ایسا مردِ خدا بھیج جو میرا مقابلہ کرے اور مجھے ٹھکرا دے تاکہ اس شکست میں مجھے کچھ مزہ ملے:۔

اے خداوندِ صواب و ناصواب
من شدم از صحبتِ آدم خراب

ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت
چشم از خود بست و خود را در نیافت

خاکش از ذوقِ ابا بیگانۂ
از شرارِ کبریا بیگانۂ

صید خود صیاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پذیر

از چنیں صیدے مرا آزاد کن | طاعتِ دیروزۂ من یاد کن
پست از و آں ہمتِ والائے من | وائے من اے وائے من اے وائے من
فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف | تاب یک ضربم نیارد ایں حریف
بندۂ صاحب نظر باید مرا | یک حریفِ پختہ تر باید مرا
لعبتِ آب و گل از من باز گیر | می نیاید کودکی از مردِ پیر
ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس است | مشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود | ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود
شیشہ را بگداختن عکارے بود | سنگ را بگداختن کارے بود
آں چناں تنگ از فتوحات آمدم | پیش تو بہرِ مکافات آمدم
منکرِ خود از تو می خواہم بدہ | سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم | لرزہ اندازد نگاہش در تنم
آں کہ گوید از حضورِ من برو | آں کہ پیشِ او نیرزم با دو جو

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست

اسی طرح ایک دوسری مرتبہ ابلیس عرضداشت لیے ہوئے آتا ہے کہ خود انسانوں میں بہت سے ابلیس سیاست دانوں کی شکل میں موجود ہیں، اب دُنیا میں میری ضرورت باقی نہیں ہے:۔

کہتا تھا عزازیل خداوندِ جہاں سے | پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کفِ خاک
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب | دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک
ناپاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت | مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک
تجھ کو نہیں معلوم کہ حورانِ بہشتی | ویرانیٔ جنّت کے تصور سے ہے غمناک
جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست | باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

حدیثِ دیگراں کے سلسلے میں اعلیٰ ترین مثال وہ ہے جو "بالِ جبریل" میں لینن اور خدا کے مکالمے کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ لینن خدا کے حضور میں عرض کرتا ہے:۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات!

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندۂ فلزات

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائیٔ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

لینن کی ان شکایتوں کو سُن کر خدا، فرشتوں کو بھیجتا ہے کہ وہ دُنیا میں جا کر تحقیقات کریں کہ واقعی یہ شکایتیں

صحیح ہیں یا نہیں۔ فرشتے واپس آکر عرض کرتے ہیں :۔

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی	نقشِ ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر	تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست	بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام	عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی	آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

لینن کی شکایتوں کی جب اس طرح تصدیق ہو جاتی ہے تو فرشتوں کو حکم دیتا ہے :۔

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو	کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے	کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ	جو نقشِ کُہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی	اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے	پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے	بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے	میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے	آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

یہ ہے خدا، اور بندے کا وہ معاملہ جس کو اقبال نے مختلف پہلوؤں سے باندھا ہے۔ ہم نے اس مضمون میں صرف اس کلام پر بحث کی ہے جس میں دو بدو خدا سے خطاب کیا گیا ہے۔ اقبال کے کلام کا ایک بڑا حصہ ان شعروں اور نظموں پر مشتمل ہے جن میں ذات باری تعالیٰ اور اس کی مختلف صفتوں کا صیغۂ غایب میں ذکر ہے۔ اس قسم کا کلام ان کی ابتدائی تصنیفوں کے مقابلے میں آخری تصنیفوں میں زیادہ پایا جاتا ہے اور وحدت کا رنگ آخر میں ان پر اس قدر چڑھ گیا تھا کہ اگر اور چند سال زندہ رہتے تو شاید کلیتہً خدا سے ہی مخاطب رہتے۔ لیکن اس کے باوجود ان کو احساس تھا کہ انھوں نے جو کچھ کہا اس کے مقابلے میں جو وہ کہنا چاہتے ہیں کچھ حقیقت نہیں رکھتا، کیونکہ انسان کی مختصر زندگی اس کے لیے ناکافی ہے اور اس کے علاوہ کوئی ہستی انسانوں میں ایسی نہیں ہے جس سے وہ ان رموز کو کہہ سکیں اور جو ان کی اس امانت کا حامل ہو سکے :۔

رمزِ عشق تو بار باہوس نتواں گفت | سخن از تاب تب شعلہ بخس نتواں گفت
تو مرا ذوقِ بیاں دادی و گفتی کہ بگوئے | ہست در سینۂ من آنچہ بکس نتواں گفت
شوق اگر زندۂ جاوید نہ باشد عجب است | کہ حدیثِ تو دریں یک دو نفس نتواں گفت

رضی الدین صدیقی

موناداتی تصوّریت

فلاطون اور برکلے کی تصوریت کے سوا ایک اور قسم کی تصوریت ہے جس کو جرمن فیلسوف "لائبنز
(گاٹفریڈ ولہلم نان) (۱۶۴۶ء تا ۱۷۱۶ء) نے پیش کی ہے۔ فلاطون نے ذہن کو کائنات میں سب سے زیادہ
اہم حقیقت قرار دیا تھا، ذہن معانی یا اقدار پر مشتمل تھا، اس کی تصوریت کو "نصب العینوں کی تصوریت"
(Idealism of Ideals) کہا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ اقدار نصب العین قرار دیے گئے تھے۔
برکلے کی تصوریت "تصوریت تصورات" کہلاتی ہے (Idealism of Ideas) جس کی رو سے
کائنات اذہان اور اس کے تصورات پر مشتمل قرار دی گئی ہے۔ لائبنز کی تصوریت کی رو سے کائنات لاتعداد
"مونادات" یا مرکز قوۃ پر مشتمل ہے، یہ مونادات و روح جیسے جوہر ہیں، جن پر موناد برتر، خدا، کی حکمرانی ہے۔
لائبنز کے نظریۂ تصوریت کو "مونادیت" (Monadism) کہا جاتا ہے۔ طلبا کو لائبنز کی مندرجۂ ذیل
کتابیں پڑھنی چاہیئے:- (۱) The Discourse on Metaphysics (۲) Letters to Arnauld
(۳) Monadology (۴) The New System
پہلی دو کتابیں ایک ہی جلد میں مل جائیں گی جس کی اشاعت "اوپن کورٹ کمپنی" نے کی ہے۔ ہم یہاں پر نہایت
اختصار کے ساتھ موناداتی تصوریت کی توضیح کرتے ہیں۔

فلسفۂ جدید کے موسس ڈیکارٹ کی طرح لائبنز بھی تسلیم کرتا ہے کہ میرا اور دوسری ارواح یا نفوس کا
وجود پایا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات میں غیر روحانی یا مادی موجودات کا وجود نہیں پایا جاتا۔ ہم جنھیں
اشیاء مادی کہتے ہیں وہ ذہن سے خارج میں مستقل اور غیر محتاج طریقے پر پائی جاتی ہیں، یہ اپنے وجود میں ذہن کی
محتاج نہیں (برعکس برکلے)۔ لیکن جب ہم ان خارجی مادی اشیاء کی حقیقی ماہیت دریافت کرتے ہیں تو ہمیں معلوم
ہوتا ہے کہ یہ دراصل ذہنی یا روحانی ہیں۔ اس طرح کائنات میں ایک ہی قسم کی حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ

روحانی یا ذہنی ہے۔ کائنات بے شمار ارواح (موناداات) کی ایک جماعت پر مشتمل ہے (روحانی کثرتیت)۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ لائبنز غیر روحانی یا جسمانی یا مادّی حقایق کے وجود کے انکار میں کیا دلائل پیش کرتا ہے۔

لائبنز کے پیشرو، وجود مادہ کے قائل فلسفی۔ ڈیکارٹ وہابس نے مادّے کے حقیقی صفات امتداد اور حرکت قرار دیے تھے۔ ہم نے اوپر دیکھا کہ برکلے نے ان صفات کو ذہنی ثابت کیا تھا۔ اب لائبنز یہ بتلانے کی کوشش کرتا ہے کہ امتداد اور حرکت کو انتہائی حقیقت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ ایک قوت کے اظہارات ہیں اور یہ قوت اپنی ماہیت کے لحاظ سے روحانی ہے۔

لائبنز کہتا ہے کہ امتداد لامتناہی طور پر قابل تقسیم ہے، یعنے اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی تجریداً مزید حصص میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ اب لائبنز کا یہ دعوےٰ ہے کہ جو شئے اپنی ماہیت کے لحاظ سے لامتناہی طور پر قابل تقسیم ہو وہ کبھی انتہائی حقیقت نہیں ہو سکتی۔ بہ الفاظِ دیگر 'انتہائی حقیقت' سے مراد ناقابلِ تحویل حقیقت ہے لہٰذا جو شئے غیر محدود طور پر قابلِ تقسیم ہے وہ انتہائی نہیں ہو سکتی۔

اب رہی 'حرکت' اس کے متعلق بات اور صاف ہے کہ یہ انتہائی حقیقت نہیں ہو سکتی۔ لائبنز کہتا ہے کہ:۔

> "اگر ہم حرکت کے ٹھیک رسمی معنے لیں یعنے تغیّر مقامی کے معنے میں اس کو سمجھیں تو
> وہ کوئی حقیقی شئے باقی نہیں رہتی، اور جب کئی اجسام مقابلۃً اپنا مقام
> بدلتے ہیں تو پھر اجسام ہی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس امر کا تعیّن کرنا ممکن
> نہیں کہ ان میں سے کس کے ساتھ حرکت یا سکون کو متّصف کیا جائے۔"

ظاہر ہے کہ جو شئے ہمیشہ کسی دوسری شئے کے ساتھ اضافت رکھتی ہو وہ انتہائی حقیقت نہیں ہو سکتی۔ حرکت تغیّرِ مقامی کے معنے میں ایک اضافی شئے ہے لہٰذا وہ انتہائی حقیقت نہیں ہو سکتی۔

جب امتداد و حرکت انتہائی حقایق نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ غیر روحانی یا جسمانی اشیاء جن کی ماہیت امتداد و حرکت قرار دی جاتی ہیں انتہائی حقایق نہیں ہو سکتیں۔ اب لائبنز کا خیال ہے کہ ان اشیاء کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ حرکی حقایق ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر، ان کا مبدء قوۃ ہے۔ ڈیکارٹ کی یہ تعلیم تھی کہ حرکت کی مقدار معیّن ہے، لیکن مشاہدہ شاہد ہے کہ اجسام حرکت بھی کرتے ہیں اور ساکن بھی ہوتے ہیں: اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حرکت پیدا بھی ہوتی ہے اور فنا بھی ہوتی ہے اور یہ قانونِ تسلسل کے خلاف ہے۔ ایسی چیز ضرور ہونی چاہیئے جو

حرکت کے موقوف ہونے پر باقی رہے، جو حرکت کا مبدا ہو اور یہ قوت ہے اور قوت اپنی کمیت یا مقدار میں مستقل و متعین ہوتی ہے۔

اس طرح حرکت و امتداد کو ایک تحتی قوۃ کے ظواہر قرار دیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی روسے کائنات روحانی حقایق اور غیر روحانی ممتد و متحرک حقایق پر مشتمل نہ ہوگی بلکہ روحانی حقایق اور غیر روحانی قوتوں پر۔ اب سوال یہ ہے کہ قوت کی کیا ماہیت ہے؟ لائبنز کہتا ہے کہ باطنی تجربے سے ہمیں صرف ایک ہی حقیقی فعال قوۃ کا علم ہوتا ہے جو ہماری روح ہے کسی شئے کا قوت میں تصور کرنا اس کو کسی معنے میں ہماری اپنی ارادہ رکھنے والی عمل و کوشش کرنے والی ذات کی طرح سمجھنا ہے۔ لائبنز کہتا ہے کہ اس یقین سے کہ حقیقی اکائیوں کی ماہیت قوت پر مشتمل ہے" یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان کا وہی تصور کریں جو ہمیں اپنی روح کا حاصل ہے۔"

خلاصہ یہ کہ لائبنز کا فلسفیانہ غور و فکر اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ غیر روحانی یا مادّی یا جسمانی حقایق کی اگر آخری تحلیل کی جائے تو وہ روحانی ثابت ہوتی ہیں۔ اس نتیجے کی بنیاد اس دلیل پر قایم ہے کہ مادّی یا جسمانی حقیقت کا تصوّر یا تو بہ حیثیت ایک ممتد و متحرک شئے کے کیا جانا چاہیئے (جیساکہ ڈیکارٹ و ہابس نے کیا تھا) یا بہ حیثیت قوت کے لیکن چونکہ امتداد لامتناہی طور پر قابلِ تقسیم ہے اور حرکت ہمیشہ اضافی، لہذا ان کو انتہائی حقیقت نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ امتداد و حرکت کو قوت کے اظہارات یا مظاہر تصوّر کیا جانا چاہیئے اور قوت کا تصوّر روح کے سوا اور کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ لہذا ساری کائنات روحانی حقایق پر مشتمل ہے۔ لائبنز روح جیسے جوہر کو مونا د کہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موناد کی اصطلاح اس نے فان ہلمنٹ سے لی ہے۔

لائبنز کی تعلیم کا پہلا حصہ تو یہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کیا کہ انتہائی حقیقت روحانی ہے۔ اس کی تعلیم کا دوسرا حصہ جس کا وہ کوئی ثبوت پیش نہیں کرتا بلکہ محض تسلیم کر لیتا ہے یہ ہے کہ کائنات کثرت پر مشتمل ہے، یعنے انتہائی حقیقت جو روحانی ماہیت رکھتی ہے کثیر مونادات پر مشتمل ہے جو ارواح کے مانند جوہر ہیں۔ اپنی فلسفیانہ تعلیم کے دوسرے حصے کے لیے لائبنز کسی ثبوت کی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ اس کو ایک بدیہی چیز خیال کرتا ہے۔

لائبنز موناد یا روح جیسی حقیقت کی چار اہم قسمیں قرار دیتا ہے:-

(۱) موناد برترین، یعنے خدا

(۲) ارواحِ عقلیہ (Spirits)

(۳) حساس و غیر عقلی مونادات (Souls)

(۴) سادہ موناداتِ یعنے اجسام عضویہ وغیر عضوی اجسام (Bodies)[1] . . . .

موناد برترین یا خدا سے لائبنز کی وہی مراد ہے جو ڈیکارٹ نے لی تھی، یعنے ایک ایسی ذات جو لامحدود اور کامل و اکمل ہے، جو قادرِ مطلق، حکیم مطلق و خیر مطلق ہے خدا کے وجود کے دلائل جو لائبنز پیش کرتا ڈیکارٹ کے دلائل سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں۔ خدا کے کامل ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کی خلق کردہ دُنیا بھی بہترین دُنیا ہے۔ لائبنز مغربی فلسفے میں رجائیت کے ایک عظیم الشان نظام کا بانی ہے اس کے نزدیک ہماری دُنیا سب سے بہتر دُنیا ہے جہاں شر سے زیادہ خیر اور غم سے زیادہ راحت ہے۔

تمام محدود موناداتِ خدا کے محتاج ہیں جو ان کا خالق ہے تخلیق کی مثال صاف طور پر پیدائش افکار سے دی گئی ہے۔ خدا سے محدود موناداتِ کا صدور "ایک طرح کا اشراق ہے۔" خدا ان کو اسی طرح پیدا کرتا ہے جس طرح ہم افکار کو پیدا کرتے ہیں"۔ کائنات میں افراد کی اس لیے کثرت ہے کہ خدا کائنات کے تمام پہلوؤں کا تمام ممکنہ طریقوں سے ملاحظہ کرتا ہے اور کائنات کے ہر منظر کے نتیجے کے طور پر جو ایک مختلف مقام سے حاصل ہوتا ہے ایک جوہر پیدا ہوتا ہے"۔[3]

ہر موناد فعّال ہے، جوہر وہ نہیں جو اپنی ذات سے قایم ہو (جیسا کہ اسپنوزا نے کہا تھا) بلکہ جوہر وہ ہے جو اپنی ذات سے فاعل ہو یا جو اپنی متغیر حالات کا مبدء اپنی ہی ذات میں رکھتا ہو"جوہر وہ ہستی ہے جو فعلیت کے قابل ہے"۔ فعلیت و وجود کے ایک کر دینے سے انفرادی اشیا میں پھر جوہریت پیدا ہو گئی جس کو اسپنوزا نے (جوہر کی قایم بالذات شئے تعریف کر کے) ان سے چھین لیا تھا۔ اپنی باطنی فعلیت کی وجہ سے ہر موجود شئے ایک متعین فرد قرار پاتی ہے جو ہر دوسری شئے سے مختلف ہے جوہر وہ انفرادی ہستی ہے جو قوت سے متصف ہے۔

ہر موناد، دوسرے موناد سے مطلقاً علیحدہ اور جدا ہوتا ہے۔ "ہر انفرادی جوہر ایک علیحدہ دُنیا ہے اور سوائے خدا کے ہر شئے سے غیر محتاج"۔ "یہ نہ کسی پر عمل کرتا ہے اور نہ کسی کا معروض عمل بنتا ہے" موناداتِ کے دریچے نہیں ہوتے جن میں سے کوئی چیز آسکے یا جاسکے"۔ لائبنز کے اس دعوے کی تائید مطالعۂ باطن سے ہوتی ہے جب میں اپنی ذات پر غور کرتا ہوں تو یہ پاتا ہوں کہ میں ایک یگانۂ روزگار فرد ہوں، میری ذات اور دوسروں کی ذات میں ایک خلیج حائل ہے۔

---

[1] ۔ دیکھو مونا ڈالوجی بند ۱۹ ـــ ۲۹ ۔

[2] ۔ دیکھو رجائیت پر لائبنز کی مشہورِ عالم کتاب (Theodicee) جو اس نے شہزادی موفیا چارلٹ کے لیے لکھی تھی۔

[3] ۔ دیکھو لائبنز کی (Discourse) بند چہاردہم، نیز مقابلہ کرو بند ۳۲ یہاں کالکنس کی کتاب محولہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

بالکل مجھ سا کوئی فرد نہیں۔ مونادات کی اس تجرید و علیحدگی سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ ناقابلِ فنا اور ازلی ہیں۔ کیوں کہ اگر یہ اپنے سے کسی خارجی شئے سے متاثر ہی نہیں ہو سکتے تو یہ نہ فنا ہو سکتے اور نہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ لائبنز کہتا ہے کہ "معجزہ ہی کی رُو سے کسی جوہر کی ابتدا یا انتہا ہو سکتی ہے۔"

"ہر موناد ساری کائنات کا آئینہ ہے"۔ یعنے ہر موناد ادراک کی قوت رکھتا ہے اور وہ ساری کائنات کا ادراک کرتا ہے اور اس کا اظہار کرتا ہے۔ اس معنے کی رُو سے وہ ایک عالم اصغر ہے "کائنات کا زندہ آئینہ"۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ "ہر شئے ان تمام چیزوں کا احساس کرتی ہے جو ساری کائنات میں وقوع پذیر ہو رہی ہیں، جو شخص دیدۂ بینا رکھتا ہے وہ ہر شئے میں سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو دوسری جگہ وقوع پذیر ہو رہا ہے اور نیز جو کچھ وقوع پذیر ہو چکا ہے اور ہونے والا ہے، اس طرح حال کے آئینہ میں زمان و مکان کے بعید واقعات کا مطالعہ کر سکتا ہے"۔ "جو شخص کسی بھی موناد کے پردوں کو کھول سکتا ہو وہ ان میں دُنیا کی ساری تاریخ پڑھ سکتا ہے۔"

بابا افضل کوہی اور دردؔ نے شاید اسی مفہوم کو اپنے اشعار میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

در جُستن جامِ جم ز کوتہ نظری	ہر لحظہ گمانے نہ بہ تحقیق بری	(بابا افضل کوہی)
رَو دیدہ بدست آر کہ ہر ذرۂ خاک	جامیست جہاں نمائے چوں درنگری	

ہر گوشۂ فضائے صد بیاباں دارد	ہر غنچہ بمشت خود گلستاں دارد	(دردؔ)
گر عقدۂ خاطرت کشاید بینی	ہر قطرہ بجیب خویش طوفاں دارد	

ہمیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ لائبنز کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ "ہر موناد تمام کائنات کو اپنے طریقے پر ظاہر کرتا ہے"، بہ الفاظ دیگر، کائنات کی عکاسی کرتا ہے یا اس کا آئینہ دار ہے۔ لائبنز کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ چونکہ ہر موناد ایک دانا ہے لہٰذا وہ تمام دُنیا کا شعور رکھتا ہے، یعنے ایک حد تک ساری کائنات کو جانتا ہے۔ میں اپنی ذات میں فرد (موناد) کی علیحدگی اور اس کی ظاہرا ہم آہنگی کو جمع کرتا ہوں۔ میں ایک منفرد ذات ہوں، اپنے سے باہر نہیں ہو سکتا، اپنے تجربے سے باہر جا نہیں سکتا، تاہم مجھے دوسرے نفوس و اشیاء کا شعور ہے۔ کائنات کا علم رکھنے کی وجہ سے میں اس کی عکاسی کرتا ہوں، تاہم میرا علم مجھے اپنی منفرد و جدا ذات سے باہر نہیں لے جاتا۔

اس نظریہ کے سمجھنے میں دو مشکلات کا سامنا ہوتا ہے:۔ (۱) چونکہ میں ایک ذی شعور ہستی ہوں لہذا یہ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ میں کائنات کا اپنے علم کی وجہ سے اظہار کرتا ہوں لیکن اس امر کا سمجھنا مشکل ہے کہ کس طرح ایک بے جان شئے، جیسے چٹان، کائنات کا اسی معنے میں اظہار کر سکتی ہے لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ لائبنز نے کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمام حقایق ارواح ہیں (حقیقت اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے روحانی ہے) تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ ذی شعور بھی ہیں۔

(۲) دوسری مشکل یہ ہے:۔ لائبنز یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ ایک محدود موناد کو ساری کائنات کا علم ہے؟ کیونکہ کیا یہ ایک بدیہی امر نہیں کہ کسی محدود و متناہی ذات یا موناد کو ساری کائنات کا علم نہیں ہو سکتا! لیکن لائبنز پھر وہی کہتا ہے کہ بے شک روح کو "لامتناہی کا علم حاصل ہے، وہ سب کچھ جانتی ہے۔" اپنی اس تعلیم کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے وہ اس امر پر زور دیتا ہے کہ بہت ساری چیزوں کے متعلق جن کا ہمیں صاف و واضح علم نہیں، مبہم و غیر ممیز علم ضرور ہوتا ہے۔ یہی نوعیت اس علم کی ہے جس کا ہمیں بدیہی طور پر نہیں ہوتا یا جس کا ہم منطقی طور پر انتاج نہیں کرتے۔[1]

یہ ہیں چند خصوصیات جو تمام محدود مونادات میں پائے جاتے ہیں: پہلے تو وہ تمام خدا یا موناد مونادات کے محتاج ہیں جو ان کا خالق ہے؛ دوسرے ہر موناد فعّال ہوتا ہے؛ تیسرے، ہر موناد دوسرے موناد سے بالکل جدا یا علیحدہ ہوتا ہے، "اس میں کوئی دریچہ نہیں ہوتا"؛ چوتھے، ہر موناد ساری کائنات کا آئینہ دار ہوتا ہے یعنے قوۂ ادراک سے متصف ہوتا ہے اور ساری کائنات کا اپنے طریقے سے اظہار کرتا ہے۔

اب ہمیں مختلف قسم کے مونادات کا باہمی فرق ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

عقلی موناد سے لائبنز کی مراد ذات، نفس یا روح ہے جس کا ہر انسان کو علم ہوتا ہے جیسے زید، لائبنز، فارابی۔ لائبنز نفس عقلی کے وجود پر کوئی دلیل نہیں لے آتا، بلکہ شعور کی ناقابلِ انکار شہادت کی بنا پر اس کو مان لیتا ہے۔ وہ میری ذات کے علاوہ دوسرے نفوس انسانی کے وجود کو بھی تسلیم کر لیتا ہے۔ دوسرے تمام محدود مونادات سے عقلی مونادات کا مابہ الامتیاز ان کے شعور کی صفائی اور وضاحت ہے۔ صرف نفوس عقلیہ ہی علاوہ ادراک و

---

[1] دیکھو کالکنس کی محولہ بالا کتاب صفحہ ۸۷ جہاں سے مندرجہ بالا بیان ماخوذ ہے ان مشکلات کی مفصل توجیہ اسی کتاب میں آگے چل کر ملے گی (صفحہ ۹۷)۔

حافظے کے عقل کے ملکہ سے متصّف ہوتے ہیں؛ اور صرف نفوسِ عقلیہ ہی اخلاقی آزادی اور ذمہ داری کے حامل ہیں۔ ارادے کی آزادی اور ذمہ داری کا تسلیم کرنا نفوسِ عقلیہ کی اخلاقی زندگی کے لیے ضروری ہے۔

موناڈات کی دوسری قسم حساّس موناڈات یا غیر عقلی ارواح ہیں۔ لائبنز حیوانات کی غیر عقلی حساّس ارواح کو افرادِ انسانی کی ذی عقل شاعر بالذات ارواح سے صاف طور پہ ممیّز کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کی رُو سے حیوانات کی ارواح ادراک اور حافظہ سے تو متصّف ہیں لیکن نہ واضح طور پر شاعر بالذات ہیں اور نہ عقل اور اخلاقی آزادی رکھتے ہیں۔ ان میں اور انسان میں ادراک و شعور کی وضاحت و صفائی کا فرق ہے۔ انسانی اور حیوانی ارواح دونوں ساری کائنات کا ادراک کرتی ہیں اور اس طرح اس کی آئینہ دار ہیں لیکن حیوانی ارواح کا ادراک غیر صاف اور مختل و مبہم ہوتا ہے۔

موناڈات کی تیسری قسم سادہ یا بسیط موناڈات کی ہے جس میں عضوی و غیر عضوی اجسام داخل ہیں۔ عضوی اور غیر عضوی اجسام کا فرق اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔ یہ دونوں کئی موناڈات یا مراکزِ قوت سے مرکب ہوتے ہیں؛ ان میں سے کوئی بھی صرف ایک موناد پر مشتمل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر مادی جسم قابلِ تقسیم ہوتا ہے اور تمام حیوانی اجسام مقطوع الاعضا ہو سکتے ہیں: اگر جسم روح ہو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں روح بھی قابلِ تقسیم و فنا قرار پائے گی جو محال ہے۔ اسی لیے اجسام کئی سادہ موناڈات کے مجموعہ قرار دیے گئے ہیں اور یہ سادہ موناڈات ہمیشہ ایک مسلسل تغیّر کی سی حالت میں ہوتے ہیں، کبھی ایک جسم کا حصہ بنتے ہیں، کبھی دوسرے کا، اور اپنا مقام بدلتے رہتے ہیں، کبھی تو آہستہ آہستہ اور مسلسل، جیسے تغذیہ کی حالت میں، اور کبھی "ایک دم، جیسے پیدائش اور موت کے وقت۔

عضوی اجسام (برخلاف غیر عضوی اجسام کے) ایک مرکزی موناد پر مشتمل ہوتے ہیں، ایک ایسے موناد پر جس کو ملکہ "کہنا چاہیئے"، یا روح، جس کے آگے تمام جسم کی ایک تصویر ہوتی ہے اور جو جسم کے دوسرے تمام موناڈات کی ہدایت و رہبری کرتی ہے۔ یہ مرکزی موناد گویا حکمراں ہے اور دوسرے موناڈات حکم بردار۔ غیر عضوی اجسام میں اس قسم کا کوئی مرکز نہیں ہوتا بلکہ وہ موناڈات کے محض ایک مجموعے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ وہ بہ قول لائبنز کے "جواہر کا ایک مجموعہ ہوتے ہیں اور صحیح معنے میں ایک جوہر نہیں ہوتے۔"

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ لائبنز کے نزدیک سادہ اور حساّس موناد یعنے مادی شئے، اور نفس یا ذات (حیوانی ہو یا انسانی) میں فرق صرف شعور کے درجوں کا ہے۔ لائبنز ہمیشہ اس امر پہ زور دیتا ہے کہ

سادہ موناد حساس موناد کی طرح مُدرک ہوتا ہے، ورنہ اس کی ماہیت روح جیسی نہ ہوگی، لیکن اس کا ادراک اس قدر غیر واضح، خفیف اور مبہم ہوتا ہے کہ سادہ موناد کو ہم اچھی طرح غیر حساس یا خفتہ موناد کہہ سکتے ہیں۔

جس دُنیا کو ہم بے جان دُنیا کہتے ہیں لائبنز کے نزدیک وہ مدہم شعور رکھنے والی ارواح سے مملو ہے:۔

"دُنیا ایک بے جان مشین نہیں جیسا کہ ڈیکارٹ اور ہابس نے خیال کیا تھا۔ اس میں کی ہر چیز گویا قوت ہے، روح ہے، زندگی ہے، فکر و خواہش ہے! ہمیں جو چیز نظر آرہی ہے وہ مشین ہے لیکن ہم ہستی کے صرف خارجی پہلو کو دیکھ رہے ہیں۔ ہستی وہ شئے ہے جو خود دیکھتی ہے" (مُدرک ہے) (بوترو)

اس بعید از قیاس نظریہ کو قابلِ فہم بنانے کے لیے لائبنز بار بار اس فرق کی طرف ہماری توجہ کو مبذول کرتا ہے جو متوجہ و غیر متوجہ شعور میں پایا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"ہزارہا علائم و اشارات ہمیں اس نتیجے کی طرف رہبری کرتے ہیں کہ ہم میں ہر لحظہ لامتناہی ادراکات وقوع پذیر ہو رہے ہیں، لیکن نہ ہمیں ان کا ادراک ہوتا ہے اور نہ ہم ان پر غور کرتے ہیں، یعنے ہماری روح میں ایسے تغیرات جاری ہیں جن کا ہم کو ادراک (یا شعوری علم) نہیں ہوتا، اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ارتسامات یا تو نہایت خفیف ہیں یا بے شمار ہیں یا بالکل متحد ہیں اس لیے ان میں کوئی چیز تمیز پیدا نہیں کرتی ..... اسی بنا پر ہمیں عادت پن چکی یا آبشار کی حرکت کا خیال کرنے سے باز رکھتی ہے جب ہم کو کچھ عرصہ اس کے قریب رہتے ہوئے گزر چکا ہوتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ حرکت کا ہمارے اعضائے حواس پہ اثر نہیں ہوتا، اور اس کے بالمقابل روح میں ایک تغیر پیدا نہیں ہوتا ..... بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ یہ ارتسامات اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ ہماری توجہ اور ہمارے حافظہ کو اپنی طرف جذب کریں"[1]

---

[1] دیکھو لائبنز کی کتاب (Nouveaux Essais) دیباچہ۔

ان مثالوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شعور کا خوابیدہ غیر متوجہ پہلو بھی ہوتا ہے۔ شعور ہمیشہ واضح و اُجاگر نہیں ہوتا، خفتہ و خوابیدہ حالت میں ہی ہوتا ہے۔ سادہ موندات کا شعور اسی خوابیدہ حالت کا سا ہوتا ہے۔ استدلال سے لائبنز یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ علاوہ حیوانانی و انسانی ارواح کے دوسری ارواح بھی پائی جاتی ہیں۔ کائنات ساری ارواح سے مملو ہے۔ ان ارواح کے شعور کے لحاظ سے مختلف درجے ہیں۔ جن اشیاء کو ہم مادّی سمجھتے ہیں وہ خفتہ شعور رکھنے والی ارواح ہیں، حیوانات کی ارواح شعور و حافظہ رکھتی ہیں، انسانی ارواح شعور ذات اور عقل سے متصف ہیں۔

انسان میں سادہ موندات بہ منزلہ جسم ہیں اور اعلیٰ تر موناد اس کی روح یا نفس ہے۔ جسم اور روح کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اپنی کتاب "نظام جدید" میں لائبنز اعتراف کرتا ہے کہ روح اور جسم کی وحدت ہی کے سوال پر غور کرتے ہوئے وہ جواہر (موندات) کے اشتراک باہمی والے عام مسئلے تک جا پہنچا۔

روح اور جسم کے باہمی ربط کو ایک تمثیل کے ذریعے لائبنز یوں ظاہر کرتا ہے:۔

"ایسی دو گھڑیوں کا تصور کرو جو ٹھیک ایک ہی وقت بتلاتی ہیں۔ یہ تین طریقوں سے ممکن ہے، پہلا طریقہ یہ ہے کہ ان دونوں میں باہمی اثر و تاثر ہوگا؛ دوسرا یہ کہ ہم ان کو ایک ہوشیار صنّاع کے ہاتھ میں دے دیں جو انھیں ہر لحظہ ایک ساتھ چلائے؛ تیسرا یہ کہ ان دونوں گھڑیوں کو ایسی حکمت و صحت کے ساتھ بنایا جائے کہ آیندہ یہ ٹھیک ایک سا وقت بتلاتے رہیں۔ باہمی اثر و تاثر نظریہ روز مرّہ کا فلسفہ[1] ہے؛ لیکن چونکہ ہم ایسے مادّی ذرّات کا تصور نہیں کر سکتے جو ایک جوہر سے نکل کر دوسرے میں نفوذ کر سکیں، لہٰذا یہ تصور قابلِ تردید ہے۔ خالق کی مسلسل معاونت کا نظریہ نظامِ علل اتفاقیہ[2] والا نظریہ ہے؛

---

[1] یہ ڈیکارٹ کا 'تعامل' یا (Interactionism) والا نظریہ ہے جس کی رُو سے ذہن جسم پر عمل کرتا ہے اور جسم ذہن پر، چونکہ خود ڈیکارٹ کے نزدیک جسم اور روح بالکل مختلف الماہیت ہیں لہٰذا یہ تعامل ناقابلِ فہم ہے۔

[2] یہ گیولنکس اور مالبرانش کا نظریہ ہے جن کے نزدیک خدا نے روح اور جسم دونوں کو پیدا کیا ہے اور ہر موقع پر

لیکن میری رائے میں یہ خدا کو ایک فطری اور معمولی معاملے میں گھسیٹ
لانا ہے جہاں عقل کی رُو سے اس کو تو اسی حد تک اشتراکِ عمل کرنا چاہیئے
جس حد تک کہ وہ دوسرے تمام فطری مظاہر میں کرتا ہے۔ لہٰذا اب میرا
نظریہ یہی باقی رہ جاتا ہے۔۔۔۔ روزِ ازل ہی سے خدا نے ان دونوں
جوہروں (روح و جسم) کو کچھ ایسی فطرت و نوعیت کا بنایا ہے کہ
اپنے ہی قوانین کی پابندی کرنے کے باوجود، جو ہر ایک کی فطرت ہی میں
ودیعت ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ توافق رکھتا ہے
گو یا کہ وہ ایک دوسرے پر عمل کر رہے ہیں۔"[1]

یہ ہے لائبنز کا نظریہ جس کو وہ "نظریہ توافق مقدّر" (pre-established harmony) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ "ارواح کا عمل علل غائیہ سے متعلق ہوتا ہے" یعنے خواہشات، غایات ان کے اعمال کا تعین کرتے ہیں۔ "اجسام کا عمل علل فاعلی یا حرکات سے متعین ہوتا ہے" یہ دونوں اپنے اپنے قوانین کی پابندی کرتے ہیں، جو ان کی فطرت میں ودیعت ہیں، تاہم ان دونوں میں کامل توافق ہے اور یہ توافق روزِ ازل ہی سے مقدّر کر دیا گیا ہے۔ اجسام عضویہ بہ قول لائبنز "خدائی مشین" ہیں۔

'توافق مقدر' کا نظریہ لائبنز کے نزدیک صرف روح و جسم کی وحدت ہی کی توجیہ نہیں کرتا بلکہ یہ ساری کائنات پر حاوی ہے۔ تمام موناداتِ اس طرح آپس میں مل کر عمل کرتے ہیں گویا کہ وہ ایک ہی عضویت کے مختلف حصّے ہیں جن میں سے ہر ایک کا اپنا علیحدہ وظیفہ ہے۔ لائبنز کہتا ہے کہ کائنات میں ہر چیز ربطِ علیّت سے مربوط ہے لیکن 'علیت' سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تمام حصص کے اعمال ایک توافق رکھتے ہیں، ان میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو خدا نے پہلے ہی سے مقرر کر دی ہے۔ بہ الفاظ دیگر خدا نے کائنات کو کچھ اس طرح سے ترتیب دی ہے کہ وہ بغیر اس کی کسی قسم کی مداخلت کے چل رہی ہے؛

جب روح اور جسم کو ایک ساتھ عمل کرنا ضروری ہوتا ہے تو خدا مداخلت کرتا ہے اور ان دونوں میں ربط قایم کرتا ہے۔ اس کو 'اقتضائیت' والا نظریہ کہتے ہیں (Occasionalism)

[1] 'فوشر' کے اعتراضات کے جواب میں لائبنز نے گھڑیوں کی یہ تمثیل پیش کی اور اپنے نظریہ کو بہت واضح کیا۔

ہر موناد کی ہر کیفیت اس کی گذشتہ کیفیت کا نتیجہ ہوتی ہے اور دوسرے تمام مونادات کی کیفیتوں کے ساتھ مل کر عمل کرتی ہے۔ کائنات کا توافق اور اس کی ہم آہنگی کامل و مکمل ہے۔ فطرت کی ہر شئے میکانکی اور سائنٹفک طور پر سمجھائی جا سکتی ہے، یعنے عالم طبیعی میں قانون، یکسانیت، نظم و ترتیب پائے جاتے ہیں، لیکن ان کا مبدء خدا ہے۔ اسی لیے لائبنز اپنے نظام فلسفہ کا ماٹو یہ مقرر کرتا ہے: "میکانیت کا مبدء مابعد الطبیعیات ہے"۔ اس طرح میکانیت اور غائیت میں تطبیق پیدا کی جاتی ہے: فطرت کی توجیہ بغیر غایت و مقصد کے تصور کو داخل کرنے کے بھی کی جا سکتی ہے، لیکن میکانکی فلسفہ خدا کی طرف ہماری رہبری کرتا ہے اور اسی کے آستانے کی جانب لے جاتا ہے کیوں کہ طبیعیات اور میکانیات کے اصول و قوانین کلی کی توجیہ بغیر خدائی غایت و مقصد کے ہو نہیں سکتی۔ اس طرح لائبنز مذہب و عقل میں تطبیق پیدا کرتا ہے[1]۔

لائبنز نے کائنات کی جو تصویر پیش کی ہے اس کے جلی خد و خال ان الفاظ میں ملخصاً پیش کیے جا سکتے ہیں:۔

> "یہ فعال قوتوں یا ارواح کی زندہ روحانی دنیا ہے، جن میں سے ہر روح کامل ہے اور اپنی ہی فطری قوانین کے تحت اپنی غایت کا تحقق کر رہی ہے، ہر روح دوسری روح سے جدا و ممیز ہے تاہم اپنے مقصد اور تمام کائنات کے اظہار کی قابلیت کے لحاظ سے دوسری تمام ارواح سے توافق اور ہم آہنگی رکھتی ہے۔ ان تمام روحانی قوتوں کا خالق اور ان میں توافق پیدا کرنے والا موناد برتر خدا ہے، جو ایک ذی شعور اور قوت مطلق، حکمت مطلق و خیر مطلق رکھنے والی ہستی ہے اور درجۂ کمال کے اعتبار سے اس کے قریب تر آزاد اور شاعر بالذات ارواح ہیں جن سے بہ قول لائبنز کے "ارواح کی ایک جمہوریت" تشکیل پاتی ہے، جس کا بادشاہ خدائے لایزال ہے"[2]۔

میر ولی الدین

[1] دیکھو تاریخ فلسفہ از تھلی ص ۲۷۲-۲۷۳۔ [2] دیکھو کالکنس ص ۹۶۔

۵۰

خوابوں کی بستی

خوابوں کی بستی اس نامعلوم مدت سے بسی چلی آتی ہے جب سے ہماری یہ ظاہری دُنیا جیتی جاگتی آباد ہے اس میں صرف سوتے جاگتے کا فرق ہے ورنہ جو کچھ ہم جاگتے میں کرتے۔ دیکھتے سُنتے اور چلتے پھرتے ہیں اُسی طرح سوتے میں بلکہ اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر دیکھتے اور کرتے ہیں گویا سونے کے بعد ایک عجیب عالم ہمارے سامنے آباد نظر آتا ہے اور ہر عمر کے بچے۔ جوان۔ بوڑھے۔ عورت اور مرد سب اس کی سیر کرتے اور اس نامعلوم آبادی سے تھوڑا بہت تعلق رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود ہمیں بہت کم معلوم ہے کہ خوابوں کی اس دل فریب بستی کی اصلیت کیا ہے؟ یہ کیوں ہے اور کیسے ہے؟ زمانہ جاہلیت سے آج کی مہذب جدید سائنس کی ترقی یافتہ دُنیا تک خواب اور اس کی تعبیر کا مسئلہ لاینحل معمہ سا بنا ہوا ہے اور باوجود مسلسل غور و فکر کے منفقہ طور پر اس کی تحقیق ابھی تک مکمل نہیں ہو سکی ہے، اس کا خاص سبب یہ بھی ہے کہ گو خواب کی اصلیت سے کسی زمانے میں کسی کو انکار نہیں ہوا لیکن عرصۂ دراز تک فلاسفۂ قدیم نے اس کی طرف توجہ نہ کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم علم لوگوں نے خوابوں کی حقیقت اور تعبیروں کے لیے اپنی سمجھ اور علم کے موافق تاویلیں کر لیں اور وہ اپنی رائے سے انھیں کو ماننے لگے۔ مفکرین و علماء نے غور بھی کیا تو بہت بعد میں اور وہ بھی بہت کم۔

جاہلیت کے زمانے میں خواب کی اہمیت بہت زیادہ تھی اور رمل۔ نجوم یا فال کی طرح خواب سے بھی ماضی اور مستقبل کے حالات کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھ کر علمائے مذہب نے اس پر توجہ کی، اور قریب قریب ہر مذہب میں خواب کی حقیقت اور سچے خوابوں کی تعبیر کی اصلیت مانی جاتی رہی جس قدر تحقیق کی روشنی بڑھتی گئی وہمی خوابوں کی اہمیت کم ہوتی گئی اور خوابوں کے شاعرانہ تخیل اور اصلیت کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لیا گیا۔ علمائے اسلام کے نزدیک خواب کی جو حقیقت ہے دوسرے مذہبی علماء اور اکثر فلاسفۂ قدیم کا بھی اسی پر اتفاق ہے۔ البتہ جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے کچھ اصطلاحی فرق

قدیمی خیالات بیں ضرور ہے۔ یہاں خوابوں کی ہستی کے تذکرے میں قدیم اور جدید فلسفہ دونوں کی بحث آئے گی اور ضمنی طور پر مذہبی نقطۂ نظر بھی واضح ہوتا جائے گا۔

یہ امر مسلّم ہے کہ انسان کے پانچ حواس ظاہری ہیں یعنے دیکھنا۔ سُننا۔ چکھنا۔ سونگھنا، اور چھونا۔ اسی طرح پانچ طاقتیں دماغ میں اور پوشیدہ ہیں جنھیں حس مشترک۔ خیال۔ متصرفہ۔ واہمہ اور حافظہ کہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا کام الگ الگ جاری رہتا ہے۔ ہم جو کچھ جاگتے میں دیکھتے ہیں یا سُنتے ہیں اور چھوتے ہیں خیال اور حافظہ کی مدد سے ہمارے دماغ میں ان کی یادداشتیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جو باتیں جاگتے میں ہمارے وہم و گمان کو محسوس ہوتی ہیں ان کی یاد ہمارے دماغ کے پردے پر قایم ہو جاتی ہے مگر ہم جاگنے کی حالت میں چونکہ برابر دماغ کی ان طاقتوں سے کام لیتے رہتے ہیں اس لیے یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ متصرفہ کا کام یہ ہے کہ جو باتیں اور صورتیں ہماری یادداشت میں محفوظ ہیں ان میں تصرف کرکے آپس میں ملائے لیکن اس قوت کا یہ کام جاگنے کی حالت میں پوری شدّت سے اس لیے نہیں ہوتا کہ یکسوئی نہیں ہوتی۔ جب ہم سو جاتے ہیں تو یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ ہمارے تمام ظاہری حواس بالکل غافل اور بے ہوش ہوتے ہیں۔ لیکن پوشیدہ طاقتیں پورے اثرات کے ساتھ جاگتی ہیں اور اپنا کام شروع کر دیتی ہیں، اب ظاہر ہے کہ قوتِ متصرفہ خیال۔ حافظہ اور وہم کی تمام یادداشتوں پر جب قابو پاتی ہے تو ان کو حرکت میں لاتی ہے اور اس حالت میں جو کچھ ہمارے سامنے آتا ہے ہم روک نہیں سکتے کیوں کہ ہمارے ظاہری حواس سو رہے ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم خواب میں ایسی ایسی باتیں دیکھتے ہیں جو جاگتے میں ممکن نہیں ہوتیں۔ یہ اس طرح ہوتا ہے جیسے سینما کے پردے پر بہت چھوٹی تصویریں غیر معمولی بڑائی کے ساتھ عجیب و غریب حرکتیں کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح متصرفہ کی مشین ہماری یادداشتوں کی تصویروں کو گھٹا بڑھا کر خواب کے پردے پر لے آتی ہیں اور ہم چُپ چاپ دیکھے چلے جاتے ہیں، یعنے جو کچھ جاگتے میں دیکھنے۔ سُننے یا سوچنے سے ہمارے دماغ کی یادداشتوں میں محفوظ ہوتا ہے، وہی اکثر خواب میں کبھی بجنسہٖ اور کبھی گھٹنے بڑھنے کے بعد نظر آتا ہے۔

یہ ہے خواب کی حقیقت فلاسفۂ قدیم کی نظر میں جس میں علمائے اسلام کی رائے خصوصاً شامل ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ایک گروہ کا بیان ہے کہ "تمام خواب گزری ہوئی باتیں اور پہلے زمانے کے خیالات ہیں جو سوتے میں نظر آتے ہیں"۔ اور دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اس حقیقت کے علاوہ بعض خوابوں کے ذریعے غیب کی خبریں خدا کی طرف سے روحوں کو ملا کرتی ہیں اور یہ خواب صحیح یا رویائے صادقہ

کہلاتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ خواب صحیح کے منکر اس قسم کے خواب کے ثبوت مل جانے کے بعد اس کی اصلیت سے تو انکار نہیں کرتے، مگر دبی زبان سے یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ جب تک روح کے مسئلے کا انکشاف پورے طور پر نہیں ہوا ہے اور عالم ارواح کی حقیقت کو نہیں سمجھا گیا ہے مادہ پرست سائنس اس قسم کے خواب کی اہمیت کو نہیں مان سکتا۔

گذشتہ خیالات وحالات کے خواب کی مثالیں تو شب و روز ہمارے سامنے ہی آتی رہی ہیں لیکن مذہب و سائنس سے قطع نظر کر کے خوابِ صحیح کی مثالوں کے تجربے بھی ہم میں سے اکثر اصحاب کو ذاتی طور پر ہوتے رہتے ہیں اور اس قسم کے واقعات بھی کثرت سے شہادت دیتے ہیں، چنانچہ:۔

"حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب سب سے پہلے اس کے شاہد ہیں
جن کا ذکر متعدد آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ قرآن کریم میں تو
اس کی پوری تفصیل ہے لیکن توریت میں اس طرح لکھا گیا ہے کہ
(حضرت) یوسفؑ نے لڑکپن کے زمانے میں ایک خواب دیکھا اور
اپنے بھائیوں سے بیان کیا کہ میں نے دیکھا ہے کہ میرا پولا اٹھا اور
سیدھا کھڑا ہو گیا، تمھارے پولے جو اِدھر اُدھر کھڑے تھے وہ
میرے پولے کے آگے جھک گئے اور اس کا سجدہ کیا۔"

اس پر ان کے بھائیوں نے کہا کہ کیا تو ہمارا حاکم بنے گا اور ہم تجھے سجدہ کریں گے۔

اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے پھر خواب میں دیکھا کہ سورج۔ چاند اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں! اس خواب کو جب ان کے باپ حضرت یعقوبؑ نے سُنا تو فرمایا کہ کیا تیری ماں، باپ (میں) اور سب بھائی تجھ کو سجدہ کریں گے اِس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت یعقوبؑ نے اس خوابِ صحیح کی تعبیر یہ کی کہ وہ بادشاہ ہوں گے اور ان کو سورج۔ چاند، یعنے ان کے ماں، باپ اور گیارہ ستارے، سب بھائی سجدہ کریں گے! اس پر ان کے بھائی ان سے جلنے لگے یہاں تک کہ ان کے جانی دشمن ہو گئے، لیکن باوجود بھائیوں کی قاتل دشمنی کے ان کا بال بیکا نہ ہو سکا اور گو وہ بھائیوں کی دشمنی سے کنوئیں میں گرے۔ غلام بنے۔ مصر میں قید ہوئے، لیکن ایک دن ان کے خواب کی تعبیر پوری ہوئی، وہ واقعی شاہ مصر بنے اور ان کے ماں، باپ۔ بھائیوں نے سجدہ کیا۔ حالانکہ خواب دیکھتے وقت ان کے گمان میں بھی یہ واقعات نہ تھے جو

انھیں نظر آئے یہ روحانی پیغام نہ تھا تو کیا تھا۔ اب ہم خوابوں کی تقسیم سے پہلے جدید سائنس کا نظریۂ خواب بھی یہاں واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ دونوں کی روشنی میں خوابوں کی بستی کی سیر سے دلچسپی حاصل ہو سکے۔

مذہبی حیثیت سے جو خواب نامے یا تعبیر نامے یورپ میں مرتب ہوئے ان کو چھوڑ کر یورپ کے فلاسفر خواب کے مسئلے کو سنہ ۱۹۰۰ء تک وہم و خیال سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

وائنا یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سگمنڈ فرائڈ نے سنہ ۱۹۰۰ء میں خواب کی حقیقت اور ماہیت پر غور کیا۔ اس فاضل پروفیسر کی تحقیقات خواب سے پہلے نفسیات خواب پر کوئی تصنیف موجود نہ تھی اور نہ سائنٹفک طریقے سے اس مسئلے پر غور ہوا۔ فرائڈ کی نفسیات خواب کی تحلیل کا خلاصہ یہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نیند اس حالت کا نام ہے جب ہمارے ظاہری حواس سو جاتے ہیں۔ حواس کی دو طاقتیں ہیں، ایک شعور اور دوسرے غیر شعور۔

"شعور" کا کام ہمارے حواسِ خمسہ کو کام میں لانا یعنے دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا، اور چھونا ہے اور غیر شعور، شعور کے ماتحت فکر و غور کا کام کرتی ہے۔ جاگتے میں ہمارے شعوری حواس کام کرتے ہوتے ہیں اس لیے غیر شعوری طاقت یکسوئی کے ساتھ اس وقت اپنا کام نہیں کر سکتی۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب ہم ایک تحریر پڑھتے ہوتے ہیں اس وقت کوئی مضمون دماغ سے سوچ کر لکھ نہیں سکتے۔ لیکن سو جانے کے بعد "شعور" کا کام بند ہوتا ہے، اس لیے غیر شعوری مدد کے تیار کیے ہوئے خاکے اُبھرتے ہیں اور خواب کے پردے پر ان کی حرکتیں شروع ہو جاتی ہیں اور وہ تمام خیالات و حالات جو جاگتے وقت ہمارے شعور کے سامنے آتے ہیں انھیں ہم سونے کے وقت شعور کے غافل ہوتے ہی تیزی سے حرکت کرتے دیکھتے ہیں۔"

اسی نظریہ کو زمانۂ حاضرہ کا دوسرا فلاسفر پروفیسر برگسان تصدیق کے ساتھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ :-

"بے شمار خواہشیں، خیالات اور صورتیں ہمارے دل اور دماغ۔
ذہن و حافظہ میں بند ہوتی رہتی ہیں اور جاگنے کی حالت میں
ان سب پر شعور کی روشنی پڑتی رہتی ہے۔ اسی طرح غیر شعور کی
مدد سے جو کچھ سوچتے سمجھتے ہیں وہ بھی یادداشت میں ہیں، لیکن

ان کی مثال ایک اندھے کنویں کی سی ہے۔ ہماری یہ یادداشتیں
ذہن کے اندھے کنویں میں بند ہیں اور ان پر شعور کی روشنی پھیلی
ہوتی ہے، غیر شعور کی طاقت اس کے نیچے دبی رہتی ہے اس لیے
جاگتے میں ان باتوں کی طرف توجہ نہیں ہوسکتی جو ذہن میں گزشتہ
شعور نے بند کی ہیں سونے کے بعد اس اندھے کنویں کا دروازہ
کھل جاتا ہے، یعنے شعور کے سوجانے سے سب رکاوٹیں اٹھ جاتی ہیں
اس لیے یہ یادداشتیں اس اندھے کنویں میں سے نکلنا شروع
ہوتی ہیں اور غیر شعور کی تاریکی میں حرکت کرتی رہتی ہیں اس حالت کو
خواب دیکھنا کہتے ہیں اب جو باتیں سونے سے پہلے ہمارے ذہن
اور دماغ سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، جو آوازیں ہمارے کانوں پر
اپنا اثر زیادہ مس کرتی رہی ہیں وہی پہلے اور زیادہ واضح و نمایاں
ہوکر ہمارے سامنے سب سے پہلے خواب میں آتی ہیں اور
"خوابوں کی بستی" کو معمور کرتی ہیں۔"

یہ ہے جدید سائنس کی روشنی میں خواب کی حقیقت۔

اب خوابوں کی تعبیر اور اُن کے اثرات پر قدیم اور جدید فلسفے کی رُو سے نظر ڈالیں تو اب سے پہلے ہمارے سامنے وہ تقسیم آتی ہے جو فلاسفہ نے خوابوں کی بستی کے لیے کی ہے، یعنے اول خوابِ پریشاں دوسرے خوابِ مرض تیسرے خوابِ صحیح یا رویائے صادقہ۔ سب خواب سچے اور یقین کے قابل نہیں۔ ان میں سے پہلے دو کے متعلق قدیم اور جدید فلاسفہ کا اتفاق ہے، مگر خوابِ صحیح پر جدید سائنس یقین نہیں کرتا خوابِ صحیح کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے خوابِ پریشاں وہ خواب ہیں جو ہاضمہ کی خرابی یا دماغ کی پریشانی کی حالت میں سو جانے سے دکھائی دیتے ہیں جیسے سردی کے موسم میں سوتے وقت کمبل یا لحاف ہمارے اوپر سے دور ہو جائے تو ہم خواب دیکھتے ہیں کہ بالکل ننگے پھر رہے ہیں اسی طرح بھوک پیاس اور اس طرح کی تمام خواہشوں اور ضرورتوں میں سونے والے اس خواہش کو پورا ہوتے دیکھتے ہیں اور جاگنے کے بعد ان کا نہ کوئی اثر ہوتا ہے نہ وہ آیندہ زندگی سے کوئی تعلق رکھنے والی ہیں، مگر بعض اوقات اس قسم کے

خواب بھی سچے ہو جاتے ہیں چنانچہ یورپ کے شہرۂ آفاق شاعر کولرج کی مشہور نظم کبلا خان کے دو سو سے تین سو مصرعے خواب میں اس نے کہے۔ جاگنے کے بعد وہ سب شعر اس کو یاد تھے جو اس نے لکھ لیے۔

خوابِ مرض میں وہ خواب شامل ہیں جو کسی بیماری کی حالت میں سوتے وقت نظر آتے ہیں۔

مثلاً ہماری روح اور دماغ پر بخار کے سبب گرمی کا اثر غالب ہوتا ہے۔ اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ آگ میں جل رہے ہیں یا آگ کے شعلے ہمیں جلائے دیتے ہیں۔ اس قسم کے خوابوں کی تعبیریں بہت آسان ہیں جن کو اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ اگر بیماری کے زمانے میں زرد رنگ کی مختلف شکلیں لڑتی جھگڑتی یا مار پیٹ کرتی دکھائی دیں تو یہ صفرے کی زیادتی کے سبب سے ہیں۔ سُرخ یا کسی رنگ کی خوشنما حسین صورتیں نظر آئیں تو یہ خون کی کثرت کے سبب سے ہیں۔ دریا میں تیرنا۔ مینہ یا پانی کے طوفان دیکھنا بلغم کی زیادتی کی علامت ہے۔ سیاہ رنگ کی صورتیں۔ قبرستان۔ مُردے۔ سیاہ رنگ کے کُتّے۔ دیو اور آندھی وغیرہ سوداویت کی علامت ہیں اور ان سب واقعات میں خوابِ پریشاں کی طرح بے ترتیبی، بے تکا پن ہوتا ہے لیکن خواب دیکھنے والے کی روزمرّہ کی زندگی کے واقعات سے دُور نہیں ہوتے بلکہ عام دیکھی اور گزری ہوئی باتیں بڑھنے گھٹنے کے بعد نظر آتی ہیں جدید تحقیقات کے بعد بعض ڈاکٹر نفسیاتی نقطۂ نظر سے امراض کا علاج کرتے وقت اس قسم کے خوابوں سے مرض کی تشخیص میں مدد لیتے ہیں۔

اب صحیح خوابوں کی باری آتی ہے، اس قسم کے خواب کی نسبت افلاطون کی تحقیق بہت کچھ سچ ثابت ہوتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ خواب میں ہم عموماً وہی چیزیں دیکھتے ہیں جنھیں جاگتے وقت دیکھا یا سُنا ہے لیکن ایسے خواب کھانا کھانے کے بعد سوتے وقت دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب معدہ اور دماغ کے خالی اور لطیف ہونے کے وقت جو کچھ ہم خواب میں دیکھتے ہیں ان کا تعلق کسی اور دُنیا سے ہے۔ چنانچہ اس خیال کی تصدیق علمائے اسلام خصوصاً اور دوسرے مذہب کے بزرگوں نے ثبوت کے ساتھ کی ہے اور اکثر واقعات اور تجربات بھی موجود ہیں۔ دو فلاسفرز کا متفقہ بیان ہے کہ خواب جو ہم دیکھتے ہیں اُن میں سے بعض یقیناً خدا کی طرف سے ہیں۔

مذہبی روایات اور بیانات کو چھوڑ کر جدید ماہرین نفسیات کے بیانات بھی بڑی حد تک صحیح خوابوں کی حقیقت کو مانتے ہیں مگر کُھلم کُھلا نہیں بلکہ دبی زبان سے چنانچہ ایک ماہر نفسیات کہتا ہے کہ:-

"ہم خواب میں جو حالت دیکھتے ہیں اگر وہ کیفیت خواب ہی میں ختم

ہو جائے تو اس کی تعبیر کرنی چاہیئے کہ نتیجہ آیندہ کچھ نہ ہوگا، وہیں
تمام ہوگیا، اور اگر وہ حالات خواب میں ناتمام رہے یا کش مکش کو
جاری دیکھ کر آنکھ کھل جائے تو نتیجہ ضرور نکلے گا اور ناخوشگوار ہوگا۔"

ڈاکٹر یونک جو پروفیسر فرائڈ کا سب سے بڑا نایب ہے کہتا ہے کہ:۔

"خواب سب کے لیے اہم اور مفید ہوتے ہیں بہ شرطیکہ اُن کا استعمال
کرنا ہم سیکھ چکے ہوں۔"

اس کے مختلف نظریوں کا لب لباب یہ ہے کہ خواب کی صحیح تعبیر اس وقت کی جا سکتی ہے کہ خواب دیکھنے کے بعد واقعات یاد رہیں اور یہ اچھی طرح دیکھ اور سمجھ لیا جائے کہ خواب میں دیکھی ہوئی باتیں ہم نے اس سے پہلے نہ کبھی سنیں نہ ان حالات کو دیکھا، اور نہ ان کا ہماری روزمرّہ کی زندگی میں کبھی کوئی ذکر یا خیال آیا۔ ہمارا ذہن جاگتے وقت ان حالات سے بالکل خالی تھا۔ اس وقت یہ سمجھنا چاہیئے کہ خواب سچا ہے اور اس کی تعبیر دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔

علمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ:۔

"جو خواب دماغ کی درستی۔ جسم کی پاکیزگی اور خیالات کی صفائی کی
حالت میں سوتے ہوئے دکھائی دیں وہ خواب صحیح ہیں اور اُن کو
خدا کی طرف سے روح کو ملے ہوئے پیغام سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ
شاعر۔ شریر۔ مست۔ مریض اور غمگین آدمیوں کے خواب اکثر سچے
نہیں ہوتے۔ خواب میں ہم بعض اوقات ماضی کے علاوہ حال کی باتیں
اور مستقبل کے واقعات قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے
حالات بھی معلوم کر لیتے ہیں، یہ سب خواب روحانی کہے جاتے ہیں۔"

شنکر موہن لعل ماتھر

انڈیا آفس کے چند تاریخی دستاویزات

انڈیا آفس (لندن) کے کتب خانے میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں، مرقعوں وغیرہ کے ساتھ قدیم اسنادی کاغذات بھی محفوظ ہیں۔ میں نے اپنے قیام یورپ کے زمانے میں بہ لحاظ دلچسپی ان کا بھی معاینہ کیا تھا۔ ان کی مختصر کیفیت یہاں درج کی جاتی ہے۔

اس قسم کے فارسی کاغذات ایک "چکٹ بک" میں چسپاں ہیں، اور ان پر ایک ایک انگریزی نوٹ بھی لگا ہوا ہے۔ اس چکٹ بک میں جو کاغذات ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) کاغذات فتح علی شاہ قاچار (۲) خطوط والاجاہ رئیس ارکاٹ

(۳) فرمان شہنشاہ بابر (۴) اسنادات عالمگیر

(۵) پاس پورٹ سلطنت ترکی (۶) سند سلطنت آصفیہ

فتح علی شاہ قاچار کے کاغذات وہ فرامین ہیں جو کمپنی انگریز اور ان کے سفیر مقیم ہندوستان کو تجارت وغیرہ کے متعلق دیے گئے ہیں۔ ان فرامین کی طرز بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ سلطنت مغلیہ اور سلطنت آصفیہ کے قدیم اسنادات وغیرہ ہوتے ہیں۔ ناصیہ پر مہر۔ خاتمے پر دستخط اور پشت پر تاریخ وغیرہ۔ یہ مراسلت شاہ انگلستان کے نام نہیں ہوئی ہے، بلکہ کمپنی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ کاغذات ۱۲۲۵ھ اور اس کے مابعد کے ہیں۔

والاجاہ کے خطوط شاہ انگلستان جارج سوم اور سرکار کمپنی دونوں کے موسومہ ہیں۔ یہ مراسلت نہایت عمدہ زر افشانی سنہرے حاشیے کے کاغذ پہ ہوئی ہے۔ ایک خط میں والاجاہ نے اپنے خاندانی جھگڑوں کے متعلق بھی خاص اپنے قلم سے صراحت کی ہے۔ یہ مراسلت ہم رتبہ بادشاہوں کی مراسلت کا انداز رکھتی ہے، برتری اور بزرگی کا پتا نہیں چلتا۔

بابر کا ایک فرمان ہے جو قاضی جلال کی معاش کے متعلق ہے۔ عالمگیری کاغذات میں مختلف فرمان اور اسناد وغیرہ شامل ہیں، جو صوبہ جات الہ آباد۔ پنجاب وغیرہ کے معاشوں کے متعلق ہیں اور بعض کاغذات اسد خاں محمد اسلم۔ قاضی شریعت خاں وغیرہ کے مہری بھی ہیں۔ ان کے تفصیلی معائنے کے لیے بڑے وقت کی ضرورت تھی۔

سلطنتِ ترکی کا صرف ایک پاس پورٹ اس میں شامل تھا۔ سلطنتِ آصفیہ کی ایک سند موجود تھی، یہ سند قطب الدولہ کی موسومہ ہے اس کے ساتھ ان کا ایک وصیت نامہ بھی ہے۔

قطب الدولہ آصف جاہ ثانی کے ابتدائی عہد میں راج بندری۔ ویلور وغیرہ کے جاگیردار تھے، ان کا وصیت نامہ حسب ذیل ہے :-

وصیت نامہ قطب الدولہ تحریر غرہ ذیقعدہ ۱۱۸۴ھ

"وصیت نامہ چوں ایں جانب را بیماری دراز شدید لاحق شدہ اگرچہ بعونہ تعالیٰ صحت یافتم اما زندگی را چہ اعتبار است، لہذا برخوردار مرزا زین العابدین عرف سبحان بخش را کہ اکبر اولاد است ولیعہد وقایم مقام خود کردم۔ بعد از من خانہ و اثاثہ سرانجام ہمہ املاک وجاگیرات ودیہات وغیرہ ہر رطب ویابس کہ درملکیت دارم ہمہ از برخوردار مذکور است، بجان ودل بخشیدم دیگرے را دراں دخل و اختیار نیست، باید کہ برادران کہ از وکوچکتر اند ہمیشہ در اطاعت و اختیار او بودہ دعوی وطلب چیزے نداشتہ باشند۔

برخوردار پرورش ابنیہا وہمشیرہا وجملہ قبائل ووابستگان خواہد کرد اگر از اولاد من کسی بدستور عوام از مرزا زین العابدین درخواست ترکہ وحصہ بکند مناسب نیست چراکہ نام وآبروکہ پیدا کردہ ام نخواہد ماند۔

ایں جانب از رفاقت بندگان عالی برآمد رفیق کمپنی انگریز

شده ام داز دوستی وخیرخواہی جائے پرورش ورکمپنی پیدا کردہ ام
ازینجا بجائے دیگر نباید رفت۔

حرف نمک حرامی حضور کہ از سبب رفاقت کمپنی بر ایں جانب
آمدہ است اگر خدا توفیق بدہد بوساطت نواب رکن الدولہ یا
ظفرالدولہ مراسلات از حضور کردہ ایں حرف را از من باید برآورد۔

برائے حج وزیارت از طرف من کدام شخص صالح را مقرر کردہ
باید فرستاد و قرضداری مردم کہ بطرف منست از آمدنی جاگیرات وغیرہ
ادا باید کرد۔ چوں برخوردار مرزا زین العابدین خورد سال است
تا حین رشد بحد بلوغیت، نواب صاحب مشفق مہربان نواب
جرأت جنگ بہادر را وصی وامین واتالیق مقرر کردم۔ احتیاط و
خبرداری در ہمہ امورات خانگی وجاگیرات وغیرہ کردہ بعونہ تعالیٰ
بعد رسیدن بحد بلوغ جملہ املاک وسامان وسرانجام مرزا زین العابدین را
بسپارند۔ تحریر فی تاریخ صدر۔"

اس وصیت نامے کے ساتھ انھوں نے اپنے جاگیرات کی سند کی نقل بھی شامل کی ہے، یہ سند حضرت آصفجاہ ثانی کی معطیہ ہے، نقل سند کو قاضی سید علی امجد کی مہر موثق کرتی ہے۔

اس سند کی رُو سے پرگنہ۔ ایٹ کوٹہ وغیرہ سرکار راج بندری (ضلع) صوبہ حیدرآباد مجمع کامل (لے مساحمی) ہن قطب الدولہ حسن علی خاں انتظام جنگ کی جاگیر (تعلقہ) میں عطا ہوئے ہیں۔

یہ سند ان کے وصیت نامے کے پہلے عطا ہوئی ہے۔ سند کے ساتھ دفتری کیفیت کی نقل بھی موجود ہے (جیسا کہ اس زمانے میں قاعدہ تھا) اس کیفیت پر حضرت آصف جاہ ثانی کی شرح تجویز کی نقل کی گئی ہے جو حسب ذیل ہے:۔

"خاطر جمعدار ند انشاء اللہ تعالیٰ ایں چار تعلقہ بر شما تا اولاد احفاد
برقرار خواہد بود۔"

اس سند سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث معاش قطب الدولہ کی صرف وہ معاش تھی جوان کے حسب خواہش

ان کی اولاد و احفاد کے نام عطا ہوئی تھی۔ اس جاگیر کے علاوہ شمالی سرکار کے کئی تعلقے مثلاً مصطفےٰ نگر، ایلور، راج بندری وغیرہ بھی قطب الدولہ کی جاگیر میں تھے۔

اب مورخ دکن کے لیے یہ سوال دلچسپ اور تحقیق طلب ہوگا کہ سرکار کمپنی کی رفاقت نے اپنی رفاقت کا کیا صلہ دیا، اور قطب الدولہ کے بعد ان کی جاگیرات جو لاکھوں کی تھی کیا حشر ہوا؟

نصیر الدین ہاشمی

واردات

یاد میں ان کی جیے جاتا ہوں — دہر میں نام کیے جاتا ہوں

اور کیا دہر سے ملتا مجھ کو — غم کے کچھ داغ لیے جاتا ہوں

اس قدر ہے تری رحمت کا یقیں — جرم پر جرم کیے جاتا ہوں

جیسے آئیگی نہ اب فصلِ بہار — یوں گریباں کو سئے جاتا ہوں

زندگی موت سے بدلی کاوشؔ
میں بہر حال جیے جاتا ہوں

کاوش

مبداءِ حیات

"عوطلبسائنس عثمانیہ کی چھٹی سالانہ کانفرنس میں پڑھا گیا"

ہماری زندگی کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جو عقلی جستجو سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم قدیم زمانے سے زندگی کے تمام مسایل پر خواہ وہ عقلی ہوں یا نقلی، روایتی انداز میں غور کرکے مذہب کی طرح ایقان کا ایک جزو بنانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ انھیں میں ایک حیات اور اس کے مبداء کا مسئلہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ قدیم خیالات کے حامی اس پر ناک، بھوں چڑھائیں کہ مبداءِ حیات کا سوال ہی کیوں اُٹھایا گیا! وہ تو صرف اتنا جاننا کافی سمجھتے ہیں کہ خدا نے انسان اور دوسری جان دار مخلوق کو اپنی قوت "کُن فیکون" سے پیدا کر دیا۔ ایک سائنس داں کو پورا یقین ہے کہ کائنات کی تخلیق میں پہلے بر قیے ارتقائی منزلوں کو طے کرکے جوہر بنے، اور اس کے بعد ان جوہروں نے مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ سادہ جوہروں سے مرکب سالمات پیدا ہوئے، اور بالآخر، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص طریقے سے جس کو 'پُراسرار' کہنا چاہیئے، 'زندہ مادّے' کا ظہور ہو گیا۔ اس لیے مبداءِ حیات کا سوال یہاں خود بہ خود پیدا ہو جاتا ہے۔ چارلس گبسن کے الفاظ میں:-

"ایک عالمِ حکمیات، خالق کو اس کی کائنات سے جُدا کرنا نہیں چاہتا،
بلکہ وہ صرف ان طریقوں کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے جن سے خالق کائنات نے
فطرت میں گُل کاریاں کی ہیں۔"

یہ سچ ہے کہ ابتدائے حیات کے مسئلے پر انسان عرصے سے غور کرتا رہا ہے۔ قدیم مصری آفتاب کو مبدءِ حیات سمجھتے تھے۔ ہندی آریاؤں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ آفتاب سرچشمۂ حیات ہے۔ چنانچہ اسی لیے وہ سورج کی پرستش کرتے تھے۔ سب سے پہلے، ایک یونانی حکیم تھالیس نے ۶۴۰ ق م میں اس مسئلے کو چھیڑا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ کائنات کی تمام اشیاء کا اصل مبداء صرف پانی ہی ہو سکتا ہے لیکن اس طریقۂ استدلال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو پانی کی ترکیب معلوم نہ تھی۔ اسی طرح ۵۰۰ ق م میں ایک اور حکیم نے ہوا کو توانائی اور حیات کا اصل منبع قرار دیا تھا ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک خیالِ خام سے زیادہ نہیں ہے۔ اسی طرح اور یونانی حکماء نے اپنی خیال آرائیاں کیں مختلف عناصر اور مرکبات کو مبدءِ حیات سمجھتے رہے، لیکن ان خیالات کی اب صرف تاریخی اہمیت رہ گئی ہے۔ البتہ ان مباحث سے ایک فایدہ یہ ضرور ہوا کہ متجسس آنکھوں کے سامنے تحقیق و تدقیق کے کئی راستے کھل گئے۔

اس تحقیق کی دوسری منزل ۱۸۳۹ء ہے جبکہ دنیا خلیوں کی کائنات سے روشناس ہوئی۔ خلیوں کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک قدرتی ساخت ہوتی ہے۔ یہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتے، ان کی شکل شہد کی مکھی کے چھتے کی سی ہوتی ہے۔ ہر خلیہ (یا Cell) ایک جھلی سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔ خلیے کے اندرونی حصے میں ایک رقیق دانہ دار مایع ہوتا ہے، اس کو "نخزمایہ" یا ابتدائی جان دار مادہ کہنا چاہیئے۔ نخزمایہ (یعنے Protoplasm) کے بیچ میں ایک اور جسم ہوتا ہے جو رنگوں کو آسانی سے قبول کرنے کی وجہ سے گہرے رنگ کا نظر آتا ہے، اور اس کو مرکزہ (یا Nucleus) کہتے ہیں تمام پودوں اور جانوروں کے جسم انھی خلیوں کے بنے ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد سائنس دانوں کا خیال ہوا کہ یہ خلیہ ہی زندگی کا پہلا جزو، یا اکائی ہے۔ اسے ایک مکمل جان دار عضویہ سمجھا جا سکتا ہے جو حیات کے جملہ افعال انجام دیتا ہے۔ چنانچہ ایبا، اور کلامیڈ و موناس، دو یک خلوی عضویے ایسے ہیں جو جملہ حیاتی افعال انجام دے لیتے ہیں۔

اگر ہم اس حقیقت کا پتا لگانا چاہیں کہ جان دار سے بے جان کی کیسے ابتدا ہوئی، تو ہم کو پہلا ایک تعریف کی تلاش کرنی چاہیئے۔ جان دار یا ذی حیات کے کیا معنے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ حیات ہمیشہ کاربن سے مشہور عنصر کے ساتھ وابستہ سمجھی جاتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاربن کا، چند اور عناصر، یعنے نائٹروجن۔ ہیڈروجن اور آکسیجن کے ساتھ مل کر مرکب بنانا ضروری ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ حیات 'مقناطیسیت' اور تاب کاری (Radioactivity) کی طرح تمام جواہر میں پوشیدہ ہے۔ یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ حیات ایک پُر اسرار شئے ہے جس کے ظہور کے لیے مادے اور توانائی کا ملاپ ضروری ہو۔ بات یہ ہے کہ کوئی خصوصیت بھی ایسی نہیں جس کو ایک عالم حیاتیات، ذی حیات اشیاء سے مخصوص کر سکے، اور جس کا اطلاق

بے جان مادے پر بالکل نہ ہوتا ہو۔ مثال کے طور پر ایک عضویہ (یعنے Organism) اپنی طرح کے اور عضویوں کی تولید کر سکتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں نمک کا ایک قلم بھی، جو ایک بے جان چیز ہے، یہ کام کر سکتا ہے۔ ایک مجروح غوک بچہ (یا Tadpole) اپنی نئی دُم پیدا کر لے سکتا ہے، لیکن ایک منتشر جوہر (یعنے Mutilated atom) بھی اپنی اصلی حالت پر واپس آسکتا ہے۔ ابتدائی آبی حیوان امیبا، بیرونی محرکات سے متاثر ہوتا ہے تو ایک گیسی سالمہ بھی بیرونی محرکات جیسے برقی اور مقناطیسی میدان کے اثرات کو قبول کرتا ہے۔ انسان اور آبی حیوان پیرامیشیم، دونوں سانس لیتے ہیں، لیکن کچھ بے جان اجسام بھی ہیں جو آکسیجن استعمال کرتے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی بیکٹیریا جراثیم ہیں جو بغیر آکسیجن کے زندہ رہتے ہیں۔ بہرحال حیات کی کوئی مخصوص پہچان نہیں، اور نہ کوئی ایسا موزوں امتحان ہے جس سے تمام صورتوں میں اس کی تمیز ہو سکے۔ حیات کی تعریف اس طرح نہیں کی جا سکتی جیسے کہ ایک چوہے یا کُتے کے متعلق ہو سکتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس کی کیفیات سے آشنا ہیں، اور اس لیے اس کو پہچان سکتے ہیں۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ چوہا ایک زندہ حیوان ہے، اس کے پیر کاٹ ڈالیے تو بھی چوہا بدستور زندہ رہتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس کو چیر کے اس کے دل کو نکال لیں اور اسے اس کے مخصوص ماحول کے اندر کسی آلے میں رکھیں تو کئی مہینے تک چوہے کا یہ عضو زندہ رہ سکتا ہے۔ اس پورے عضو کو نکالنا بھی ضروری نہیں۔ دل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو کاٹ کر مناسب اور موافق حالات کے تحت، ایک غذا رساں محلول میں رکھیں تو بافت کا یہ جزو اپنے کُل سے علیحدہ ہونے پر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

خوردبین سے معلوم ہوتا ہے کہ بافت (یا Tissue) واحداکائیوں کا مجموعہ ہے، اور نازک جھلیوں کی دیواروں کے اندر چھوٹے چھوٹے سریشی مائع کے قطرے پائے جاتے ہیں۔ بافت کا ہر فرد ایک زندہ خلیہ ہے۔ اور یہ کہنا غالباً صحیح ہوگا کہ بافت کے ہر فرد کو شیشے کے برتن میں خاص محلول کے ساتھ نہ صرف زندہ رکھا جا سکتا ہے، بلکہ اس میں نشو و نما بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ خلیہ کو بافت سے، اس کی صحت مند حالت میں آسانی سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ بعض خلیے آزادانہ طور پر زندہ رہتے ہیں، چنانچہ خلوی پودوں اور جانوروں کی کئی مثالیں ملتی ہیں جو اپنی چھوٹی سی کائنات میں تمام حیاتی افعال پورے کر لیتے ہیں۔ بافتی خلیے اسی قسم کے مخصوص فرد ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیات یعنے اُس کُل کو اعضا میں تقسیم کر کے

ہر عضو کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ اعضا کی بافتوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے، اور بافت انفرادی طور پر زندہ رہ سکتی ہے۔ بافتوں کی خلیوں میں تقسیم ہو سکتی ہے، اور ہر منفرد خلیہ زندہ رہ سکتا ہے۔

یہاں مبداء حیات کے سوال میں یہ دیکھنا ہے کہ آیا متذکرۂ بالا بحث اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کافی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک خلیہ کا جزو بھی انفرادی طور پر زندہ رہ سکے؟ یا کیا ہم خلیہ کی مزید تقسیم کر سکتے ہیں، یا خلوی کل میں کوئی ایسا جزو تلاش کر سکتے ہیں جو دوسرے اجزا کی نسبت زیادہ زندہ ہو، کوئی اور چھوٹی وحدت جو اس پوشیدہ شعلۂ حیات کی چنگاری ہو، یا مختصر الفاظ میں، وہ جگہ جہاں سے حیات کی ابتدا ہوئی ہو؟

یہ ایک دلچسپ، لیکن مشکل سوال ہے۔ یہاں چند جدید تحقیقات، اور ان مختلف کوششوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنی ضروری ہے جو اس سوال کو حل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

(ا)

طاقتور خوردبین سے کسی خلیہ کا معاینہ کیا جائے تو یہاں ان گنت تبدیلیوں کی ایک دنیا نظر آتی ہے۔ خلوی دیوار کی نازک پرت میں نخزمایہ (یا پروٹوپلاسم) بہتا اور گردش کرتا ہے، غالباً یہ زندہ مادے کی حرکت ہے۔ لیکن اس متحرک مادے کے علاوہ خلیہ میں چند غیر متحرک چیزیں بھی ملتی ہیں۔ وسط میں ایک کروی یا بیضوی شکل کا حصہ ہوتا ہے جو اپنے آس پاس کے مادے سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، یہ اندرونی نخزمایہ خلوی مرکزہ ہے جو خلیہ کا سب سے اہم جزو ہے اور یہ خلیے کے تمام تعاملات پر قابو رکھتا ہے۔ اور جو مائع اس کو گھیرے ہوئے ہے خلیہ مایہ (Cytoplasm) کہلاتا ہے۔ یہ مرکزہ بیکٹیریا (یا جراثیم)، بعض لجی (یعنے ابتدائی سبز پودے) اور پستانی خون کے سرخ جیموں کو چھوڑ کر باقی تمام قسم کے خلیوں میں واضح طور پر پایا جاتا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ خلیہ کو مارے بغیر خلوی دیوار میں سوراخ کر دیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلیہ کو مارے بغیر خلیہ مایہ (Cytoplasm) کا بیشتر حصہ نکال لیا جائے۔ اصل میں اس نقصان کی تلافی نئے خلیہ مایہ کی تیاری سے ہو جاتی ہے۔ غوکچہ کی طرح ایک خلیہ بھی اس قابل ہوتا ہے کہ محدود تولید کر سکے، لیکن اگر مرکزہ کو ضرر پہنچایا جائے تو صورتِ حال بالکل بدل جاتی ہے۔ یہ اندرونی حصہ نہایت اہم اور ضروری ہے، اس کے کسی حصے کی علٰحدگی بھی خلیہ کی زندگی کو ختم کر دیتی ہے۔

اگر ہم تخم مایہ یا پروٹوپلاسم کے مخصوص حصوں کو جنھیں (Germ cells) ثابت خلیے یا تناسلی خلیے کہتے ہیں منتخب کرلیں تو مرکزہ کی اس اہمیت کو تجربے سے سمجھا سکتے ہیں ۔ غالباً یہی ، یعنی مادہ کے (Egg cells) بیضوی خلیے اور نر کے (Sperm cells) یا منوی خلیے دوران ارتقا میں حیات کے مخصوص حامل ہو گئے ۔ چند سال پہلے یہ تحقیق ہوئی تھی کہ کسی بیضے (مثلاً Sea urchin کے بیضے) پر نمک کے محلول ، یا اس میں سوئی چبھانے کے عمل ، یا کسی اور میکانکی عمل سے خلیہ میں مصنوعی طور پر اپج پیدا کی جاسکتی ہے ، اور وہ نمو پاکر ایک نیا (Sea urchin) بن جاتا ہے ۔ یہاں بیضہ کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کرسکتے ہیں کہ ایک نصف مرکزہ (یعنی Nucleus) آجائے اور دوسرا نصف بغیر مرکزے کے رہے ۔ وہ نصف جس میں مرکزہ موجود ہے بارور ہوسکتا ہے اور دوسرا عقیم رہ جاتا ہے ۔ بعض حیوانوں کی صورت میں جن میں مرکزہ بیضے کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہوتا ہے ، مرکزے کو نکال دینے سے بیضے کی جسامت میں زیادہ فرق تو نہیں ہوا ، لیکن ایسے بے مرکزہ بیضے میں تولیدی قابلیت باقی نہیں رہی ۔

عموماً قدرت میں (Sperm) یا منویہ کے بیضے (Egg) میں دھنس جانے سے باروری ہوتی ہے ۔ منویہ (Sperm) مرکزے سے پیوست ہوتا ، اور اسی میں مل جاتا ہے (Sperm cell) منوی خلیہ بہت زیادہ چھوٹا ہوتا ہے ، اور ایک مرکزی سر ، اور (Cytoplasm) کے ایک چھوٹے باریک ناگہ نما حصے پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اتنا چھوٹا ہونے کے باوجود یہ منوی خلیہ (Sperm cell) اپنے اجداد کی تمام خصوصیات کا حامل ہوتا ہے ، جو بعد کو بچہ میں نمودار ہوتی ہیں ۔

یہاں ایسے بیضے کے متعلق جس میں سے مرکزہ نکال لیا گیا ہو ، ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منوی خلیہ (Sperm cell) شعلۂ حیات کو اس بیضے تک پہنچاتا ہے یا نہیں ؟

جب بیضے کا صرف ایک حصہ جو خلیہ مایہ (Cytoplasm) پر مشتمل تھا ، اس کی اپنی نوع کے ایک منوی خلیے (Sperm cell) سے ملایا گیا تو تخم یا (Sperm) بیضے (Egg) کے اس ٹکڑے میں داخل ہوا ، اور اس ادخال کے ساتھ ہی مرکزے کا مادہ پیدا ہوگیا ۔ چنانچہ تجربے سے دیکھا گیا کہ بیضے کے ایسے حصے کی احیاء ہوئی ، اس کی تقسیم ہونے لگی اور یہ نمو پاکر ایک نئے فرد میں تبدیل ہوگیا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرکزہ ہی حیات کا حامل سمجھا جاسکتا ہے ۔ یہ حیات پر کتنا قادر ہے اور اپنی چھوٹی سی جسامت کے ساتھ کتنی اہمیت

رکھتا ہے، اس کا تذکرہ (J. Mueller) کی کتاب (Out of the Night) میں
کیا گیا ہے۔ انھوں نے اندازہ لگایا ہے کہ تمام انسانی (Sperms) یا منویے اور بیضوں کے ضروری
مادے کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو اِن کی جسامت ایک اسپیرن کی ٹکیہ کے برابر ہو جائے گی حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر مُلر کے
بیان پر ذرا مشکل سے یقین ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ایسے مرکزوں کے متعلق قیاس کیا ہے جو تمام دُنیا میں کروڑں اور اربوں کی
تعداد میں انفرادی حیثیت سے واقع ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خلوی مادہ بہت پیچیدہ ہے، اور اس کے
ساتھ ہی دُنیا کی تمام چیزوں میں سب سے زیادہ قیمتی اور اہم بھی۔

اس کی بعض پیچیدگیاں مناسب توشیہ (یعنی Stain) یا رنگوں کے استعمال سے)
کر کے خوردبین کے ذریعے دیکھی جا سکتی ہیں۔ مرکزے کے اعضا کا اچھی طرح مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کروموسومز، جو
چھوٹی چھوٹی مختلف شکل کی ساختیں ہیں، نظر آتے ہیں۔ کروموسومز صرف تناسلی یا ثابت خلیوں ہی میں نہیں بلکہ
جسدی خلیوں (یعنی Somatic or Body Cells) میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہر خلیہ میں ان کی
ساخت ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔

پودے اور حیوان کی ہر نوع میں ان مرکزی اعضا (یعنی Nuclear organs) کی ایک
تمثیلی تعداد ہوتی ہے اور ہر ایک میں مخصوص شکل، سائز اور ترتیب ہوتی ہے۔ اناج کے خلیوں میں بیس کروموسومز
ہوتے ہیں۔ لیلی (Lily) کے خلیوں میں چوبیس، مینڈک میں چھبیس، انسان میں اڑتالیس اور گھوڑے میں
ساٹھ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ہاتھی اور وہیل جیسے بڑے جانوروں میں کروموسومز کی کیا تعداد ہوتی ہے جو
انسان کے کروموسومز کی، یعنی اڑتالیس لیکن جنوبی امریکہ کے بندروں کی صورت میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ان میں
کروموسومز کی تعداد چوّن ہوتی ہے۔

ان خوردبینی مرکزی اجسام، اور مسئلہ وراثت میں تعلق کی دریافت بیسویں صدی کی تحقیقات میں سے ہے۔
پھل مکھیوں (fruit flies) پر متعدد تجربے کیے گئے (Thomas Hunt Morgan)
اور ان کے ساتھیوں نے جو کولمبیا یونیورسٹی میں تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں ان چھوٹے حیوانوں کی
جن کا نام Drosophila Melanogaster ہے) بوتلوں میں پرورش کی۔ ان کے نمو اور تولید
کے لیے مقدور بھر مناسب حالات فراہم کیے اور کئی پشتوں تک ان کی ایک ہی نسل کو برقرار رکھا۔ جیسے ہی
نئی مکھیاں پیدا ہوتیں، یہ ماہرانِ حیاتیات ہر نو عمر فرد کا مطالعہ کرتے کہ کسی قسم کی تبدیلی ان کی طبعی خصوصیات میں تغ

نہیں واقع ہوئی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد انھوں نے مختلف تبدیلیاں دیکھیں، مثال کے طور پر ڈروسوفا ئلا کی ابھری ہوئی آنکھیں عموماً سُرخ ہوتی ہیں، لیکن کبھی اِن سے سفید آنکھ والے بچے بھی پیدا ہوتے ہیں۔

(Morgan) اور اس کے ساتھیوں نے اِن ناگہانی تبدیلیوں (Mutations) کی توجیہ اُس تبدیلی سے کی جو مکھی پیدا کرنے والے بیضے کے کروموسومز کے ایک مخصوص حصے میں واقع ہوتی ہے۔ بعد کو انھیں معلوم ہوا کہ (Mosaics) پروں میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئیں۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ عملاً مکھی کی ہر خصوصیت میں بیسیوں اختلافات ہوتے جاتے ہیں۔ غرض ان تمام طبعی تبدیلیوں کی توجیہ اُن لوگوں نے اس طرح کی کہ کروموسومز میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر مُلر کے شعاعی عملوں سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مُلر نے بتلایا کہ مکھیوں پر لاشعاعوں کا عمل کریں تو ناگہانی تبدیلیوں (Mutations) کی رفتار طبعی حالت کی نسبت بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ اس سے کروموسومز کے مخصوص حصوں، اور کروموسومز سے پیدا ہونے والی مکھیوں کی طبعی خصوصیات میں راست رشتہ معلوم ہوتا ہے۔ ان چھوٹے خلوی اعضا میں شعاعوں کا ادخال تخریبی بھی تھا، اور تعمیری بھی۔ بعض صورتوں میں کروموسومز کے ایک حصے کو سخت صدمہ پہنچا، اور وہ بالکل غایب ہوگیا، اور بعض میں اس حصے کے دوسرے کروموسومز سے مل جانے سے ایک غیر طبعی جسامت اور شکل کی نئی ساخت پیدا ہوئی۔ دوسرے تجربوں میں کروموسومز کی دو دو حصوں میں تقسیم کی گئی اور ایک کے نصف کی جگہ دوسرے کا نصف رکھا گیا، اس طرح نئی مخلوط شکلیں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس طرح کے تمام تجربوں کے نتیجے کے طور پر سائنس دانوں کو یہ خیال ہوا کہ کروموسومز سادہ مسلسل کُل (Simple continuous wholes) نہیں ہیں بلکہ ان کی پیچیدہ قسم کی ایک دُنیا ہے، جو نہایت چھوٹی تبدیل پذیر اکائیوں سے بنی ہوئی ہے۔ یہی اکائیاں جین (Genes) کہلاتی ہیں۔

کسی نے اب تک جین (Gene) کی شکل نہیں دیکھی۔ زیادہ طاقتور خوردبین کے عمل سے بھی اس کی وضاحت ناممکن سی ہے، لیکن جس طرح مادہ کے کیمیادی اور مناظری (Optical) پہلو کے لیے ہم جوہر (atom) جیسی اَن دیکھی چیز فرض کر لیتے ہیں اسی طرح ضرورت ہے کہ تخم مایہ، یا پروٹوپلاسم کے نمومی پہلو پر روشنی ڈالنے کے لیے اَن دیکھے جین (Gene) کا وجود بھی فرض کرلیں۔ جین ایک واحد ساخت ہے جو جوہر وراثت ہے۔

لیکن یہی ہمارا ماحصل نہیں موجودہ تحقیقات سے ایک اور بنیادی حقیقت کا پتا چلتا ہے۔ تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ جین کو نقصان پہنچانے سے خلیہ بھی بڑی حد تک متاثر ہوتا ہے۔ بعض جین (Genes) ضائع ہوجائیں تو موت بھی واقع ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خلیہ کے افعال میں جین (Gene) کا فعل صرف وراثت پر قابو حاصل کرنا ہی نہیں، بلکہ حیات کو قبضے میں رکھنا بھی ہے۔

۲

جین کی حیاتی اہمیت کی دریافت کا سہرا ڈاکٹر (Demerec) کے سر ہے، وہ (Carnegie Institution of Washington) کے Geneticist ہیں۔ چند سال سے ڈاکٹر ڈیمیرک، ڈروسوفائلا مکھی کی تولیدی قوت پر ناگہانی تبدیلیوں کے اثرات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے یونیورسٹی آف ٹکساس (Texas) کے تجربوں سے بھی فایدہ اُٹھایا۔ اس جین کی جسامت کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں لیکن اس مسئلے کو حل کرنے کا غالباً یہ اچھا طریقہ ہے کہ کروموسوم میں جین (Genes) کی تعداد معلوم کی جائے اور کروموسومی مادے کے طول کی اس جین کی تعداد سے تقسیم کی جائے اس سے ایک اوسط قیمت حاصل ہوجاتی ہے۔

یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جین کی تعداد کروموسومز میں ان مقامات کی تعداد کے متناسب ہوتی ہے جہاں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ڈروسوفائلا پر تجربے کرکے معلوم کیا گیا ہے کہ ایسے مقامات تین ہزار ہیں۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ ہر خلیہ میں تقریباً تین ہزار جین (Genes) ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی آف ٹکساس کے ڈاکٹر (Painter) نے ۱۹۳۲ء میں جین (Genes) کی تعداد معلوم کرنے کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا۔ انھوں نے پھل مکھی کے لعابی غددوں پر تجربے کیے۔ یہ غدود کافی بڑے خلیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر Painter نے معلوم کیا کہ ان خلیوں کے کروموسومز میں جین زنجیر کی شکل میں ہوتے ہیں۔ کروموسومز کی ہر پٹی بہ ذات خود جین نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی جین gene کے حامل ہیں۔ اور ڈاکٹر پینٹر کے الفاظ میں:۔ "یہ پٹی وہ مقام ہے جس میں جین رہتا ہے۔" لہٰذا ان پٹیوں کی تعداد معلوم کرلینے سے جین (gene) کی تعداد معلوم ہوجاتی ہے۔ (Calvin B. Bridges) اور مکروغیرہ نے ان پٹیوں کی تعداد معلوم کی ہے، لیکن ہم یہاں (Bridges) کی گنتی کو لیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ڈروسوفائلا مکھی کے خلیے میں تقریباً پانچ ہزار جین ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایک جین کروموسومی مادے کے $\frac{1}{....}$ حصے کے برابر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حیات کی اس اکائی کی ماہیت کیا ہے؟ اس کا ایک دلچسپ جواب ڈورتھی ایم ونچ Dorothy M. Winch کے تجربوں میں ملتا ہے، وہ کروموسومز کو خاص قسم کے پروٹینی سالموں کے متعدد رشتک سمجھتے ہیں، لیکن عام طور پر Geneticists ذرّے کے تخیل پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ڈیمرک جین Gene کو ایک نامیاتی ذرّے کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ ایک واحد بڑا سالمہ ہے، اس سالمے کی ساخت ایک پیچیدہ مرکب پر مشتمل ہے جسے Nuclear Proteins کے (Thymo-Nucleic acid) کہتے ہیں۔ یہ مرکب کیمیاوی تجزیئے سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا ایک سالمہ ہیڈروجن کاربن آکسیجن نائٹروجن اور فاسفورس کے جملہ (۱۵۲) جوہروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اکثروبیشتر کسی ایک جوہر کے نقصان سے بھی جین Gene کی ساخت بالکل بدل جاتی ہے اس کا دوہرا ہونا (Duplication) ناممکن سا ہوجاتا ہے اور اس سے خلیہ کی تقسیم بھی اکثر صورتوں میں رُک جاتی ہے۔

غرض ہم اس طرح نخزمایہ تک پہنچتے ہیں جہاں ایک چھوٹی سی وحدت غیر معمولی طور پر اہم معلوم ہوتی ہے۔ اس چھوٹی سی وحدت پر ہی جین (Gene) کے افعال کا دارومدار ہے۔ جین کی غیر موجودگی میں کروموسومز بےکار ہوجاتے ہیں، اور پھر کروموسومز معطل ہوجائیں تو خلیہ ہی باقی نہیں رہتا، وہ اپنے افعال انجام نہیں دے سکتا، اس کا نمو رُک جاتا ہے، تولید بند ہوجاتی ہے اور حیات باقی نہیں رہتی۔ اب اگر جین کے افعال پر حیات کا دارومدار ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا ہم حیات کے متعلق یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی ابتدا جین (Gene) کی حرکت سے ہوئی؟ جین کی اس حرکت کے تین نتایج یقینی ہیں:۔

(۱) یہ کہ جین Gene دوہرا ہوجاتا ہے

(۲) یہ کہ جین (Gene) میں کبھی ناگہانی تبدیلیاں بھی واقع ہوتی ہیں

(۳) یہ کہ جین (Gene) کو اپنے امتیازی طبعی خصوصیات پر قابو رہتا ہے اور ان کو وہ اپنی اولاد میں منتقل کرتا ہے

لیکن یہ تمام مظہر جین کے گروہوں ہی میں دیکھے گئے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ ہم جین کو گنجان کروموسومز میں ان کی حرکات سے جان سکے ہیں لیکن واحد جین میں جو اپنے گروہ سے علٰحدہ کر دیا گیا ہو یہ مظہر دیکھنے میں نہیں آتے چنانچہ ڈاکٹر VAN Dug کا خیال ہے کہ ایک واحد جین بر باد کن ہی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں (Virus) تذکرہ بھی کیا ہے

وائرس (Virus) کا وجود کوئی چالیس برس سے معلوم ہے، اور عرصے سے یہ خیال ہے کہ وائرس (Virus)
سب میں اولین زندہ شے ہے۔ گذشتہ تین سال کے عرصے میں اس پر بہت کچھ کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر
(Wendell M. Stanley) کے تجربات بہت اہم ہیں، ان کے تذکرے کی یہاں گنجائش نہیں،
لیکن ان کا حاصل یہ ہے کہ وائرس (Virus) کی ماہیت کے متعلق ہم کو بہت سے قیمتی معلومات
ملتے ہیں۔ مختلف بیماریوں جیسے فالج، انفلوئنزہ، زرد بخار (Sleeping Sickness) وغیرہ اور نیز
بہت سی پودوں کی بیماریوں کا سبب یہی وائرس ہیں۔ ڈاکٹر (Stanley) نے متعدد بار وائرس کو
قلمایا، خوردبینی مطالعے میں چمک دار سوئی نما ساختوں کا ایک تودہ نظر آتا ہے، ان میں کی ہر سوئی کو ایک وائرس
نہیں سمجھا جاسکتا، بلکہ جس طرح شکر کا ہر قلم شکر کے متعدد سالموں پر مشتمل ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح ان قلمی شوکوں
(Spikes) کا ہر فرد پروٹین کے لاکھوں سالموں کا ایک گچھا ہے اور ہر سالمہ ایک واحد وائرس ہے۔
(Stanley) کے کیمیاوی تجزیئے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وائرس (Virus) کا سالمہ کاربن،
ہیڈروجن، نائٹروجن، اور آکسیجن پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن اس میں گندک اور فاسفورس نہیں ہوتی۔ اس سالمے میں کاربن،
ہیڈروجن وغیرہ کے جوہروں کے تناسب اور سالمے کی ساخت کے متعلق ابھی تحقیقات جاری ہیں۔

وائرس Virus کے متعلق Stanley کے تجربوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں جان دار اور بے جان
دونوں کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں، غالباً وائرس کے سالمے کی دو حیثیتیں ہیں، وہ زندہ ہے بھی اور نہیں بھی، زندہ مناسب
ماحول میں جو اس کے لیے مفید ہو، اور بے جان کسی دوسرے ماحول میں، وائرس کی دریافت اور اس کے خواص کا مطالعہ
ہماری صدی علم حیاتیات کی سب سے بڑی ترقیوں میں سے ہے۔

۳

قلمائے ہوئے وائرس (Virus) کا چھوٹا سا ٹکڑا تمباکو کے پتے پر ڈال دیا جائے تو پورا پودا
بیمار ہوجاتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ تمباکو کا پورا کھیت اس سے متاثر ہوتا ہے، اس بیماری کا نام Mosaic Disease ہے،
اس کے (Mosaic proteins) اکثر باتوں میں جین (Gene) سے مشابہت رکھتے ہیں، دونوں کی
تقریباً ایک ہی جسامت ہوتی ہے، دونوں سالمے ہیں جو خاص ماحول میں اپنے کو دوہرا سکتے ہیں، دونوں اپنی اس تولیدی
خاصیت کو عرصہ دراز تک ملتوی رکھ سکتے ہیں اور مناسب ماحول مل جانے پر ان میں تولید کی خاصیت پھر ظاہر

ہو جاتی ہے۔ جین (Gene) بعض اوقات غیر قیام پذیر ہوتے ہیں اور (Stanley) نے اپنے قلمی پروٹین میں بھی کچھ اسی طرح کی خاصیت دیکھی ہے Carnegie Institution of Washington کے ڈاکٹر Oscar Riddle نے جین اور وائرس کے تعلق پر دلچسپ تجربے کیے، ان کا خیال ہے کہ جین، وائرس کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ عضویوں کی نمائندگی کرتا ہے لیکن یہاں بھی :۔

"فرد قائم ضبط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں"

ایک جین (Gene) تنہا کچھ نہیں ڈاکٹر Riddle کے خیال میں ایک واحد جین کوئی فعل انجام نہیں دیتا، یہی نہیں بلکہ وہ ایک واحد جین کو ذی حیات سمجھنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ Stanley بھی اپنے قلمی پروٹین کے متعلق کچھ ایسا ہی خیال رکھتے ہیں۔

ازوٹوبیکٹر (Azotobacter) نامی ایک جرثومہ ہے، جو زمین کے اندر رہتا ہے، وہ سانس لیتا ہے اور اپنے ماحول سے غذا حاصل کرتا ہے، وہ نشو و نما پاتا، اور اپنی تعداد کو بڑھاتا جاتا ہے چنانچہ اس کو تمام علماء حیاتیات متفق طور پر ذی حیات سمجھتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ ازوٹوبیکٹر میں ایک اور اہم و دلچسپ خاصیت پائی جاتی ہے، وہ آزاد ہوا سے نائٹروجن حاصل کرتا ہے اور زمین سے بعض کیمیاوی مادوں کو جذب کرتا ہے، ان مادوں اور نائٹروجن کے امتزاج سے وہ عجیب و غریب طریقے پر امونیا بناتا ہے۔ اس سے امائنو ترشے اور پھر ان سے پروٹین بنتے ہیں، یہ چیز حیات کے لیے بہت ضروری ہے کیوں کہ بغیر پروٹین کے تخم مایہ، یا پروٹوپلاسم حاصل نہیں ہوتا۔ پروٹین بنانے کی قابلیت ہی حیات کا ثبوت ہے۔

ماسکو کی (Academy of Sciences) میں تین روسی کیمیا دانوں نے حال ہی میں ازوٹوبیکٹر پر متعدد تجربے انجام دیے ہیں، ان کے نام (A. M. Bach) Z. V. Yermolieva اور (M. P. Stepanian) ہیں انھوں نے تھوڑے سے بیکٹریا، کو شیشے کے برتن میں لے کر شکر سے ان کی پرورش کی، اس سے وہ امونیا کی قلیل مقدار حاصل کر سکے اس کے بعد ان کیمیا دانوں نے جراثیم کو اکٹھا کر کے کوٹا، پیسا اور دباؤ کے تحت ان سے ایک رس حاصل کیا، اس بیکٹریائی مادے کو خوب چھان لیا، صاف مقطر میں انھوں نے شکر ملایا اور ہوا کی تھوڑی سی مقدار محلول میں سے گزاری، مقطر میں جیسا کہ ان کا بیان ہے، کافی مقدار میں امونیا پیدا ہوگئی یہاں بے جان رس میں کوئی پوشیدہ چیز وہ کام کر رہی ہے جس کو کہ بیکٹریا نے انجام دیا تھا۔

پروفیسر Bach اور ان کے ساتھیوں نے اس واقعے کی توجیہ اس طرح کی کہ

زندہ بیکٹیریا میں نائٹروجن کی تثبیت ایک خامرے (یا Enzyme) کی بدولت ہوتی ہے۔ خامرہ یعنے خمیر پیدا کرنے والا مادّہ عامل (یا Catalyst) ہے، اور عامل ایک ایسا مادہ ہے جس سے دوسرے مادوں کے آپس میں تعامل میں مدد ملتی اور تعامل کی رفتار تیز ہوتی ہے لیکن وہ خود تعامل سے متاثر نہیں ہوتا۔ روسیوں کا خیال ہے کہ ان کے تجربے میں مقطر کے ساتھ وہ نامیاتی عامل آجاتا ہے اور اس طرح وہ ثابت کرتے ہیں کہ عامل اتنی ہی قوت سے شیشے کے برتن میں اپنا عمل کرتا ہے جتنا کہ قدرت میں جاندار عضویے کر سکتے ہیں۔

حیات کی تعریف غالباً یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ مادے کی تنظیم کے لیے ایک اسٹیج ہے از وٹو بیکٹر (Azotobacter) سے انسان تک حیات کا تدریجی ظہور عضویوں کے ایک مسلسل ارتقاء کا نتیجہ ہے جو بہت پیچیدہ طریقے پر واقع ہوا ہے، ٹھیک اسی طرح مادے میں (Protons) سے شروع کر کے متعدد برقی ذرّات کا ظہور جس سے جرثومہ کی پیدائش عمل میں آئی ہے، ایک پُر اسرار اور پیچیدہ طریقے سے ہوا ہے۔

(Electrons) اور (Neutrons) اپنے اطراف کے برقیوں (Protons) کے ساتھ جوہر بناتے ہیں، لیکن جوہروں میں کسی صورت میں بھی حیات نہیں مانی جا سکتی۔ جوہروں سے سادہ مرکبات کے سالمے بنتے ہیں جیسے پانی، نمک وغیرہ کے سالمے لیکن ان حاصل مرکبات میں بھی حیات کا پتا نہیں چلتا۔ قدرت میں ان سادہ سالموں سے زیادہ پیچیدہ سالمے بنتے ہیں جیسے شکر اور دوسرے کاربوہیڈریٹ۔ چربیاں اور دوسرے ہیڈرو کاربنز، اور کسی خاص طریقے پر جوہر آپس میں مل کر عامل (Catalyst) پیدا کرتے ہیں جن میں خامرے (یا Enzyme) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ابتدا میں عامل سے امائنو ترشے بنتے ہیں اور پھر ان سے پروٹین، سادہ پروٹین، پیچیدہ پروٹین میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں اور بالآخر وہ بڑے سالموں کے گروہوں کی شکل میں آپس میں مل جاتے ہیں اور کسی پُر اسرار طریقے پر اولین جین (Gene) پیدا کرتے ہیں۔ یہ بڑے سالمے زنجیرے کی شکل میں ایک دوسرے سے متعلق ہو جاتے ہیں اور اس طرح کروموسومز بناتے ہیں، اُن کے خواص کا ظہور ہوتا ہے، ان کا آپس میں الحاق بڑھتا جاتا ہے، ہر فرد دوہرا ہوتا، تقسیم پاتا اور اس طرح اپنی تعداد اضافہ کرتا جاتا ہے، پھر اُس کل میں داخل ہوتا ہے جو مسلسل طور پر حرکت میں ہے، اُس طاقت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جسے ہم 'حیات' کہتے ہیں۔

یہاں اُس اصلی مقام کا پتا لگانا مشکل ہے جو 'حیات' کا مبدء ہے، لیکن شاید ایسا سمجھنا قرین قیاس

ہوسکتا ہے کہ غیر ذی حیات میں حیات کی ابتدا پروٹین بنانے والے عامل (Catalyst) کے ظہور سے ہوتی ہے۔ جین (Gene) کو اولین زندہ وحدت سمجھا جاسکتا ہے اور وائرس (Virus) حیات کے سب سے قدیم اور اولین خوشہ چیں (Precursor) تصوّر کیے جاسکتے ہیں، لیکن یہ خیال صحیح ہے کہ ان دونوں عضویوں میں سے کوئی بھی خامرے (Enzyme) سے قدیم تر نہیں۔ خامرے کو شاید حیات تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ "حیات" کا خوشہ چیں ضرور ہے اور جس جگہ بھی وہ فاعل (Agent) بن جاتا ہے وہی "مبدءِ حیات" ہے۔

عبدالحفیظ صدیقی

آجکل

ہر سُو نشاط و کیف کا ساماں ہے آجکل
عالم تمام صبحِ بہاراں ہے، آجکل

موجِ شراب، زیست کا عنواں ہے آجکل
کونین غرقِ مستیٔ عصیاں ہے آجکل

قطرہ میں سلسبیل کی موجوں کا ہے فروغ
ذرّہ طلوعِ صُبحِ گلستاں ہے آجکل

لطفِ نشاط کم نہیں ہوتا کسی طرح
ٹھیری ہوئی سی گردشِ دوراں ہے آجکل

فردا کی فکر ہے، نہ گذشتہ کا کوئی غم
دستِ جنوں میں ہوش کا داماں ہے آجکل

خود آرہے ہیں اُن کی طرف سے پیامِ شوق
اپنے کیے پہ حُسن پشیماں ہے آجکل

ٹھیرا ہوا ہے منزلِ عشرت پہ کارواں
قابو میں میرے عُمرِ گریزاں ہے آجکل

کہہ دو غمِ حیات سے فرصت نہیں مجھے
اُن کا خیال سلسلہ جنباں ہے آجکل

وہ کیفیت کہ زیست کا حاصل کہیں جسے
ماہرؔ تری نظر سے نمایاں ہے آجکل

ماہرالقادری

قانون بلدیہ اس کے اختیارات اور اثرات

قانون بلدیہ کے لحاظ سے مجلس بلدیہ حیدرآباد کو اگرچہ کہ اس کی ترکیب جداگانہ ہے بالکلیہ وہی اختیارات حاصل ہیں جو بلدیہ بمبئی کو حاصل ہیں جسے ہندوستان کی سب سے بڑی بلدیہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ موازنے کی ترتیب اور منظوری۔ تقررات اور علحدگی۔ جدید ٹیکس عائد کرنا وغیرہ ان سب امور میں بلدیہ بمبئی اور بلدیہ حیدرآباد بالکل مساوی الاقتدار ہیں۔

جہاں تک کہ ان امور کا تعلق ہے جو بہ موجب قانون بلدیہ مجلس بلدیہ انجام دے سکتی ہے، یا جن کا انصرام وہ اپنے صوابدید پر کر سکتی ہے۔ بمبئی میں بھی یہ امور کم وبیش وہی ہیں جو یہاں کے قانون میں موجود ہیں اسی طرح قانون بلدیہ حیدرآباد کی دفعات ۴۷ و ۴۸ ملاحظہ فرمائے جائیں جن میں مندرج ہے کہ :-

"مجلس بلدیہ پر لازم ہے کہ ان سب امور کا مناسب اور معقول انتظام کرے، بجز اس کے کہ سرکار عالی نے کسی امر کا انتظام اپنے ذمہ رکھا ہو۔"

لیکن نفاذ قانون بلدیہ کے بعد سے سرکار عالی کی طرف سے ایسا کوئی اعلان نہیں ہوا کہ جس میں یہ صراحت رہتی کہ دفعہ ۴۷ میں مصرحہ کن امور کو سرکار عالی اپنے سے متعلق رکھنا چاہتی ہے۔ محض عمل درآمد کے لحاظ سے جو امور بہ وقت نفاذ قانون بلدیہ دیگر سررشتہ جات انجام دے رہے تھے وہی عمل قایم رکھ کر وہ تمام امور بہ دستور ان ہی سررشتہ جات سے متعلق رہے، بلکہ فایئر برگیڈ کی سررشتۂ کوتوالی کے تحت منتقلی عمل میں آئی اور محلہ جات کے نام رکھنے کی حد تک ذات شاہانہ کے ساتھ مختص کر دیا گیا۔

نتیجہ یہ ہے کہ گو اقتدار کی وسعت کے لحاظ سے بلدیہ حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی بلدیہ کے مساوی ہے، لیکن کارفرمائی کا لحاظ کرنے بعض مضافاتی بلدیات برطانوی ہند کے مقابل بھی نہیں ہے۔

اس کے خلاف بلدیہ بمبئی وہ سب کام انجام دے رہی ہے جو بہ موجب قانون اس سے متعلق ہیں۔ ڈرینج۔

ب رسانی۔ آرائش شہر۔انتظامات تدفین و تحریق۔نگرانی حیات و ممات۔چیچک براری۔امراض متعدی کا انسداد۔
شفاخانے۔سینی ٹوریم۔مارکٹ۔مسالخ۔نگرانی تجارت اشیائے خوردونوش ومفر و خطرناک۔ فایر برگیڈ۔
تعمیر امکنہ و انہدام امکنہ خطرناک۔ مانع گرد تعمیر شوارع وغیرہ۔برقی روشنی و آب پاشی شوارع۔ شوارع کی نام
لکھائی کے علاوہ ابتدائی تعلیم۔کتب خانے۔میوزیم۔چڑیا گھر۔ باغ۔سڑکوں پر درختوں کی تنصیب۔پیمائش آراضی۔
مردم شماری۔انتظامات موسیقی و بانڈ نوازی اندرون حدود شہر بھی اسی سے متعلق ہیں۔یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ
بلدیۂ بمبئی کے ساڑھے چار کروڑ موازنے میں حکومت بمبئی کی طرف سے کسی طرح کی گرانٹ یا امداد نہیں شریک ہے۔
بلدیۂ بمبئی نے اپنے ہی صرفہ سے زمین دوز موریاں بنائی ہیں اور آب غلیظ کو سمندر میں بہا دینے یا اس کو
صاف کرنے کے لیے انتظامات کا صرفہ بھی وہی برداشت کر رہی ہے۔ آب رسانی کے لیے شہر سے (۲۶) میل کے
فاصلے پر کئی کروڑ کے صرفہ سے اراضی حاصل کر کے تالاب کی تعمیر۔ ڈبل پایپ لائین، اور ذخایر آب کا قیام
کیا گیا ہے۔بلدی اراضیات پر قبرستان مسان دخمے قایم ہوئے ہیں، اور ان پر بلدی عملہ نگراں ہے۔خانگی قبرستان
مسان بھی زیر نگراں ہیں۔حیات و ممات سے متعلقہ اعداد بہت ہی عمدگی اور وسیع طرز پر محفوظ رہتے ہیں۔
ایسا ہی انتظام چیچک براری اور امراض متعدی کے انسداد کا ہے۔کنگ اڈورڈ میموریل ہاسپٹل جو بلدیے کا اپنا
شفاخانہ ہے ہندوستان کے سب سے بڑے دواخانوں میں ہے زچگی خانے میں مراکز اطفال کو امداد دی
جاتی ہے۔اس کے ساتھ ایک میڈیکل کالج بھی قایم ہے امراضِ دق کے لیے سینی ٹوریم موجود ہے۔امراض خبایث کے لیے بھی
جگہ جگہ مراکز علاج قایم ہیں۔حدود شہر میں کئی مارکٹ ہیں جہاں لاکھوں کا کاروبار ہوتا ہے۔خانگی مارکٹ بھی ہیں
مگر زیر نگرانی بلدیہ ہیں۔مسلخ صرف ایک ہے اور حدود شہر سے دُور قایم ہے ایسی نگرانی وہاں کی جاتی ہے کہ جس سے
بہت اچھا گوشت شہر میں ملنا ممکن ہے۔ مارکٹ میں کولڈ اسٹوریج قایم کر کے وہاں فروخت شدنی اشیاء کو
دیر پا باقی رکھنا ممکن کیا گیا ہے، اور یہ سب باعث آمدنی ہے۔فایر برگیڈ قایم ہے اور سارے ہندوستان میں
ممتاز ہے۔ہر حلقے کے لیے فایر اسٹیشن ہیں اور کئی کئی انجن ہیں۔تعمیر امکنہ پر ایسی نگرانی ہے کہ مکان کا نقشہ بننے سے
لے کر مکان میں قیام ہونے تک نگرانی رہتی ہے اور امکنہ محفوظ و دیرپا تعمیر ہونے کی طمانیت رہتی ہے۔ سارے
شہر میں مانع گرد سڑکیں بلدیہ نے ہی تعمیر کی ہیں۔سارے شہر میں روشنی شوارع بہ ذریعۂ گیاس یا بہ ذریعۂ قوت برقی
ہوتی ہے، گو قوت خانہ بلدیہ کا اپنا نہیں ہے بلکہ اسے مقامی کارخانوں سے خریدا جاتا ہے۔ابتدائی تعلیم کے لیے
چوتھائی کروڑ روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور دو حلقوں میں تعلیم جبری ہے۔ ماسوا اس کے بہت سارے مدارس اور

تعلیمی اداروں کو امداد جاری ہے متعلموں کا طبی امتحان، ان کا معالجہ اور کشافی بھی رائج ہے وکٹوریہ گارڈن میں میوزیم اور چڑیا گھر بھی قایم ہے۔ شہر کی ہر جہتی پیمایش اراضی بلدیہ ہی سے ہوتی ہے۔

بالکل یہی حال بلدیۂ مدراس کا ہے۔ وہاں بھی یہ ساری مصروفیات بلدیہ کی جانب سے جاری ہیں۔ البتہ یہ فرق ہے کہ جملہ کارہائے سرمایہ کے لیے حکومت مدراس سے نصف رقم بطور عطیہ اور نصف رقم بطور گرانٹ ملتی ہے لیکن انجام دہی بالکلیہ بلدیہ کے ذمہ ہے چند ایک حلقوں میں ڈرینج ابھی ہوتا ہے۔ آب رسانی کے لیے حکومتی تالاب سے پانی بہ قیمت مقررہ حاصل کیا جاتا ہے، لیکن پایپ لائین فلٹر بیڈ اور ذخائر آب بلدیہ کے ہیں۔ فایر برگیڈ پر کوتوالی کی نگرانی رکھی گئی ہے، گویا کہ اشتراک عمل ہے۔ مانع گرد سڑکوں کی تعمیر بڑی حد تک تکمیل پا چکی ہے۔ ابتدائی تعلیم جبری ہے، غریب اطفال کو دوپہر کا کھانا مفت ملتا ہے! ایک ہائی اسکول بھی ہے مراکز اطفال بلدیہ کے اپنے اہتمام میں قایم ہیں اور محلے محلے میں دواخانے ہیں۔ زچگی خانوں کو امداد دی جاتی ہے۔ روشنی سارے شہر میں قوت برقی سے ہوتی ہے جس کے لیے بلدیہ اپنے ذاتی ستون اور تار نیز ذیلی مراکز قایم کر رہی ہے تاکہ مجتمعاً قوت برقی یا تو مقامی ٹراموے کمپنی سے بہ دستور حاصل کی جائے یا حکومت مدراس سے ان کی تیار کردہ قوت لی جائے۔ حال حال تک بلدیہ کی اپنی نشترگاہ بھی تھی۔

ان دو بڑے بلدیات کو چھوڑ کر بلاری اور مدورا کی بلدیات کی بابت بھی کچھ تفصیل بے محل نہ ہوگی۔

بلاری میں آب رسانی بلدیہ سے ہی متعلق ہے۔ ڈرینج کی تعمیر سرکاری محکمے سے ہو رہی تھی اور بعد تعمیر وہ کام زیر نگرانی بلدیہ آرہا تھا، ان کے مدرسے بھی تھے اور نیز ان کا اپنا قوت خانہ تھا جہاں سے شہر بھر میں قوت فروخت کی جاتی اور سڑکوں پر روشنی ہوتی ہے۔ یہی حال مدورا کا بھی ہے! البتہ وہاں زچگی خانے بھی بلدیہ نے قایم کر رکھے ہیں اور بلدیات کی حد تک یہ اصول قایم ہے کہ کارہائے تعمیری جنھیں کارہائے سرمایہ کے طور پر انجام دلانا ہے حکومتی محکمے کے ذریعے تعمیر پائیں، البتہ بعد تعمیر ان کو منتقل کر دیا جاتا ہے اور نصف رقم امداد نصف رقم قرضے کی شکل میں ایصال ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ وسعت عمل کے لحاظ سے بلدیۂ حیدرآباد، مدراس و بمبئی تو کجا، ان صوبوں کی مضافاتی بلدیات کا مقابلہ نہیں کر سکتی اگرچہ کہ یہ تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ گو وسعت عمل کے لحاظ سے بلدیۂ حیدرآباد، ٹری ونڈرم۔ ارناکولم، اور میسور کی بلدیات کے مساوی ہے لیکن بہ لحاظ اقتدار محصلہ

بلدیۂ حیدرآباد ان تینوں مقامات سے فایق ہے مثلاً میسور میں ہلت افسر و انجینیر کا تقرر ابتدائی جانب حکومت ہوتا ہے، اسی طرح ٹری ونڈرم میں یہ دیکھا گیا کہ وہاں کا میونسپل کمشنر حکومت ٹراونکور کا ایک عہدہ دار رہا ہے اور بہ لحاظ اپنے اختیارات و فرایض کے وہاں کی مجلس ہمارے ہاں کی سابقہ مجلس صفائی کے مماثل ہے یہی حال ارناکیولم کا ہے اور وہاں مثل سابقہ مجلس صفائی حکومت سے منظوریاں حاصل کی جاتی ہیں اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بوجہ نفاذ قانون بلدیہ سرکار عالی نے دیگر ریاستہائے ہند میں ایک ترجیحی جہت حاصل کرلی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیوں نہ یہ اُمور جو بہ لحاظ قانون بلدیہ، بلدیہ سے متعلق رہنے ضروری ہیں اور جو دیگر مقامات میں بھی بلدیات سے ہی متعلق ہیں بلدیہ کے تفویض ہوں؟

واقعہ یہ ہے کہ نفاذ قانون بلدیہ کے ساتھ ہی سرکار عالی نے گویا اس اصول کو تسلیم کرلیا کہ بلدۂ حیدرآباد کا داخلی نظم و نسق جس سے ساکنین بلدہ متاثر ہوتے ہیں بہ ذریعہ مجلس بلدیہ مراحل تکمیل ختم کرے جہاں تک کہ کارکردگی کا تعلق ہے اس سے مطلق انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر وہ مختلف ادارے جن کا مقصد مشترک ہے ایک ہی نظام کے تحت مربوط ہوکر کام کریں تو زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل ہوں گے اور جو ہم آہنگی اس طرح ظہور پذیر ہوگی وہ بہت ہی اثر آفریں ہوگی۔

اس سے قطع نظر یہ بھی یقینی ہے کہ اس سے اخراجات میں بھی کفایت ہوگی۔ گذشتہ ڈسمبر میں معاشئین ہند کی جو کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی اس میں صوبہ واری مالیات کی ترقی اور استحکام کے عنوان پر بھی اظہار خیال کیا گیا تھا، اور انجام کار اس سے اتفاق کیا گیا کہ سردست اضافہ آمدنی کے وسایل تلاش کرنے کی جگہ طریقۂ خرچ اور نظم و نسق کی مشنری کی تفصیل سے دیکھ بھال اور تنقیح کی ضرورت ہے تاکہ سررشتہ جات میں تواردی کیفیت (overlapping) پیدا نہ ہوجائے۔

صلاحیت کا سوال بجائے خود وہ مہتم بالشان سوال ہے جس کے تحت یہ موضوع نظرانداز ہوتا رہا ہے۔ مجالس بلدی کی حد تک اس کو برطانوی ہند میں بہت زیادہ اہمیت اور وزن دیا گیا ہے، لیکن وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ صلاحیت بہت اچھی طرح سے مہیا ہوجاتی ہے بہ شرطیکہ طریقۂ کار معین اور مفید رہے۔

اکثر مواقع ایسے رہے ہیں کہ صلاحیت کا تعلق قانون بلدیہ اور مجلس بلدیہ کی ترکیب سے وابستہ ہوجاتا ہے، مثلاً احاطۂ مدراس میں ایک عرصہ تک مضافاتی بلدیات میں منتخب شدہ میر مجلس بلدیہ بھی عاملانہ فرایض انجام دیتا تھا جس کی بنا پر یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ایک اعزازی میر مجلس جو اپنا پورا وقت بلدیہ کے لیے صرف نہیں کرتا ان فرایض سے

کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس کے نتائج یہ ہوئے کہ دفتر بلدیہ کے کم استعداد اور قلیل المواجب منتظمین کے ہاتھ میں انتظامات آ گئے جنھوں نے اقسام کی ابتریاں پیدا کیں۔ بالآخر حکومت نے ہر بلدیہ کے لیے کمشنر کا تقرر لازم کر دیا۔ قانون میں اصلاح کی گئی اور اب وہاں ہمہ وقتی واقف کار افراد عاملانہ فرایض کی انجام دہی کے لیے کمشنر مقرر ہوتے ہیں۔

اسی طرح بلدی ملازمین کی حد تک قواعد تقرر و ملازمت کے فقدان سے عام شکایات پیدا ہوتی رہی ہیں تو حکومت ہائے مدراس و بمبئی نے اس کے لیے ضوابط و قواعد منظور کیے، نیز مختلف بلدیات ملازمین کا ایک مربوط کیڈر مرتب کر دیا ہے تاکہ عند الضرورت تبادلے کیے جا کر رفع شکایات ہو، نیز ترقی کے مواقع بھی فراہم کیے گئے۔

اس قانون کی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں مجلس بلدیہ اور ناظم بلدیہ کے تعلقات اور فرایض کا بہت اچھی طرح سے تعین ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے ایک کمپنی سرمایۂ مشترکہ کا کاروبار انجام پاتا ہے، اسی طرح بلدیۂ بمبئی کا کاروبار بھی طے ہو رہا ہے۔ نظمائے بلدیہ بھی جو عہدہ دار مقرر ہوئے ہیں وہ حکومت بمبئی کے منتخب اور آزمودہ افراد ہوتے ہیں۔

یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ ہمارا قانون بلدیہ بھی اسی قانون کو پیش نظر رکھ کر مرتب ہوا ہے، اور چونکہ حیدرآباد میں سرکار و غیر سرکار کا فرق اس قدر شدید اور بعید نہیں ہے کہ جیسے بیرون حیدرآباد، لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترکیب مجلس بلدیہ کی حد تک جو بھی اختلاف کیا گیا ہے اس سے ہمارا قانون اور بھی مفید مرام ہو گیا ہے۔

ہماری مجلس بلدیہ کی موجودہ ترکیب یہ ہے کہ ایک عہدہ دار سرکاری اس کے میر مجلس ہیں اور اس حد تک یہ عرض کرنا ہے کہ اس امر کو ہندوستانی ادارہ ہائے حکومت مقامی میں عام طور پر قبول کیا گیا ہے کہ ایک سرکاری عہدہ دار کے میر مجلس ہونے سے جو وزن اس مجلس کی آواز کو سارے ملک میں حاصل ہو جاتا ہے وہ غیر سرکاری میر مجلس کے ہونے پر کم ہو رہا۔ محض اس لیے کہ برطانوی ہند میں سرکاری عہدہ داروں کو غیر سرکاری حلقوں میں اجنبی تصور کیا جاتا رہا تھا اور نیز سوال حصول آزادی کا تھا لہذا سرکاری میر مجلس کے لیے اصرار بلکہ تقاضا کیا گیا۔ اگرچہ یہ اب بھی مسلم ہے کہ مجالس بلدی کی حد تک ایک سرکاری عہدہ دار بھی بہ حیثیت اہل شہر میں سے ہونے کے اور نیز بہ لحاظ اپنے مرتبے کے بہت زیادہ کارآمد میر مجلس ہوتا ہے اور اس طرح سے مباحث مجلس میں بھی ایک وزن قایم رہتا ہے۔

اس طرح ہماری مجلس بلدیہ میں تیرہ[13] نمایندگان منتخب کے ساتھ تیرہ[13] نمایندگان سرکار نامزد ہوتے ہیں۔

سابقہ مجلس صفائی میں کوتوال صاحب بلدہ۔ ناظم فوجداری۔ ناظم تعمیرات سمت حیدرآباد۔ ناظم طبابت۔ ناظم امور مذہبی بہ لحاظ عہدہ رکن رہتے تھے اگر اسی اصول پر اب بھی ان تیرہ نمایندگان سرکار کا تعلق ان محکموں سے

رہے کہ جن کے ذیلی بعض اُمور کو بلدیہ کے تحت منتقل کرنا پیش نظر ہے یا جن سے متعلق بلدہ کے متعلقہ اُمور ہیں۔ مثلاً محکمۂ تعمیرات۔ محکمۂ طبابت۔ محکمۂ کوتوالی بلدہ۔ محکمۂ عدالت۔ محکمۂ اُمور مذہبی۔ محکمۂ تعلیمات۔ محکمۂ مالگزاری۔ محکمۂ آبکاری۔ محکمۂ کروڑگیری۔ محکمۂ ریلوے۔ محکمۂ برقی اور نیز محکمۂ صدر محاسب و فینانس، تو پھر عملاً کوئی شبہ مجلس بلدیہ کی صلاحیت سے متعلق سرکار کو نہیں رہنا چاہیئے۔

مزید طمانیت کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ بلدیۂ بمبئی کے مماثل صیغہ ہائے تعمیرات۔ ملت و غیرہ کی اسپیشل کمیٹیاں بنائی جائیں۔ اور ہر امر جو اس صیغہ سے متعلق ہو، اس صیغہ کی اسپیشل کمیٹی کی رائے کے لیے اولاً پیش ہو، اور اس اسپیشل کمیٹی کا صدر بہ رو ئے قواعد یا قانون نمایندہ محکمہ کو ہی مقرر کیا جائے۔ معیار رائے دہی میں امتحان میٹرک یا اس کے مماثل امتحان کی کامیابی کا لزوم بھی مناسب ہوگا۔

عہدہ داران کی حد تک گو قانون میں ان کی قابلیت کی صراحت موجود ہے اور ان کا تقرر[۲] دو کی حد تک محتاج منظوری سرکار ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ بھی طے کر دیا جائے کہ یہ دونوں عہدہ داران سرکار عالی سے مستعار حاصل کیے جائیں گے گو حق انتخاب بلدیہ کو رہے گا، اور رعہدہ داران کی حد تک بھی ایسا کیا جا سکتا ہے، یہ اس لیے کہ برطانوی ہند میں عہدہ داران کی کارکردگی کو کافی اہمیت دی جاتی ہے اور غالباً یہاں بھی مختلف محکمہ ہائے سرکار کے ارباب اقتدار یہ طمانیت طلب کریں گے اور اس کی حد تک انھیں یہ معلوم رہنا کہ عہدہ داران ہی کے مستعار دادہ ہوں گے نامناسب نہ ہوگا۔

آخری سوال اس ضمن میں مالیات کا ہے۔ برطانوی ہند میں مجالس بلدی کو شکایت رہی ہے کہ ذمہ داریاں انھیں تفویض ہوئیں، لیکن مالیہ کی حد تک انھیں بے بس رکھا گیا بہت ہی محدود ذرایع آمدنی انھیں دیے گئے۔

بلدیۂ بمبئی کو یہ ایک افتخار حاصل ہے کہ اپنی ساری مصروفیات کی تکمیل وہ اپنی ہی آمدنی سے کرتی ہے، یہ واقعہ اس ضمن میں قابلِ دلچسپی ہے کہ ایک مرتبہ بلدیۂ بمبئی میں یہ تحریک منظور ہوئی تھی کہ جزیرۂ بمبئی کی حد تک ایک علٰحدہ صوبہ بنایا جائے تو اہالیانِ شہر بمبئی اپنے جملہ لوازم حکومت کی خود تکمیل کر لیں گے۔

اس طرح بلدہ حیدرآباد کی حد تک یہ امر عدیم المثال ہے کہ یہاں کی تقریباً ساری شہری آسائشیں سرکار عالی نے بلا مجلس بلدیہ کو زیر بار کیے فراہم کی ہیں جس کی وجہ اہالیانِ حیدرآباد کو دوہرے اخراجات کا بار برداشت کرنا نہ پڑا۔

اس سلسلے میں یہ بہر حال وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محکمۂ کروڑگیری محکمۂ آبکاری محکمۂ ریلوے، محکمۂ برقی،

نیز محکمہ ہائے ٹپہ۔ رجسٹریشن وعدالت سے سرکار عالی کو جو آمدنی اہالیان بلدہ حیدرآباد سے ہوتی ہے اس کی مقدار بہت کافی ہے اور اگر اس رقم کا کچھ حصہ بلدی انتظامات کے لیے مختص کر دیا جاتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جہاں رقم وصول ہو رہی ہے وہاں ہی صرف ہو رہی ہے۔ ممکن ہے کہ سرکار عالی نے اب تک جو اخراجات برداشت کیے ہیں وہ اس آمدنی سے کہیں زیادہ ہیں لیکن بہ لحاظ اس کے کہ بلدہ حیدرآباد اس ریاست کا پایہ تخت ہے، یہ صرفہ عین مناسب اور موزوں تھا۔

غرض کہ سرکار عالی خود اس وقت ان مختلف محکموں پر جو صرفہ برداشت کر رہی ہے کہ جو بلدہ کی حد تک آسایش انتظامات میں لگے ہوئے ہیں، اگر وہی رقم آیندہ بھی بہ طور گرانٹ دی جائے تو بہت زیادہ ہم آہنگی کے ساتھ مفید تر انتظامات ہو کر اچھے نتایج برآمد ہوں گے۔

بہ تدریج بلدی محاصل بھی بڑھائے جاسکتے ہیں، بالخصوص بالواسطہ محاصل جیسے چنگی۔ ٹرمینل ٹیکس پٹرول ٹیکس۔ رجسٹری معاہدات کے ضمن میں فیس رجسٹری میں کچھ اضافہ کہ جو بلدیہ کو ایصال ہوگا۔

البتہ اس ضمن میں تنقیح حسابات کے لیے محکمہ سرکار کی مزید طمانیت کے لیے اگر ناظم صاحب حسابات لوکل فنڈ کا تعلق قایم رکھا جاسکتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ قانون بلدیہ کے نفاذ کے بعد ہی یہ سوال محکمۂ فینانس میں پیش ہوا تھا کہ جب سرکار عالی ایک کافی رقم بہ طور امداد بلدیہ کو دے رہی ہے تو کیوں نہ محکمۂ صدر محاسبی و فینانس کا تعلق نگرانی قایم نہ رہے۔

جہاں تک محکمۂ آرایش کا تعلق ہے چونکہ مجلس آرایش بلدہ کی تشکیل بالکل خاص ہے اس لیے اور یہ اس بنا پر بھی کہ آرایش بلدہ کے کام کی نوعیت کے مد نظر بمبئی۔ کلکتہ۔ ناگپور۔ لاہور میں علیحدہ مجالس نے کام کیا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے لیے ایک مختصر ادارہ زیادہ موزوں ہے، اس لیے محکمۂ آرایش بلدہ نیز مجلس آرایش بلدہ علیحدہ رہ سکتا ہے لیکن ناظم صاحب بلدیہ کو بہ حیثیت عہدہ مجلس آرایش بلدہ کا معتمد قرار دیا جاسکتا ہے تاکہ زیادہ تر اتحاد عمل ہو رہے۔

اسی طرح محکمۂ برقی بہ جائے خود علیحدہ قایم رہ سکتا ہے کہ جیسے مدراس و بمبئی کا حال ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اگر سرکار عالی اس ادارے کو محکمۂ بلدیہ پر منتقل کر دے تو ایک ذریعۂ آمدنی بھی محکمۂ بلدیہ کو مل رہے گا۔

بالاجمال یہ ہر طرح ممکن ہے کہ کارکردگی کو بڑھانے اور اس طرح اخراجات میں بھی کفایت اور ان سے زیادہ سے زیادہ افادہ ممکن کرنے کے لیے سرکار عالی محکمۂ بلدیہ پر بہت سارے امور کو منتقل کر دے جو چیدہ چیدہ محکمے انجام دے رہے ہیں، اور اس کے لیے بہ صراحت صدر تغیرات کیے جائیں تو خوش نظمی کی بھی طمانیت ہو رہے گی۔

سرمار

بزمِ طیلسانین

ڈاکٹر بہادر خاں صاحب کو ۱۳۳۹ف میں جبکہ انھوں نے کلیۂ طبیہ جامعہ عثمانیہ سے یم۔بی۔بی۔یس کے پہلے فنی امتحان میں ممتاز طریقے پر کامیابی حاصل کی تھی، ان کی ذہانت محنت اور فراست کے مدِ نظر منجانب سرکارِ عالی علم طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہ عطائے وظیفہ انگلستان روانہ کیا گیا جہاں انھوں نے آٹھ سال تک حصولِ تعلیم میں مصروف رہ کر یل۔آر۔سی۔پی (لندن)، یم۔آر۔سی۔یس (انگلینڈ)، یم۔بی۔سی ایچ۔بی (لیڈس)، یف۔آر۔سی۔یس (لنڈن)، یم۔سی ایچ (لیڈس) کی اعلیٰ ترین اسناد حاصل کیں، اور ملازمت سرکارِ عالی میں بکم آذر ۱۳۵۶ف سے بہ عہدۂ سیول سرجنی مامور ہو کر ملک کے عظیم المرتبت دواخانہ عثمانیہ میں کام شروع کیا۔ ان کی شاندار کامیابی کے ساتھ مراجعت کے موقع پر کاوش صاحب نے یہ نظم "تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے" کے بہ مصداق کہی ہے۔ (ادارہ)

کامیابِ زندگی

دوست! تجھ کو ہو مبارک نغمۂ روحِ نشاط ... یہ ہجومِ فصلِ گل، یہ سرخوشی، یہ انبساط

ہو مبارک تجھ کو بوڑھے باپ کا دیدار بھی ... اور اپنے دوستوں کا جلوۂ پندار بھی

ہو مبارک جلوۂ رنگِ حیاتِ کامیاب ... تیری شہرت کا رہے رخشاں ہمیشہ آفتاب

ہو مبارک تجھ کو یہ سرشاریٔ جامِ سرور ... ساقیٔ دوراں فزوں کر دے ترا حسنِ شعور

کاوش

جمہوری شہریت کی تعلیم

جے ایچ نکلسن پرنسپل۔ یونیورسٹی کالج ہل (انگلستان)

فاسطی حکومتیں، اور سوویٹ روس، بالارادہ اپنے بچوں کو فاسطیت اور اشتمالیت Communism کی تعلیم دیتے ہیں جمہوریت پسند اسے رجحان Bias کہتے ہیں، اور یہ دعوے کرتے ہیں کہ اُن کے اپنے مدارس غیر رجحاناتی ہیں۔ کیا یہ حقیقت ہے؟ — اور اگر ایسا ہے تو کیا یہ دانش مندی ہے؟

رجحان سے بچنے کا آسان ترین طریقہ واقعات کی تعلیم ہے، آرا کی نہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ سائنس کی حد تک یقیناً۔ ہاں! — کوئی حکیم (سائنس داں)، واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے خیال کے مطابق بنانے کی کوشش نہیں کرتا، لیکن فنون کی حد تک اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ ادب جس طرح کہ آج کل اس کی تعلیم دی جاتی ہے، سائنس بھی ہے اور ایک فن بھی کیوں کہ وہ واقعات سے بحث کرتا ہے (جن کی تصدیق ضروری ہے) اور قدر و قیمت Values سے بھی (جو درحقیقت انفرادی رائے پر مبنی ہیں اور جن کی صحیح جانچ ناممکن ہے)۔ — اور یہی آراء کی تعلیم ہے۔ ثقافی علوم Humanities کا معلّم قدر و قیمت کے مسائل سے گریز نہیں کرسکتا۔ پھر رجحان سے گریز کیسا؟ — امر واقعہ یہ ہے کہ ہم سیاسیات سے جس قدر قریب تر ہو جاتے ہیں یہ مسئلہ اسی قدر مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اسی لیے تو انگلستانی مدارس سے سیاسی پروپگنڈا کو جائز طور پر خارج رکھا گیا ہے لیکن کیا ہمیں ہر قسم کی سیاسی تعلیم کو بھی خارج رکھنا چاہیئے؟ — اگر ایسا ہے تو پھر شہریت کی تعلیم کا کیا حشر؟

چونکہ مدارس میں ہم قدر و قیمت کے مسائل سے گریز نہیں کرسکتے، اس لیے ہمیں رجحان کے مسئلے سے رو در رو ہونا چاہیئے۔ ہم بچوں کو خصوصیت کے ساتھ دیانت داری۔ سچائی۔ صفائی۔ پابندیٔ وقت اور شاید جراءت اور ایثار کی جانب بھی مائل کرتے ہیں لیکن اس پر کوئی بھی اعتراض نہیں کرتا کیوں کہ عام طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ یہ

پسندیدہ خوبیاں ہیں۔ ہم انہیں وفاداری کی بھی تعلیم دیتے ہیں، حالانکہ درحقیقت انہیں آگے چل کر یہ پتا چلتا ہے کہ وفاداریوں کے درمیان اکثر تصادم ہو جاتا ہے۔ گویا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم صرف انہی معاملات میں رجحان کو تسلیم کرتے ہیں جن کے متعلق خیالات (آراء) میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بالخصوص مذہب، سیاسیات، تاریخ اور معاشیات میں۔ مثلاً ہم ادب یا موسیقی یا فنون کے ایک استاد کو صحیح الدماغ (Sound) کہہ سکیں گے اگر اس کا مذاق مسلمہ معیاروں کے مطابق ہو یا اگر مطابق نہ ہو تو سر پھرا (Cranky) لیکن اسے عام طور پر "رجحان زدہ" یا متعصب (Biased) نہیں کہتے، یا اسی طرح اس کے بالکل برعکس اصول و فرائض زندگی (اخلاق) کی حد تک ایک بدعتی (Innovator) کو صرف نامہذب یا بد اخلاق کہا جائے گا، اور بس۔

آمرین کی اُن کوششوں کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے جو وہ نہ صرف سیاسی و مذہبی خیالات اور معاشی زندگی پر قابو حاصل کرنے کے لیے بلکہ ادب و فنون اور موسیقی پر بھی اپنا قبضہ جمانے کے لیے کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل صحیح استدلال پر مبنی ہے، کیوں کہ بات یہ ہے کہ سیاسی اداروں کو ان سماجی بنیادوں سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جن پر ان کی تعمیر ہوتی ہے۔ ادب اور فنون نے نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں کلیسا کی گرفت سے آزادی حاصل کی۔ ضمیر کی آزادی فکر (خیالات) کی آزادی کا پیش خیمہ بنی، سیاسی آزادی سب سے آخر میں حاصل ہوئی لیکن ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم بہت تنگ ہے کیوں کہ ہم نے ابتدائی جدّ و جہد کو بھلا دیا ہے۔ آزادی، امن کی طرح، ناقابلِ تقسیم ہے، یعنے کوئی شخص اس وقت تک حقیقی معنیٰ میں آزادانہ غور و فکر نہیں کر سکتا جب تک اس کے احساسات یا جذبات اُن قدر و قیمت کے تابع ہوں جنھیں اس نے دوسروں سے حاصل کیا ہے۔ اِلّا اس صورت کے جب کہ غور و فکر کسی تنگ مخصوص مہارتی میدان میں ہو۔ اسی طرح کوئی جماعت زیادہ عرصے تک سیاسی حیثیت سے آزاد نہیں رہ سکتی، تا وقتیکہ اس کے اراکین بھی نئی نئی سماجی قدر و قیمت کی تخلیق کرنے کے لیے آزاد نہ ہوں ــــ اور آزاد نہ ہوں فنون، ادب اور کردار میں اُن کا اظہار کرنے کے لیے۔

ضبط۔ انضباط (Discipline) اور آزادی کے درمیان بہ ظاہر جو تضاد اور تصادم پایا جاتا ہے اسی کو اکثر نمایاں کیا جاتا ہے، گویا یہ دونوں کبھی یکجا پائے ہی نہیں جا سکتے۔ مدرسہ ہو یا سماج ــ وجہ یہ ہے کہ تعلیم عام (liberal education) کے سلسلے میں چند ابتدائی تجربات حقیقت میں صحیح راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ چونکہ کم عمر بچے کے لیے بیرونی اعانت کے بارہ میں جو اندازہ قایم کیا گیا تھا وہ ضرورت سے بھی کم تھا ــ اسی اعانت کے بارہ میں جو حقیقی دُنیا کے متعلق اس کی اپنی ذاتی عجیب عجیب تاویلات کے

خلاف ہو۔ حالانکہ صحیح مشاہدہ اور منطقی استدلال کے لیے بچّے کی تربیت کرنا اس کی آزادی کو محدود کرنا نہیں ہے، بلکہ اس میں وسعت دینا ہے بہ شرطیکہ اس کے تفکّر کو مقید کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ تعلیم کا دوسرا بڑا مقصد الہامی حِس Intuition کے لیے وہی کرنا ہے جو کچھ ہم نے ذہن کے متعلق کرنا سیکھا ہے۔ قدر وقیمت لیکن آج کل ہم میں سے اکثر یا تو اپنے خود کے اخلاقی اور جمالیاتی معیاروں کو جبراً بچّے سے اختیار کرواتے ہیں یا اُسے اخلاقی اور جمالیاتی معاملات میں بغیر کسی حقیقی رہنمائی کے چھوڑ دیتے ہیں اس خوف سے کہ مبادا ہم اس کی فطری حِسِ قدر وقیمت کو برباد نہ کردیں، یا پھر ہم اُن میں ایک میل پیدا کرتے ہیں انضباط کی قسم سے زیادہ اس کی سختی کا لحاظ رکھتے ہوئے اب غور وفکر کرنا کچھ تو طریقۂ آزمائش وغلطی trial and error کے ذریعے سیکھتے ہیں (کیا یہ نتیجہ خیز ہے؟)؛ کچھ دوسروں کو غور وفکر کرتے ہوئے دیکھ کر یا پھر ہمارے سامنے پیش کردہ مختلف توضیحات میں سے کسی کا مجبوراً انتخاب کرنے کی وجہ سے۔ ہمیں تقریباً اسی طرح قدر وقیمت کا تعین کرنا سیکھنا چاہیئے۔ اولاً آزمائشی تعین قدر وقیمت کے ذریعے جو ممکن ہے امتحان میں پورا نہ اُترے، یا ثانیاً یہ دیکھ کر کہ دوسرے اشخاص اشیاء کی اور ہمارے اپنے افعال کی قدر وقیمت کا کیا تعین کرتے ہیں۔ یا ثالثاً متضاد قدروں Values کے درمیان انتخاب کے ذریعے، سچ تو یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اسی طرح کیا کرتے ہیں، لیکن جبکہ ایک طرف تمام بہترین اساتذہ میدانِ فکر میں تجربہ کرنے اور تصدیق کرنے کے لیے بچّے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو دوسری طرف قدر وقیمت کے مسئلے میں طریقۂ دوم پر تعلیم بہ ذریعۂ نقل یا تقلید پر) بے انتہا زور دیا جاتا ہے اور قدر وقیمت کے راست تعین کی کوشش پر بہت ہی کم۔ شاید یہ اس لیے ہوگا کہ ممکن ہے، یہاں آزمائشات مضر ثابت ہوں، یعنے ایسی بدعتوں Innovations کی جانب رہنمائی کریں جو سماجی نقطۂ نظر سے ناقابلِ قبول ہوں۔ درحقیقت ایک ایسا مقام بھی ہے جہاں پر ہمیں مداخلت کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اور یہ تنبیہ کرنی پڑتی ہے کہ: "اگر تم ایسا کروگے تو تمھیں معلوم ہوگا۔۔۔" یا پھر "ایسا مت کرو۔۔۔" (کیوں کہ ایک غلط وجہ بتانے سے کچھ نہ بتانا بہت بہتر ہے) جہاں کہیں بھی اس کا امکان ہو عقل سے اپیل کرنا ہمیشہ بالکل درست فعل ہے۔ اس طرح بچّے کی اپنی متعین کردہ قدر وقیمت سے مختلف ایک اور قدر وقیمت اس کے سامنے رکھنے کی کوشش بھی درست ہے بہ شرطیکہ آپ اس قدر کو اپنے ذاتی استناد کی بناء پر قبول کرنے کے لیے اس کو مجبور نہ کریں۔ فطری طور پر بچّے کی نظر میں بالغ آدمی کا وقار ہوتا ہے، اور اس وقار سے وہ (بالغ) ہرگز دست بردار نہیں ہوسکتا، ورنہ بچّے کے دل میں اس کا اعتماد باقی نہیں رہے گا؛ یہ ایک مفید تعلیمی ذریعہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا غلط استعمال کیا جائے۔

بہ لحاظ کردار کسی شخص کی شخصیت کے مقابلے میں اس کی "آرا" کی اہمیت بہت کم ہوتی ہے اکثر تیقنات جو بہت زیادہ پختہ ہوتے ہیں۔ ان کی بنیادیں جذباتی ہوتی ہیں ــــ وہ صرف عقل ہی کو مطمئن نہیں کرتے (ممکن ہے کہ بڑی حد تک وہ غیر عقلی بھی ہوں) بلکہ وہ کسی ایسی ضرورت کے جواب میں ہوتے ہیں جو شعوری تفکر کی پہنچ سے بھی باہر ہو۔ اُن (تیقنات) کو قایم کرنے یا اُن میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے ایک جذباتی ترتیب adjustment کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحث و مباحثے کے ذریعے قدیم اعتقادات کا چھڑانا، یا نئے اعتقادات کا قبول کرانا بہت مشکل کام ہے، چونکہ اس صورت میں ہر شخص کو اپنے سابقہ تجربے کی قدر و قیمت کا نئے سرے سے تعین کرنا پڑتا ہے۔ کُوڑ دماغ شخص وہ ہے جس میں قدر و قیمت پہچاننے کی قوت مردہ ہو چکی ہے، یا اب تک جگائی ہی نہیں گئی۔ اس کی تعلیم ضرور کہیں کچھ غلط ہوئی ہے ــــ شاید گھر پر، مدرسے میں شریک ہونے سے بہت قبل۔ اور وہ اب تک بھی اپنی شخصیت کو جبراً توڑنے کی کسی ابتدائی کوشش کے خلاف جہاد کر رہا ہے ــــ یعنے اس کی مرضی کے خلاف جبراً قدر و قیمت تسلیم کرانے کی کوشش کے خلاف۔ یہ بالعموم ایک خراب رفیق نا فرماں بردار ماتحت، یا خود رائے افسر ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ جمہوری جماعت کا ایک بہت کمزور رکن ہوتا ہے۔ چند لوگ تیقنات قایم کرنے کے ناقابل معلوم ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ انھیں کبھی اس کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ یہاں تک کہ وقت گذر گیا۔ وہ عام طور پر اپنی صاف گوئی پر فخر کرتے ہیں۔ ان کا ذہن آزادی کے ساتھ حرکت کرتا ہے لیکن ان کے جذبات اُن کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ اکثر محدود مخصوص تعصبات سے بھرے رہتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ رائے قایم کر لی ہے وہی درست ہے۔ ایسے لوگ بھی نہایت ادنیٰ قسم کے جمہوری ہوتے ہیں۔

جمہوریت کی تعلیم کا اہم ترین مقصد، یا "فرض" ایسی شخصیت کی تعمیر ہے جس کے بغیر جمہوریت چل ہی نہ سکتی ہو ــــ یعنے حریت پسند، روادار، اعانت کن شخصیت۔ چند طبائع بہ نسبت دوسروں کے بہت آسانی کے ساتھ جمہوری خوبیوں کے آئینہ دار ہو جاتے ہیں۔ جمہوریت پر لازم ہے کہ وہ انسانی طبائع کی گوناگونیت کو تسلیم کرے اور اس کی قدر کرے اور مختلف استعدادوں کے لیے میدان مہیا کرے۔ ہر اچھا استاد اپنا فرض سمجھتا ہے کہ طالب علموں کو اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے، نیز ایک جماعت کے رکن کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا سیکھنے میں مدد دے ــــ اور انھیں ایسے اشخاص میں رہنے اور کام کرنے کے لیے تیار کرے جنھیں ضروری نہیں کہ وہ پسند بھی کرتے ہوں اور اگر سچ پوچھا جائے تو اپنے ضمیر کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اُن میں سے تمام کو وہ پسند کر بھی نہیں سکتے اور نہ ہی سب کو مساوی طور پر پسند کر سکتے ہیں۔ اب اگر ہم کوئی بات پسند نہیں کرتے تو اس کے توجوہ ہوتے ہیں لیکن جب ہم نفرت کرتے ہیں تو یہ اکثر

غیر عقلی ہوتا ہے، بجز اس کے کہ ہم ذاتی نقصان کو مفادِ عامہ پر ترجیح دیں۔ "سماج کے دشمن" اکثر اسی طرح پیدا ہوئے ہیں۔ خراب گھروں اور خراب مدرسوں کی وجہ سے، یعنے ایسے گھروں اور مدرسوں کی وجہ سے جنھوں نے ان کی غلط طریقے پر تربیت کی ہے بعض لوگ اپنی شخصی شکایتوں کو رنگ دے کر ان کو سماجی اصلاح کا بہانہ قرار دے لیتے ہیں۔ سماج ان میں سے بہترین افراد کی بہت کچھ ممنون احسان ہے لیکن سماجی مصلحین پیدا کرنے کا یہ ایک خطرناک طریقہ ہے اور شاذ ہی کامیاب ہوتا ہے۔

بلاشبہ جمہوریوں کو اس سماج کے متعلق معلومات حاصل رہنے چاہئیں جس کے آیندہ چل کر وہ شہری بننے والے ہیں اور اگر ممکن ہو تو انھیں اس کی حُبّ آزادی کا حصہ دار ہونا چاہیئے اور اس کے لیے ذمہ داری محسوس کرنی چاہیئے۔ لیکن وہ آزادی سے بہ خوبی محبت نہیں کر سکتے تاوقتیکہ اسے نہ سمجھیں اور اس کے صحیح معنے کے متعلق انھیں کوئی حقیقی تجربہ نہ ہو۔ ایسے کئی طریقے ہیں جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کم و بیش کامیابی کے ساتھ مدرسوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر مفید ثابت ہوتے ہیں بہ شرطیکہ صدر مدرسہ اور اساتذہ فی الحقیقت حریّت پر یقین رکھتے ہوں اور خود بھی مستعد شہری ہوں۔ لیکن حکومت خود اختیاری کا منصوبہ یا شہریت سے متعلق نصاب بہت کم مفید ہوتے ہیں اگر انہیں ایسی درسگاہی زندگی کے ساتھ منسلک کر دیا جائے جو عملاً غیر آزاد ہو۔ یعنے جس میں حریّت فکر و کردار کی حوصلہ افزائی نہ کی جاتی ہو یا جہاں "ایک نمونہ" پر سب کو ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہو۔ بہترین منصوبے۔ مدرسے کے کام اور مشاغل ہی سے فطری طور پر نشو و نما پاتے ہیں، اور انھیں اختیار کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ ذمہ دار ہستیوں کا تجربہ ہے کہ ان کے تعلیمی مقاصد کے حاصل کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہیں۔ بعد میں تجربے میں وسعت کے ساتھ ساتھ اُن میں ترمیمات کر لی جاتی ہیں۔

لڑکے اور لڑکیاں اور بالخصوص بالغ اپنے سے زیادہ عمر والے ایسے لوگوں کی دلچسپیوں میں بڑے شوق سے حصہ لیتے ہیں جن کی وہ قدر کرتے ہوں اس میں خطرہ یہ ہے کہ وہ اکثر نہ صرف ان کا شوق بلکہ ان کی رائے اور ان کے ذوق کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ بہترین اساتذہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے لیکن اس سے کلیتاً نجات پانا بھی آسان کام نہیں۔ ایک خفیف درجے کا "سہارا" آسانی کے ساتھ حد سے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن کئی اشخاص اپنی زندگی بھر ایسے تیقنات کے حامل ہوتے ہیں جو انھوں نے اپنے والدین، اساتذہ یا اپنے سے زیادہ عمر والے دوستوں سے بلا تامل و غور حاصل کر لیا ہے۔ مدرسے میں بچوں کے یہ ذہن نشین کرا دینا چاہیئے کہ اچھے آدمی اکثر اپنے نظریوں میں بہت زیادہ اختلاف رکھتے ہیں، کیوں کہ جدید دُنیا ان لوگوں کے لیے بہت پریشان کن ہے جو پہلے سے متضاد تیقنات اور وفاداریوں کے لیے تیار نہیں کیے گئے ہیں۔

انسان کی سماجی جبلّتیں خود پسندانہ جبلّتوں کی بہ نسبت زیادہ مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑی ہوئی ہیں۔ وہ بے انتہا زیادہ قدیم ہیں جب جماعت خطرہ میں ہوتی ہے (مثلاً جنگ کے زمانے میں) تو جماعتی وفاداری بہ آسانی خود صیانتی جذبات پر غالب آجاتی ہے۔ مغربی سماج اخلاقی کمزوریوں سے ضرور ہیں لیکن فرد پر سماجی دباؤ بہت زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے قوم پرستی فطری جذبہ ہے اس کے سکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں، صرف اس کی تربیت کی ضرورت ہے جبلّت میں جڑ پکڑے ہوئے تمام قسم کی تحریکات کی طرح اس کی قوت بھی شاید بڑھائی گھٹائی نہیں جا سکتی لیکن اس کی رہنمائی کی جا سکتی ہے۔ ہم میں سے اکثر ذیلی جماعتوں کے مطالبات کا فوری جواب دیتے ہیں، مثلاً ہمارا خاندان ہمارا اپنا یارانہ شاید ہماری جماعت، یا فرقہ۔ ہم آداب یا لباس کی غیر اہم تفصیلات میں بھی تقلید کرتے ہیں (مثلاً ٹائی کالی ہے یا سفید) اکثر مدرسے اس ایقان پر عمل کرتے ہیں کہ مدارسی مشاغل کے ذریعے وفاداری اور جماعتی اسپرٹ (Team spirit) کی تربیت کی جا سکتی ہے اور پھر انھیں حسب مرضی اُن گروہوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے جن سے کہ بالغ متعلق ہیں۔ مجھے اس میں شبہ ہے۔ اگر بچوں کو اچھے شہری بننا ہے تو انھیں اس جماعت کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیئے جو ان کی وفاداری اور ان کی محبت کی خواستگار رہے۔ انھیں یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ جماعت اُن سے نہ صرف وفاداری چاہتی ہے بلکہ "تعمیری تنقید" بھی! اور یہ کہ ذیلی جماعتوں کے مطالبات کی مخالفت کی جانی چاہیئے جبکہ وہ وسیع تر وفاداریوں سے آکر ٹکرائیں۔

شہریت کی تعلیم کا جذبات کے ساتھ ساتھ ذہن (عقل) سے بھی تعلق ہونا چاہیئے۔ ہم جذبات کی تربیت ضرور کرتے ہیں، لیکن بسا اوقات جو تربیت ہم دیتے ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ جذبات کو اُن مقاصد (Ideals) اور اداروں کا ہمنوا بنایا جائے جن کو ہم خود قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جائز یہ ہوگا کہ ہم اپنے تجربات کو طلباء کے سامنے رکھ دیں اور انھیں یہ صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے نزدیک ان کی کیا قدر و قیمت ہے لیکن ہمیں یہ سیکھنا چاہیئے کہ انھیں بطور خود قدر و قیمت کا تعین کرنے سے روکے بغیر یہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت ہمیں انھیں یہ تعلیم دینی چاہیئے کہ ایسا کرنا اُن کا اپنا فرض ہے۔ ایک دوسرے معنی میں تعلیم میں رجحان ناگزیر ہے۔ چونکہ مدرسہ ایک بیرت وار سماج (Social Ideal) ہے (جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) حکومتی منصوبوں کے ذریعے قائدین کے انتخاب اور ان کے اتباع اور اخلاقی مسائل کے حل کرنے کے متعلق مفید تجربہ حاصل ہو سکتا ہے نیز ہم عصر سماج کا مطالبہ ہمدردی اور شوق کو جگانے اور عملی شہریت کے لیے تیار کرنے میں مدد ہو سکتا ہے۔ ہمارا حقیقی مقصد اس قسم کی تعلیم ہونا چاہیئے کہ ہمارے طلباء حریت پسند اور ذمہ دار بالغوں میں نشو و نما پائیں۔۔۔ یہ عقل اور جذباتی ترقی میں مکمل طور پر بالغ ہوں اور ایسے مختلف قسم کے فیصلہ جات کرنے کے قابل جن کی جمہوری شہریت میں ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مدرسے کی سیرت درست ہے تو طلباء میں آزادانہ اور تحقیق پسند اسپرٹ پیدا کرنا آسان ہوگا۔ لیکن جذبات کی اس طرح تربیت کرنا کہ یہ مسلمہ معیاراتِ قدر و قیمت سے بے نیاز ہو جائیں، کچھ آسان کام نہیں۔ لیکن جب تک ہم یہاں بھی کامیابی حاصل نہ کر لیں "فکر" خود اس وقت تک حقیقی طور پر آزاد نہیں ہو سکتی۔

مترجمہ محمد علی

روئیداد نمائش ملکی مصنوعات سلطنت آصفیہ

اس حقیقت سے خواہ وہ کیسی ہی ناقابل یقین کیوں نہ ہو، اکثر ہمدرد احباب مطلع ہو چکے ہیں کہ معاشی کمیٹی انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی گرہ میں صرف ڈھائی روپیہ تھا اور محض نو دن کی مدت باقی تھی جبکہ نمائش ملکی مصنوعات کے انعقاد کا عملی اقدام کیا گیا۔ ذیل میں بالاجمال اس کی روئیداد قلمبند کی جا رہی ہے تاکہ اہل ملک کو عام طور پر اس کی اطلاع ہو جائے:۔

کانفرنس طیلسانئین عثمانیہ میں بے روزگار طیلسانئین عثمانیہ کے مسئلے پر غور کے ضمن میں ملک کی عام خوش حالی کے اضافے کو ہی سب سے بہترین ذریعہ فراہمی روزگار تصور کیا گیا، اور اس کے لیے ایک مستقل ادارہ بنام "معاشی کمیٹی" قایم کیا گیا۔ مولوی محمود علی صاحب لکچرار سٹی کالج اس کے صدر اور عبدالرحیم صاحب بی۔ اے معتمد منتخب ہوئے۔ اس معاشی کمیٹی نے جہاں ملک کی معاشی سروے وغیرہ کے متعلق تجاویز مرتب کیں وہاں یہ بھی قرار دیا گیا کہ ملک کی مصنوعات اور صناعوں سے اہل ملک کو روشناس کرنے کے لیے ایک نمائش کا انعقاد ضروری ہے، اور اس کے افتتاح کے لیے ہز اکسلنسی نواب سر صدر اعظم بہادر میں یہ استدعا کی کہ آں جناب نمائش کے افتتاح کو قبول فرمائیں نمائش کی کامیابی متیقن ہوگئی کہ جب معاشی کمیٹی کو یہ جواب وصول ہوا کہ ہز اکسلنسی نے کمیٹی کی استدعا کو بطیب خاطر و بہ مسرت تمام قبول کر لیا ہے۔ معاشی کمیٹی کا دوسرا کام نمائش کے لیے ایک ورکنگ کمیٹی کی تشکیل تھا۔ حسن اتفاق سے اس میں محمد فاروق صاحب بی لمہ۔ پی سی یس مددگار ناظم بلدیہ۔ پریم لال جی صاحب رکن بلدیہ اور عبدالوہاب صاحب بی لے انجینیر اسٹیٹ راجہ شیوراج بہادر نے شرکت قبول کر لی۔ مسٹر شنکر جی اس کے معتمد مقرر ہوئے۔

نمائش کے لیے اولڈ ڈپارٹمنٹل پروگرس پاولین کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جناب مہر علی فاضل صاحب قابل شکریہ ہیں کہ انھوں نے بہ عجلت ممکنہ شہزادہ والاشان معظم جاہ بہادر صدر مجلس آرائش بلدہ سے اس کے اجازتی احکام حاصل کیے۔ نہ صرف اس پاولین کی اجازت بلکہ باغ عامہ سے اور دیگر مراعات کے حصول کے لیے جناب مہر علی فاضل صاحب

اور جناب جمال الدین صاحب ناظم باغات نے بہمہ وجوہ امداد دی ہے۔

پراسپکٹس کی ترتیب اور طباعت دوسرا مرحلہ تھا۔ خواجہ حمید احمد صاحب بی اے ناظم نظامت صنعت و حرفت نے اسکو مرتب کیا۔ مسٹر مشتاق احمد پرسنل مددگار جنرل منیجر ریلوے نے اس ضمن میں مفید مشورے دیے تھے۔ طباعت پراسپکٹس کا مرحلہ مبادلتاً رقم دے کر طے کیا گیا اور پھر جناب محمد علی صاحب ام اے مددگار مدرسہ فوقانیہ چادر گھاٹ، عبدالرحیم صاحب بی اے اور محمد علی خاں صاحب بی اے نایب معتمد معاشی کمیٹی نے کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رکھا کہ مختلف کارخانوں اور صناعوں کے ہاں جاکر ان کو آمادہ کیا جائے کہ نمایش میں شریک ہوں۔ روزآنہ جو صناع اور کارخانے شریک ہوتے ان کی فیس شرکت اور بعض کے پیشگی کرایوں سے ٹیکسی موٹر کے کرایے ادا ہوتے تھے۔ جشن سال نو کے دوران میں نمایش کے انعقاد سے متعلق تشہیر کا موقع ہاتھ آیا، یہ اشتہارات بھی مبادلتاً رقم دے کر طبع کرائے گئے تھے۔

جشن سال نو کے مشاعرہ میں صدر معاشی کمیٹی اور نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی گفتگو ہی کہ نواب صاحب نمایش کے انعقاد میں اپنی امداد و اشتراک سے ممنون فرمائیں۔ نواب صاحب نے کمی وقت پر متوجہ کیا کہ مبادا یہ نمایش کی کامیابی کو متاثر نہ کردے۔ دوسرے روز نواب صاحب دفتر کمیٹی پر تشریف بھی لائے اور کافی مباحثہ رہا کہ نمایش کو فروردی میں کیوں نہ ملتوی کردیا جائے۔ خواجہ حمید احمد صاحب اس پر مصر تھے کہ نمایش کو ملتوی نہ کیا جائے۔ رائے مدن موہن لعل صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد ایک اعلان لکھا گیا کہ بہ لحاظ توقع بارش و کمی وقت نمایش یکم فروردی تک کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔

اس کے بعد میں جناب نواب مہدی نواز جنگ بہادر تشریف لے گئے، لیکن ابھی اعلان کی روشنائی خشک بھی نہ ہوئی ہوگی کہ ارکان معاشی کمیٹی نے ایک طرح کی پستی محسوس کرنی شروع کی اور ایسا محسوس کیا گیا کہ یہ ردعمل بہت زیادہ مہلک ہوگا۔ خواجہ حمید احمد صاحب نے ازسرنو اپنا نکتہ خیال پیش کیا۔ رائے موہن لال صاحب نے تائید کی میر محمود علی صاحب صدر نے بھی کہا کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ بالآخر یہی طے ہوا، اور اس بارہ بجے رات تک جملہ مبادیات پروگرام طے ہوئے، مگر صبح پھر موسلا دھار بارش میں التوا کی مناسبت پر غور کیا گیا۔ محکمہ ہائے نظامت صنعت و حرفت اور معتمدی صدر اعظم بہادر سے بہ ذریعۂ فون گفتگو کی گئی، اور محض اس لیے کہ ہز اکسلنسی سر صدر اعظم بہادر تک التوا کی اطلاع پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوئی۔ کارکنوں نے اس تاخیر سے شگون لیا کہ اب التوا کا خیال قطعاً ترک کردیا جائے۔ اس روز شام میں نواب اکبر علی خاں صاحب تمپیر سٹر نے ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں شرکت کی اور ازسرنو مبادیات پر غور کیا جاکر تقسیم کار کی تکمیل کی گئی۔ صاحبزادہ میر وزیر علی خاں بی اے، ال ال بی (کیبل) کو شعبۂ تفریحات

سپرد کیا گیا۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے کمال آمادگی سے اپنے عملے کی رضاکارانہ خدمات نمایش کے لیے عطا کر دیں۔ بلدیہ کا برقی آب دار خانہ بھی نصب کیا گیا۔ ناممکن تھا کہ نواب صاحب کے اس اشتراک کے بغیر نمایش کامیاب ہوتی۔

ڈپارٹمنٹل پروگرس پاویلین میں اسٹال قایم کرنے میں مشکلات نظر آئیں تو عجایب خانہ سرکار عالی سے متصل عمارت تیار کردہ محکمۂ صنعت وحرفت کا انتخاب بہت ہی موزوں ثابت ہوا، اور ساتھ ہی مولوی احمد محی الدین صاحب ناظم صنعت وحرفت سے جو وہاں رفتار کار دیکھنے آئے تھے اس کی اجازت کی بابت عرض کر دیا گیا۔ اس عمارت کا صحن کئی فٹ جھاڑی سے بھرا ہوا تھا، اور صفائی و آہک پاشی کی شدید ضرورت تھی جس کا سلسلہ شروع کروا دیا گیا تھا کہ دکن ماربل لایم کمپنی نے ملکی سنگ مرمر کے چونے سے ساری عمارت کی اپنی گرہ سے آہک پاشی کر دی۔

نواب زین یار جنگ بہادر نے اس موقع پر اسٹالس کی ترتیب اور عام سجاوٹ سے متعلق بہت ہی مفید مشورے دیے جن کو عبدالوہاب صاحب انجینیر نمایش نے بہت ہی اچھی طرح پر تکمیل کو پہنچایا۔ سامان تعمیر جوبلی پاویلین بھی مستعار عطا کیا گیا۔ نواب زین یار جنگ بہادر نے علاوہ ازیں عطائے اسناد کی کمیٹی میں عملی شرکت کی غرض سے بھی اپنا بہت وقت دیا۔ حضور والاشان شہزادہ برار اور شہزادی برار کی نمایش میں رونق افروزی میں نواب زین یار جنگ بہادر کے توسط کو بڑا دخل تھا، اور ان کے ملاحظہ نمایش کے وقت بھی وہ موجود تھے۔

نمایش گاہ میں عارضی ٹیلیفون قایم ہونے سے بڑی سہولت رہی اور یوم خواتین کو اس کی ایک شاخ باہر مردانے میں قایم ہوئی۔ جناب مرزا مصطفےٰ بیگ صاحب مہتمم محکمۂ ٹیلیفون نے اس میں بڑی دلچسپی لی۔ اسی طرح سے نل کی بھی عارضی طور پر احاطۂ نمایش میں کئی شاخیں قایم ہوئیں۔ مسٹر فریدون سہراب جی چینائی نے اس خصوص میں بڑی مدد کی۔ نمایش کے افتتاح سے ایک روز پہلے سے ہی کوتوالی کا پہرہ مامور کر دیا گیا۔ نواب رحمت یار جنگ بہادر نے ہر جہتی طور پر بڑی امداد فرمائی۔ راہ رو نیز داخلے کے انتظامات میں کوتوالی کے اشتراک عمل سے بڑی آسانی ہوئی۔ نواب رحمت یار جنگ بہادر نے دو دن کے لیے کوتوالی کا بیانڈ بھی عطا فرمایا، اور عہدہ داران کوتوالی بلدہ کے علاوہ حامد الدین صاحب صدر امین سمت نے بھی بڑے ہی تعاون سے کام کیا۔

محکمۂ ریلوے نے ریل کے کرایے میں اور نیز ریلوے بسوں کی حد تک رعایتی ٹکٹ جاری کیے۔ نمایش میں، ان کا ایک پبلسٹی اسٹال بھی قایم ہوا تھا جسے خاص طور پر باب الدخلہ میں جگہ دی گئی تھی۔ اس ضمن میں میجر سلاٹر اور

مسٹر مشتاق احمد کی کمیٹی خاص طور پر مشکور ہے۔ نمایش گاہ میں مسرس کیو برادرس کے غازی نے اپنا ایک ریڈیو اسٹال قایم کیا تھا کہ جہاں سے وقت بہ وقت کمیٹی نمایش کی طرف سے محمد فاروق صاحب کیپ افسر اطلاعات نشر کرتے تھے۔

پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر سے ایک ہاتھی معہ ہودج اور کئی اونٹ مستعار ملے۔ اسی طرح جناب شمشیر نواز جنگ بہادر کے علاقے سے بھی ایک ہاتھی اور اونٹ مستعار ملا کہ جو بازیچے میں نمایش کو آنے والوں کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث رہے۔ مسٹر سری دھرنایک نے دو کشتیاں دیں کہ جو یکساں طور پر باعث دلچسپی۔ ایک ہاتھی کا ہودج نواب بہادر یار جنگ کے ہاں سے ملا۔

ناظم صاحب آثار قدیمہ اور مولوی محمد احمد صاحب مہتمم عجایب خانہ کو اوقات نمایش کے موافق کرکے نیز عجایب خانے کے سامان کو نمایش گاہ سے جلد منتقل کرکے بڑا تعاون کیا۔ نصیر الدین حیدر صاحب مہتمم فراش خانہ عامرہ سے بھی بڑی مدد ملی۔

نمایش میں مختلف صناعوں نے شرکت کی۔ جملہ (۸۵) اسٹال قایم ہوئے تھے۔ اس نمایش میں چرمی سامان۔ صابون۔ روغن۔ ظروف۔ بیدری صنعت۔ فرنیچر و چوبی کام۔ ادویات سگریٹ کھلونے کاغذ سازی و صنعت کاغذ۔ دست کاری ملبوسات اور پارچہ جات۔ نقاشی تصویر کشی۔ ڈرائنگ خطاطی اور طباعت۔ برش۔ آہنی اشیاء۔ چاندی و سونے کے زیورات شیشہ و چینی کی اشیاء جلد سازی۔ بید بافی۔ ٹوپیاں بکری کے علاوہ قدیم مصنوعات کے بھی شعبہ جات قایم کیے گئے تھے۔ معاشی کمیٹی کی جانب سے بھی ایک اسٹال قایم کیا گیا تھا جس میں خواتین اور طلباء کے تیار کردہ مصنوعات اور گھریلو صنعتیں رکھے گئے تھے اس میں خصوصیت سے محترمہ صغرا ہمایون مرزا، اور مس سعیدہ ضمیر الدین صاحب کا نام قابلِ تذکرہ ہے۔ بہ لحاظ تعداد فروخت اشیاء یہ کوشش بہت کامیاب رہی خواجہ حمید احمد صاحب اور سید علیم اللہ صاحب قادری متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ نے اس اسٹال میں رضاکارانہ طور پر کام کیا۔ علاوہ ازیں محکمہ ہائے صنعت و حرفت۔ محابس جنگلات نے نمایش میں اپنی جانب سے اسٹال قایم کیے تھے۔

ناظم صاحب آبکاری نے اندرون نمایش گاہ جو درخت تاڑیوں کے تھے ان کے قطع کرنے کی منظوری دی اور نارا ین گوڑہ ڈسٹلری سے تیار کردہ سامان کو بھی نمایش میں روانہ کرنے کا حکم دیا جو عدم گنجایش مسرس عبدالرزاق کے اسٹال ہی میں رکھا گیا۔ محکمہ صنعت و حرفت کے ٹکسٹایل اکسپرٹ مسٹر ناگنا تھ نے شروع سے ہی نمایش سے دلچسپی لی۔ اور اس کا بڑا افسوس ہے کہ عین یوم افتتاح کو ان پر فالج کا اثر ہوگیا

خدا کرے کہ ان کو صحت کلی حاصل ہو۔ نمایش کے افتتاح سے ایک روز پہلے تک بھی ایک طرف یہ حال تھا کہ مزید درخواستیں وصول ہو رہی تھیں اور ان کے لیے اندرون عمارت صحن پر عارضی سائبان تیار ہو رہے تھے۔ دوسری طرف بعض اسٹال جن کو مختلف صناع صاحبان کے حوالے کر دیا گیا تھا، ابھی سجائے نہیں گئے تھے دراصل یہ اس لیے تھا کہ ان کو اس کے لیے صرف چند گھنٹے درکار تھے بر ایں ہم محمد علی خاں صاحب نائب معتمد نے موٹر میں شہر بھر کی ایک چکر کر لی ان کے واپس ہونے تک ہر اسٹال میں سجاوٹ شروع ہو چکی تھی۔

نمایش کے افتتاح کی پہلی رات کو نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے جملہ رضا کاروں کو نمایش گاہ میں ضیافت ڈنر پر مدعو کیا کیونکہ ان کو پھر ساری رات معروف رہنا تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس رات کو تمام شب روشنی رہی اور ہر ہر اسٹال میں سامان لایا جاتا رہا۔

افتتاح کا وقت ۹ر آذر ۱۳۴۷ف کو دن کے ۹ بجے سے مقرر تھا، بحمد اللہ اس وقت تک جملہ انتظامات کی تکمیل ہو چکی تھی اور ایک ممتاز مجمع کے سامنے ہز اکسلنسی سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر نے مسٹر ناراچند کی پیش کردہ نقروی چابی سے نمایش کا افتتاح کیا اور پوری تفصیل کے ساتھ ملاحظہ بھی کیا۔ یہاں سے نواب صاحب ٹاون ہال تشریف لے گئے اور کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے نمایش سے متعلق اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار کیا۔ ممدوح الشان کی اس تقریر کا ابتدائی حصہ قابلِ ملاحظہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ :۔

> ''میں آپ کی نمایش کے نہایت اچھے نقوش اپنے ساتھ لایا ہوں۔
> جس کوشش سے مُلکی صنعتوں کے نمونے خواہ وہ صنعتیں دستی ہوں یا بڑے
> پیمانے کی، قدیم ہوں یا جدید فراہم کیے گئے ہیں، اور جس سلیقے سے
> انھیں ترتیب دیا گیا ہے اور ان کی نمایش کی گئی ہے اس کے لیے
> بانیانِ نمایش قابلِ مبارک باد ہیں وہ جملہ کارخانہ دار وصناع بھی
> جنھوں نے اس نمایش کی کامیابی میں حصہ لیا ہے لایقِ ستایش ہیں''۔

کمیٹی نمایش نے بعض بہی خواہ احباب کے اصرار کے باوجود بہ خیال افادہ عوام داخلہ صرف ایک آنہ رکھا تھا۔ فی الجملہ اس کی وجہ تیس ہزار مرد اور پانچ ہزار سے زاید خواتین نے نمایش دیکھی اور اور اس کی وجہ مصنوعات کی تشہیر و سرپرستی میں بڑی مدد ملی مولوی غلام محمد خاں صاحب رکن بلدیہ اور

سید شہاب الدین صاحب ید اللہی نے رضا کارانہ طور پر نمائش کی تشہیر کا کام اپنے ذمے لیا تھا۔

زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر نمائش کے ٹکٹ ہائے داخلہ میں سے بہ ذریعہ قرعہ اندازی تین تین ٹکٹوں پر انعامات دیے گئے۔ وہ اس طرح کہ رقم انعام سے مصنوعات خرید کردی جاتی تھیں۔

علاوہ کوتوالی بلدہ کے علاقہ فوج بے قاعدہ کا بیانڈ کمانڈر نواب قدرت نواز جنگ بہادر کی مہربانی سے چار دن آتا رہا۔ علاقۂ فوج کا ایک روز آیا، اور علاقۂ کوتوالی کا بیانڈ ایک روز تھا۔ کشافہ لڑکوں نے بھی ایک روز مظاہرہ کیا۔ اس ضمن میں نواب صمدیار جنگ بہادر برگیڈیر۔ قادر یار جنگ بہادر مسٹر ہالنس مولوی سید محمد حسین جعفری صاحب اور سید محمد ہادی صاحب کا شکریہ واجب ہے۔ یوم اطفال کے موقعے پر کہ جب داخلہ صرف تین فلوس کردیا گیا تھا اکثر مدارس سرکار عالی نے جلد برخاست کیا تھا نمائش میں بہت سارے امدادی مدارس کے طلباء کا غیر اوقات میں مفت داخلہ رہا۔ ہر رات نمائش کے ختم ہونے کا اعلان ملکی آتش بازی سے کیا جاتا تھا۔ ابتداً میں نمائش آٹھ بجے ختم ہوتی تھی مگر بعد میں معروضہ پیش ہونے پر اجازت ملی کہ دس بجے تک نمائش رکھی جائے۔ اور نیز دیوالی کی تعطیلات میں بھی اس کو جاری رکھنے کی اجازت عطا ہوئی۔ ان امور کے لیے نیز یوم خواتین کے انعقاد کی اجازت کے حصول میں عالیجناب نواب کاظم یار جنگ بہادر کی توجہات کو بڑا دخل رہا۔

نمائش میں حضور والا شان ولی عہد بہادر اور حضرت شہزادی برار کے علاوہ مہاراجہ یمین السلطنت بہادر نواب کمال یار جنگ بہادر۔ نواب مہدی جنگ بہادر امرائے عظام میں، اور وزرائے سلطنت میں نواب سر عقیل جنگ بہادر۔ نواب فخر یار جنگ بہادر۔ نواب مرزا یار جنگ بہادر اور مسٹر گرافٹن کی تشریف آوری قابل تذکرہ ہے۔ نواب کمال یار جنگ بہادر نے تو دو سو روپے کا عطیہ بھی نمائش کمیٹی کو مرحمت فرمایا۔

فروخت ٹکٹ داخلہ کی حد تک محمد علی خاں صاحب عبدالرحیم صاحب جھندرجی صاحب کلیم الدین صاحب انصاری محمد غوث صاحب معتمد انجمن طیلسانئین عثمانیہ اور رام راؤ صاحب نے خاص طور پر بڑی محنت اٹھائی۔ اسی طرح تفریحات کے ٹکٹوں کی فروخت پر عبدالہادی صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ اور قاضی شمس الدین صاحب نے بڑا وقت دیا۔ دفتر نمائش میں سالمین بن عمر صاحب نے بہت کام کیا۔ ایام نمائش میں رضا کاروں کے ریفرشمنٹ کا انتظام محمد علی صاحب ام اے کے ذمے تھا۔

مصنوعات پر عطائے اسناد کے لیے ایک کمیٹی ترتیب دی گئی تھی جس میں مسٹر گرافٹن۔ راجہ بہادر

بشیشر ناتھ۔ نواب زین یار جنگ بہادر۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر، مولوی سید فضل اللہ صاحب پچ سی یس۔ نواب اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب شریک تھے، اور بہت ہی تفصیل سے غور و خوض کیا جاکر یہ امر طے ہوا اس کا علیحدہ اعلان کیا جاچکا ہے۔

نمائش کا انعقاد بجائے خود کتنا ہی سود مند کیوں نہ ہو عملاً رائیگاں ہوتا اگر صناعوں کے اجتماع اور مصنوعات کے مظاہرے سے کچھ ٹھوس علمی اور تحقیقی کام کی ابتدا نہ کی جاتی چنانچہ اس کے لیے خواجہ حمید احمد صاحب بی اے نے ڈائرکٹری کی ترتیب کا ذمہ لیا ہے اور اس کے لیے ہر ہر صنعت سے متعلق تفصیلی اعداد فراہم کر لیے گئے ہیں اس کے لیے ہر ہر اسٹال کا فوٹو بھی لیا گیا ہے۔

ہر ہر صناع کی مشکلات اور دقتوں نیز ان کے مال کی نکاسی وغیرہ سے متعلق تفصیلات کی فراہمی کے لیے مرزا عبدالباسط بیگ صاحب سیول سروس کلاس نے ایک سوال نامہ بھی مرتب کیا تھا اور مسرت کا مقام ہے کہ باوجود نمائش کی مصروفیت کے ہر ہر صناع نے اس کے جوابات دیے ہیں ان سب کو مرتب کیا جارہا ہے تاکہ ان پر مناسب کارروائی ہوسکے۔

ان سب کے سوا صناعوں کی اور نیز کارکنانِ نمائش اور عہدہ دارانِ محکمۂ صنعت و حرفت کی ایک کانفرنس بھی بہ تاریخ ۱۸ر آذر ۱۳۴۸ف شام میں اندرون احاطہ نمائش گاہ زیر صدارت میر محمود علی صاحب صدر معاشی کمیٹی منعقد کی گئی اور اس میں جتنی بھی تقاریر کی گئیں ان میں اس امر پر اتفاق رائے رہا کہ صناعوں اور کاری گروں کا کسی مرکزی ادارے سے متعلق رہنا مناسب ہے تاکہ اجتماعی طور پر ان کی مشکلات کا اظہار ہو اور نیز علمی تحقیق کی رو سے ان کی صنعت کی ترقی کے وسایل فراہم ہوں اور اس غرض کے لیے معاشی کمیٹی کو موزوں قرار دیا گیا چنانچہ کئی اصحاب معاشی کمیٹی میں شریک ہوچکے ہیں۔

اس جلسے کا مقصد ملکی صنعتی ترقی میں جو رکاوٹیں حایل ہیں انھیں معلوم کرکے مناسب تجاویز پر غور کرنا تھا۔ جلسے کی کارروائی کا آغاز محمد فاروق صاحب پچ سی یس کی تقریر سے ہوا موصوف نے نمائش کے انعقاد کی ضرورت اس کی اہمیت اور کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں امیر علی خاں صاحب مارکٹنگ آفیسر سرکار عالی نے ایک مختصر اور جامع تقریر کی۔ صاحب موصوف نے کہا کہ سرکار عالی ہمیشہ صنعتوں کی امداد کے لیے آمادہ رہتی ہے، ضرورت ہے کہ عوام بھی اس طرف متوجہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اضلاع کے صناعوں کے لیے ایک مرکزیت کی ضرورت ہے، اور خواہش ظاہر کی کہ جملہ صناع معاشی کمیٹی کے رکن ہوجائیں

خواجہ حمید احمد صاحب بی اے نے معاشی کمیٹی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے درخواست کی کہ صناع جامعہ عثمانیہ کے طلبا کو تحقیقات کا موقع دیں اور معاشی پیمایش (سروے) میں ان کی اعانت کریں۔ اس کے بعد تجمل حسین صاحب یم یس سی مالک کارخانہ کلے ورکس نے معاشی کمیٹی کی جد وجہد کی ستایش کرتے ہوئے ملک کی عام حالت کا ذکر کیا اور ہر طرح کمیٹی کی مدد پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ جناب غلام غفار صاحب نے کہا کہ نمایش سے صناعوں کا فایدہ ہوتا ہے۔ موصوف نے بیان کیا کہ بیدری صنعت کی بہتری کے سلسلے میں بعض کام کی باتیں انھیں اس نمایش میں مل گئیں۔ اس کے بعد ممتاز الدین صاحب نمایندہ امیر سوپ فیاکٹری نے اپنے کارخانے کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۴۶ صناعوں کے لیے اس نمایش کی یہ دولت مبارک و مسعود ثابت ہوا۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے صناعوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انعقاد نمایش کے سلسلے میں صناعوں اور کارخانہ داروں کو جو زحمت ہوئی اس کا مقصد یہ تھا کہ آیندہ ان صنعتوں کی بہتری کے لیے کوئی تدبیر ہو سکے۔

خواتین کے اصرار پر نہایت تامل کے بعد جمعہ ۱۶ ر آذر کو پردہ دن رکھا گیا تھا جس دن اندرون حدود نمایش گاہ تمام انتظامات بالکلیہ خواتین ہی کے ذمے تھے مسرت اور اطمینان کی بات ہے کہ یہ دن خیر وخوبی کے ساتھ گزرا۔ باوجودیکہ خواتین ہزاروں کی تعداد میں نمایش دیکھنے آئی تھیں خواتین رضاکاروں کے حسنِ انتظام کی وجہ سے کوئی حادثہ پیش نہ آیا، اور نو بجے سے قبل ہی تمام اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔ بیگم مہدی نواز جنگ کی سرکردگی میں خواتین رضاکاروں نے ٹکٹ فروشی تنقیح ٹکٹ، اسٹالوں کی نگرانی و فروخت اشیاء و تفریحات کا جس حسن و خوبی کے ساتھ انتظام فرمایا وہ بہت قابلِ قدر و لایقِ ستایش تھا اور شاید ان کے اشتراکِ عمل اور احساسِ تعاون کی عدم موجودگی میں نمایش ہرگز کامیاب نہ ہو سکتی۔

نمایش میں ٹکٹوں کی فروخت و تنقیح وغیرہ مس پلومن مس نندی مس بہروچہ سے متعلق تھی جنھوں نے اپنی گرل گائیڈز اور طالبات کی مدد سے قابلِ تعریف طریقے پر اپنے فرایض کو بلا رو رعایت انجام دیا۔ مس پلومن نے دفتر میں اپنے کام کو نہایت سلیقہ و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اسٹالوں کی نگرانی اور رفرشمنٹ کا انتظام مسز پلے کے ذمے تھا جسے انھوں نے اپنی رضاکار خواتین کے ساتھ بہ حسن و خوبی پورا کیا۔ سینما، کشتی رانی و دیگر تفریحات کا انتظام مسز دادابھائی اور ان کی رضاکار خواتین کے سپرد تھا جس عمدگی کے ساتھ وہ اپنے نازک فرائض سے سبک دوش ہوئی ہیں وہ نہایت لایقِ ستایش تھا۔ اس تمام

انتظام میں گرل گائیڈز اور طالبات کلیۂ اناث کے علاوہ دوسری خواتین نے رضاکارانہ خدمات انجام دے کر اپنے احساسِ شہریت کا ثبوت دیا ہے جن خواتین کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ مسز حسین علی خاں مسز آمنہ پوپ۔ مسز فاروق۔ مسز ڈاکٹر مقبول علی مس مہدی یار جنگ اور مس حیدر علی خاں اور مسز پلوسن سے بھی انتظام میں بڑی مدد ملی بیگم مہدی نواز جنگ نے جس دلچسپی، انہماک۔ ایثار اور حسنِ انتظام کا ثبوت دیا ہے اس سے خواتینِ دکن کا مستقبل نہایت خوش آیند نظر آتا ہے۔

۱۸ر آذر ۱۳۴۷ف کو نمائش بخیر و خوبی ختم ہوئی۔ افتتاح رایٹ آنربیل سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر کے ہاتھوں ہوا تو ختم ہونے والی رات ہز ہائینس والا شان شہزادۂ برار و ہز ہائینس شہزادی برار کی رونق افروزی یادگار رہی اس روز شب میں نواب علی یاور جنگ معتمد امور دستوری نے پروفیسر اسد انصاری اور ان کے ساتھیوں اور بعض رضاکاروں کو انعامات تقسیم کیے۔

دوسرے روز صبح میں مظاہرہ کنندگان کی طرف سے کارکنانِ نمائش کو چاء نوشی پر مدعو کیا گیا تھا اور اس موقع کی مناسبت سے نواب رئیس جنگ بہادر معتمد صنعت و حرفت کو عطائے اسناد کے لیے زحمت دی گئی تھی مظاہرہ کنندگان کی طرف سے کارکنانِ نمائش کا شکریہ ہو چکنے کے بعد نواب اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے ان کی تشریف آوری کے لیے نواب رئیس جنگ بہادر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے عطائے اسناد کی خواہش کی اور نواب صاحب نے اسناد تقسیم کرنے کے بعد اپنے تاثرات کا مختصر طور پر اظہار فرمایا کہ نمائش بہت ہی کامیاب رہی ہے اور اس کا مقابلہ بہت اچھی طرح سے لکھنؤ۔ لاہور کی نمائشوں سے کیا جا سکتا تھا، اور یہ توقع کی کہ ہر سال معاشی کمیٹی نمائش کا انعقاد کیا کرے گی۔

آخر میں ایک گروپ فوٹو بھی کارکنانِ نمائش اور مظاہرہ کنندگان کا لیا گیا۔ اختتام پر نمائش کے متعلق بعض حضرات کی رائے قابلِ ذکر ہے:۔

۱۔ اپنی نوعیت کی کامیاب نمائش	ہز اکسلنسی سر صدر اعظم بہادر سرکارِ عالی
۲۔ ایسی ہی کوششیں ملک کی ترقی کے لیے کرنی چاہئیں۔	حضرتہ شہزادی درشہوار بیگم صاحبہ
۳۔ آپ نوجوانوں سے ہی ملک کی ترقی کی توقع ہو سکتی ہے۔	ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر

۴۔ نمائش کا ہر شعبہ قابلِ تعریف ہے، دعا کرتی ہوں کہ یہ ترقی عروج پر رہے۔	مسز خدیجہ شفیع طیب جی
۵۔ بہت اچھا مظاہرہ۔	نواب سر عقیل جنگ بہادر
۶۔ نہایت کامیاب کوشش	مسٹر گرافٹن صدر المہام مال و پولیس
۷۔ نمائش بلاشبہ کامیاب رہی لیکن اس کے بعد کا کام اور زیادہ اہم ہے۔	نواب ناظر یار جنگ بہادر
۸۔ توقع سے زیادہ نمائش کامیاب رہی۔	نواب مہدی نواز جنگ بہادر
۹۔ نمائش بہ آسانی لکھنؤ و لاہور کی آل انڈیا نمائش کا مقابلہ کرسکتی ہے۔	نواب زین یار جنگ بہادر
۱۰۔ نمائش کی بدولت بعض صنعتوں کے وجود کا پہلی مرتبہ علم ہوا۔	مولوی سید فضل اللہ صاحب ناظم امداد باہمی
۱۱۔ گذشتہ پندرہ سال میں ملک نے جو صنعتی ترقی کی ہے اس کا مکمل مظاہرہ۔	مولوی محمد بیگ صاحب اول تعلقدار باغات
۱۲۔ جامعہ عثمانیہ کے طلباء کی زندگی کا بہترین ثبوت۔	پروفیسر الیاس برنی ناظم دارالترجمہ
۱۳۔ سرکار عالی اور رعایا برایا کے تعاون عمل اور اشتراک کا بدرجہ تمم مفید ثمرہ۔	نواب میر اکبر علی خاں بارایٹ لا
۱۴۔ حیدرآباد کے نوجوانوں نے اپنی کوشش و محنت سے بہت اچھی نمائش کی۔	صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ

اسی طرح پر نمائش کا کامیاب انعقاد بلاشبہ اس کا اظہار ہے کہ ملک بہ وجہ اتم اس کے لیے آمادہ تھا۔ محکمہ ہائے سرکاری کا خاطر خواہ تعاون نمائش کی کامیابی کا دوسرا سبب ہے کہ جس کے لیے نواب میر اکبر علی خاں بیرسٹرایٹ لا اور مولوی سید محمد محی الدین صاحب ناظم سررشتۂ صنعت و حرفت کی سرگرم اور موفور مساعی قابلِ تشکر ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ اظہار ہے کہ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے نمائش کو ایک ہزار روپئے کی گراں قدر امداد ملی جو معاشی کمیٹی کے

کاروبار میں قابلِ اطمینان سرگرمی پیدا کرنے کا باعث ہوا۔

ان دو اسباب سے قطع نظر کارکنانِ نمائش کا رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو شبانہ روز نمائش کے لیے اس طرح وقف کردینا بھی کہ نہ گھر بار کی فکر تھی نہ ہی کھانے پینے کی سدھ رہی تھی، نمائش کی کامیابی کا ذمہ دار رہا۔

---

(۱) محمد عبدالرحیم بی اے (عثمانیہ) معتمد (۲) شنکرجی بی اے (عثمانیہ) معتمد نمائش (۳) محمد شرف الدین بی اے عثمانیہ معتمد معاشی کمیٹی حیدرآباد

۸۶

مرکز مصنوعات ملکی معاشی کمیٹی حیدرآباد امداد باہمی محدود

معاشی کمیٹی کے زیر اہتمام مرکز مصنوعات ملکی کا قیام عمل میں آیا ہے اور انجمن ہائے امداد باہمی سرکار عالی کے تحت اس کی رجسٹری کرائی گئی ہے۔

اس کے مقاصد حسب ذیل ہیں:-

(۱) اراکین ادارہ ہذا کو باہمی اتفاق و اتحاد سے کام کرنے کا عادی بنانا (۲) معاشی کمیٹی حیدرآباد کے قیام کے اغراض کو عملی جامہ پہنانا۔ (۳) ملکی مصنوعات کو ترقی دینا اور ان کی مانگ اندرون و بیرونِ ملک پیدا کرنا (۴) دکان ملکی مصنوعات معظم جاہی مارکٹ کے انتظامی و مالی امور کو اپنے ذمے لینا اور انجام دینا (۵) صناعوں کی امداد کے لیے اتحادی اصول پر بنک کا قیام (۶) ایسے معاشی ادب (لٹریچر) کا شایع کرنا جس سے ملک کے قدرتی وسایل کا علم ہوسکے اور ان سے استفادہ اور ان کا وسیع استعمال (۷) باشندگانِ ملک کو مصنوعات ملکی کے استعمال کی ترغیب دلانا، اور ارکانِ ادارہ کو حتی الوسع اس کے استعمال پر پابند کرنا۔

ہر وہ شخص جو معاشی کمیٹی کا رکن ہو ادارۂ ہذا کا حصہ دار ہوسکے گا۔

ادارۂ ہذا کا سرمایہ ۲۵ ہزار روپیہ سکہ عثمانیہ کا (۲۵۰۰) حصص پر مشتمل ہے۔ فی حصہ دس روپیہ سکہ عثمانیہ کا ہے۔

تفصیلی قواعد اور حصص کے فارم معظم جاہی مارکٹ (دکان نمبر ۸) یا دفتر معاشی کمیٹی عابد روڈ سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔

ششماہی رپورٹ انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن

آذر تا اردی بہشت سنہ ۱۳۴۸ف

"انجمن طیلسانین عثمانیہ نے اپنی جدوجہد کے اور چھ ماہ کامیابی کے ساتھ ختم کرلیے ہیں، ان چھ مہینوں میں جو کام انجام دیا گیا ہے اس کی مختصر روئیداد پیش کی جاتی ہے۔"

کابینہ کی تشکیل میں اس مدت کے دوران میں کوئی تغیر عمل میں نہیں آیا، اس کی تشکیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی	صدر	۷۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب جاگیردار	رکن
۲۔ مولوی سید محمد احسن صاحب	نایب صدر	۸۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر	״
۳۔ مولوی محمد غوث صاحب	معتمد	۹۔ رائے مہندر راج صاحب سکسینہ	״
۴۔ رائے شنکرجی صاحب بی اے	نایب معتمد	۱۰۔ صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب	״
۵۔ مولوی محمد علی صاحب یم اے	خازن	۱۱۔ راجہ رائے گردداس صاحب جاگیردار	״
۶۔ مولوی محمد عبدالمجید صاحب صدیقی	رکن	۱۲۔ رائے شنکر موہن لال صاحب ماتھر	״

اس ششماہی میں کابینہ کے (۹) اجلاس ہوئے اور اس نے (۶۵) اُمور پر غور کیا۔ حسب سابق انجمن کے کاروبار کو دو بڑی نوعیتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ اُمور جن کے متعلق خود انجمن کی جانب سے عملی طور پر کام کیا جاتا ہے، اور دوسرے وہ اُمور جن کے متعلق انجمن سرکار عالی اور دوسرے عام اداروں کو مفاد ملک کے مسایل میں توجہ دلانے کا فرض انجام دیتی ہے۔

انجمن کا اندرونی کام مستقل طور سے چند ملحقہ جماعتوں میں تقسیم کردینے کا تجربہ اب عملاً بہت کامیاب ہوچکا ہے

اس قسم کی ملحقہ جماعتوں میں مجلس علمیہ عثمانیہ بلدی جماعت اور معاشی کمیٹی مستقل طور سے موجود اور اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

عثمانیہ بلدی جماعت | عثمانیہ بلدی جماعت کی مجلس عاملہ کی تشکیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ مولوی غلام مصطفےٰ صاحب مددگار باب حکومت صدر
۲۔ مولوی محمد کرامت علی صاحب بی اے معتمد
۳۔ مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب یم اے شریک معتمد
۴۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی رکن
۵۔ پنڈت پریم جی لال جی صاحب رکن
۶۔ پنڈت گنڈے راؤ صاحب بی اے۔ ال ال بی۔ رکن
۷۔ مولوی غلام محمد خاں صاحب یم اے۔ رکن
۸۔ پنڈت سوامی نایک صاحب بی اے۔ رکن
۹۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب یم اے۔ ال ال بی۔ رکن
۱۰۔ رائے مدن موہن لال صاحب بی اے۔ ال ال بی رکن
۱۱۔ مولوی محمد غوث صاحب یم اے۔ ال ال بی۔ رکن
۱۲۔ مولوی ابو الخیر صاحب صدیقی بی یس سی۔ رکن
۱۳۔ صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی۔ رکن
۱۴۔ نواب خواجہ سردار اللہ خاں صاحب جاگیردار۔ رکن
۱۵۔ مولوی سمیع احمد صاحب رکن
۱۶۔ راجہ رائے گردداس صاحب بی اے۔ ال ال بی جاگیردار۔ رکن
۱۷۔ حکیم دوارکا پرشاد صاحب جاگیردار۔ رکن
۱۸۔ مولوی میر محمد علی خاں صاحب منصب دار۔ رکن

عثمانیہ بلدی جماعت کی جانب سے بلدیہ میں جو ارکان موجود ہیں وہ بلدی سود و بہبود کے کاروبار میں پوری سرگرمی سے منہمک ہیں۔ جماعت کی مجلس عاملہ نے طے کیا ہے کہ بلدیہ کے کام کے سلسلے میں جماعت کے ارکان

بلدیہ سے یکجہتی اور نظم کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہو، اس غرض سے مجلس عاملہ نے یہ طے کیا ہے کہ بجز ان مسایل کے جن کے متعلق مجلسِ عاملہ عثمانیہ بلدی جماعت خود تصفیہ کرے دیگر تمام مسایل متعلقہ بلدیہ کا تصفیہ مجلس بلدیہ کے ان ارکان کی کمیٹی کرے گی جو جماعت ہذا کے رکن ہوں، اس کمیٹی کے تصفیہ کے وہ تمام ارکان بلدیہ پابند ہوں گے جو جماعت ہذا کے رکن ہیں مولوی غلام محمد خاں صاحب یم اے رکن مجلس بلدیہ اس کے معتمد قرار دیے گئے ہیں۔ اس جدید انتظام سے زیادہ بہتر نتایج پیدا ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مجلس عاملہ نے طے کیا ہے کہ بلدیہ کے اندر اراکین عثمانیہ بلدی جماعت میں ڈسپلن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ قواعد مدون کیے جائیں اس غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے جو توقع ہے کہ جلد اپنا کام ختم کر دے گی۔

سالِ حال بھی ایک بلدی کانفرنس زیرِ صدارت نواب مرزا یار جنگ بہادر بہ مقام باغ عامہ منعقد ہوئی۔

معاشی کمیٹی | معاشی کمیٹی نے اپنے اہتمام سے مصنوعات ملکی کی نمایش منعقد کی، ارکان کمیٹی دیگر ارباب کار اور رضا کاران نے جس سرگرمی محنت اور ایثار کا ثبوت دیا ہے آیندہ کے لیے بہت ہمت افزا اور ایک فالِ نیک ہے۔ اس نمایش سے ثابت ہو گیا ہے کہ طیلسانی برادری میں عمل کی کیسی کیسی قوتیں پنہاں ہیں۔ یہ کہ استقلال اور اخلاص عمل کے لیے کامیابی کے ابھی بہت سارے میدان موجود ہیں کمیٹی نے مصنوعاتِ ملکی کی نکاسی کے مواقع پیدا کرنے اور صناعوں کی سہولت کے مدِ نظر ایک دُکان معظم جاہی مارکٹ میں کھولی ہے۔ قانون انجمن ہائے امداد باہمی کے تحت اس کو بہ طور ایک علحدہ ادارہ کے رجسٹر کیا جا رہا ہے ہرچند ابھی اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے لیکن توقع ہے کہ بہت جلد کام کا ایک مضبوط سلسلہ قایم ہو جائے گا۔

معاشی کمیٹی کی مجلس عاملہ کی تشکیل حسب ذیل ہے :-

۱۔ مولوی میر محمود علی صاحب ام اے۔ صدر
۲۔ مولوی محمد شرف الدین صاحب بی اے۔ معتمد
۳۔ مولوی محمد علی خاں صاحب بی اے۔ شریک معتمد
۴۔ مولوی محمد فاروق صاحب ایچ سی ایس۔ رکن
۵۔ مولوی محمد علی صاحب یم اے۔ رکن

۶۔ مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے۔ رکن

۷۔ مولوی محمد غوث صاحب یم اے۔ ال ال بی۔ رکن

۸۔ مسٹر نرسنگ راؤ اڈیٹر رعیت۔ رکن

۹۔ رائے شنکر جی صاحب بی اے۔ ال ال بی۔ رکن

۱۰۔ رائے مہندر راج صاحب یم یس سی۔ رکن

۱۱۔ مولوی سید محمد احسن صاحب بی اے۔ ال ال بی۔ رکن

مجلس علمیہ | کابینہ نے طے کیا ہے کہ مجلس علمیہ کے لیے بھی علٰحدہ قواعد مرتب ہوں اور اس کے کام کو بھی انجمن کے ایک مستقل شعبے کے طور پر چلایا جائے، اب تک مجلہ طیلسائنین اس مجلس کے اہتمام میں شایع ہوتا تھا چنانچہ اب تک اس کی دو جلدیں شایع ہو چکی ہیں جن کے ذریعے یم اے کے امتحان کے لیے لکھے ہوئے تین مقالے مجلس علمیہ نے شایع کر دیے۔

انجمن طلبائے قدیم | انجمن کی کابینہ نے انجمن سے ملحق ایک انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی، اس کی جانب سے قواعد کا جو مسودہ پیش ہوا، اس کو جلسۂ عام میں پیش کیا جا رہا ہے۔

قرارداد | کابینہ نے ملک کے موجودہ حالات کے مدنظر ایک قرارداد بھی منظور کی جو حسب ذیل ہے:۔

"انجمن طیلسائنین عثمانیہ خانوادۂ آصفیہ کے زیر سایۂ عاطفت ملک کی دستوری اصلاح و ترقی میں یقین رکھتی ہے، لیکن جو غیر دستوری طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں اُن کو ناپسند کرتی ہے۔ انجمن ان دہشت ناک واقعات کو جو چند روز سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں نہایت شرم ناک تصور کرتی ہے اور اہل ملک و حکومت سے مستدعی ہے کہ ان دہشت ناک امور کے کامل طور سے دفع کرنے کے ممکنہ تدابیر اختیار کیے جائیں تاکہ ملک میں امن و سکون قایم رہے جو ہر قسم کی ترقی کے لیے شرط ابتدائی ہے۔"

زبان سرکاری | کابینہ نے ایک تحریک پر غور کیا کہ دفاتر سرکاری میں زبان سرکاری کے استعمال میں بہت غفلت برتی جاتی ہے، یہ امر مناسب معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں کافی جد و جہد کی جائے اس غرض سے کہ اس سلسلے میں مواد فراہم کیا جائے اور جد و جہد کی نوعیت تعین کی جائے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے، اس نے جو رپورٹ پیش کی ہے

وہ یہ ہے کہ زبان کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے اس بارے میں کافی جد وجہد کرنی چاہیئے حسب ذیل اُمور طے کیے گئے۔

۱۔ زبان سرکاری کے متعلق احکام جمع کیے جائیں۔

۲۔ اس امر کی نسبت تا بہ حد امکان مواد فراہم کیا جائے کہ کن دفاتر میں انگریزی زبان مستعمل ہے۔

۳۔ حکومت کو توجہ دلائی جائے کہ آیندہ مردم شماری کے موقعے پر نخۃ جات اعداد شمار میں اُردو بولنے والوں کے تعداد کی صراحت کی جانی ضروری ہے۔

۴۔ حکومت کو توجہ دلائی جائے کہ سیول سروس جماعت کے جملہ پرچہ جات بہ استثنائے پرچہ جات انگریزی و ترجمہ زبان اُردو میں مرتب ہوا کرے اور منجملہ تین سوالات زبانی کے دو سوالات اُردو میں کیے جائیں۔ زبان انگریزی کو قطعاً ذریعہ تعلیم نہ بنایا جائے۔

۵۔ زبان کی پرچار کے سلسلے میں معتمدین سرکار عالی و معتمد باب حکومت کے پاس وفود بھیجے جائیں۔

۶۔ اعلیحضرت، اور صدر اعظم بہادر کے پاس رعایا کی جانب سے محضر روانہ کیے جائیں۔

۷۔ صدر المہام بہادر فینانس کو زبان اُردو کی نسبت توجہ دلائی جائے۔

۸۔ مدیران جراید کے پاس وفود روانہ کیے جائیں۔

۹۔ اخبارات میں اطلاعات و مقالات مسلسل روانہ کیے جائیں۔

کابینہ نے یہ سفارشات منظور کر لیے ہیں اور ذیلی کمیٹی ان کو روبہ عمل لانے میں مصروف ہے۔

کانفرنس | ۱۳۴۳ف کی کانفرنس طیلسانئین عثمانیہ بہت کامیاب ثابت ہوئی، گو ڈرامے کے متعلق توقعات پورے نہیں ہوئے، لیکن بحیثیت عمومی کانفرنس نے اچھا اثر قایم کیا ہے۔ کابینہ نے قرار دیا ہے کہ آیندہ کانفرنس طیلسانئین عثمانیہ اورنگ آباد میں منعقد کی جائے، چنانچہ وہاں اس کے لیے کام ہو رہا ہے، توقع ہے کہ کانفرنس بہت کامیاب ثابت ہوگی۔

کتب خانہ | انجمن کے کتب خانے میں سرکاری مطبوعات کا کافی اضافہ ہو رہا ہے کابینہ نے مناسب متصور کیا کہ کتابوں سے استفادہ کے لیے قواعد مرتب کئے جائیں، چنانچہ یہ قواعد بعد ترتیب منظور ہو چکے ہیں کتب خانے کا انتظام صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب کے سپرد کیا گیا ہے۔

انجمن کے لیے کو پریٹو انشورنش سوسائٹی کی ایجنسی حاصل کی گئی ہے، چنانچہ محمد کلیم الدین صاحب انصاری۔ افضل علی صاحب۔ شیخ حسین محرر انجمن۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب صدر انجمن نے انجمن کے توسط سے بیمہ کرایا ہے

محسوس ہوئی ہے کہ اس کام کو خوب پھیلایا جائے کہ اس سے انجمن کو آمدنی حاصل ہوتی ہے چنانچہ اس کے کاروبار جناب رائے شنکرجی صاحب بی اے ال ال بی کے سپرد کیے گئے ہیں۔

متفرق | اس ششماہی میں جدید (۱۳) ارکان نے شرکت کی اور اب انجمن کے جملہ ارکان کی تعداد (۲۰۵) ہے سال حال ایک رکن دوامی کا اضافہ ہوا ہے جناب صدر صاحب انجمن ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے جن کے ساتھ کام کرنے میں حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے اور جو اپنی سرگرمیوں اور انجمن کے کاروبار میں انہماک سے طیلسانی برادری کے لیے ایک مثال قایم کر رہے ہیں سب سے اول (صہ) روپیے عنایت فرمائے اور رکنیت دوامی قبول فرمائی ہے۔

حسابات کی تنقیح کے لیے کابینہ نے مولوی ذکی الدین صاحب صدیقی بی اے کو مقرر کیا ہے، موصوف تنقیح میں مصروف ہیں۔

کابینہ نے سال حال دفتر کے انتظام کو بدل دیا ہے، جز وقتی اہلکار برخواست کردیے گئے ہیں اور ایک ہمہ وقتی محرر مقرر کرلیا گیا ہے اور نیز ایک ہمہ وقتی ملازم مقرر کرنے کی گنجایش موجود ہے، توقع ہے کہ اس انتظام سے انجمن کے کاروبار میں مزید وسعت اور خوبی پیدا ہوگی اس عملہ سے معاشی کمیٹی اور عثمانیہ بلدی جماعت بھی اگر کام لینا چاہیں تو لے سکیں گے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ مذکورہ جماعتوں سے عملہ کے مد میں رقمی امداد بھی حاصل ہوسکے۔ کابینہ نے بہتر کارکردگی کے مدنظر ملازموں کی رخصت کے متعلق مستقل قواعد منظور کیے ہیں تاکہ کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوسکے۔ دفتر کے لیے ایک ٹایپ رائٹر کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

کابینہ نے کام کے بہ عجلت انجام پانے کے مدنظر مدات صادر طباعت ٹکٹ ٹپہ کے اندر خرچ کرنے کا اختیار معتمد کے سپرد کردیا ہے۔

سرکار میں جو تحریکات زیر دوران ہیں ان کے متعلق مراسلت جاری ہے سال حال جامعہ عثمانیہ نے بیرسٹری کی ڈگری کے قواعد منظور کرلیے ہیں جس کے متعلق کانفرنس میں تحریک منظور ہوئی تھی طیلسانئین جامعہ عثمانیہ کو مجلس رفقاء میں راست حقِ انتخاب ملنے کے لیے عرصے سے کارروائی جاری ہے اب اطلاع ملی ہے کہ جامعہ کے لیے جدید دستور زیر منظوری ہے اس کی تکمیل پر یہ حق حاصل ہوسکے گا۔

دفاتر سرکاری میں ابتدائی گریڈ پر طیلسانئین کے تقرر کی صورت میں زاید ابتدائی یافت جو مقرر کی گئی ہے اس میں مزید توسیع عمل میں لانے کی نسبت کارروائی جاری ہے۔

انجمن طیلسانئین عثمانیہ ہمارے قابلِ فخر جامعہ کے فرزندوں کو ایک جا جمع کرنے کی مبارک سعی میں مصروف ہے۔ . . . . فرزندانِ جامعہ کو اپنی اس انجمن کے ذریعے ایک جگہ جمع ہو کر ملک کی ترقی اور ملک کی خدمت کے مسایل سوچنے اور ان پر عمل کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔ . . . . . . گو آپ کی انجمن قایم ہوئے چند ہی سال ہوئے ہیں لیکن اس نے اب تک بہت کچھ ٹھوس تعمیری کام انجام دیا ہے۔ . . . . . آپ کی کانفرنس ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کی نمایندگی کرتی ہے جس سے ملک کو بڑی بڑی توقعات جائز طور پر وابستہ ہیں۔"

یہ وہ ہمت آفریں الفاظ ہیں جو عالی جناب نواب سرصدر اعظم بہادر نے طیلسانئین عثمانیہ کی چھٹی کانفرنس کا افتتاح فرماتے ہوئے ارشاد فرمائے۔ انجمن ابتدائے قیام سے جس طرح بھی بن آیا ملک کی ترقی کے لیے ہمہ تن کوشاں اور طیلسانئین کی برادری میں جذبۂ خدمت پیدا کرنے میں مصروفِ عمل ہے۔ اور اب یہ کہنا خود ستائی نہیں ہے کہ ملک کے عام قومی اداروں کی صف میں انجمن کے لیے مناسب جگہ حاصل ہو گئی ہے لیکن باوجود اس کے یہ بھی کہنا ایک حقیقت ہے کہ ابھی بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ آج دنیا کے ہر حصے میں ایک برق آسا سرگرمی نمایاں ہے۔ قومیں ترقی کے منازل اس سرعت سے طے کر رہی ہیں کہ پیش روی کی ساری روئیدادیں افسانہ ہوتی جا رہی ہیں جیدرآباد میں کام کرنے اور اس سے اچھے نتایج حاصل کرنے کے بیسوں مواقع حاصل ہیں۔ کامیابی کی بڑی بڑی وسعتیں نظر کے سامنے موجود ہیں ضرورت ہے کہ طیلسانی برادری اپنی توجہ بڑھائے اور دام اور قدم کی اعانت میں ذرا تیزروی دکھائے ع

"کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں"

سالِ حال یہ اندیشہ ہے کہ مثل سال ہائے گذشتہ انجمن کا مالیہ متوازن نہ رہے گا کیا ایک متعدد امور کی انجام دہی پیشِ نظر ہے۔ سالِ حال اگر انجمن کی برادری صرف اپنا سالانہ چندہ اور گذشتہ بقایا ادا فرمائے تو انجمن کی ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ نیز یہ کہ ہر رکن انجمن صرف مزید ایک رکن کے اضافے کی کوشش عمل میں لائے۔

خاتمہ: انجمن کے کاروبار کے چھ ماہ کی یہ ایک مختصر روئیداد ہے۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں دفتری طور سے جو کام انجام پایا ہے اور جو مراسلت ہوئی ہے اور رکابینہ نے کئی گھنٹے جو کام کیا اس کی تفصیلات بہت طویل ہو جائیں گی۔

مختصر یہ ہے کہ کام کرنے اور اس سے اچھے نتایج حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع ہمیں حاصل ہے کامیابی کی بڑی بڑی وسعتیں اپنا دامن پھیلائے پڑی ہیں، ضرورت صرف یہ ہے کہ ہماری طیلسانی برادری اپنی توجہ بڑھائے اور درم وقدم کی اعانت میں ذرا تیزی بتائے۔

محمد غوث معتمد انجمن

رپورٹ عثمانیہ بلدی جماعت

بابتہ ۱۳۴۷ف

عثمانیہ بلدی جماعت انجمن طیلسانئین عثمانیہ حیدر آباد دکن کا ایک ملحقہ نظام ہے جس نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز موجودہ قانونِ بلدیہ کے نفاذ سے قبل ہی سے کر دیا تھا۔ قانونِ بلدیہ کے نفاذ سے دکن میں پہلی بار عام انتخابات کے اصول پر ارکان منتخب کیے جانے لگے۔

عثمانیہ بلدی جماعت کی ابتدا، آواخر سال ۱۳۴۳ف میں ہوئی! اس جماعت کے ابتدا ہی سے یہ اساسی اصول پیش نظر تھا کہ جماعت بندی کے اصول پر کام کیا جائے! اس جماعت نے اپنے اغراض و مقاصد حسب ذیل قرار دیے:۔

الف۔ جو رقبہ حدود بلدیہ حیدر آباد میں شامل ہے اس کی بہبودی کی ہر ممکن کوشش کرنا۔

ب۔ اس رقبے کے حفظان صحت کے لیے ہر قسم کی ممکنہ جد و جہد کرنا۔

ج۔ اس امر کی کوشش کرنا کہ بلدیے کا مالیہ مستحکم ہو، اور غیر ضروری محاصل کا بار عاید نہ ہو۔

د۔ حتی الامکان بلدہ فرخندہ بنیاد کی صفائی، آب رسانی۔ روشنی۔ ڈرینج اور محلوں اور سڑکوں کی ترتیب تنظیم اور اسی قسم کے دوسرے بلدی معاملات میں حیدر آباد کو اعلیٰ ترین معیار پر لانے کی کوشش کرنا۔

ھ۔ حیدر آباد کے شہریوں میں اپنے بلدی حقوق اور ذمہ داریوں کا صحیح احساس و شعور پیدا کرنا۔

و۔ بلدی انتخابات میں حصہ لینا۔

حیدر آبادی پبلک خصوصاً نوجوانانِ ملک میں بلدی فرائض کا احساس جس سرعت سے ترقی پذیر رفتار پر ہے یہ ملک کے لیے ایک خوش آیند فال ہے۔ آج سے چند سال قبل بلدی امور سے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہ کیا جاتا تھا مگر

آج حالات کی رفتار جداگانہ ہے۔ ملک میں ایک عام بیداری کی روح موجزن ہے۔ بلدی امور اور بلدی معاملات سے پبلک کو ایک خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اور یقیناً عثمانیہ بلدی جماعت کی کوششوں کا نتیجہ ہے عثمانیہ بلدی جماعت ہی حیدرآباد دکن کا وہ واحد ادارہ ہے جو شہریوں کی خدمت گزاری اور شہریوں میں اپنے بلدی حقوق اور ذمہ داریوں کا صحیح احساس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ موقع نہیں ہے کہ اس کی ساری بلدی کارگزاریوں کی تفصیل بیان کی جائے، لیکن مختصراً کارگزاریوں کی رپورٹ حسب ذیل ہے:۔

عثمانیہ بلدی کانفرنس بابتہ ۱۳۴۷ف

عثمانیہ بلدی جماعت کی دوسری سالانہ کانفرنس بہ صدارت عالی جناب راجہ بہادر بشیشر ناتھ صاحب رکن عدالت عالیہ بہ مقام ریڈی ودیالہ ہاسٹل بتواریخ ۲۸، ۲۹، ۳۰ آذر ۱۳۴۷ف منعقد ہوئی۔ کانفرنس ہال پبلک اور مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ارکانِ بلدیہ اور دیگر ممتاز اصحاب نے شرکت کی جناب راجہ گرو داس صاحب بی اے ال ال بی (عثمانیہ) صدر استقبالیہ نے اپنا خطبہ سنایا اور حاضرین کا خیر مقدم کیا۔

خطبۂ صدارت کے اختتام پر تحریک اظہارِ عقیدت بالاتفاق کھڑے ہو کر منظور کی گئی، اس کے بعد رایٹ آنریبل عالی جناب نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم باب حکومت۔ ہز اکسلنسی عالی جناب مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین سلطنت۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ) بار ایٹ لا مسٹر رنگا ریڈی صاحب رکن مجلس وضع قوانین۔ مولوی کلیم الدین صاحب انصاری بی اے ال ال بی صدر انجمن طیلسانئین عثمانیہ مسٹر پی ین گپتا صاحب کے بیانات پڑھ کر سنائے کے بعد مولوی عبد الحلیم بیگ صاحب معتمد عثمانیہ بلدی جماعت نے اپنی مطبوعہ دلچسپ رپورٹ عثمانیہ بلدی جماعت کی کارگزاریوں کی نسبت سامعین کے گوش گذار کی۔

رپورٹ کے ختم ہونے پر مولوی محمد فاروق صاحب بی اے (عثمانیہ) ہچ سی یس مددگار ناظم بلدیہ نے "بلدیہ اور سالِ رواں" پر ایک تقریر کی جس میں موجودہ ناظم صاحب بلدیہ کے حُسنِ انتظام کا ذکر کیا گیا اور مختلف اسکیمیں جو اس وقت بلدیے کے زیرِ غور ہیں ان پر کافی روشنی ڈالی۔

اس تقریر کے اختتام پر ڈاکٹر مرزا حسن بیگ صاحب مددگار پبلک آفیسر بلدہ نے بہ ذریعہ طلسمی فانوس تقریر کی، اس کے بعد پہلا اجلاس ختم ہوا۔

دوسرے دن یعنے ۲۹ آذر ۱۳۴۷ف کو مطاہرۂ جاروب کشی کوچہ گلباغ میں ہوا، اور (۸) بجے صبح سے کانفرنس کے دوسرے اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ چند تحریکات پیش ہوئیں اور ڈاکٹر مقبول علی صاحب بی اے (عثمانیہ)

سیول سرجن بلدہ نے فرسٹ امڈ پر اور مولوی عبدالغفار بیگ صاحب ڈنٹری سرجن نے غذا اور صحت عامہ پر اپنی پُر از معلومات تقاریر کیں۔ اس دوران میں نمایش سواری ہائے کرایہ وجانوران بھی انجام کو پہنچی۔

تیسرا اجلاس ۲۹ رتیر ۱۳۴۲ف کو شام کے پانچ بجے منعقد ہوا۔ بقیہ تحریکات پیش ہوئیں اور جناب پنڈت بی۔ ین چوبے صاحب بی اے۔ ال ال بی وکیل "بلدیہ اور بلدی جماعت" پر اور مولوی لئیق احمد صاحب نعمانی معتمد انجمن طلبہ طبیہ نے "طب یونانی" پر بسیط تقاریر کیں۔ اور ملیریا آفیسر صاحب نے میجک لنٹرن کے ذریعے مرض ملیریا کے متعلق حفظانی تدابیر اختیار کرنے کے لیے معلومات بہم پہنچائے۔

چوتھا اور آخری اجلاس تیسرے دن ۳۰ رتیر ۱۳۴۲ف کو شام میں (۴ ½) بجے شروع ہوا۔ نمایش اطفال اور فوٹو ہوئی۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر ناظم بلدیہ نے شہری اخلاق و فرائض وغیرہ پر، مولوی سید عسکری حسن صاحب اسیسر بلدیہ نے بلدی ٹکس پر، مولوی عبدالحلیم بیگ صاحب معتمد عثمانیہ بلدی جماعت نے کچھ ہمارے اور کچھ بلدیے کے فرائض پر، اور مسز ہمایوں مرزا صاحبہ نے صفائی پر تقاریر کیں۔

اس کے بعد طوطیٔ ہند مسز سروجنی نایڈو نے باوجود ناسازیٔ طبع کے بلدی امور سے متعلق اپنی شیریں زبان میں تقریر کی اور شہریوں کو بلدی اغراض و مقاصد اور ذمہ داریوں سے واقف کراتے ہوئے نصیحت دی۔

بعد اختتام تقریر مسز سروجنی نے انعامات تقسیم فرمائے۔ پس کانفرنس کا یہ آخری اجلاس صدر کی اختتامی تقریر اور معتمد کانفرنس کے شکریے کے بعد اختتام کو پہنچا۔

ضروری امور جو کانفرنس میں رکھے گئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

نمایش | نمایش مصنوعات بلدہ، آرایش بلدہ، مصنوعات محبس، محکمۂ برقی، کارخانہ بید بافی، ریاض اسلام فیاکٹری، کارخانۂ صندل، سگریٹ فیاکٹری، دکن بٹن فیاکٹری، دکن سن شیڈ کمپنی، مصنوعات کارخانہ پریم جی لال جی صاحب حیدرآباد ائرن اینڈ اسٹیل ورکس کمپنی، انٹرنیشنل ریڈیو کمپنی، سینیٹری انجینیرس وغیرہ۔

اس نمایش کی غرض وغایت یہ تھی کہ شہریوں کو حفظانِ صحت سے متعلق نہ صرف معلومات بہم پہنچائے جائیں بلکہ ان کی معاشی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ حفظانِ صحت سے متعلق نمایش کے ذریعے جہاں عوام کو کافی معلومات ہوئیں وہاں مصنوعات سے متعلق اداروں کو نہ صرف فایدہ ہوا بلکہ عوام بھی ایک خاص قسم کے خیالات ان صنعتوں کے متعلق اپنے ساتھ لے گئے۔

نمایش سواری ہائے کرایہ وجانوران | اس نمایش کی کامیابی کا انحصار محکمۂ بلدیہ پر ہے، اور کانفرنس نے

(۱۹) انعامات تقسیم کیے۔

نمائش اطفال | اس کے انتظامات جناب پنڈت پریم جی لال جی صاحب و جناب پنڈت شنکر جی صاحب بی اے کے سپرد تھے جس کو صاحبان موصوف نے اچھے پیمانے پر کیا۔ کانفرنس کی جانب سے بچوں کو (۱۱) انعامات کے علاوہ تَوال۔ صابون اور کھلونے بھی دیے گئے اور فوٹو بھی لی گئی۔

مظاہرۂ جاروب کشی | اس کانفرنس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ حیدر آباد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس تقریب کے موقع پر مظاہرۂ جاروب کشی ترتیب دیا گیا جس میں ارکان بلدیہ منجانب جماعت ہذا جناب ناظم صاحب بلدیہ اور ارکان عثمانیہ بلدی جماعت نے عملاً حصہ لیا جس کا عوام پر ایک اچھا اثر مترتب ہوا۔

ڈنر | دوسری نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس تقریب میں شہریوں کا ایک پُر تکلف ڈنر ترتیب دیا گیا جس میں ہندو مسلم دونوں اصحاب نے شرکت کی۔ اس ڈنر کی کامیابی کا سہرا مولوی غلام محمد خاں صاحب ایم اے رکن بلدیہ کے سر ہے۔

عثمانیہ بلدی جماعت اور ۱۳۴۸ف | ختم سال ۱۳۴۷ف پر انتخابات سال حال کے لیے ایک کاروباری جلسۂ عام بہ تاریخ ۳۰ر آبان ۱۳۴۷ف منعقد ہوا جس میں خفیہ رائے دہی کے ذریعے حسب ذیل مجلس عاملہ کی تشکیل عمل میں آئی۔

صدر۔ جناب مولوی غلام مصطفےٰ خاں صاحب مددگار رباب حکومت سرکار عالی و رکن بلدیہ

معتمد محمد کرامت علی صاحب بی اے (عثمانیہ)

شریک معتمد۔ جناب مولوی قدرت اللہ بیگ صاحب ایم اے (عثمانیہ)

ارکان جناب نواب میر اکبر علی خاں صاحب بی اے۔ بار اٹ لا۔ رکن بلدیہ

۲۔ جناب نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) رکن بلدیہ

۳۔ جناب پنڈت پریم جی لال جی صاحب۔ رکن بلدیہ

۴۔ جناب مولوی غلام محمد خاں صاحب یم اے (عثمانیہ) رکن بلدیہ

۵۔ جناب پنڈت گنڈے راؤ صاحب ہرو الکر بی اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) رکن بلدیہ

۶۔ جناب پنڈت سریدھر وامن نایک صاحب بار اٹ لا۔ رکن بلدیہ

۷۔ جناب صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

۸۔ جناب نواب خواجہ سردار اللہ خاں صاحب جاگیر دار

۹۔ جناب مولوی محمد غوث صاحب ایم اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

۱۰۔ جناب مولوی ابوالخیر صاحب صدیقی بی ایس سی (عثمانیہ)

۱۱۔ جناب مولوی عبدالسمیع احمد صاحب

۱۲۔ جناب رائے مدن موہن لال صاحب بی اے۔ ال ال بی وکیل ہائیکورٹ

۱۳۔ جناب مولوی میر محمود علی خاں صاحب میر محلہ اعزازی

۱۴۔ جناب حکیم رائے دوارکا پرشاد صاحب میر محلہ اعزازی

قواعد جماعت ہٰذا کے دفعہ ۲۲ میں حسب ذیل ضمن ۵ کا اضافہ بہ الفاظ ذیل کیا گیا کہ جماعت :۔

سال گذشتہ کا صدر اگر وہ عام انتخابات میں کسی عہدہ کے لیے منتخب نہ ہو سکے تو

سال آیندہ کے لیے وہ خود بہ خود رکن مجلس عاملہ متصور ہوگا۔"

اس ترمیم کے بعد جناب رائے راجہ گرو داس صاحب بی اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) سابق صدر جماعت ہٰذا کا اضافہ عمل میں آیا۔

مسئلۂ انتخاب نایب صدارت بلدیہ | سال حال مجلس عاملہ نے یہ تصفیہ کیا کہ اس مسئلے کو جماعتی سوال (پارٹی کویسچن) نہ بنایا جائے۔ اس لیے جماعت ہٰذا نے اپنا کوئی امیدوار پیش نہیں کیا۔

سہ سالہ نظام نامہ | عثمانیہ بلدی جماعت کی جانب سے جو امیدوار صاحبان مجلس بلدیہ کی رکنیت کے لیے پیش کیے گئے تھے انھوں نے ایک خاص سہ سالہ نظام نامہ پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ فرمایا تھا۔ سہ سالہ نظام نامہ عثمانیہ بلدی جماعت میں ہماری ایک نمایاں تحریک منجانب بلدیہ مدارس شبینہ کے قیام کے متعلق تھی۔ گذشتہ رپورٹ میں بتلایا گیا تھا کہ مجلس بلدیہ نے اس مسئلے کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر کیا تھا۔ اس دوران میں کمیٹی نے جناب ناظم صاحب تعلیمات سرکار عالی کے فراہم کردہ مواد کو پیش نظر رکھ کر مجلس بلدیہ میں قیام مدارس شبینہ کی ایک اسکیم پیش کی۔ مجلس بلدیہ نے اس اسکیم کو منظور کرتے ہوئے ہر حلقے میں فی الحال ایک ایک شبینہ مدرسہ قایم کرنے کی منظوری دی، اور انتظامات کے لیے نایب میر مجلس بلدیہ، ناظم صاحب بلدیہ، رکن حلقہ و ناظم صاحب تعلیمات پر مشتمل ایک بورڈ قایم کر دیا گیا ہے۔ رقم ۱۳۴۷ف کے موازنے میں شریک ہو چکی ہے اور مدارس کا قیام عنقریب عمل میں آجائے گا۔

تحریک نمبر (۲) یعنی بلدی حلقوں کی ترتیب جدید کے متعلق تحریک ناظم صاحب بلدیہ کی رپورٹ

بہ توسط سب کمیٹی مشاورتی ابھی مجلس بلدیہ میں پیش نہیں ہوئی ہے۔ کارروائی میں عجلت کے لیے توجہ دلائی جارہی ہے۔

تحریک نمبر ۳۔ انسداد امراض سے متعلق صحت کمیٹی پورے انہماک کے ساتھ کام کررہی ہے اور سررشتۂ طبابت سرکار عالی کا اتحاد عمل بھی صحت کمیٹی کے پیش نظر ہے۔

تحریک نمبر ۴۔ اس سلسلے میں امراض کی روک تھام کے لیے نشر و اشاعت کی ضرورت مجلسِ بلدیہ نے محسوس کرکے نشر و اشاعت کے لیے موازنۂ سال حال میں رقم محفوظ کی ہے۔

تحریک نمبر ۵۔ یونانی و ایورویدک دواؤں کے استعمال کے سلسلے میں صحت کمیٹی نے ایک تفصیلی اسکیم مجلسِ بلدیہ میں پیش کی ہے مجلس نے اسکیم کو منظور کرلیا ہے، موازنۂ سال حال میں گنجائش نہ نکل سکنے کی وجہ سے فی الحال اس کا نفاذ معرض التوا میں ہے۔

تحریک نمبر ۶۔ بلدیے کے ملازمینِ ادنیٰ کے حالات کو بہتر بنانے میں بلدیہ ممکنہ کوشش کررہی ہے ان کی تنخواہوں میں اضافے کی تجویز زیرِ غور ہے ان کے لیے ہتر امکنہ اور دیگر سہولتوں کے متعلق بھی ضروری کارروائی جاری ہے۔

تحریک نمبر ۷۔ مجلس بلدیہ کی قانونی کمیٹی نے ہوٹلوں اور چائے خانوں کے متعلق ضروری قواعد مرتب کردیے ہیں اور مجلسِ بلدیہ نے ان کو منظور بھی کرلیا ہے، یہ قواعد زیرِ منظوریٔ سرکار عالی ہیں۔

تحریک نمبر ۸۔ کرایہ کی سواریوں کی دیکھ بھال اور ان کی خاطر خواہ اصلاح کے متعلق جناب ناظم صاحب بلدیہ کو مناسب انتظام عمل میں لانے کے لیے بلدیہ نے توجہ دلائی تھی، لیکن ابھی ان میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی اور نہ کافی طور پر دیکھ بھال ہوتی ہے۔ ناظم صاحب بلدیہ اس کے متعلق خاص دلچسپی لیں تو ایک دیرینہ شکایت رفع ہوگی۔

تحریک نمبر ۹۔ دفتری کاروبار میں غیر ضروری تعویق نہ پیدا ہونے کے متعلق ناظم صاحب بلدیہ کی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

تحریک نمبر ۱۰۔ انسداد گداگری کے متعلق ناظم صاحب بلدیہ کی تجاویز کو بلدیے نے منظور کرلیا ہے جس میں لاٹری پائی فنڈ وغیرہ داخل ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب اس کے متعلق ضروری کارروائی شروع ہوجائے گی۔

تحریک نمبر ۱۱۔ ضروریاتِ بلدیہ میں مصنوعات ملکی کے استعمال سے متعلق بلدیے کی توجہ مبذول ہے

لیکن سختی سے اس کی پابندی نہیں ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں مزید توجہ کی جائے۔

تحریک نمبر ۱۲۔ انتخابی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کے انسداد کے متعلق قانونی کمیٹی کی رائے مجلس بلدیہ نے طلب کی تھی جو ابھی وصول نہیں ہوئی۔

تحریک نمبر ۱۳۔ قابلیت رائے دہندگی میں توسیع کے مسئلے میں قانونی کمیٹی کی رائے بھی عدم وصول ہے

تحریک نمبر ۱۴۔ مجلس قایمہ میں الونس کی مسدودی کو مجلس بلدیہ نے منظور کرلیا ہے۔ یہ مسئلہ ابھی سرکار عالی کے زیر منظوری ہے۔

تحریک نمبر ۱۵۔ ٹیکس تفریحات کے قیام کے متعلق قانونی کمیٹی کی رپورٹ وصول ہونے پر مجلس بلدیہ نے متعدد تفریحی ٹیکسوں کی منظوری دی ہے جو ابھی زیر منظوری سرکار عالی ہے۔

تحریک نمبر ۱۶۔ قانون میر محلگان کے متعلق ابھی قانونی کمیٹی کی رائے مجلس بلدیہ میں وصول نہیں ہوئی ہے۔

تحریک نمبر ۱۷۔ تعمیر مکانات کی اجازتی چھٹی سابق کی طرح غیر معمولی تعویق سے تو نہیں مل رہی ہے مگر پھر بھی اس میں غیر ضروری تاخیر ہو جایا کرتی ہے۔ مزید عجلت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

سہ سالہ نظام نامے کے علاوہ اراکین بلدیہ منجانب عثمانیہ بلدی جماعت نے حسب ذیل مفید و اہم تحریکات اپنے اپنے متعلقہ حلقہ جات کی اصلاح اور دیگر شہری ضرورتوں میں پیش فرمائیں:۔

۱۔ تحریکات نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم۔ اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) رکن بلدیہ حلقۂ دوم اندرون:۔

۱۔ نسبت تعمیر موری کوچۂ ایٹونٹ راک اندرون لال دروازہ

۲۔ تنصیب جالیاں بر موری کوچۂ اندھیری باؤلی

۳۔ تہہ اندازی کوچۂ اندھیری باؤلی

۴۔ مورم اندازی سڑک ہائے سلطان شاہی

۵۔ تعمیری موری احاطۂ مبارز الدولہ

۶۔ تعمیری موری پولا کوٹم لال دروازہ

۷۔ تعمیر موری مسجد شکر سلطان شاہی

۸۔ تنصیب برقی روشنی فٹنگ مغربی دایرۂ حضرت میر مومن صاحب قبلہؒ

۹۔ نسبت تنصیب جالیاں بر موریاں سلطان شاہی
۱۰۔ نسبت تکمیل موری عابد یار جنگ مرحوم مغل پورہ
۱۱۔ تنصیب جالیاں موریاں سڑک ہائے مسجد مولوی مظہر صاحب
۱۲۔ تعمیر پیشاب خانہ مدرسہ تحتانیہ سلطان شاہی
۱۳۔ درستی و اصلاح پلے گراؤنڈ سلطان شاہی وغیرہ
۱۴۔ تعمیر موری مراد محلہ
۱۵۔ نسبت تنصیب برقی روشنی رام بخش بنڈہ

۲۔ تحریکات مولوی غلام محمد خاں صاحب ایم اے (عثمانیہ) رکن بلدیہ حلقۂ اول بیرون :۔

۱۔ نسبت تبدیلی نام النقشہ برج
۲۔ اجرائی رسالہ ماہوار موسوم بہ بلدیہ
۳۔ سینما وغیرہ کے بورڈ آف سنسر میں بلدیہ کے نمائندے کی شرکت
۴۔ حوالگی محکمہ جات برقی و ٹیلیفون و آب رسانی بہ محکمہ بلدیہ
۵۔ نسبت توسیع نیا پل
۶۔ انتظام کشتی رانی بہ رودِ موسیٰ
۷۔ نسبت مسدودی میٹنی شو۔
۸۔ انتظام برقی روشنی حلقۂ اول بیرون
۹۔ نسبت انسداد وصول کم فی صد ٹنڈر
۱۰۔ حدود بلدیہ میں پبلک فون کے مراکز کا قیام
۱۱۔ بلدیہ کے صدر کے لیے ایک مخصوص گون کا استعمال ضروری ہے
۱۲۔ آرائشِ بلدہ کی نئی آبادیوں میں تقریب گھڑی
۱۳۔ حدود بلدیہ سے گولیوں کی اور بیرون بلدہ دودھ گھروں کا قیام
۱۴۔ دھوبیوں کو موریوں کے پانی کے استعمال سے بچایا جائے
۱۵۔ شہر کی سڑکوں، گلی، کوچوں اور پارک وغیرہ کو اکابر ملک کے نام سے موسوم کیا جائے

۱۶۔ نسبت انہدام فصیل قدیم شہر

۳۔ تحریک پنڈت گنڈے راؤ صاحب ہروالکر بی اے۔ ال ال بی۔ رکن بلدیہ حلقۂ دوم بیرون

۱۔ نسبت رفع خرابیاں سمت دوم بیرون

۴۔ تحریک مولوی سید محمد علی صاحب موسوی رکن حلقۂ اول اندرون

۱۔ نسبت اصلاح مسالخ وغیرہ

۵۔ تحریک مولوی شاہ عالم خاں صاحب رکن حلقۂ چہارم اندرون

۱۔ اضافہ تنخواہ عملہ کنسروِنسی

۶۔ تحریک پنڈت سریدھر نایک صاحب رکن بلدیہ

۱۔ نسبت قیام نل جدید عقب کٹلمنڈی

۷۔ تحریکات مولوی غلام مصطفےٰ صاحب رکن حلقۂ (الف)

۱۔ تعمیر سڑک ہائے اعظم جاہی ومعظم جاہی وغیرہ وتعمیر بدررو چلکل گوڑہ وغیرہ

۲۔ نسبت شکستگی کنٹہ چلکل گوڑہ

۳۔ تنصیب درختان ہر دو جانب سڑک ہائے حلقۂ (الف)

۴۔ نسبت تیاری سڑک عنبرپیٹھ تا حد صفائی بہ ذریعۂ سمنٹ وتعمیر بدررو ہائے محلہ کاچی گوڑہ وغیرہ

۵۔ نسبت اضافہ تنخواہ مزدور و مزدورنیاں

تنظیم حلقہ جات عثمانیہ بلدی جماعت کی کامیابی اور طاقت کا انحصار شاخہائے حلقہ جات کی تنظیم وکارکردگی پر منحصر ہے، اس لیے ابتداہی سے مجلسِ عاملہ کے زیرِ غور شاخوں کی تنظیم جدید کا مسئلہ رہا ہے مجلسِ عاملہ کے ایک دیرینہ و نہایت سرگرم عمل رکن جناب صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی کو اس سلسلے میں رپورٹ پیش کرنے کا مجاز گردانا گیا تھا موصوف کی رپورٹ پر غور کرنے کے بعد مجلسِ عاملہ نے تمام حلقہ جات کی شاخوں کی تشکیل جدید کردی ہے۔ اول بیرون دوم اندرون میں جماعت ہذا کا کام پورے انہماک وسرگرمی سے جاری ہے۔ امید ہے کہ دیگر حلقہ جات کے معتمدین ومنتخب شدہ مجالس عاملہ اپنے حلقہ جات کے صدر صاحبان کے ساتھ اشتراکِ عمل کرکے جماعت کے مقاصد کو آگے

بڑھائیں گے اس کے علاوہ آئندہ ہر ماہ کی کسی خاص تاریخ کو جملہ شاخوں کے معتمد صاحبان کی ایک میٹنگ منعقد کیے جانے کے انتظامات کیے گئے ہیں تاکہ اس سلسلے میں مفید مشورے ملتے رہیں اور باہمی تبادلہ خیال عمل میں آتا رہے۔

تعداد ارکان ہر جماعت کی قوت کا انحصار اس کے اراکین کی عددی قوت اور اس کے مالی استحکام پر مبنی ہے، ہمیشہ سے یہ اصول جماعت کے پیش نظر رہا ہے اور ہر سال اراکین کی تعداد (۷۰۰) سے زاید ہے، اور گذشتہ کانفرنس کے بعد سے تقریباً (۲۵۰) اراکین کا اضافہ عمل میں آیا ہے، آیندہ اس کام میں مزید توجہ مبذول کی جائے گی اس موقع پر حلقۂ دوم اندرون کا ذکر خاص طور پر ضروری ہے، جہاں کافی اراکین کا اضافہ عمل میں آیا۔

نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے ال ال بی رکن بلدیہ وصدر حلقہ نواب خواجہ سردار اللہ خاں صاحب معتمد حلقہ، مولوی خواجہ سیف الدین صاحب شریک معتمد، مولوی عبدالسمیع احمد صاحب معتمد حلقۂ سوم مولوی شیخ محمد صاحب قریشی معتمد حصۂ چہارم کی کوششیں خاص طور پر قابلِ داد ہیں اس کے علاوہ حلقۂ اول اندرون میں مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب ایم اے (عثمانیہ) رکن بلدیہ وصدر حلقہ اور مولوی سید شہاب الدین صاحب معتمد حلقہ نے اس طرف خاص توجہ مبذول فرمائی اور ان حلقہ جات میں اپنی مسلسل کوشش وسرگرمی سے اراکین کی تعداد قابلِ لحاظ حد تک ترقی کر گئی مگر اس سلسلے میں بہت کچھ کام باقی ہے، بقیہ حلقہ جات کے صدر و معتمد صاحبان سے توقع ہے کہ آیندہ اس سلسلے میں کامیاب قدم اٹھایا جائے گا۔

سب کمیٹی برائے تشکیل قواعد پارٹی ڈسپلن در مجلس بلدیہ یوں تو انتخابات کے بعد ہی سے اراکین بلدیہ منجانب عثمانیہ بلدی جماعت نے جماعت ہذا کے سہ سالہ نظام نامے کی تکمیل میں سرگرمی کے ساتھ کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن بلدیے کے اندر کام پارٹی سسٹم (Party System) پر نہونے کی وجہ سے ایک کمزوری محسوس کی جارہی تھی ابتدائے سال ہی سے مجلس عاملہ نے اس جانب خاص توجہ کی اور مولوی محمد غوث صاحب ایم اے ال ال بی کی تحریک پر ایک سب کمیٹی جو حسب ذیل ارکان پر مشتمل ہے پارٹی کے اصول و قواعد کو منضبط کرنے کے لیے تشکیل دی گئی ہے:۔

۱۔ جناب مولوی غلام مصطفےٰ خاں صاحب صدر جماعت و رکن بلدیہ

۲۔ جناب نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے۔ ال ال بی رکن بلدیہ

۳۔ جناب پنڈت پریم جی لال جی صاحب رکن بلدیہ

۴۔ جناب صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی

۵۔ مولوی محمد غوث صاحب ایم اے۔ ال ال بی

یہ کمیٹی مصروف عمل ہے اور عنقریب اس کی رپورٹ مجلس عاملہ میں بہ غرض منظوری پیش کردی جائے گی۔

کمیٹی ارکان بلدیہ منجانب عثمانیہ بلدی جماعت

منظوریٔ قواعد تک فی الحال ایک کمیٹی اراکین بلدیہ منجانب عثمانیہ بلدی جماعت تشکیل دی گئی ہے جس کے معتمد مولوی غلام محمد خاں صاحب ایم اے (عثمانیہ) اور شریک معتمد نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) مقرر کیے گئے ہیں اس کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ بلدیے کے اندر اراکین جماعت ہذا میں ڈسپلن و ہم آہنگی قایم رہے۔

یہ کمیٹی اچھے اصول پر کام کر رہی ہے اب عام طور پر بلدیے کے ہر ایک مسئلے کو جماعتی اصول کی حیثیت دی جاتی ہے جس پر تمام ارکان مشترکہ غور کے بعد بلدیے کے اندر متفقہ طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔

عطیہ

سال حال نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے۔ ال ال بی رکن بلدیہ نے مبلغ (عنہ) روپیے کا عطیہ مرحمت فرمایا جس کی جماعت ہذا مشکور ہے۔

رپورٹ ختم کرنے سے پہلے میں اپنے معاونین خصوصاً نواب میر احمد علی خاں صاحب و نواب خواجہ سردار اللہ خاں صاحب و صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب و مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب و مولوی عبدالسمیع احمد صاحب اراکین مجلس عاملہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان حضرات نے اپنے مفید و پُر خلوص مشوروں سے میری ہر وقت مدد فرمائی۔

دعا

اب میں آپ حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ بارگاہِ رب العزت میں اعلیٰحضرت بندگانِ عالی کی خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ ترقی عمر و اقبال کے لیے دعا فرمائیں کہ ذات والاصفات کے دورِ ہمایونی میں بلا قید مذہب و ملت ہم نہایت ہی امن و آسایش کی زندگی بسر کرتے ہوئے یہ تیسری سالانہ بلدی کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔

محمد کرامت علی بی اے (عثمانیہ) معتمد عثمانیہ بلدی جماعت

دوسری نمائش مصنوعات ملکی ممالک محروسہ سرکار عالی کی تیاریاں

منجانب

معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن

گذشتہ ماہ آذر ۱۳۴۸ف کی کامیاب نمائش مصنوعات ملکی کے مدنظر یہ تصفیہ کیا گیا ہے کہ اس مرتبہ نمائش ماہ بہمن ۱۳۴۹ف میں عظیم الشان طریقہ پر منعقد کی جائے اس کے لیے ابھی سے شایانِ شان انتظامات عمل میں لائے جا رہے ہیں :۔

۱۔ حیدرآباد کے موسمی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موسمِ سرما میں ماہ بہمن کی ایسی تاریخوں میں اس کا انعقاد کیا جائے جبکہ ملک کے ہر گوشے سے کثیر تعداد میں صناع و تاجر اور ناظرین شریک ہو سکیں اور انھیں بارش وغیرہ کی تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ امر بھی ملحوظ رکھا جائے کہ آئندہ ماہ بہمن ۱۳۴۹ف میں حیدرآباد میں جو متعدد آل انڈیا نوعیت کی کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں اور ہندوستان کے مشاہیر، علماء اور دیگر نمائندے شرکت کی غرض سے آ رہے ہیں ان کو بھی حیدرآباد کی صنعتی ترقی اور مصنوعات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملے۔

۲۔ اس مرتبہ نمائش میں ایسی اشیاء کا خاص طور پر مظاہرہ کیا جائے گا جو خاص اہتمام کے ساتھ نمائش کی غرض سے تیار کی گئی ہیں یا جو ممالک محروسہ سرکار عالی کی جدید ایجادات و اختراعات سے متعلق ہوں۔ اس ضمن میں صناعانِ ملک کو ترغیب دلائی جا رہی ہے کہ وہ اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کر کے انعامات حاصل کریں۔

۳۔ جدید اور پیمانہ کبیر کی صنعتوں کیلیے بھی علیحدہ علیحدہ شعبے مخصوص کیے جائینگے۔ پارچہ بافی۔ کوئلہ۔ لوہا۔ سمنٹ۔ شکر۔

کاغذ اور روغنیات کی ترقیات کیلیے علیحدہ اسٹال قایم کیے جائینگے۔

۴۔ صنعتی مظاہروں کا بھی بطور خاص انتظام کیا جائیگا۔ صنعتی کیمیا کی اہمیت، ترقی اور سائنس کے تجربوں سے عوام کو واقفیت پیدا کرانے

کیلیے کالجوں کے پروفیسر صاحبان اور سرکار عالی کے تجربہ خانوں کے افسروں سے تعاون حاصل کیا جائیگا۔ سائنس کے ایسے

تجربات کا مظاہرہ کیا جائیگا جن سے عوام اپنی صنعتی ترقی میں اس سے مستفید ہو سکیں۔

۵۔ عملی تجربوں کے علاوہ ماہرانِ فن کی عام فہم تقاریر کا بھی انتظام کیا جائیگا۔

۶۔ ملکی مصنوعات کو بیرون ملک کے افراد سے روشناس کرانے کیلیے ایسی تدابیر و سہولتیں بہم پہنچائی جائینگی جن کے ذریعے

بیرونی ممالک محروسہ سرکار عالی کے تجار اور صناعوں کو بھی اس میں شرکت کی ترغیب ہو سکے، وہ یہاں کی مصنوعات

خرید کر ہندوستان میں ان کیلیے بازار فراہم کر سکیں۔

۷۔ نمایش کے انعقاد سے قبل معاشی کمیٹی کیجانب سے بزبان اردو و انگریزی ایک نہایت شاندار صنعتی و تجارتی ڈائرکٹری شایع

کیجارہی ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی اور جامع ڈائرکٹری ہوگی۔ اس ڈائرکٹری کا کتابچہ دس ہزار کی تعداد میں شایع کیا جائیگا جو

عوام کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ تین چار ماہ کے اندر ڈائرکٹری طبع ہو جائیگی جو آیندہ نمایش کیلیے بطور گائیڈ کام دیگی۔

۸۔ اس نمایش کا پراسپکٹس اور دیگر تفصیلات زیر طبع ہیں۔ اس وقت اعلان کا منشا یہ ہے کہ گذشتہ مرتبہ جن صناعوں نے اس میں حصہ لیا تھا وہ اور

دیگر صناع ابھی سے اس میں شرکت کیلیے مصنوعات کی تیاری شروع کر دیں۔ ارباب حکومت اور عوام سے اس کی قوی

امید ہے کہ وہ گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی معاشی کمیٹی کے ساتھ تعاون سے نمایش کو کامیاب بنائینگے۔

رپورٹ عثمانیہ بلدی جماعت حلقۂ دوم اندرون بابت ۱۳۴۷ف

عثمانیہ بلدی جماعت حیدرآباد کا وہ واحد ادارہ ہے جو شہریوں کی خدمت گذاری اور شہریوں میں اپنے بلدی حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ موقع نہیں ہے کہ اس کی ساری بلدی کارگذاریوں کی تفصیل کا اظہار کیا جائے لیکن آپ سب حضرات یہ جانتے ہیں کہ اس کی کامیابی کا بڑا انحصار اس کی حلقہ واری اور حصہ واری شاخوں کی کارگذاری اور مستعدی پر ہے۔ اس موقع پر اس کی شاخ دوم اندرون کی کارگذاری کی مختصر کیفیت پیش کی جاتی ہے:۔

عہدہ داران و مجلس عاملہ

جماعت ہذا کی صدارت کے فرائض حسب دفعہ ۲۴ ضمن د قواعد عثمانیہ بلدی جماعت بہ حیثیت رکن بلدیہ حلقۂ ہذا نواب میر احمد علی خاں صاحب یم لے۔ ال ال بی جاگیردار نے انجام دیے اور دفعۂ مذکور کی ضمن ب کے تحت صدر مجلس عاملہ نے معتمدی کے لیے میرا تقرر فرمایا۔ جماعت ہذا کے جلسۂ عام بہ موجب ضمن ج مجلس عاملہ کی رکنیت کے لیے مولوی خواجہ سیف الدین صاحب۔ مولوی عبدالحلیم بیگ صاحب اور رائے رگھوبیر بلی صاحب بی لے (عثمانیہ) کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور مولوی محمد کرامت علی صاحب بی اے (عثمانیہ) اور رائے مانک راؤ صاحب کی نامزدگی مرکزی مجلس عاملہ کی جانب سے عمل میں آئی۔

جلسہ ہائے مجلس عاملہ

سال حال مجلس عاملہ کے جلسوں کی تعداد (۴) رہی جن میں جماعت ہذا کے کاروبار سے متعلق متعدد امور طے پائے۔

جلسہ ہائے عام

سال حال جماعت کے دو جلسہ ہائے عام منعقد ہوئے۔ ایک اوائل سال میں ترتیب موازنے سے متعلق اور دوسرا آج کا جلسہ (۲۶ر آبان ۱۳۴۷ف) رپورٹ کارگذاری کی سماعت اور انتخابات سال آیندہ سے متعلق۔

تعداد ارکان

ختم ۱۳۴۶ف پر جماعت ہذا کے ارکان کی تعداد (۶۸) تھی اور اب (۲۲۸) ہے۔ یہ امر ہمارے لیے باعثِ فخر ہے کہ عثمانیہ بلدی جماعت کے کُل ارکان کا تہائی سے زاید حصہ ہمارے حلقے کے ساکنین پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں عموماً حلقۂ ہذا کے ان تمام ساکنین کا میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے توسیع رکنیت کے لیے کوشش فرمائی ہے اور خصوصاً مولوی شیخ محمد صاحب قریشی۔ مولوی کرامت علی صاحب بی اے (عثمانیہ) اور مولوی نوازش عمر صاحب کا ممنون ہوں۔

حصہ واری شاخیں

حسب دفعہ ۲۵ قواعد عثمانیہ بلدی جماعت حلقۂ ہذا کے چاروں حصوں میں حصہ واری شاخیں قایم ہیں۔ ۱۳۴۷ف میں حصۂ اول کے صدر جناب بابوراؤ صاحب والوجکر معتمد جناب مانک راؤ صاحب اور ارکان مجلس عاملہ جناب وینکٹ سوامی صاحب جناب ہنمنت راؤ صاحب جناب سید خواجہ معین الدین صاحب۔ جناب یس۔ کے پانڈو صاحب۔ جناب رگھو ویر راؤ صاحب وکیل ہائیکورٹ رہے۔

حصۂ دوم کے صدر جناب ڈاکٹر ستنارا ین صاحب میر محلہ معتمد جناب محمد غوث صاحب اور ارکان مجلس عاملہ جناب سوہن لال صاحب وکیل۔ جناب نوازش عمر صاحب۔ جناب نواب فخر الدین خاں صاحب۔ جناب محمد حسین خاں صاحب اور جناب بالکشن صاحب رہے۔

حصۂ سوم کے صدر جناب احمد سعدی صاحب میر محلہ معتمد جناب محمد کرامت علی صاحب بی اے (عثمانیہ) اور ارکان مجلس عاملہ جناب فضل الدین خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ۔ نواب خواجہ احمد اللہ خاں صاحب جاگیردار۔ جناب عبدالسمیع احمد صاحب۔ جناب خواجہ معین الدین صاحب اور جناب مجید اللہ خاں صاحب رہے۔

حصۂ چہارم کے صدر جناب محمود علی خاں صاحب میر محلہ معتمد جناب شیخ محمد صاحب قریشی اور ارکان مجلس عاملہ جناب ہند کشور صاحب ماتھر بی اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ۔ جناب بندھیاچند صاحب بی اے (عثمانیہ) جناب محمد سبحان صاحب جناب سید رضا صاحب اور جناب پریم راج صاحب رہے۔

ان حصہ واری شاخوں کی سالانہ رپورٹ تا حال وصول نہ ہونے کی وجہ سے شریک رپوٹ ہذا نہ کی جا سکیں۔

دورہ ہائے معمولی

مجلس عاملہ جماعت ہذا نے ابتدائے سال ہی میں یہ طے کیا تھا کہ ہر جمعہ کو سہ پہر میں حلقے کا دورہ کیا جائے اور یہ اصول بنایا گیا تھا کہ ہر مہینے کا پہلا جمعہ حصۂ اول کے دوسرا جمعہ حصۂ دوم کے تیسرا جمعہ حصۂ سوم کے اور چوتھا جمعہ حصۂ چہارم کے دورہ کے لیے مختص کیا جائے جس کی تعمیل میں سال حال (۳۶) معمولی دورے کیے گئے۔ اِن دوروں میں جس قدر اصلاح طلب اُمور بلدیہ سے متعلق پائے گئے ان کو لیے صدر جماعت ہذا کے ذریعے مجلس بلدیہ میں تحریکات پیش کی گئیں یا عہدہ داران و ملازمین بلدیہ سے ارتفاع شکایت کی کوشش کی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ ہوا اُس سے بہت زیادہ ابھی انجام پانا ہے۔ ان دوروں میں صدر و معتمد اور ارکان مجلس عاملہ کے علاوہ حصہ واری شاخوں کے عہدہ داران و ارکان مجالس عاملہ گہری دلچسپی کے ساتھ شرکت فرماتے رہے۔ حصۂ دوم کے اُمور اصلاح طلب مثلاً تعمیر بدر رو۔ انتظام روشنی اور نہ اندازی وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر سن نارائن صاحب جناب محمد غوث صاحب اور جناب یم بالکشن صاحب کی توجہ سے مکمل فہرستیں تیار ہو چکیں اسی طرح حصۂ چہارم کے متعلق بھی جناب شیخ محمد صاحب قریشی کی توجہ سے مکمل مواد فراہم ہو چکا ہے حضرات متذکرۂ صدر جماعت کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ حصۂ اول اور حصۂ سوم کے مواد کی فراہمی کی کوشش بھی جاری ہے۔

دورہ ہائے غیر معمولی

معمولی دوروں کے علاوہ صدر جماعت ہذا نے بہ حیثیت رکن بلدیہ حلقہ دوم اندرون محفوظ،

درخواستوں اور زبانی شکایتوں کی بنا پر متعدد غیر معمولی دورے موقعوں کے معاینہ کے لیے کیے۔

مالیہ

سال حال آج کی تاریخ تک جماعت ہٰذا کی نہ کوئی آمدنی ہوئی اور نہ کوئی خرچ۔ جماعت ہٰذا کے ذرائع آمدنی دو ہیں، عطیات اور مرکزی جماعت کی امداد۔ جماعت ہٰذا نے کوئی عطیات وصول نہیں کیے اور نہ مرکزی جماعت سے کوئی امداد تا حال حاصل ہوئی، اس لیے آمدنی میں کوئی رقم شریک نہیں ہے۔ ممکن ہے مرکزی مجلس عاملہ کے ایک تصفیہ کے بہ موجب ارکان عثمانیہ بلدی جماعت مقیم حلقۂ ہٰذا کے وصول شدہ چندہ کا سہ ربع حصہ ہیں ختم سال سے قبل وصول ہو جائے۔ خرچ کی رقم اس لیے شریک نہیں ہے کہ ناگزیر اخراجات مثلاً تنخواہ اہلکار و چپراسی وغیرہ بھی جماعت کو برداشت نہیں کرنے پڑے بلکہ صدر جماعت ہٰذا نے بہ کمال ہمدردی دفتری اور تقسیم لفافہ جات وغیرہ کے کام کو اپنے ذاتی آدمیوں کے ذریعے انجام دلوایا۔ جو کام جماعت ہٰذا کے آیندہ پیش نظر ہے مثلاً مدارس شبینہ۔ کتب خانہ جات اور کلبس وغیرہ کے قیام کے لیے جماعت کو رقمی ضرورتیں پیش آئیں گی۔ مرکزی جماعت کی امداد کے علاوہ کاموں کی وسعت کے لحاظ سے عطیات کا وصول کرنا بھی ضروری ہو جائے گا۔

اُمورِ بلدیہ

صدر جماعت ہٰذا نے بہ حیثیت رکن بلدیہ جو فرائض انجام دیے ان کی مختصر کیفیت بھی ذیل میں درج کردی جاتی ہے:-

اجلاس ہائے مجلس بلدیہ | سال حال مجلس بلدیہ کے معمولی ملتویہ اور خاص (۴۵) اجلاس ہوئے جن میں سے ہر ایک میں معزز رکن نے شرکت فرمائی۔

اجلاس و دورہ ہائے صحت کمیٹی | بلدیہ میں بلدہ حیدر آباد کی صحت و عافیت کی نگرانی کے لیے سات ارکان کی ایک سب کمیٹی بنام "صحت کمیٹی" قایم ہے جو اپنے دوروں اور اجلاسوں میں بلدہ حیدر آباد کی صحت سے متعلق ضروری امور پر غور کرتی اور ان کے متعلق تصفیے کر کے مجلس بلدیہ میں پیش کرتی ہے۔ ہر ہفتہ میں اس کمیٹی کا ایک دورہ اور ایک اجلاس ہوا کرتا ہے۔ صدر جماعت ہٰذا کا بھی اس کمیٹی کی رکنیت کے لیے انتخاب ہوا، اور انھوں نے اس کے سال حال کے (۲۲) دوروں اور (۹) اجلاسوں میں سے ہر ایک میں شرکت کی۔

اجلاس ہائے سب کمیٹی متعلق قیام مدارس شبینہ | نظام نامہ عثمانیہ بلدی جماعت کی جو تحریکات سال حال مجلس بلدیہ میں

پیش ہوئی تھیں ان میں سے ایک قیام مدارس شبینہ کے لیے بھی تھی مجلس بلدیہ نے اس تحریک کو منظور کرکے اس کے متعلق ایک سب کمیٹی قایم کی ہے جس میں صدر جماعت ہذا کا نام بھی شریک ہے۔ اب تک اس کے دو اجلاس ہوئے اور دونوں میں انھوں نے شرکت کی۔

اجلاس ہائے سب کمیٹی متعلق قرضہ بلدیہ | مذکورہ بالا سب کمیٹیوں کے علاوہ حصول قرضہ سے متعلق ایک ہنگامی سب کمیٹی بھی صدر جماعت ہذا کا انتخاب عمل میں آیا تھا، اس کے (۵) اجلاسوں میں سے وہ صرف ایک میں شرکت کر سکے۔

کارہائے تعمیری حلقۂ ہذا | سال حال کا موازنہ مجلس بلدیہ نے ۱۳۴۶ف ہی میں منظور کر دیا تھا، اس وقت مجلس بلدیہ میں جماعت ہذا کی کوئی نمایندگی نہیں ہو رہی تھی۔ حلقۂ ہذا کے تعمیری کاموں کے لیے کچھ زیادہ رقم شریک موازنہ نہ ہو سکی۔ سال حال ایک موری (کوچۂ مسجد جعفری و احاطہ بہرام الدولہ) اور دوسری موری اندرون دروازہ علی آباد تعمیر ہو سکی! ور اول الذکر موری کی بچت کی رقم سے اسی کوچہ میں دو مکانات حاصل کرکے سواریوں کی آمد و رفت کا راستہ قایم کیا گیا۔ ان کے علاوہ ایک پیشاب خانہ اور ایک حوض آب نوشید نی برائے جانوران بھی حلقۂ ہذا میں قایم ہوا۔

روشنی | البتہ سال حال حلقۂ ہذا میں برقی روشنی کی کافی توسیع ہوئی محلہ جات اندرون لال دروازہ۔ کوٹلۂ عالی جاہ۔ کوچۂ مسجد جعفری۔ راستہ ڈیوڑھی مہاراجہ بہادر۔ کٹہ تالاب میر جملہ اور مغلپورہ میں (۸۰۰) برقی چراغوں کا اضافہ ہوا محلہ جات سلطان شاہی، اندرون دروازہ گولی پورہ، بیلۂ مہاراجہ چندو لال، کوچۂ نانا کا ماٹی، احاطۂ میر پاشا، کوچۂ گڑے کاری گوڑہ، اور کوچۂ نعیم الدین خاں میں بھی انشاء اللہ عنقریب برقی روشنی آجائے گی۔ آخر الذکر دو کوچوں کے علاوہ برقی روشنی کے ستون نصب ہیں۔ مجلس بلدیہ کے ایک حالیہ تصفیہ کے بموجب توقع ہے کہ ہمارے حلقہ کے چھوٹے چھوٹے کوچہ جات بھی اوائل ۱۳۴۸ف میں کم از کم مٹی کے تیل کی قنادیل سے منور ہو جائیں گے۔

کٹہ یان خاشاک | حلقۂ ہذا میں (۱۸۵) آہنی کنڈیاں اور (۲۷) خاشاک اندازی کے مقام گڑھے تھے۔ سال حال (۲۵) جدید آہنی کنڈیوں کا اضافہ کیا گیا۔

تحریکات مجلس بلدیہ | ضروریات حلقہ کے سلسلے میں تعمیر موری چھوٹا بازار سلطان شاہی (۲) تنصیب جالیاں بر موری ہری باؤلی (۳) تعمیر موری کوچۂ ایشونت راؤ (۴) تنصیب جالیاں بر موری کوچہ اندھیری باؤلی (۵) تہ اندازی کوچۂ اندھیری باؤلی (۶) مورم اندازی سڑک کھائے سلطان شاہی (۷) تعمیر موری احاطۂ مبارز الدولہ

(۸) تعمیر موری پلاٹم واقع لال دروازہ (۹) تعمیر موری عقب مسجد شکر سلطان شاہی کے متعلق مجلسِ بلدیہ میں تحریکات پیش کی گئیں جن میں سے تحریک (۱) منظور ہوئی اور باقی تحریکات زیرِ غور ہیں۔

دیگر امور | نظامت بلدیہ کے بارہ آدمیوں کا ایک زاید عملہ ۶ ار فروردی سنہ ف سے حلقہ ہذا میں متعین ہے جس کے ذریعے حلقہ کی متعدد ایسی موریوں کی گِل براری کی گئی جو سالہائے سال سے غیر چالو اور بند تھیں اور چند گلیوں اور راستوں کی مٹی وغیرہ کی ہمواری کا کام بھی اس عملہ سے لیا گیا۔ یہ عملہ اس وقت حلقہ ہذا ہی میں کارگذار ہے اور توقع ہے کہ سال آیندہ حلقہ ہذا کی جملہ موریاں صاف ہو جائیں گی اور مزید راستوں کی ہمواری کا کام بھی انجام پائے گا۔

انتظام مسجد احاطۂ قبیہ الدولہ مرحوم واقع اندرون دریچۂ رنگ علی شاہ | مسجد مذکور کی بے حرمتی سے متعلق محلہ سے جو شکایت پیش ہوئی تھی اس کے سلسلے میں نظامت امور مذہبی کو توجہ دلائی گئی، جواب وصول ہوا کہ کارروائی جاری ہے۔

تنازعہ موری مکان عالیہ بیگم صاحبہ ساکن پنچ محلہ | موری کے تنازعہ سے متعلق صاحبۂ موصوفہ کی درخواست پیش ہونے پر نظامت بلدیہ کے توسط سے عہدہ داران صرف خاص مبارک کو توجہ دلائی گئی۔ وہاں سے جواب آیا ہے کہ کارروائی زیرِ تصفیہ ہے۔

تبدیلی نل اسٹانڈ بہوئی واڑہ سلطان شاہی | تنصیب جدید نل بہوئی واڑہ کے سلسلے میں اہالیانِ بہوئی واڑہ کا ایک محضر پیش ہونے پر بہ ذریعۂ محکمۂ آب رسانی حسب خواہش اہالیانِ محلہ نل اسٹانڈ کا مقام تبدیل کر دیا گیا۔

یوم ترک مسکرات | یوم ترک مسکرات کے سلسلے میں جماعت ہذا نے جو حصہ لیا اس کی رپورٹ منسلک ہذا ہے۔

دکانات گوشت واقع شاہ علی بنڈہ | دکاناتِ گوشت واقع شاہ علی بنڈہ کے متعلق ایک شکایتی محضر پیش ہونے پر کہ وہ لوگ کھلی جالیاں رکھ کر گوشت فروخت کیا کرتے ہیں، گذر کے جوان کے علاوہ ایک خاص جوان کو اس کی نگرانی کے لیے متعین کر دیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ شکایت رفع ہو جائے گی۔

انتظام آب رسانی بہ زمانۂ عیدین و تہوارات | جناب میر محلہ صاحب اعزازی حصۂ دوم کی تحریک کی بنا پر عیدین و تہوارات میں پابندی کے ساتھ نلوں کے کھلے رکھنے کے متعلق توجہ دلائی گئی۔ وہاں سے جواب آیا کہ آیندہ سے عیدین و تہوارات کے موقع پر نلوں کے کھلے رکھنے کی پابندی کی جائے گی۔

اصلاح کوچۂ بن شاہ | اہالیانِ کوچۂ بن شاہ کے ایک محضر کی بنا پر کوچۂ مذکور کی رفع شکایت کے متعلق بہ توسط

نظامت بلدیہ عہدہ داران صرف خاص مبارک کو توجہ دلائی گئی ہے۔ ابھی کارروائی جاری ہے۔

پری باؤلی مسجد جالی | مصلیان مسجد مذکور اور اہالیان محلۂ مذکور کی خواہش کی بناء پر مسجد مذکور کی باؤلی کی پری سے متعلق بہ توسط نظامت بلدیہ محکمۂ امور مذہبی سے کارروائی جاری ہے چونکہ اس باؤلی تک خاشاک کے بنڈیوں کو جانے کے لیے مسجد کی دیوار کو توڑنے کی ضرورت ہے اس لیے محکمۂ امور مذہبی کی اجازت کی ضرورت ہے۔

فسادات بلدۂ حیدرآباد | بلدۂ حیدرآباد میں اوائل خورداد ۱۳۵۶ف میں جو منحوس فسادات پھوٹ پڑے اُن سے حلقۂ دوم اندرون بہ فضل خدا محفوظ رہا حلقۂ ہذا میں امن و امان قایم رکھنے میں مولوی میر مظہر علی صاحب کامل وکیل ہائیکورٹ سابق رکن بلدیہ کی کوششوں کا بڑا حصہ ہے عثمانیہ بلدی جماعت حلقۂ دوم اندرون نے بھی امن و امان قایم رکھنے میں امکانی جد وجہد کی اِس سلسلے میں نواب میر احمد علی خاں صاحب رکن بلدیہ۔ مولوی محمود علی خاں صاحب میر محلہ اور ڈاکٹر ست نارائن صاحب میر محلہ کی کوششیں بھی قابل ستائش رہیں۔ پنڈت گنپت راؤ صاحب دیشپانڈیہ وکیل ہائیکورٹ اور مولوی خواجہ معین الدین صاحب جاگیردار بھی اپنے حلقۂ اثر میں کوشش فرماتے رہے۔ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب امین کوتوالی کی مستعدی اور اپنے فرائض میں انہماک بھی قابلِ تعریف رہا اس رپورٹ کو مرکزی جماعت میں پیش کرنے پر وہاں سے ذریعۂ مراسلہ ہم کو مطلع کیا گیا کہ حضراتِ مذکور کا منجانب جماعت شکریہ ادا کیا جائے، چنانچہ حسبہٗ عمل کیا گیا۔

حضرات ناشکرگذاری ہوگی اگر اس موقع پر صدر جماعت ہذا نواب میر احمد علی خاں صاحب کے

شکریہ | متعلق بہ طور خاص کچھ عرض نہ کروں۔ اس سال مجلس بلدیہ کا کوئی ایسا اجلاس نہ ہوا جس میں ممدوح نے شرکت نہ کی ہو۔ بلدیہ کی دوسری ذیلی کمیٹیوں میں بھی وہ عموماً شریک رہے۔ ممدوح کی بلدی معروفیات کو مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں بلاخوفِ تردید عرض کرسکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا وہ یہی تھا کہ روزانہ ان کے اوقات کا بیشتر حصہ محکمۂ بلدیہ وغیرہ سے مراسلت کرنے، بلدیہ ہی سے متعلق سوچنے اور بلدیہ ہی سے متعلق کچھ کرنے میں گذرتا تھا۔ جماعت ہذا کے اخراجات ممدوح نے خود برداشت کیے۔ غرض جماعت اور حلقۂ ہذا کے لیے انھوں نے عملاً وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتے تھے اس سلسلے میں خود جماعتِ ہذا بھی قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے اپنی نمایندگی اور حلقہ کی اصلاح کے لیے ایسے موزوں ترین فرد کا انتخاب کیا۔

حضرات، ظاہر ہے کہ ہمارا کوئی ادارہ اور کوئی کام کامیاب نہ ہوتا اگر ہمارے بادشاہ ذیجاہ خلد اللہ ملکہ کی مراحم و عطوفتِ شاہانہ شہریوں اور بلدیہ کی اصلاح کی جانب مبذول نہ ہوتی۔ ہم سب بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ اعلیحضرت بندگانِ عالی معہ شہزادگان و شہزادیانِ بلند اقبال تا دیر ہم پر حکمراں رہیں (آمین)۔

۲۶ر آبان ۱۳۴۷ ف

خواجہ سردار اللہ خاں جاگیردار

معتمد عثمانیہ بلدی جماعت حلقۂ دوم اندرون

مجلس علمیہ (انجمن طیلسانیئن عثمانیہ) اس غرض سے قایم کی گئی ہے کہ عام طور پر تعلیم یافتگان جامعہ عثمانیہ اور بالخصوص طیلسانیئن کے علمی و ادبی کارناموں کو منظر عام پر لائے اور اس طرح اُردو زبان کی خدمت اور اعلیٰ علمی کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دے۔ اس سلسلے میں محققانہ مقالے جو جامعہ عثمانیہ کے پوسٹ گریجویٹ طلبہ سے لکھائے گئے ان کو انجمن کے ترجمان مجلہ طیلسانیئن میں طبع کرنے کے علاوہ کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے:-

۱۔ **اُردو ادب بیسویں صدی میں**۔ تالیف سید علی حسنین صاحب بی اے یم اے (عثمانیہ) موجودہ صدی کے اُردو ادب پر ایک سیر حاصل تنقیدی مقالہ۔ قیمت ۱۲ر آنے۔

۲۔ **عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیانِ ریاست**۔ تالیف سید علی محسن صاحب یم اے (عثمانیہ) عادل شاہی ریاست کے دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ۔ قیمت عا؍ روپیہ

۳۔ **سلطان احمد شاہ ولی بہمنی**۔ تالیف ظہیر الدین یم اے (عثمانیہ) سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ۔ قیمت عہ؍

قواعد جماعت اتحاد و ترقی

منظورۂ جلسۂ عام انجمن طیلسانئین عثمانیہ

منعقدہ

۲؍خورداد ۱۳۴۸ف فصلی

نام

(۱) ۔ اس جماعت کا نام "جماعت اتحاد و ترقی حیدرآباد" ہو گا۔

الحاق

(۲) ۔ یہ جماعت انجمن طیلسانئین عثمانیہ سے ملحق ہو گی اور اس جماعت کے قواعد و ضوابط کے لیے انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی منظوری لازمی ہو گی۔

ترمیم قواعد

(۳) ۔ قواعد ہذا میں ترمیم کرنے کے لیے حسب ذیل طریقہ عمل میں لایا جائے گا۔ ترمیم خواہ رکن اپنی تحریک معتمد کے پاس بھیجے گا، معتمد اس تحریک کو مجلس عاملہ کے معمولی اجلاس میں پیش کرے گا۔ بہ صورت منظوری مجوزہ ترمیم معتمد انجمن طیلسانئین عثمانیہ کے پاس کارروائی کی غرض سے بھیجدی جائے گی۔

اغراض و مقاصد

(۴) ۔ یہ جماعت کامل طور سے غیر فرقہ واری ہو گی اور اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

الف ۔ خانوادۂ آصف جاہی اور پرچم آصفی کے بقا اور استحکام کی کوشش عمل میں لانا اور ان کے ساتھ جذباتِ وفاداری و احترام کو مستحکم کرنا۔

ب ۔ پُرامن اور دستوری ذرایع سے اس امر کی کوشش کرنا کہ خانوادۂ آصفیہ کے زیرِ سایۂ عاطفت ممالک محروسہ سرکار عالی میں دستور و سیاست ارتقاء کے ایسے درجے پر پہنچ جائے کہ جو ملک و اہلِ ملک کے حقیقی مفاد کے تحت رائے عامہ کا صحیح مظہر ہو، اور ایک فرقہ دوسرے فرقے پر فرقہ واری بنیاد پر غلبہ حاصل نہ کرسکے۔

ج ۔ حیدرآباد کے مشترکہ تہذیبی عناصر اور روایاتِ ملک کے بقا و استحکام کی کوشش۔

د ۔ رعایائے مملکت آصفیہ میں اپنے دستوری حقوق اور ذمہ داریوں کا صحیح احساس اور خدمتِ ملک کا جذبہ پیدا کرنا۔

ھ ۔ مملکتِ آصفیہ کی مجالسِ مقننہ اور ان سے متعلقہ اداروں کے انتخابات میں حصہ لینا۔

و ۔ قانون سازی میں بہ لحاظ حالات مقننہ کی صحیح رہنمائی کے ذرایع اختیار کرنا۔

ز ۔ وہ تمام ذرایع اختیار کرنا جو مقاصد مندرجۂ بالا کے حصول میں ممد و معاون ہوں۔

رکنیت

۵ اس جماعت میں حسب ذیل اصحاب شریک ہوسکیں گے:۔

الف ۔ ارکان انجمن طیلسانئین عثمانیہ۔

ب ۔ مجالسِ مقننہ سرکار عالی اور ممالک محروسہ سرکار عالی کی بلدی مجالس کے ارکان۔

ج ۔ وہ اصحاب جن کے نام جماعت کی مجلس عاملہ میں پیش ہو کر ۳/۴ ارکان حاضر کی تائید سے منظور ہوئے ہوں اور اس کی منظوری کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ سے حاصل کی گئی ہو۔

ذرایع آمدنی

۶ ۔ جماعت کے ہر رکن کو سالانہ دو روپیے چندہ ادا کرنا ضروری ہوگا، لیکن انجمن طیلسانئین عثمانیہ کے ارکان سے جو اس جماعت کے رکن ہوں سالانہ ایک روپیہ چندہ لیا جائے گا، اور انجمن ایسے ارکان کے چندے کا ۱/۲ حصہ جماعت کو دے گی جو جماعت کے رکن ہوں۔

۷ ۔ جماعت کو اختیار رہو گا کہ حسب ضرورت بہ اغراض جماعت عطیات فراہم کرے۔

اقرار پابندیٔ قواعد

ف۸ ۔ کوئی شخص اس وقت تک اس جماعت کا رکن متصور نہ ہوگا، اور نہ اس کی کارروائی میں حصہ لے سکے گا تا وقتیکہ اس نے اقرار نامۂ منسلکہ قواعد ہذا پر اپنے دستخط نہ کر دیے ہوں کسی فرقہ واری جماعت کا رکن، جماعت ہذا کا رکن نہ ہو سکے گا۔ فرقہ داری جماعتوں کا تعین کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کرے گی۔

عہدہ داران

ف۹ ۔ اس جماعت کے حسب ذیل عہدہ دار ہوں گے:۔

۱۔ صدر ۔ ۲۔ نایب صدر ۔ ۳۔ معتمد ۔ ۴۔ شریکِ معتمد ۔ ۵۔ خازن ۔

ف۱۰ ۔ ان عہدہ داروں کا انتخاب ہر سال بہ ماہ آبان جماعت کے جلسۂ عام میں ہوگا۔

مجلسِ عاملہ

ف۱۱ ۔ اس جماعت کی مجلسِ عاملہ علاوہ عہدہ داران مندرجہ ف۹ کے حسب ذیل ارکان پر مشتمل ہوگی:۔

الف ۔ چار ارکان مجلسِ مقننہ جو جماعت کے رکن ہوں، ان کا انتخاب خود ایسے ارکان مجلسِ مقننہ کریں گے جو جماعت کے رکن ہوں۔

ب ۔ چار ارکان جن کو کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ مقرر کرے گی۔

ج ۔ چار ارکان جن کو جماعت کے جلسۂ عام میں ہر سال بہ ماہ آبان منتخب کیا جائے گا۔

انتخاب عہدہ داران و ارکان مجلسِ عاملہ

ف۱۲ ۔ الف۔ جماعت کے جملہ عہدہ داران اور حسب ف۱۱ ضمن ج مجلسِ عاملہ کے چار ارکان کا انتخاب خفیہ رائے دہی کے ذریعے بہ ماہ آبان جلسۂ عام میں ہوا کرے گا جس کے انعقاد کی اطلاع معتمد جماعت کم از کم ایک ہفتہ قبل ارکان جماعت کو دے گا۔

ب ۔ کوئی رکن نہ تو انتخاب میں امیدوار ہو سکے گا، اور نہ رائے دے سکے گا تا وقتیکہ اس نے اپنے ذمے کے جملہ مطالباتِ رقمی ادا نہ کر دیے ہوں۔

ج ۔ جماعت کے صدر کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کا رکن ہو۔

فرائض و اختیاراتِ عہدہ داران

۱۳ ۔ صدر، جماعت کا اعلیٰ عہدہ دار ہوگا، اور اس کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔

الف ۔ جماعت کے عام مفاد کی نگرانی کرے گا۔

ب ۔ مجلسِ عاملہ اور جلسۂ عام کی صدارت کرے گا۔

ج ۔ ہر جلسے میں اسی نوع کے جلسۂ ماقبل کی روئداد سُن کر ارکانِ حاضر کے حسب صواب دید توثیق کرے گا۔

د ۔ جن جلسوں میں وہ صدر ہو، ان کی ترتیب و تنظیم پر نگرانی رکھے گا، اور قواعد کی توجیہ و تاویل کا مجاز ہوگا۔

ھ ۔ بہ صورت تساوی آرا اس کو فیصلہ کن رائے بھی دینے کا اختیار ہوگا۔

و ۔ جماعت کے کاروبار کی اجرائی میں قواعدِ جماعت کے بہ موجب مختلف عہدہ داروں اور ارکانِ جماعت کو مناسب ہدایات دے گا۔

نایب صدر

۱۴ ۔ نایب صدر، صدر کے غیاب میں فرائض صدارت انجام دے گا، اور ان اُمور کی تکمیل کا ذمہ دار ہوگا جو صدر اس کے تفویض کرے۔

معتمد

۱۵ ۔ معتمد کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔

الف ۔ جماعت کے تمام ملوکات ۔ رجسٹرات ۔ روئداد ۔ کاروبار تنظیم اور دیگر متعلقہ اُمور کی نگرانی۔

ب ۔ صدر کے مشورے سے مجلسِ عاملہ کے جلسوں کا انعقاد۔

ج ۔ صدر کی منظوری سے ایسے ملازمین کا تقرر جن کی ماہوار پندرہ روپیے سے زیادہ نہ ہو۔

د ۔ جماعت کی رکنیت کے امیدواروں کے نام بہ موجب ۵ ضمن ج منظوری کی غرض سے مجلس عاملہ میں پیش کرنا، اور بہ موجب ۵ ضمن الف و ب ارکان کے ناموں سے

مطلع کرنا، اور ارکان سے چندہ وصول کرنا۔

ھ۔ عہدہ داروں اور ارکان مجلس عاملہ کے انتخابات کا کم از کم پندرہ روز قبل اعلان کرے گا اور مجلس عاملہ کی منظوری سے جملہ انتظامات عمل میں لائے گا۔

و۔ جماعت کے ارکان کا رجسٹر اور مجالسِ مقننہ سرکار عالی کے ارکان کا رجسٹر صحیح اور درست حالت میں رکھے گا۔

شریکِ معتمد

۱۶۔ شریکِ معتمد، جماعت کے معتمد کا شریکِ کار اور معاون ہوگا، اور معتمد کی عدم موجودگی میں اس کے جملہ فرائض ادا کرے گا۔ مجلسِ عاملہ معتمد کے بعض فرائض شریکِ معتمد کے سپرد کرسکے گی۔

خازن

۱۷۔ خازن کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔

الف۔ جماعت کے حسابات کا ذمہ دار رہنا۔

ب۔ ہر ماہ مجلسِ عاملہ میں آمد و خرچ کا گوشوارہ پیش کرنا۔

ج۔ ہر سال تمام حسابات کی تنقیح مجلس عاملہ کے مقرر کردہ تنقیح سازوں سے کرانا، اور اس کی رپورٹ مجلسِ عاملہ میں پیش کرنا۔

مالیات

۱۸۔ جماعت کے مالیات کا انتظام حسب ذیل طریقے پر ہوگا:۔

الف۔ ہر سال انتخاب عہدہ داران کے بعد خازن اور معتمد، آمدنی اور خرچ کا موازنہ مرتب کرکے مجلسِ عاملہ میں پیش کریں گے۔ یہ موازنہ مجلسِ عاملہ کی رائے کے ساتھ جماعت کے جلسۂ عام میں بہ غرض منظوری پیش کیا جائے گا۔

ب۔ موازنۂ منظورہ کے اندر رقم خرچ کرنے کا اختیار معتمد کو بہ منظوریٔ صدر حاصل ہوگا۔

ج۔ خازن کو اختیار نہ ہوگا کہ جماعت کی کوئی رقم زاید از پندرہ روپیے اپنے پاس رکھے۔

د۔ جماعت کی رقم کسی بنک میں بہ منظوریٔ مجلسِ عاملہ رکھی جائے گی۔

ھ۔ بنک سے رقم کی داد و ستد صدر کی دستخط سے ہوا کرے گی۔

مجلسِ عاملہ کے فرائض و اختیارات

۱۹ـ مجلسِ عاملہ کے فرائض و اختیارات حسب ذیل ہوں گے:-

الف۔ خازن و معتمد کے پیش کردہ موازنہ پر جلسۂ عام میں پیش کرنے سے قبل غور کرنا۔

ب۔ ان ارکان کی شرکت جماعت کی منظوری جن کے نام بہ موجب ۵ ضمن ج پیش ہوں۔

ج۔ جماعت کی شاخوں کا قیام۔

د۔ جماعت کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے کاروبار کے طریقے سوچنا، اور ان کے عمل میں لانے کے ذریعے اختیار کرنا۔

ھ۔ ملازمین جماعت کی عام نگرانی کرنا، اور بہ صورتِ عدم کارگذاری تنزل یا برطرفی عمل میں لانا۔

و۔ حساباتِ جماعت کی تنقیح کے لیے سالانہ تنقیح سازوں کو مقرر کرنا۔

ز۔ کاروباری اور عام جلسوں کے انعقاد کی تاریخ مقرر کرنا، اور ان کے انتظامات کی بابت معتمد کو ہدایت دینا۔

۲۰ـ اگر جماعت کا کوئی عہدہ دار یا مجلسِ عاملہ کا کوئی رکن تحریری اطلاع کے بغیر مجلسِ عاملہ کے تین جلسوں میں موجود نہ رہے تو اس کو جماعت کے عہدہ یا مجلس عاملہ کی رکنیت سے مستعفی سمجھا جائے گا، اور مجلسِ عاملہ باقی ماندہ مدت کے لیے دوسرا انتخاب عمل میں لائے گی۔

۲۱ـ قواعدِ ہذا کی مناسب تعمیل کے لیے مجلسِ عاملہ جماعت کے جلسۂ عام کی منظوری سے ذیلی قواعد مرتب کرے گی، ان قواعد کی منظوری کابینۂ انجمنِ طیلسانیین عثمانیہ سے عمل میں آنا ضروری ہوگا۔

عام جلسے

۲۲ـ جلسۂ عام سال میں کم از کم ایک مرتبہ انتخاب عہدہ داران اور سالِ ماسبق کی کارروائیوں پر بحث و تمحیص کے لیے ماہ آبان میں منعقد ہوگا، اور پہلی ششماہی کے ختم پر جماعت کے عام کاروبار پر غور کرنے کے لیے بھی ایک جلسۂ عام منعقد ہوگا، لیکن مجلسِ عاملہ اگر چاہے تو کسی ضروری امر کے

تصفیہ کے لیے غیر معمولی عام جلسے منعقد کر سکے گی۔ نیز اگر جماعت کے (۱۵) ارکان معتمد سے کسی خاص کارروائی کے لیے غیر معمولی جلسہ عام کے انعقاد کی تحریری خواہش کریں تو معتمد کا فرض ہوگا کہ یہ اطلاع مجلس عاملہ دو ہفتے کے اندر ایسا جلسہ طلب کرے۔

۲۳۔ الف۔ کوئی عہدہ دار جماعت یا رکن مجلس عاملہ اپنے فرائض کی ادائی میں ایسا تساہل یا غفلت کرے جس سے ہرج کار واقع ہو تو وہ جلسہ عام ۲/۳ آراء سے اپنے عہدے یا رکنیت سے سبک دوش ہو جائے گا۔

ب۔ اگر کوئی رکن جماعت اپنے اقرار نامہ یا پابندئی قواعد کی خلاف ورزی کرے تو مجلس عاملہ کے ارکان حاضر کی ۳/۴ اکثریت سے رکنیت جماعت سے خارج کر دیا جائے گا، اور آیندہ چھ مہینے کے اندر اس کی شرکت مکرر کی درخواست پر غور نہ ہوگا۔

جلسوں کا نصاب

۲۴۔ جماعت کے مختلف جلسوں کا نصاب حسب ذیل ہوگا:-

جلسہ عام ...... ۱۵ ارکان

مجلس عاملہ ...... ۵ ارکان

نصاب کے مکمل نہ ہونے سے ہر نوعیت کا جلسہ ملتوی ہو جائے گا۔ اگر دوبارہ جلسہ منعقد ہو تو اس صورت میں جلسہ عام کے لیے (۷) ارکان اور مجلس عاملہ کے لیے تین ارکان کا موجود ہونا ضرور ہوگا۔

جلسوں کی اطلاع

۲۵۔ معتمد کا فرض ہوگا کہ جلسوں کی تاریخ سے اتنی مدت قبل جو ہر جلسے کے محاذی ذیل میں درج ہے ارکان متعلقہ کو اطلاع دے:-

ماہانہ جلسہ مجلس عاملہ ..... ۴ روز

غیر معمولی جلسہ مجلس عاملہ ..... ۲۴ گھنٹے

معمولی جلسہ عام ..... ۷ روز

غیر معمولی جلسہ عام ..... ۲ روز

۲۶ - اگر مجلسِ عاملہ ضرورت سمجھے تو علاوہ سالانہ جلسۂ عام کے جماعت کی ایک عام کانفرنس سال کے کسی زمانے میں منعقد کرسکے گی اور اس کی صدارت کے لیے علاوہ جماعت کے صدر کے کسی اور ممتاز شخص کو منتخب کرسکے گی۔

عارضی انتظام

۲۷ - جماعت کی مجلسِ عاملہ کی تشکیل ہونے اور ارکان مجلس عاملہ کا انتخاب عمل میں آنے تک جماعت کے عاملانہ کاروبار ایک ایسی مجلس انجام دے گی جس کا انتخاب کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کرے گی۔

اقرار نامہ حسب دفعہ ۸

میں جماعت اتحاد و ترقی حیدر آباد کا رکن بننا چاہتا ہوں اور عہد واثق کرتا ہوں کہ تاریخ شرکت سے جماعت مذکور کے قواعد کی ہر طرح پابندی اور اغراض و مقاصد کی تکمیل کروں گا۔

تبصرے

تحریک ترقی مملکت آصفیہ۔ از خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ)

عہد حاضر میں مملکت آصفیہ اپنی ترقی کے ایک خاص مرتبہ پر فائز ہے۔ اعلیحضرت آصف سابع خلد اللہ ملکہ کی اورنگ نشینی کے جشن سیمیں کے موقع پر نواب سہراب نواز جنگ بہادر آنجہانی کے ورثاء نے "ممالک محروسہ سرکار عالی کے ایک باعزت اور خوش حال مستقبل کی تدابیر اور مسایل" کے موضوع پر مسابقتی مقالے لکھوائے عثمانیہ طیلسانی برادری کے رکن رکین جناب خواجہ حمید احمد صاحب کا مقالہ اول اور قابلِ انعام (صمادؔ) قرار پایا۔ یہ اسی مقالے کی کتابی صورت ہے۔ اس کتاب میں ملک کے خوش حال اور باعزت مستقبل کے اساسی اصول پر بحث کے بعد ملک کی زندگی کے مختلف شعبوں کے مسایل، ان کی ترقی کے مواقع اور امکانات، ذخائر اور وسائل پر جامعیت کے ساتھ نہایت خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

ملکی صنعت و حرفت کی ترقی کے امکانات اور ملکی سرمایہ کے استعمال کے ذرایع سے متعلق ابواب کو ہم نے خصوصی توجہ کا مستحق پایا۔

ہمارے ملک میں مختلف مسایل کے تعلق سے اعداد و شمار کی فراہمی کا کام متمدن مغربی ممالک کے مقابلے میں نہایت ابتدائی منزلوں میں ہے۔ ایسے مسایل پر ایک سنجیدہ، محققانہ اور عالمانہ تنقید اور تبصرے کے لیے ایسا مواد لابد ہے۔ اس سلسلے میں بڑی محنت اور کاوش سے مصنف نے متعلقہ منتشر مواد فراہم کیا ہے اور اسے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔

ابواب کے مندرجہ اعداد و شمار کے علاوہ کتاب کے آخر میں چند تقابلی گراف و اعداد و شمار کے تختے ملیں گے جنھیں بڑی محنت اور خوبی سے ترتیب دیا گیا ہے۔

اب حیدرآباد میں تعلیم یافتہ لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد خاصی ہوگئی ہے لیکن ابھی تک اکثر

صاحبانِ قلم خاص ادبی موضوعات یا صرف افسانوں پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ یہ ہماری بڑی کمزوری ہے، اور ہماری زبان اور ادب کی بڑی محرومی ہے۔ ہمیں زندگی کے اہم اور روزمرّہ کے مسایل پر علمی روشنی ڈالنی چاہیئے، اس سے نیا اور ترقی پذیر ادب پیدا ہوگا۔ جناب خواجہ حمید احمد صاحب نے اس باب میں رہنمائی کے فرائض انجام دیے ہیں۔

بیان اور زبان دونوں موضوع بحث کے مناسب حال ہیں۔ اُردو کو یہ اسالیب زیادہ تر جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ اصحاب کی بدولت نصیب ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں کوئی جملہ مزید سُلجھے ہوئے پیرایہ میں ادا کیا جا سکتا ہے، امید ہے کہ آیندہ اشاعت کے موقع پر یہ اصلاح ہوجائے گی۔

کتابت جلی اور واضح۔ طباعت روشن، سرِ ورق مجلا اور مصوّر ہے۔ کاغذ سفید اور ستھرا۔ اعلیٰحضرت بندگان عالی کی تصویر سے بھی کتاب مُزیّن ہے۔

مصنف سے ترپ بازار سابق عمارت دفاتر صرف خاص مبارک حیدر آباد دکن کے پتے پر یا دیگر مشہور کتب فروشوں سے مل سکتی ہے۔

اُردو ادب بیسویں صدی میں ۔ تالیف مولوی سید علی حسنین صاحب زیبا ام۔اے (عثمانیہ)۔

طیلسانیین عثمانیہ کی مجلس علمیہ نے اپنے ذمے ایک خدمت یہ بھی لی تھی کہ ام۔ اے کی جماعتوں کے لیے جو تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں، ان میں سے اچھے مقالے منتخب کرکے پہلے تو قسط وار مجلہ طیلسانیین میں شایع کیے جائیں، پھر کتابی صورت میں ان کی اشاعت ہو۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"یہ مقالہ ۱۸۵۷ء کے قریب سے شروع ہوکر ۱۹۳۳ء کے ادبی ہنگاموں پر ختم ہوتا ہے اس کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے نظم و نثر" اس میں مصنف نے عہدِ انقلاب اور عہدِ اضطراب کے ادبی انقلاب، اس کے اسباب اور آثار کا ذکر کیا ہے۔ اُردو ادب و شعر کے مختلف شعبوں اور اصناف کی تبدیلی اور ترقی دکھائی ہے۔

ہماری زندگی اور خیالات کے ساتھ ساتھ ہمارا ادب بھی چلتا اور بدلتا رہا۔ عہد بہ عہد کے مشاہیر نظم و نثر اور ان کی خصوصیات پر اجمالی نظرِ تنقید ڈالی گئی ہے یہ ہمارے جدید ادب کا ایک آئینہ ہے۔
تحقیق کی ابتدائی منزل میں ہر شخص سے کچھ نہ کچھ لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں، ایسی بعض مثالیں اس کتاب میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن فی الجملہ کتاب نہایت مفید ہے۔

زبان صاف، سلیس اور بیان دلچسپ ہے۔

قیمت صرف (۱۲/ر) ہے۔ دفتر انجمن طیلسانیین عثمانیہ یا مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

قواعد عربی حصہ اول ۔ تالیف حکیم مولوی صبغتہ اللہ صاحب لکچرار سٹی کالج۔

عربی زبان دنیا کی مستند اور مسلمہ زبانوں میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے ایشیا میں وسیع ترین زبان ہے۔ وہ دنیا کے سب سے زیادہ آدمیوں کی مادری زبان ہے۔ غیر یورپی زبانوں میں بہ قول آقبالؔ سب سے زیادہ تابناک مستقبل رکھتی ہے۔ دنیا کے ساٹھ ستر کروڑ انسانوں کی واحد مذہبی زبان ہے۔

اس کی قواعد وسیع اور نہایت مرتب و مدوّن ہے۔ پرانا طریق تعلیم و تفہیم طلبا پر شاق گذرتا تھا وہ زیادہ وقت میں کم سیکھتے تھے۔

ادھر کئی سال سے مسلسل کوشش ہو رہی ہے کہ اس کے قواعد (گرامر) کو سہل اور آسان طرز میں مرتب کیا جائے تاکہ سیکھنے والے جلد اور آسانی سے سیکھ لیں۔

جناب حکیم صبغتہ اللہ صاحب یہاں عربی زبان کے کامیاب اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں! اس سلسلے میں ان کی کوشش امتیازی شان رکھتی ہے! اپنے تجربے اور خیال کی مدد سے انھوں نے یہ کام کیا ہے۔ طلباء کے ماحول مدرسہ اور روزمرّہ کا اس میں خاص لحاظ کیا گیا ہے۔ ہر قسم کی مشقیں دی ہیں عربی کے مبتدیوں کو اس سے خاص فایدہ اُٹھانا چاہیئے۔ کتاب صاف ستھری چھپی ہے۔

ملنے کا پتا:۔ صحن منزل حسینی علم، بارہ گلی۔ قیمت صرف (۶/ر) حالی۔

"س"

۱۴۰

تحریک ترقی مملکت آصفیہ

مصنفہ مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ)

قیمت مجلد (۳) روپیہ سکہ عثمانیہ

اس کتاب میں مملکت آصفیہ کی ہرجہتی ترقی کے لیے نہایت جامع اور منضبط لائحۂ عمل اہل ملک کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے مملکتِ آصفیہ کے شاندار قرونِ ماضیہ اور دَورِ عثمانی کے زرین کارناموں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آیندہ ترقی کے امکانات پر وضاحت سے بحث کی گئی ہے۔

مملکت آصفیہ کے قدرتی وسایل زرعی ترقی کے مواقع، دیہی تنظیم، صنعت وحرفت کی ترقی کے امکانات معدنی ذخائر، تجارتی وسایل، ملکی سرمایہ کے استعمال کے ذرایع اور حکومت کے نظم ونسق کے متعلق کافی معلومات فراہم کیے گئے ہیں۔ اردو زبان میں مملکت آصفیہ کے متعلق اس قدر جامع اور مفید کتاب اب تک شایع نہیں ہوئی اس کی اشاعت میں معنوی خوبیوں کے ساتھ حسنِ طباعت کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے نقشوں اور تختہ جات کے ذریعے ملک کے دقیق مسایل کو نہایت سہل بناکر پیش کیا گیا ہے، اور جگہ جگہ برطانوی ہند اور دیگر ریاستوں سے یہاں کے حالات کا مقابلہ کرکے دکھایا گیا ہے۔

یہ کتاب اپنی بے شمار خوبیوں کی وجہ سے سرکاری محکمہ جات و دیگر حلقوں میں بہت مقبول ہو رہی ہے اور قابل مصنف کو اس کے صلہ میں پانچ سو روپیے کا انعام بھی عطا کیا گیا ہے یہاں کے اور برطانوی ہند کے اخبارات میں اس پر بہت اچھے تبصرے کیے گئے ہیں۔

ملنے کے پتے۔ ۱۔ نور احمد مہتمم دفتر اشاعت تحریک ترقی مملکت آصفیہ
وجملہ مطبوعات حیدرآباد۔ دہلی۔ لکھنؤ و لاہور مقابل زنانہ اسکول نام پلی حیدرآباد دکن

۲۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

۳۔ مکتبۂ علمیہ چارمینار حیدرآباد دکن

۴۔ دفتر مجلہ طیلسانئین "

سلسلۂ انجمن اصلاح العشیرہ

۱۔ ریاض النسواں، اُردو تالیف قاضی بدرالدولہ۔ فقہ شافعی کی مستند کتاب۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ اور زکواۃ وغیرہ مسایل روزمرہ۔ کاغذ چکنا، رائل سائز (۱۵۶) صفحات قیمت ایک روپیہ دو آنے۔

۲۔ تفسیر فیض الکریم تالیف قاضی بدرالدولہ و مفتی محمد سعید خاں، عربی مستند تفاسیر کا خلاصہ اُردو، (۸) جزو۔ قیمت چار روپیے۔

۳۔ تحفۃ الخلان، تالیف مولوی خلیل اللہ صاحب سابق مددگار معتمد مالگزاری، فقہ شافعی۔ معاملات بیع و شریٰ و ترکہ وغیرہ کے مسایل۔ کاغذ چکنا۔ رائل سائز (۱۷۶) صفحات قیمت عہ۔

۴۔ فوایدبدریہ، اُردو، تالیف قاضی بدرالدولہ، پیغمبر اسلام کی سیرت میں مستند کتاب عربی مستند کتابوں کا بہترین اُردو خلاصہ، رائل سائز۔ ۶ پونڈی چکنا کاغذ (۳۰۴) صفحات، لکھائی و چھپائی بہتر قیمت مجلد ۴ روپیے غیر مجلد تین روپیے۔

۵۔ عہد سلف، تالیف مولوی محمد مرتضیٰ، ۱۳ سو سال کی تاریخ سلطنت اسلامی پر دقت نظر کے ساتھ دلچسپ اسلوب میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ رائل سائز (۱۲۰) صفحات قیمت عہ۔

۶۔ خواتین عہد عثمانی، تالیف نصیرالدین صاحب ہاشمی۔ عہد آصف سابع میں خواتین دکن کی ترقی کا تذکرہ قیمت عہ۔

۷۔ زراعت دکن۔ تالیف مولوی قادر مرتضیٰ حسین صاحب۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کے مختلف موسموں کی کاشت کا احوال قیمت ۸ر۔

۸۔ طب قدیم و طب جدید۔ تالیف حکیم محمد اسمعیل صاحب۔ طب یونانی سے عصری طب کا تقابل قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ

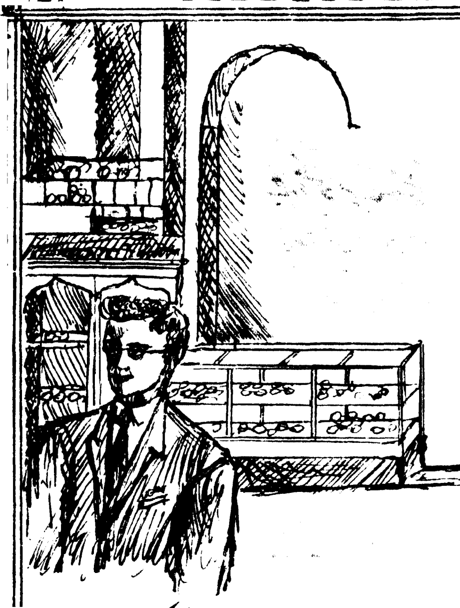
حافظ عبدالعظیم صاحب معتمد کتب خانہ سعیدیہ جام باغ ترپ بازار حیدرآباد دکن

رسید کتب

سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی کی حالیہ شایع شدہ (۴۳) کتابیں دفتر انجمن میں موصول ہوئی ہیں جن کی نسبت ہم جناب مولوی محمد الیاس برنی صاحب ناظم سررشتہ کے ممنون ہیں یہ کتابیں کتب خانۂ انجمن طیلسانیین عثمانیہ میں شریک ہیں اور ان سے تحت قواعد کتب خانہ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:-

۱ - طبیعیات حصہ ششم برق (ڈنکن اسٹارلنگ) ترجمہ مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب
۲ - محکم کنکریٹ کی تجویز جلد اول نظری (فیبر بووی) ترجمہ مولوی محمد ضیاءالدین صاحب
۳ - اصول نفسیات جلد اول (ولیم جیمس) ترجمہ مولوی احسان احمد صاحب
۴ - تاریخ انگلستان حصہ اول (سیرل رانسم) ترجمہ مولوی سید ہاشمی صاحب
۵ - تاریخ یونان جلد چہارم (اڈولف ہوم) ترجمہ پروفیسر محمد ہارون خاں صاحب شروانی
۶ - اصول وطریق محصول (آرمیٹج سمتھ) ترجمہ پروفیسر محمد حبیب الرحمٰن صاحب
۷ - علم ہندسہ نظری (جی - ایچ - اسکوتھ) ترجمہ مولوی محمد نذیر الدین صاحب
۸ - حکومت ہائے یورپ حصہ دوم (یف - اے - آگ) ترجمہ مولوی قاضی تلمذ حسین صاحب
۹ - طب قانونی وسمومیات حصہ اول (ڈکسن میان ڈبلیو - اے برنڈ) ترجمہ ڈاکٹر محمد حسین صاحب
۱۰ - اصول معاشیات جلد اول (ٹازگ) ترجمہ مولوی رشید احمد صاحب
۱۱ - فلسفہ نتائجیت (ولیم جیمس) ترجمہ مولوی عبدالباری صاحب ندوی
۱۲ - ہندسی مخروطات، تالیف مولوی شیخ برکت علی صاحب و خواجہ محی الدین صاحب
۱۳ - مٹی کا کام (سلسلۂ اشاعت رڑکی) ترجمہ مولوی سید منظور حسین صاحب
۱۴ - علم الولادت حصہ اول (دس اساتذہ) ترجمہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن صاحب

۱۵۔ عمل طب حصہ اول (ٹیلر) ترجمہ ڈاکٹر محمد عثمان خاں صاحب
۱۶۔ جراحی اطلاقی تشریح حصہ اول (سر یف۔ ٹریوز) ترجمہ ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب
۱۷۔ جراحی اطلاقی تشریح حصہ دوم (سر یف۔ ٹریوز) ترجمہ ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب
۱۸۔ طب قانونی و سمومیات حصہ دوم (جے۔ ڈکسن میان۔ ڈبلیو۔ اے برنڈ) ترجمہ ڈاکٹر محمد حسین صاحب
۱۹۔ اصول نفسیات جلد دوم (ولیم جیمس) ترجمہ مولوی احسان احمد صاحب
۲۰۔ نظریہ مبادلات خارجہ (رائٹ آنریبل وائکونٹ گاسچین) ترجمہ پروفیسر محمد حبیب الرحمن صاحب
۲۱۔ یورپ سولھویں صدی میں (اے۔ یچ۔ جانسن) ترجمہ مولوی رحیم الدین صاحب
۲۲۔ زر اور ذرائع مبادلہ (ڈبلیو۔ یس۔ جیونس) ترجمہ مولوی احمد محی الدین صاحب
۲۳۔ تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج عفیف) ترجمہ مولوی فدا علی صاحب طالب
۲۴۔ تاریخ دولت عثمانیہ جلد اول (ڈی لا، جانکیو یری) ترجمہ مسٹر ایم کھتال و مولوی سید احمد صاحب و مولوی سید حمید الدین صاحب
۲۵۔ نظریہ خیر و شر کی پہلی کتاب (یچ۔ راشڈل) ترجمہ مولوی خواجہ عبد القدوس صاحب
۲۶۔ تاریخ الکامل عہد بنی عباس حصہ اول ترجمہ مولوی سید ابو الخیر صاحب مودودی
۲۷۔ ہند کے سیاسی مسلک کا نشو و نما (جی۔ اینڈرسن۔ یچ صوبیدار) ترجمہ مولوی محمد عبد الستار صاحب
۲۸۔ آئین اکبری حصہ اول ترجمہ مولوی فدا علی صاحب طالب
۲۹۔ اصول معاشیات جلد دوم (ٹاسگ) ترجمہ مولوی رشید احمد صاحب
۳۰۔ مبادی نباتیات حصہ اول (لوسن۔ ساہنی) ترجمہ پروفیسر محمد سعید الدین صاحب
۳۱۔ نظری علم الحیل (جے۔ یچ۔ جیمس) ترجمہ مولوی محمد نذیر الدین صاحب
۳۲۔ ذرہ اور استوار اجسام کا علم حرکت (یس۔ یل۔ لونی) ترجمہ مولوی شیخ برکت علی صاحب
۳۳۔ عملی نباتیات (آر۔ بی۔ کے۔ رنگاچاری) ترجمہ مولوی عبد الباری صاحب
۳۴۔ نسیجیات حصہ اول (سر ای۔ شارپے۔ شافر) ترجمہ ڈاکٹر محمد عثمان خاں صاحب
۳۵۔ تاریخ ہند برائے فوقانیہ تالیف مولوی سید ہاشمی صاحب (بار ششم)
۳۶۔ انڈیا ان پرتگیز لٹریچر تالیف مس آمنہ پوپ صاحبہ
۳۷۔ پیمائش حصہ دوم (سلسلہ اشاعت رڑکی) ترجمہ مولوی رضاء اللہ صاحب




شیخ بالے چوڑی فروش

مطبع مکتبہ ابراہیمیہ

مجلۂ طیلسانئین

حیدرآباد دکن

اردو کی بلند پایہ علمی تصنیفات

جامعہ عثمانیہ کے پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے محققانہ مقالے

جن کا

ہر کتب خانہ، مدرسہ، دارالمطالعہ اور علمی ادارہ میں موجود رہنا ضروری ہے

۱۔ **اردو ادب بیسویں صدی میں** موجودہ صدی کے اردو ادب پر ایک سیر حاصل تنقیدی مقالہ
مولفہ سید علی حسنین صاحب زیبا ام اے (عثمانیہ) قیمت بارہ آنے (۱۲ر)۔

۲۔ **عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست** ۔ عادل شاہی دور نوابیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ مولفہ سید علی محسن صاحب ام اے (عثمانیہ) قیمت دو روپیہ (عہ)

۳۔ **سلطان احمد شاہ ولی بہمنی** ۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ
مولفہ ظہیر الدین صاحب ام اے (عثمانیہ) قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ۴ر)

۴۔ **موضع دویلی کی معاشی تحقیق** ۔ از محمد ناصر علی صاحب ام اے (عثمانیہ) (زیر طبع)

ارکین انجمن اور خریداران مجلہ طیلسانئین سے نصف قیمت

کتب فروشوں کے ساتھ خاص رعایت ۔ بغرض سہولت کتابیں

تبادلہ میں بھی دیجاتی ہیں

۱۔ مجلہ طیلسانئین (انجمن طیلسانئین عثمانیہ) حیدرآباد دکن۔

۲۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔

شمارہ سوم
سنہ ۱۳۴۸ ف

جلد سوم
سنہ ۱۹۳۹ء

مجلہ طیلسانئین

انجمن طیلسانئین عثمانیہ کا علمی و ادبی

سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت

مقاصد

۱۔ علمی و ادبی مضامین، معیاری نظمیں اور جامعۂ عثمانیہ کے ام اے اور ایم ایس سی کی ڈگریوں کیلئے پیش شدہ تحقیقاتی مقالات بالاقساط شائع کرنا۔

۲۔ اردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ شائع کرنا۔

۳۔ انجمن طلیسانئین عثمانیہ کی مختلف سرگرمیوں کی روئداد کی اشاعت۔

۴۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گی۔

قواعد

۱۔ یہ رسالہ بہمن، اردی بہشت، امرداد، اور آبان مطابق جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

۲۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم ایک سو صفحے ہوگی۔

۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

چندۂ مجلۂ طلیسانئین

خریداران حیدرآباد سے عا؍ سالانہ، فی پرچہ ۸؍

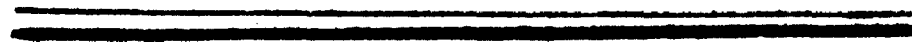
خریداران بیرون حیدرآباد سے عا؍ ۱۲ سالانہ فی پرچہ ۱۲؍
مع محصول ڈاک

اراکین انجمن طلیسانئین عثمانیہ سے عہ سالانہ
علاوہ محصول ڈاک

نرخ اشتہارات

مقدار		سال بھر	فی اشاعت
پورا صفحہ	سرورق	عـہ	سے
	اندرونی	معہ	عا؍
آدھا صفحہ	سرورق	صہ	عـعـہ ۸؍
	اندرونی	سے ۱۲؍	عـعـہ ۲؍
پاؤ صفحہ		عا؍	۱۰؍
فی سطر		۸؍	۳؍

فہرست مضامین



اداریہ

ہمیں افسوس ہے کہ رسالہ مجلۂ طیلسانئین کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی ۔ اتنی تاخیر کہ اکثر خریداران کو اس کے بند ہو جانے کا شبہ ہوا۔ اس تاخیر کا سب سے بڑا سبب مالی مشکلات کے سوا اور کچھ نہیں تھا جس کا اظہار گذشتہ شمارہ میں کیا جا چکا ہے۔ سرپرستانِ مجلہ کی ہمت افزائی اور قدر شناسی سے اس پر غلبہ حاصل کرنے کی مناسب تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں اور خاص طور پر کوشش کی جا رہی ہے کہ رسالہ وقت پر شائع ہو۔ پہلی مرتبہ جو تاخیر ہوئی اس کا اثر بعد کے شماروں پر بھی پڑا عنقریب اس نوع کی بے ضابطگیاں رفع ہو جائیں گی

مجلہ طیلسانئین کے علمی و ادبی معیار کو بلند رکھنے کی مسلسل کوشش جاری ہے۔ اس میں مختصر و بلند پایہ تحقیقاتی اور سائنٹیفک مضامین شائع ہوتے ہیں طیلسانئین عثمانیہ کے ترجمان اور سہ ماہی رسالہ ہونے کی وجہ سے اس کا معیار قائم رکھنا ضروری ہے۔ ہمیں جملہ طیلسانئین سے توقع ہے کہ وہ اس معیار کو برقرار رکھنے میں ہماری مدد فرمائیں گے ۔

وقتاً فوقتاً اس میں تصاویر کے چھاپنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ چنانچہ گذشتہ شمارہ میں کارکنان نمائش مصنوعات ملکی ۱۳۴۵ف کا گروپ فوٹو اور اس شمارہ میں مقالہ سے متعلق دو تصاویر شریک کی گئی ہیں ۔

ہماری یہ کوشش ہوگی کہ مجلہ کے اہتمام اور انتظام سے ہمارے معاونین مطمئن ہوں اور ہمیں توقع ہے کہ

وہ اپنی قدردانی کا عملی ثبوت دیں گے یعنے اولاً تو وہ اپنے ذمہ کا چندہ ادا کردیں گے اور ثانیاً مجلہ کی توسیع اشاعت کی جانب توجہ مبذول فرمائیں گے تاکہ ادارہ اپنے کام کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔

اس ترجمان کے اجرا کا ایک مقصد جیسا کہ قبل ازیں ظاہر کیا جاچکا ہے یہ بھی ہے کہ نوجوانانِ مُلک کے ذوقِ علم وادب کی خدمت کے ساتھ ان قابل قدر اور لائقِ اشاعت مقالوں کو بھی بالاقساط شائع کیا جائے تاکہ بالآخر وہ کتابی صورت میں منظر عام پر آئیں جو ام اے وغیرہ کے طلبائے جامعہ عثمانیہ نے لکھے اور جو ان کی عدم استطاعتی کے باعث ممنونِ طباعت نہ ہوسکے۔ چنانچہ اب تک تین ضخیم مقالے جو مستقل کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں اس ترجمان کے ذریعہ شائع ہوکر منظر عام پر آئے۔

اس شمارہ سے محمد ناصر علی صاحب ام اے (عثمانیہ) کا مقالہ "موضع دُوپلی کی معاشی تحقیق" کی اشاعت کا آغاز کیا گیا ہے۔ موصوف نے اس مقالہ کو بڑی محنت، کدوکاوش اور مقامی افراد سے مل کر بڑی عرق ریزی کے بعد صحیح معلومات اور اعداد وشمار کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جابجا مناسب اور موزوں مقامات پر نقشے اور تصاویر بھی شریک کی گئی ہیں جس سے اس کی خوش سلیقگی کا پتہ چلتا ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے اس مقالہ کی بڑی اہمیت ہے۔ توقع ہے کہ دیگر مواضعات اور تعلقات کے لئے یہ اسلوب تحقیق نمونہ کا کام دیگا۔ اور اس طرح نتیجۃً مُلک کی معاشی خوشحالی میں اضافہ کرنے کی جدوجہد استحکام حاصل کرتی جائے گی۔

اس شمارہ میں مندرجہ بالا مقالہ کے علاوہ جو مضامین شریک کئے گئے ہیں وہ اپنی اپنی نوعیت کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

ناظرین کرام کے لئے یہ امر باعث دلچسپی ہوگا کہ جناب عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی یس سی (عثمانیہ) نے دنیا کی رفتار سے باخبر رکھنے کے لئے تاریخی، تعلیمی اور معاشی رفتار زمانہ سے متعلق دلچسپ مضامین مجلہ کے لئے تحریر کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اس شمارہ سے اس کا آغاز بھی ہوگیا ہے۔ طلبا وامیدواران سیول سروِس کے علاوہ ان تمام اصحاب کے لئے یہ سلسلہ مضامین فائدہ مند ثابت ہوگا جو زندگی کی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے ایسی معلومات حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ کا وقت نہیں نکال سکتے۔ ہم موصوف کے

شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس سلسلے میں مجلہ اور ناظرینِ مجلہ کے لئے دل چسپ مواد پیش کرنے کا تہیہ فرمایا ہے۔

مجلہ طیلسانئین کی گزشتہ اشاعت کے بعد مُلک کا اہم ترین واقعہ حیدرآباد میں اصلاحات کا اعلان ہے۔ مذہب کے بعد سیاست ہی اجتماعی زندگی کی سب سے زیادہ ہمہ گیر طاقت ہے۔ وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ زندگی کے سارے شعبوں کو متاثر کرتی ہے۔

طیلسانئین کی برادری کے لئے یہ امر باعث اطمینان ہے کہ مجلس مقننہ میں ان کے لئے دو نشستیں محفوظ کی گئی ہیں طیلسانئین کی صلاحیت اور اہمیت کا یہ عملی اعتراف ایک صحت بخش اصول کا احساس ہے۔

معاشی کمیٹی کی جانب سے اگلے دسمبر میں اعلیٰ پیمانہ پر مُلک کی صنعتوں کی نمائش کا اہتمام شروع ہوگیا ہے۔ اس زمانہ میں اورنیٹل کانفرنس اور ریاضی اور فلسفہ کی کانفرنس بھی منعقد ہو رہی ہیں۔ باہر کے مہمان کثیر تعداد میں شریک ہوں گے۔

اس سلسلہ میں معاشی کمیٹی پوری سرگرمی سے اس امر کی کوشش کر رہی ہے کہ نمائش کے انعقاد سے قبل مملکت آصفیہ کی مصنوعات کی ایک ڈائرکٹری خاص اہتمام کے ساتھ شائع کرے۔ ڈائرکٹری کے سلسلہ میں ایک خوبصورت کتابچہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ ڈائرکٹری کی اشاعت سے توقع ہے کہ نہ صرف مُلک کی گمنام صنعتیں منظر عام پر آجائیں گی بلکہ مُلک میں صنعتی ترقی کے لئے نئی سرگرمی پیدا ہوگی۔

پیام!

از

جناب ماہر القادری صاحب

ہو جو احساس تو پتی بھی ہے تلوار کی دھار
چشمِ بینا ہو تو ذرہ بھی ہے روشن قندیل

زندگی نام ہے اک جذبۂ آزادی کا
یہ وہ نکتہ ہے کہ جس کی نہیں ممکن تحلیل

پھول بن سکتی ہے ہر وقت، دہکتی ہوئی آگ
پر یہ لازم ہے کہ ہو جراءتِ ایمانِ خلیلؑ

اُمتیں فتنۂ تہذیب سے ہوتی ہیں تباہ
اس میں بابل کے مکیں ہوں کہ بنی اسرائیل

عشق ہر وادی و منزل سے گذر جاتا ہے
خواہ لبنان کی چوٹی ہو کہ صیبر کی فصیل

شرط یہ ہے کہ تجھے دعوتِ حق کا ہو شوق
ہر کھنڈر میں تجھے آئے گا نظر "شہرِ جلیل"[۱]

رُوحِ فرعون کو ہے ضربِ کلیمی کی تلاش
منتظر آج بھی ہے معجزۂ رودِ نیل

عشق وہ بزم ہے کمزور ابابیلوں سے
کچلی جاتی ہے جہاں قوتِ اصحابِ فیل

ایک ہی شمع کے پروانے ہیں داؤدؑ و مسیحؑ
ایک ہی ساز کے پردے ہیں زبور و انجیل

مجھ کو یہ دھن کہ رہِ عشق کبھی ختم نہ ہو
تجھ کو یہ ضد کہ ہو افسانۂ دل کی تکمیل

تجھ کو گر دینِ براہیمؑ کی عزت ہے عزیز
ٹھوک دے سطوتِ نمرود کے تابوت میں کیل

سطوتِ جم کو بھی ٹھکرا کے گذر جاتے ہیں
درگہِ عشق و محبت کے گدایانِ ذلیل

اس سے جنگل کے درندوں کی ہے وحشت بہتر
عصرِ حاضر نے تراشی ہے جو تہذیبِ جمیل

کاش فطرت اُسے ہر وقت طلب کر سکتی
ذہنِ شاعر میں جو غلطاں ہے اچھوتی تمثیل

رُوحِ اقبالؒ سے ماہر کو ملا ہے یہ پیام
شعر وہ ہے کہ ہو جس شعر میں نطقِ جبریلؑ

---

[۱] "شہرِ جلیل" (گلیلی)، جہاں حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تبلیغ فرمائی تھی۔

مثنوی کا درجہ اصنافِ شعر میں

از

جناب عبدالقادر صاحب سروری ام۔اے، ال ال بی پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ

ہماری شاعری میں، سب سے اہم صنف مثنوی کی ہے کیونکہ اس میں ایک وسیع مضمون اور مربوط خیال کے نشو و نما کی گنجایش ہے۔ شاعری کی کوئی صنف بھی ہو، بذاتِ خود غیر اہم نہیں سمجھی جاسکتی۔ اچھائی اور برائی صناع میں ہوتی ہے۔ ایک باکمال شاعر پیش پا افتادہ اصناف کو بھی، اپنی وجدانی قابلیت کی مدد سے، بے انتہا بلندی تک پہنچا سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُردو شاعری کی دوسری دو تین اہم اصناف جیسے غزل، قصیدہ اور رباعی، اساتذہ کے افکار کی اتنے عرصہ سے بطورِ خاص زیرِ مشق رہ چکی ہیں، اور ان کے اصلی اور بنیادی موضوعات کے اتنے وسیع پہلو طبع آزمائی کے مرکز رہ چکے ہیں کہ، ایک اعلیٰ صناع کے لیے بھی یہ منزل ذرا کٹھن ہی ثابت ہوتی ہے۔ پھر اگر اس کی طبیعت کی اپج، ان میں کچھ جوہر بھی دکھاتی ہے، تو ان کے پڑھنے والوں کے لیے اس صنف کے لوازم اور شکل خود صنف کی اصطلاحی یکسانیت ناخوش گوار ثابت ہوتی ہے۔ غزل گو شاعر، باوجود اپنی تمام قابلیت کے، اس کے بنیادی عناصر کو قائم رکھ کر استعارے سے کام لینے پر مجبور ہے۔ قصیدے میں، غزل کی وسعت بھی نہیں۔ یہ شعر کی ایک صنف ہے کل شاعری نہیں۔ ہماری شاعری پر یکسانیت کے الزام کا ایک بڑا عنصر، اصناف کی تحدید ہے مضامینِ شعر سے زیادہ، دراصل اسی قید نے بعض اعلیٰ صناعوں کی قابلیتوں کو بھی ضایع کر دیا۔ اب ہمارے روشن خیال نقادوں کو، ان کے افکار، ایک ناقابلِ امتیاز اجزا کی ڈھیر نظر آتے ہیں۔

مثنوی میں کچھ تو اس وجہ سے کہ یہ صنف بہت زیادہ تختۂ مشق نہیں بن سکی، اور کچھ اس کی نوعی وسعت کے سبب، بڑی گنجایش ہے اور شاید یہ گنجایش ہمیشہ باقی رہیگی۔ یہ صحیح ہے کہ صناعی ابتدا میں بھی ایمائی اختصار کی حامل ہوتی ہے اور انتہا پر بھی لیکن محض ایمائی اختصار ہی پوری شاعری نہیں ہے۔ غزل گو کی مثال ایک

شئے کے نقش بنانے والے کی سی ہے اور مثنوی نگار ایک بسیط اور مکمل تصویر بنانے والا صناع ہے اسی لیے غزل میں سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی شعر کی تشنگی باقی رہتی ہے۔ اور یہ، مربوط خیالی، ایک معین مقصد کے تحت، واقعات کے ترکیبی ارتقا، اور متنوع کیفیات اور کائنات کی شاعرانہ تشریح اور توضیح سے پوری ہو سکتی ہے۔ اور یہی مثنوی کے اصلی خد و خال ہیں۔ وہ کہنے کو تو ایک خیالی اور اکثر اوقات ایک فوق الفطرت یا خلاف قیاسی قصہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے ارتقا میں حیات کے بہت سے حسین اور قبیح پہلو آجاتے ہیں اس میں ڈرامائی مواقع، بیانیہ اور توضیح شاعری کی تفصیلات اور طربیہ شاعری کی دل گدازی اور رزمیہ اور قصیدہ کا طمطراق، سب کچھ آسکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ چیزیں تنہا پیش کی جائیں تو شاید اتنی دلکشی کا سامان نہ رکھتی ہوں، لیکن، جب وہ ایک مکمل whole کے ترکیبی عناصر بن جاتی ہیں، تو ان کی دل کشی میں کئی گونا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ایک شاعر، ایک ہزار شعر کی واحد، مربوط نظم کے سرمایہ کے ساتھ، ہزاروں بلند پایہ اشعار کا دیوان بغل میں دبائے ہوئے سخن سنجوں کے گروہوں کو پس منظر میں ڈال سکتا ہے۔

لیکن یہ بات ضرور ہے کہ مربوط خیالی، اطمینان قلب، اور آسایش دماغ کی پیداوار ہے۔ جہاں یہ مفقود ہو، شعرا کا انتشار قلب، اظہار کے، مناسب اور موزوں ذرائع تلاش کر لیتا ہے۔ وہ بہت کچھ بلکہ سب کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن لمحات فرصت اور اطمینان قلب کا اس کو یقین نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ جو موقع مل جائے اسی کو غنیمت سمجھ کر اس سے پورا فائدہ اٹھا لینا چاہتا ہے اور شاید اسی لیے کسی طول طویل تجویز کی بیڑیاں اپنے پیروں میں ڈال کر، وہ اپنے کام کو اتفاقات کے خدشوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے بڑے بوڑھے نقاد اپنی طویل، اور شاید خوش حال زندگی کو مد نظر رکھ کر، اس کی جلد بازی کے خلاف طرح طرح سے زہر اگلتے ہیں، لیکن وہ خلاف فطرت کچھ نہیں کر سکتا۔

ہماری شاعری پر بظاہر کچھ خوش حالی کے دَور بھی گذرے ہیں مثلاً لکھنؤ میں آصف الدولہ اور ان کے جانشینوں کا عہد اردو شعرا کے لئے ہمت افزا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ مختصر سا زمانہ دو تباہیوں کا وسط ہے۔ لکھنو کی آبادی، دلی کے تباہی بردوش شعرا سے ہوئی۔ ان کی اولاد، جو اگلی نسل کے صدموں سے نا آشنا تھی، اور جس کی آنکھ اس "الکہ لٹ" عہد کی خوش بختیوں میں کھلی تھی، موقع سے فائدہ اٹھاتی، اور فطرت کے اقتضا کو پورا کرتی ہے۔ اور، اردو کی چند مثنویاں، اور شاید ایک بڑی مثنوی، وجود میں آتی ہے۔

اس دَور سے آگے بڑھ کر، ہم ایک اور، قدیم تر دَور پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو طویل ترکا ناموں کے لئے

زیادہ موزوں تھا۔ یہ دَور، ایک طویل خوش حالی کا نتیجہ تھا۔ دکن کی بہمنی سلطنت ایک عرصہ کی امن اور آسایش کی زندگی کو ختم کرکے، جب اپنی فطری موت مرتی ہے، تو اس کی پانچ اولادیں اس کی جانشین ہوتی ہیں۔ یہ بیدر کے برید شاہی فرماں روا، احمد نگر کے نظام شاہی حکمران، بیجاپور کے عادل شاہی اور گولکنڈے کے قطب شاہی سلاطین ہیں۔ ان میں سے بعض نو وارد تھے، اور بعض نو دولتی، لیکن ماحول انھیں بہت جلد اپنے اندر جذب کرلیتا ہے اور تربیت دے کر ادب اور فنون لطیفہ کے بڑے سرپرست بنادیتا ہے۔ صناعی، حُسن کاری اور ادبیت کے تخم جو فضا میں بکھرے ہوئے تھے، وہ ان کی سرپرستیوں میں نشو ونما پانے لگتے ہیں۔ اور تھوڑے عرصہ میں ان میں سے بعض سلاطین کے دربار، شعرا اور صناعوں کا قابل رشک مرکز بن جاتے ہیں۔

نظام شاہی حکمران اس معاملے میں قابل رحم ہیں۔ اپنی جائے وقوع کی قیمت انھیں بہت گراں ادا کرنی پڑی۔ سب سے زیادہ شمال میں ہونے کی وجہ سے یہ ہمیشہ مورد آفات رہے، شمال کے طاقتور شہنشاہوں کی شمشیریں ہمیشہ ان کے سروں پر چمکتی رہیں اور امن و عافیت ہمیشہ تہ و بالا ہوتا رہا۔ رزم آرائیوں سے انھیں بہت کم فرصت ملی۔ تاہم وہ ایک عظیم الشان تمدن کے پاسبان بنے رہے، گو خود انھوں نے کچھ زیادہ ادبی کارنامے نہیں چھوڑے، لیکن آگے زیادہ جنوب کی دو سلطنتوں یعنے بیجاپور اور گولکنڈے کے لئے یہ سپر بنے رہے۔ اور انھیں ایک نفیس ادبی مذاق اور شاعری کو نشو ونما پانے کا موقع دیا۔ گویا بیجاپور اور گولکنڈے کے ادبی کارناموں کی آبیاری، انھیں کے شجاعوں کے خون سے ہوتی رہی۔ اس ماحول میں بیجاپور اور گولکنڈے کی ادبی فضا کا فروغ نہ پانا خلاف فطرت تھا۔

بیجاپور کا زرخیز خطہ، اپنے سلاطین کی نفاست پسندیوں اور صنعت گرانہ اپج کی بدولت، تاریخ ہند میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ اسی طرح گولکنڈے کی جواہر خیز معدنوں کے ساتھ ساتھ، اس کے ادبی جواہر ریزے بھی ہمیشہ تخیل کا مرکز بنے رہینگے۔

قدیم تر عہد کے اُردو کارناموں میں، امن و آسایش کے عہد کی پیداوار کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں ہے، بلکہ اس عہد کے امن زا ماحول نے، شعرا کے حوصلوں کو ہمیشہ بلند رکھا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا ایک ایک کارنامہ، سینکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس طرح کے طویل شعری کارنامے، اُردو کے ارتقا کے دوسرے ادوار میں بہت کم پیدا ہوسکے۔ اس میں شک نہیں کہ

اکثر شعرا نے بڑے بڑے ضخیم دیوان چھوڑے جن کے اشعار کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن یہ دیوان زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہیں، کچھ قصیدے، رباعیاں، قطعے یا ترکیب اور ترجیع بند بھی ہیں۔ اور بعض شعرا کے دیوانوں میں مختصر مثنویاں بھی شامل ہیں جیسے حاتم، میر، سودا، غالب، مومن وغیرہ لیکن سوائے سوز، میرحسن، نسیم اور نواب مرزا شوق کے مستقل طور پر مثنوی لکھنے کی سعی بہت کم کی گئی۔

اس تحریر کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ ہم مثنوی اور غزل کا شعریت کے لحاظ سے کوئی مقابلہ اور موازنہ کرنا چاہتے ہیں یا مثنوی کو غزل پر مرجح سمجھ رہے ہیں اسی طرح یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے کہ غزل گو شعرا نے ہزاروں اشعار کے جو ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، وہ کسی اعتبار کے قابل نہیں ہیں۔ ہمارا منشا صرف یہ ہے کہ، غزل، رباعی وغیرہ میں جس طرح کے شعری خیالات کے اظہار کی گنجایش ہے، ان کو ختم کرنے کے بعد بھی ذوق شعری کی تکمیل کے لئے، کسی اور چیز کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ غزل ہو یا رباعی، اپنی بہترین شکل میں بھی، منتشر خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اور قطعات یا مختصر مثنویاں کسی خاص واقعے کے خاص پہلو روشنی ڈالتی ہیں لیکن ایک طویل اور مکمل و مربوط کام مثنوی ہی کے ذریعہ پورا ہوسکتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی تکمیل میں غزل، رباعی، قصیدہ یا قطعے، سب سے زیادہ محنت، فکر، ربط خیال، ترتیب اور تعمیر کی ضرورت پڑتی ہے اسی لئے جب ایک ہزار شعر کی اچھی مثنوی تیار ہو جاتی ہے، تو وہ پانچ ہزار شعر کے غزل کے دیوان سے زیادہ اہمیت حاصل کرلیتی ہے۔ یہ محض خیال نہیں، بلکہ واقعہ ہے۔ اثر کی مثنوی "خواب وخیال" ایک چار پانچ سو شعر کا مربوط کارنامہ ہے لیکن خاکے، ترتیب، تعمیر اور تکمیل کے نقطہ نظر سے بے حد ناقص ہے۔ شاعر بظاہر ایک قصے کا آغاز کرتا ہے لیکن وہ اپنی ہیروئن کے سراپا اور خدوخال میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ، دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر، قصے اور اس کے ساتھ مثنوی کو بھی ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک متصوفانہ ذہن، اس کی بے ربطی اور عدم تکمیل میں بھی ربط اور تکمیل پیدا کرسکے لیکن اس سے ایک عام پڑھنے والے کی تشفی نہیں ہوسکتی۔ پھر صناعی کے نقص کا شافی جواب تصوف سے بھی پورا نہیں ہوسکتا۔ اس کے باوجود "خواب وخیال" کو اردو شاعری میں جو مرتبہ حاصل ہے، وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی کئی مثنویاں اور بھی گنائی جاسکتی ہیں، جو تخیل کی بلندی اور اسلوب کی لطافت کے نقطہ نظر سے، چند دوسرے درجہ کے غزل گو شعرا کے کلام کا مقابلہ نہیں کرسکتیں لیکن پھر بھی وہ اردو شاعری میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مثلاً سودا کی اکثر مثنویاں اور میر اور مرزا شوق کی چند مثنویاں، شعریت کے اعتبار سے

کچھ زیادہ بلند رتبہ نہیں رکھتیں لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ غزل اور مثنوی، دو بالکل جدا اصناف ہیں۔ دونوں کی صناعی (آرٹ) میں بہت فرق ہے بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی لئے ان کے جانچنے کے معیار بھی جدا ہیں۔ غزل مفرد خیال کا آلہ ہے اور مثنوی مربوط خیال کا۔ غزل میں محض استعارہ ہی کافی ہے۔ لیکن مثنوی میں جب تک حقایق نہ ہوں وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ غزل میں تکرار اور تقلید کی گنجایش ہے۔ لیکن مثنوی میں تکرار ممکن نہیں اور تقلید بھی ایک محدود دائرہ رکھتی ہے۔ اسی لیے وہ اُردو مثنویاں بھی جو فارسی کا ترجمہ یا اقتباس ہیں یا فارسی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں، ایک مقامی رنگ اور شخصی عنصر رکھتی ہیں۔ اسی لئے زیادہ دلچسپی کی حامل بھی ہوتی ہیں۔ ایک بلند پایہ غزل گو شاعر کا کلام، عوام کے لئے دلچسپی کا کم مواد رکھتا ہے، لیکن ایک بلند پایہ مثنوی بھی، خواص اور عوام دونوں کے لئے یکساں دل کشی کا مواد رکھتی ہے۔ گویا غزل ذہنی امارت کی ملک ہے اور مثنوی زیادہ تر عوام کی ملک ہوتی ہے، اور اس سے ان کی تعلیم اور درستی مذاق کا کام بہت آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے حالی نے فارسی شاعری کو عربی شاعری پر ترجیح دی ہے۔

غرض مثنوی کا سب سے اہم جز واقعات ہیں۔ خواہ وہ رزمیہ ہوں کہ بزمیہ، متصوفانہ ہوں کہ محض روایتی۔ بغیر واقعات کے مثنوی وجود میں نہیں آسکتی۔ عشقیہ قصے، مہمات کی داستانیں اُردو مثنوی کا اکثر و بیشتر موضوع رہی ہیں لیکن محض اس بنا پر، حالی کی طرح، کوئی نقاد مثنوی کو ساقط از اعتبار نہیں سمجھ سکتا۔ عشقیہ قصے اور فوق الفطرت داستانیں بھی، اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان کا کوئی مقصد ہوتا ہے، اور اگر کوئی معین مقصد نہ ہو بھی تو، مسرت زائی کی خصوصیت سے یہ عاری نہیں ہو سکتیں۔ اور یہ ادب کی ایک بڑی علت غائی سمجھی جاتی ہے۔

دوسری چیز مثنوی کا اسلوب اور طرز بیان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں شاعر کو شعری نزاکتوں کے استعمال کی بڑی گنجایش ہے لیکن اس کا بڑا کمال سادگی اور صفائی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی پیش آتی ہے کہ شاعر کی توجہ، واقعات کے ارتقا، ترتیب اور ربط میں زیادہ الجھی رہتی ہے۔ اسی لئے بہترین مثنوی نگار بھی خاص خاص مواقع کے سوا، بہت کم توجہ صنعت گری پر صرف کر سکتا ہے۔

مثنوی کا ایک تیسرا وصف، بیان، توضیح اور تشریح ہے۔ اس میں مقامات اور مناظر کی تشریح کے علاوہ مواقع اور نفسی کیفیات کی توضیحات بھی داخل ہیں۔ شاعر کی قوت مشاہدہ ذرا بھی بیدار ہو، تو وہ

اس ضمن میں، خاص لطف اور کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ اور بیانیہ، توضیحی اور نفسیاتی شاعری کے علاوہ غنائی یا طربیہ شاعری کے بھی اچھے نمونے پیدا ہو سکتے ہیں۔

مثنوی کی رفتار کے دوران میں بیسیوں ڈرامائی مواقع پیدا ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ اگر شاعر انھیں ذرا عمدگی سے پیش کرے اور مکالموں پر ذرا سی توجہ صرف کرے تو مثنوی میں بڑا لطف پیدا ہو جاتا ہے اور ذہن کے اس ذوق اور تشنگی کی بھی تشفی ہو سکتی ہے جس کی اسے تلاش ہوتی ہے۔

ایک طویل کارنامہ ہونے کی وجہ سے، مثنوی میں شاعر کا تناظر اور احساس تناسب بھی خاص طور پر معرض امتحان میں آجاتا ہے۔

سب سے آخر میں مثنوی کا وہ مقصد ہے، جس پر اس صنعت کی ساری عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ بعض وقت مثنوی کا پایہ صرف اس کے مقصد کے مدنظر گھٹ یا بڑھ جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی اُردو مثنوی ایسی لکھی گئی ہوگی، جس کا کوئی مقصد معین نہ ہو۔ یہ مقصد کبھی تو مذہبی ہوتے ہیں، کبھی اخلاقی یا معاشرتی اور کبھی محض صناعی۔

انھیں اسباب کی بنا پر مثنوی، اگر ٹھیٹ صناعی کے نقطہ نظر سے دیکھی جائے، تو ایک نہایت بسیط، اور مرکب صنعت ہے۔ جس کے تمام فنی مقامات پر روشنی ڈالنے کے باوجود بھی لطف اور خوبی کا ایک بڑا حصہ ناگفتہ باقی رہ جاتا ہے۔ اسی لئے ایک ترقی یافتہ تمدن اور معاشرت کے لازمی اجزا کے طور پر، مربوط خیالی واقعات کے ارتقا اور ایک مقصد پر ان کے اختتام کو جب تک اہمیت حاصل رہیگی، مثنوی یا مثنوی کی طرز کی شاعری کی ضرورت کم نہیں ہو سکیگی۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ دنیا کے شاعر اپنی زندگی اور تمدن کی وسیع دلچسپیوں اور ضرورتوں میں گھر کر مختصر ادبی شکل کی چیزوں کی طرف زیادہ متوجہ ہو جائیں، لیکن جب کبھی ایک طویل اور بلند پایہ کارنامہ پیدا ہو، اس کے پڑھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے، مصروف سے مصروف زندگی میں بھی چند ساعتوں کی گنجائش نکلتی رہیگی۔

اراکین انجمن اور خریداران "مجلہ" سے التماس ہے کہ براہ کرم تبدیلی پتہ سے دفتر مجلہ کو فوراً مطلع فرمادیں۔

مصر جدید

از جناب ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ۔ ڈی لٹ (قاہرہ) پروفیسر جامعۂ عثمانیہ

چند دنوں پہلے تک مصر سے جو بے اعتنائی برتی جاتی تھی اس کی تو اب زیادہ شکایت نہیں رہی ہے حیدرآباد نے تو اپنے باقاعدہ علمی ارسالیات کے ذریعہ بلاد اسلامیہ کی اس ممتاز اور ترقی یافتہ مملکت سے ایک غیر فانی ذہنی ارتباط قائم کرلیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے ہونہار فارغ التحصیل اس وقت بھی جامعہ مصریہ میں زیر تعلیم ہیں اور اس فکری ارتباط کی توثیق اور استحکام کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی مبارک اور مسعود اقدام تھا جس کے لئے ارباب جامعہ بجا طور پر نقد بر وطن کے مستحق ہیں۔

اپنی تاریخی عظمت، شاندار ماضی اور غیر فانی آثار کے لحاظ سے مصر دنیا کے ممالک میں سرفہرست دکھائی دیگا تاریخی مطالعہ فراعنۂ مصر کے ذہنی ارتقاء اور ان کی عجوبہ روزگار تمدنی ترقیات سے واقفیت کا ضامن ہے اور اب تو آئے دن کے اثری اکتشافات نے قدماء مصر کی عظمت دماغی اور ترقیات علمی کے متعلق انسانی معلومات میں قابل لحاظ حد تک اضافہ کردیا ہے۔ یہ حقیقت اب بے نقاب ہوتی جارہی ہے کہ قدیم مصری تمدن کسی طرح روما، یونان اور فارس کے تمدن سے کم نہیں رہا۔ روما کے دور ارتقاء میں مدتوں تک اسکندریہ بالکل اسیطرح سرچشمۂ علم و تہذیب بنا رہا جس طرح زمانہ خلفاء میں مدرسہ قرطبہ اور مدرسہ بغداد، اور یا جس طرح آج یورپ اور امریکہ کی جامعات! اس میں شک نہیں کہ دولت فاطمیہ کا زوال مصر کی پستی اور انحطاط کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا اور ایک عرصہ تک اس کو بھی اور بلاد اسلامیہ کی طرح بنی نوع انسان کی فکری قیادت سے علحدگی پر مجبور رہنا پڑا تاہم اس دور انحطاط میں بھی ہمیشہ اس نے اس امتیاز کو قائم رکھا کہ آس پاس کے ممالک کے لئے علمی اور ادبی ترقیات میں مثال اور نمونہ کا کام دے۔ ایوبیین، جراکہ، اور ممالیک کے انتہائی تنزل یافتہ زمانوں میں بھی مصر ہی ایک ایسا مرکز تھا جس سے غیر ممالک فیض پاتے تھے اسلامی علوم اور ادبیات کا یہی ایک

گہوارہ تھا جس سے شمالی افریقہ، بلاد عرب، ترکی اور شام اکتساب معارف کرتے تھے۔ نپولین اول کے داخلہ نے تاریخ مصر میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ فرنچ علماء کی وساطت سے مصر کو مغربی تہذیب اور یورپین اصول تعلیم و تربیت سے روشناس ہونے کا موقع ملا تھا لیکن صحیح معنوں میں مصر اپنی نشاۃ جدیدہ کے لئے اس بیدار مغز اور سلیم الفطرت حکمران کا رہین منت ہے جو بجائے خود تھا تو ایک ارناؤوی اس درجہ ان پڑھ کہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک فصیح عربی تو در کنار عامی عربی میں بھی کسی صحیح جملہ کے تلفظ یا ایک ہی سطر صحیح لکھنے پر قادر نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود تاریخ حکمرانی میں اپنے ملک اور اپنی قوم کی ہمہ جہتی ارتقاء و فلاح کے لئے اس کے کارنامے ایسے نہیں ہیں جن کے مٹنے پر تغیرات زمانہ اور مرور ایام قدرت پا سکیں۔ دنیا میں ایسی بہت کم مثالیں ملینگی کہ تنہا کسی ایک شخص نے اپنی دوربینی، عالی ہمتی، بلند حوصلگی اور روشن دماغی کے بل بوتے پر قعر مذلت و انحطاط کی گہرائیوں میں پڑی ہوئی کسی قوم کو حد درجہ ناموافق حالات میں بچشم زدن اوج رفعت تک پہنچا دینے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ کون شخص ہے جس کے لئے مصر جدید کے بانی محمد علی کے کارنامے حیرت اور استعجاب کا موجب نہ رہے ہوں۔
زمام حکومت تھامنے کے بعد پہلا کام جو اس نے کیا وہ اہل ملک کے ذہنی ارتقاء اور جدید علوم کی ترویج سے متعلق تھا۔ جہالت کی تباہ کاریوں کو اس کے دردمند دل نے بُری طرح محسوس کیا۔ بے چین تھا کہ پوری قوم جہل و غباوت کی لعنت سے بزودی ممکنہ خلاصی پا جائے۔ مغربی تہذیب سے روشناس کرنے اور جدید علوم و فنون کے اکتساب کے لئے ملک کے نوجوانوں کو اس نے بھرتی کرنا شروع کر دیا اور یورپ کی جامعات میں ان کا تانتا باندھ دیا۔ ان ارسالیات کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہونے نہ پاتا تھا۔ یورپ میں ان کی فرض شناسی اور کارکردگی کی پوری احتیاط کے ساتھ نگرانی رکھی جاتی تھی۔ فراغ تعلیم کے بعد جب یہ واپس ہوتے تو قلعۃ الجبل میں جو خود محمد علی کی قیام گاہ تھی اس وقت تک کے لئے نظر بند کر دیئے جاتے جب تک کہ وہ اس علم میں جس میں کہ انھوں نے مہارت اور اختصاص حاصل کیا ہو کسی بلند پایہ تصنیف کا عربی میں ترجمہ نہ کر دیں۔ زمانہ نظر بندی میں مترجمین کے لئے ممکنہ سہولتیں پیدا کیجاتیں اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی کمی نہ کیجاتی۔ ترجمہ جب ختم ہو چکتا تو اختصاصیین، ورمبصرین کی ایک مجلس میں جس کو لجنۃ الامتحان کا نام دیا گیا تھا پیش ہوتا۔ لجنہ کی توثیق کے بعد خاص اہتمام کے ساتھ مطبع امیریہ میں اس کی طباعت کا انتظام کیا جاتا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکتا تو محمد علی کے فیاض ہاتھوں ان مترجمین کے نوازے جانے کی باری آتی حسب حیثیت اور قابلیت، عہدوں پر فوراً ان کا تقرر عمل میں آتا۔ خطابوں اور انعام و اکرام سے ان کی ہمت افزائی کیجاتی کہ خدمت وطن میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ زیادہ دن نہ گذرنے پائے تھے کہ محمد علی نے ملک میں ایک ایسا

ذہنی ماحول پیدا کر دیا جو جہالت اور نا واقفیت کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا۔ انقلابات ایام نے جس ہئیات اجتماعی کو جہل اور امیت کے گڑھوں میں ڈھکیل رکھا ہوا اس کی ذہنیت میں یکبارگی اس درجہ تغیر کہ ان پڑھ اور جاہل کے لئے اس میں کوئی جگہ ہی نہ باقی رہے یقیناً تاریخ کے عجوبۂ روزگار واقعات سے شمار ہوگا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ عربی زبان نے صدیوں تک علمی درجہ اور مقام سے محروم رہنے کے بعد علم و استناد کی ان بلندیوں تک رسائی پائی جس کو کسی زبان کا منتہائے کمال قرار دیا جاسکتا ہے۔ مختلف النوع بلند پایہ علمی اور ادبی تصانیف کے ذخیرے بڑی تیزی کے ساتھ عربی میں منتقل ہو رہے تھے۔ صرف اسی ایک واقعہ سے اس تحریک کی قوت و متانت اور کام کی سرعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محمد علی نے ایک مرتبہ اس کام کو شروع کر کے اس کے بہترین نتائج خود اپنی زندگی میں صرف ایک فرنچ زبان کی دو ہزار مستند علمی تصنیفات کو طہطاوی، رشدی، حماد، نحراوی، بہجت، فلکی اور نبرادی وغیرہ جیسے پایہ کے مترجمین کے ہاتھوں عربی میں منتقل ہوتے ہوئے دیکھ لئے۔ علم و ادب کے انہی پرستاروں نے عربی زبان کے ان ہزارہا الفاظ کو از سر نو زندگی بخشی جو عباسیین بغداد اور امویین قرطبہ اور فاطمیین مصر کے دماغی اعجاز کا نمونہ اور دقیق تر علمی مطالب کی تعبیر کا واحد ذریعہ تھے لیکن اسلامی تمدن کے زوال و انحطاط اور علم و حکمت سے مسلمانوں کی بے تعلقی نے ان کو حوالہ طاق نسیاں کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون میں وضع اصطلاحات کا کام انہی کے ہاتھوں انجام پایا جو آج نہ صرف عربی لغت کا بہترین سرمایہ ہے بلکہ جب ترکوں اور ایرانیوں نے بلاد عثمانیہ اور ایران میں علوم جدیدہ کی تعلیم ترکی اور فارسی میں دینی چاہی تو انہی عربی مصطلحات نے ان کی مشکل کو آسان کیا۔

علم و فن سے محمد علی کی اس نادر المثال وابستگی اور ترجمہ و تالیف سے اس کے اس غیر معمولی شغف نے مامون عباسی کی یاد تازہ کر دی تھی، لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ مامون جیسے علامۂ وقت خلیفہ کے لیے اسلامی تہذیب و تمدن کے شباب اور انتہائی عروج و کمال کے زمانہ میں خدمت علم و فن سے متعلق کارنامے اتنے حیرت خیز نہیں ہوسکتے جتنے محمد علی جیسے بیگانۂ علم کے لئے۔ اور وہ بھی اسلام اور مسلمانوں کے انتہائی دور ادبار و انحطاط میں۔

محمد علی کی ان اصلاحی سرگرمیوں نے مصر کو نہ صرف بلاد اسلامیہ بلکہ تمام مشرقی ممالک میں مطمح انظار بنا دیا۔ عربی زبان و ادب نے جو صدیوں کے اہمال کے نتیجہ کے طور پر از کار رفتہ نثر مسجع اور

سنگ ریگ کا انبار ہو کر رہ گیا تھا اس دور میں اپنے سابقہ علمی درجہ اور مقام کو واپس لیا اور دیانت و امانت کے ساتھ ایک دنیا کی فکری قیادت کا علمبردار رہا۔ محمد علی نے اپنے پیش نظر وسیع اصلاحی پروگرام پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی مہلت نہ پائی تھی کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اس کو چھین لیا اور اس کے جانشینوں میں سے اکثر نے ان اصلاحی تجاویز اور منصوبوں پر عمل کرنے کی نہ خود میں قابلیت پائی اور نہ ان کی عیش پسندی اور اسراف نے اس کی مہلت ہی دی اس طرح اصلاح اور تجدید کی چلتی گاڑی میں رکاوٹیں پیدا ہوگئیں اور اتنے زور و شور سے اٹھی ہوئی تحریک بے پناہ اور بے سہارا ہو کر رہ گئی اور اس کو انھی تلخ نتائج سے دوچار ہونا پڑا جس کا مظاہرہ آئے دن شخصی سلطنتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ ایک بلند حوصلہ وسیع النظر، صاحب عزیمت حکمران کسی اچھے کام کی ابتدا کرتا ہے اپنی زندگی تک تو وہ ہر طرح کے موانع اور مشاکل پر غالب آتا اور اس کی کامیابی کے لئے راستے صاف اور پیدا کرتا رہتا ہے لیکن جوں ہی کہ اس کی آنکھیں بند ہوئیں اس کی تجاویز اور منصوبے بھی مٹ کر رہ گئے، اس کے برخلاف جن کاموں کی ابتدا کسی قوم کے مجموعی ارادے اور عزیمت سے ہوتی ہے تو اس کے باوجود کہ اشخاص فنا ہوتے رہتے ہیں، قومی منصوبے برابر اپنے تقدم اور کامیابی کے راستے پیدا ہی کرتے رہتے ہیں اس میں شک نہیں کہ محمد علی کے بعد کچھ عرصہ کے لئے نہ صرف یہ کہ ترقی کی رفتار ہی رک گئی بلکہ مصر نے اپنی آزادی بھی جو ہر طرح کی ترقیوں کی بنا ہوا کرتی ہے کھو دی تھی، لیکن اس حقیقت سے انکار بھی کوئی آسان کام نہیں کہ مصر جدید کی عقلی تحریکات، ادبی رجحانات اور ملک کے استقلال اور آزادی سے متعلق منظم قومی جد و جہد کا بیج محمد علی ہی کے ہاتھوں بویا گیا تھا جو آج پھلتا اور پھولتا دکھائی دے رہا ہے۔

خدیو اسمٰعیل کے تعیش اور مجنونانہ اسراف نے جب ملک کے خزانہ کو کھوکھلا کر دیا تھا تو اپنی متعیش زندگی کی پیاس بجھانے اور ملک کی مالی ساکھ قائم رکھنے کے لئے ممالک یورپ سے خطیر مقدار میں قرض لینے کی ضرورت دامنگیر ہوئی، استعماری سلطنتیں اس طرح کی فیاضانہ دستگیری کے مواقع تو ڈھونڈتی ہی رہتی ہیں، دول یورپ نے اس زریں موقع سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا اور اس طرح مصر کو اقتصادی غلامی کی بیڑیوں میں کس دینے کی دیرینہ تمنائیں پوری ہوگئیں، رہی سہی سیاسی آزادی کا قلع قمع خدیو توفیق کی بیجا ہٹ، مفاد ملک سے بے اعتنائی اور وطن پرست جماعت سے کشمکش نے کیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی، اجنبی امتیازات کے خلاف کچھ ملکی مطالبات تھے جن کے تسلیم کرنے میں خدیو توفیق کی کمزور اور بودی فطرت مانع

ہو رہی تھی، وطن پرست طبقہ کا نفس ناطقہ عرابی پاشا نے جو وزیر حرب تھے ان قومی مطالبات کے منوانے کے لئے بالآخر تنگ آکر خدیو وقت پر فوجی دباؤ ڈالا۔ قدرت نے مصر کو رہی سہی سیاسی آزادی سے بھی محروم کر دینے کا ایک نایاب موقع دول استعمار کے لئے پیدا کر دیا۔ مدبر یہ عمل آیا کہ عرابی کے فتنہ ئے مالبین یورپ کو اپنے مطالبات کی پابجائی کے متعلق خطرات اور اندیشے لاحق ہوگئے ہیں لہٰذا دول یورپ کے لئے اس فتنہ کا قلع قمع کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ انگلستان نے اس موقع پر پیش قدمی کی اور خود کو نمایندہ دول قرار دیکر اس فتنے کے فرو کرنے کے لئے مصر کے طول و عرض میں اپنی فوجوں کا جال پھیلا دیا۔ مصر میں برطانوی اضمحلال کی بنا تو صرف اسی قدر تھی اور بعد میں چلکر نہر سویز کی حفاظت کا شاخسانہ جو کھڑا ہوا تو اس میں قصور اختلال کا نہ تھا قصور سراسر سرزمین مصر کی جذابیت اور دلکشی کا تھا کہ ایک مرتبہ یہاں آکر پھر چھوڑنے کو کسی کا دل نہیں چاہتا لہٰذا نہ قوت اختلال کو سویز سے استغنا ہوا اور نہ مصر کو اختلال سے نجات ہے۔ اب مصر نے اپنی سیاسی آزادی ہی کھو دی تھی اور مالبین یورپ کے لئے مصر سے بلند پیمانہ پر تجارتی اور زراعتی تعلقات قائم کرنے کے مواقع دستیاب ہوئے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اکثر حالات میں بڑی بڑی عمرانی تجاویز پر اخلاص اور صداقت سے عمل کیا جو مصر کی حالیہ اقتصادی اور معاشی بیداری میں حد درجہ مفید ثابت ہوئیں۔

لارڈ کرومر جیسے بیدار مغز اور مدبر برطانوی ہائی کمشنر کی نگرانی میں انگریزوں کے کارنامے ملک کی زراعت اور آبپاشی کی تحسین اور حکومت کی بہتر تنظیم سے متعلق یادگار رہینگے۔ لارڈ کرومر نے مصر کی فکری آزادی پر قیود عاید کرنا کبھی پسند نہ کیا، اس کا قول تھا کہ انسانی فکر اور خیال کا کھلے بندوں چھوڑ دینا ہی بہتر ہوا کرتا ہے ورنہ ان کا اندر ہی اندر ایسے متعفن مادہ کی شکل میں منتقل ہو جانا مستبعد نہیں جو ہر وقت پھوٹ پڑنے کے لئے آمادہ اور پھر جب ایک مرتبہ پھوٹ پڑے تو اصلاح و تدارک محال ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں مصر کے اخبارات کو جو آزادی نصیب ہوئی مشرقی ممالک میں شاید ہی کسی ملک کے اخبارات کو نصیب ہوئی ہو۔ اس قدر آزادی دیدینے کے باوجود لارڈ کرومر نے مصریوں کو کبھی پیشہ زراعت سے آگے نہ بڑھنے دیا یا زیادہ سے زیادہ حکومت کی ایسی ملازمتیں ان کی نذر کی گئیں جن کا تبرع برطانوی سیاست پر موثر نہو۔ اس سیاست اور طرز حکومت کے پیچدار اور بے پناہ مفہوم سے مصری وطن پرست غافل نہ تھے۔ آزادی اور ترقی سے متعلق محمد علی کبیر کی پیدا کی ہوئی چنگاری کو انقلابات ایام نے صرف راکھ تلے دبا ہی دیا تھا، بجھایا نہ تھا اس کو از سر نو بھڑک اٹھنے کے لئے صرف ایک پھونک کی ضرورت تھی۔ آزادی اور تقدم کی روح جب کسی قوم میں

سرایت کر جاتی ہے تو پھر دنیا کی مادی قوتیں اس کے مٹنے پر قادر نہیں ہو سکتیں، یہ اور بات ہے کہ کچھ دنوں کے لئے یہ اپنی سابقہ تابناکی سے محروم ہو جائے تا ہم ایک معمولی سا بہانہ اس کو حیات نو بخشنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے چنانچہ برطانوی فوج کے چند جلد باز سپاہیوں نے یہ بہانہ پیدا ہی کر دیا۔ بات اتنی ہوئی کہ مصر کے ایک قریہ دنشوائی میں چند فوجیوں نے شکار کی ٹھانی، کاشتکاروں کے جھونپڑوں پر پلے ہوئے کبوتروں کو منکتا دیکھ کر چاہا کہ انھی کو نشانہ بنائیں، ادب اور لجاجت کے ساتھ جب کاشتکاروں نے مزاحمت کی تو پرندوں کی بجائے انھی میں سے چند کو نشانہ پر رکھ لیا، تڑپتی ہوئی لاشیں جب ٹھنڈی ہو چکیں تو یہ بھی اپنی بارکوں کو لوٹ آئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان چند کسانوں کا خون توقع سے زیادہ گراں ثابت ہوا، شہرۂ آفاق مصری وطن پرست مصطفیٰ کامل، اسی واقعہ کی پیداوار ہے جس نے صرف اسی ایک چیز کو سپر بنا کر ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک استعمار کے خلاف ایک ایسی ہلچل پیدا کر دی کہ برطانوی طاقت اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ اس کو دبانے سے عاجز رہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ پورا ملک ان چند فلاحوں کے ایک ایک قطرۂ خون کا حساب لینے پر تلا ہوا ہے۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں نے اس راہ میں اپنی جانیں قربان کر دیں اور استعمار کے خلاف ایک ایسی منظم جد و جہد کی ابتدا ہوئی جس کا دائرۂ عمل صرف سرزمین مصر ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ ممالک یورپ خصوصاً انگلستان میں اس تحریک کے داعی پوری قوت سے اپنا کام کر رہے تھے ملک کی اس یکبارگی سیاسی بیداری نے مدبرین یورپ کو حیران کر رکھا تھا۔ در پردہ خدیو عباس کی تائید وطن پرستوں کے شامل حال تھی! اس چیز نے آزادی کی اس تحریک کو اور قوت بخشی۔ لارڈ کرومر نک جس کی بیدار مغزی اور تدبر کا ایک عالم میں ڈنکا بجا ہوا تھا اس گتھی کو سلجھانے سے عاجز نظر آتا تھا زیادہ خطرناک صورت حال خود فلاحین میں آزادی کی روح کا سرایت کر جانا اور شہری وطن پرستوں کے دوش بدوش اس تحریک میں ان کا ساتھ دینا ہوئی! اس موقع پر مصر کی ترقی یافتہ اور آزاد صحافت کو اہل ملک کی سیاسی اور اجتماعی تربیت میں بڑا دخل رہا! آزادی کی اس طویل داستان میں جو چیز زیادہ دلچسپ اور محل استعجاب ہے وہ سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ مذہبی بیداری کا نشو و نما پانا ہے۔ واقعہ نفس الامری تو یہ ہے کہ مصر کی نشاۃ جدیدہ اور اس کی موجودہ ترقیات کا ذکر قطعاً ناتمام رہ جائیگا اگر اس دور کی تحریک اصلاح مذہب پر کسی قدر روشنی نہ ڈالی جائے۔

مدتوں کے ذہنی جمود و فکری انحطاط ادبار و تنزل اور علم و حکمت سے بیگانگی نے مسلمانوں کو اپنے مذہب کے بسیط اور فطری اصول سے اس درجہ نا آشنا اور اسلام کی سیدھی سادی تعلیمات سے ان کو اس قدر

دور کر دیا تھا کہ ان کو دیکھ کر "ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی" کا مصداق نظر آجائے۔ ذمیم تعصبات لفظی مناقشات اور حد درجہ رکیک اوہام و خرافات مسلمانوں کا شعار بنے ہوئے تھے علماء جو ورثۃ الانبیاء ہونے کے مدعی اور حمایت دین متین کے ٹھیکے دار تھے زمانہ کی رفتار سے ناواقف اور وقت کی ضرورت سے بے خبر آپس کے اختلافات اور منافرانہ تحریکات کے ہاتھوں ایک دوسرے کے گلے کا ہار بنے ہوئے تھے کسی تعمیری کام کی طرف تو ان کو کیا توجہ ہوتی ان کے لئے اگر زندگی کا کوئی دلچسپ مشغلہ تھا تو صرف اس قدر کہ رہے سہے مسلمانوں کی تکفیر اور تلقین میں اپنے تفقہ فی الدین کے جوہر دکھائیں اور خود ان کی اپنی یہ حالت تھی کہ ؎

ترا از کاف کفرت ہم خبر نیست حقائق ہائے ایماں را چہ دانی

حماۃ دین کی اس نفس پرستی، تنگ نظری اور غفلت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کا قومی شیرازہ بکھر جائے۔ متحد مذہبی نصب العین مٹ جائے اور ان کی معاشرت اور زندگی کلیتہً ایسے رسم و رواج کی پابند اور غلام ہو جائے جس کو مذہب سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ رسم و رواج نے اسلام کے سیدھے سادے اصول اور احکام مذہب پر تفوق حاصل کر لیا تھا مسلمانوں کے گھر اسلامی تعلیمات سے محروم ہو چکے تھے۔ جامعہ ازہر جو کسی وقت اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کی عظمت دماغی کا نمایندہ، علم و حکمت اور بحث و تحقیق کا مرکز بنا ہوا تھا اب اس کی لسان حال مسلمانوں کے ادبار اور انحطاط کی داستان گو تھی اور اس کی دماغی کاوش اور ذہنی جولان کا انحصار تدریس متن تقریر شرح، تفسیر حواشی توضیح تعلیقات اور لاطائل و بے معنی لفظی مناقشات پر ہو کر رہ گیا تھا اس کا نصاب تعلیم وہ تھا جو صدیوں پہلے بھی بے فائدہ ثابت ہوتا اور طریق تعلیم ایسا کہ صدیوں بعد بھی اس کے سمجھنے سے عقل قاصر رہے طلبہ جو اپنی نوخیزی میں اکتساب علم کے لئے داخل ہوتے اپنی عمر کے آخری لمحوں تک تکمیل نصاب کی سعادت سے محروم رہتے۔ ہزار ہا طلبہ تھے جو ازہر کی چار دیواری میں کسلمندی، بیکاری اور عبادت کی زندگی بسر کرتے تھے ان کی زندگی کا کوئی نصب العین ہی نہ تھا۔ ان کی اخلاقی تربیت کا سوال ایک ایسی چیز تھی جو کبھی بھی حضرات شیوخ ازہر کی گرانی فکر کا باعث نہ ہوئی تھی ان کے اس اہمال نے ان کے ہر طرح کے شریفانہ اوصاف کا استیصال کر دیا تھا، روپیہ اور پیسہ کی کمی کا سوال نہ تھا صرف اوقاف ہی کی آمدنی کی بہتات اور افراط کا یہ عالم تھا کہ اگر اس کا جائز اور صحیح مصرف ہوتا تو اس کو خدمت و انسانیت کے یورپ اور امریکہ کی کسی بہتر جامعہ سے کم مواقع حاصل نہ ہوتے لیکن مصرف اس کا اگر کچھ تھا تو یہ کہ شیوخ ازہر کی جیب اور معدہ کی خاطر خواہ ضیافت کا سامان مہیا ہو۔ جناب شیخ کے لئے علاوہ معتدبہ ماہوار کے روزانہ ایک ہزار روٹی

مقرر تھی، اور درآں حالیکہ طلبہ ایک یا دو روٹی سے زیادہ نہ پا سکتے تھے۔ جناب شیخ کا گدھا طے مسافت کے صلہ میں (۰۰۰ ھ) روٹیوں کا حقدار قرار دیا گیا تھا، اور یہ علاوہ اس کی سوا ایکڑ زمین کے تھا جو اس کی چندی اور گھانس کی سربراہی کے لئے معین تھی۔

گذشتہ صدی کا ربع اخیرہ وہ زمانہ ہے کہ ادبار و انحطاط کی اس گھٹا ٹوپ تاریکی میں دنیائے اسلام کے ایک سچے خادم جمال الدین افغانی نے اصلاح مذہب اور مسلمانوں کے نصب العینی تقدم و ارتقاء سے متعلق وسیع تجاویز کو بروئے عمل لانے کے لئے سرزمین مصر کو اپنا مستقر بنایا۔ دنیائے اسلام کے لئے جمال الدین افغانی کے کارنامے مصر کے روشن خیال اور حساس طبقہ کو ان کے مناسب مقام خیر مقدم کے لئے بہت پہلے آمادہ کر چکے تھے۔ مصر پہنچکر ان کی جذاب شخصیت نے بہت جلد اپنے ہمنوا اور حلقہ بگوش پیدا کر لئے۔ اپنے متبعین اور تلامذہ کے ایک وسیع حلقہ میں انھوں نے اپنے اصلاحی خیالات کی نشر و تبلیغ شروع کی اتحاد اسلامی کی تحریک جمال الدین افغانی کے اصلاحی پروگرام کا لب لباب تھی جس نے مستعمرین یورپ کے لئے نیند حرام کر رکھی تھی اس تحریک کا بانی ہونے کی حیثیت سے جمال الدین افغانی کے لئے عرصہ حیات تنگ ہو چکا تھا اور دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہ رہی تھی کہ جہاں ان کو چین اور اطمینان سے بیٹھنا نصیب ہوا ہو، ہندوستان سے بھاگے ہوئے ایران میں چین نہ لینے پائے تھے کہ یہاں سے بھی نکالے گئے، مصر پہنچکر جب ان خیالات کی ترویج شروع کی تو قوت استعمار نے ان کو بچشم غضب دیکھا اور بہت جلد ان کی شہر بدری کی افواہیں گرم ہونے لگیں! اس انجام کے وہ نہ صرف عادی تھے بلکہ منتظر بھی۔ تاہم اس قلیل عرصہ قیام مصر میں انھوں نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی تھی جو ان خیالات سے پوری طرح متاثر ہو چکی تھی اور ان کی تبلیغ و اشاعت میں ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار تھی۔ ان کے تلامذہ میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز شیخ محمد عبدہ تھے جن کو اپنے استاد کے فیض صحبت اور تعلیم کا بدرجہ اتم حصہ ملا تھا شہر بدری کا حکم ملا تو اپنی جگہ پر محمد عبدہ کو چھوڑا، اور فرانس کا رُخ کیا۔ محمد عبدہ نے اپنی ہمہ گیر شخصیت، علمی تبحر، جذبہ ملی، اور احساس قومی کی وجہ سے ملک میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی! انھوں نے آخر وقت تک اپنے استاد کی رفاقت اور ان کے خیالات سے کامل اتفاق اور ہمدردی کا ثبوت دیا، خدیو عباس کی تائید نے ان کے ارادوں میں مزید استحکام اور ان کے حوصلوں میں مزید تقویت پیدا کی اور شہر بدری کے بھوت سے ان کو چندے امان ملگئی اور بڑی مستعدی اور دیانت کے ساتھ انھوں نے اپنے استاد کے خیالات کی ترویج شروع کی۔ سب سے پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ مذہبی تعصبات کا مقابلہ اور عقائد مذہب کو رسم و رواج، اور

اوہام و خرافات کی آمیزش سے پاک و صاف کرتا تھا۔ قدامت پسندوں کی مخالفت اور نفس پرست کوتاہ بیں مولویوں کی تکفیر کے باوجود ملک کے سنجیدہ طبقہ خصوصاً نوجوانوں کے دل میں ان کی تعلیمات نے گھر کرلیا اور بہت جلد آزادی فکر کی ایک بالکل ہی نئی اور مقدس فضا سارا مصر پر محیط دکھائی دینے لگی۔ اس چیز کو محمد عبدہ نے بڑے قوی دلائل سے ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی کہ اسلام زمانہ کے ہر طرح کے انقلابات اور تغیرات اور زندگی کی ہر طرح کی پیچیدگیوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے عالمگیر ہونے اور اعلیٰ سے اعلیٰ علمی، تمدنی اور تہذیبی ترقیات میں اس کی موزونیت اور مناسبت پر انھوں نے جس سنجیدگی، متانت اور قابلیت سے بحث کی ہے وہ نہ صرف عربی لٹریچر کی جان ہے بلکہ اس نے اپنوں کو خواب غفلت سے جگانے اور مخالفین کو اس کی حقانیت کے قائل کرنے میں وہ کام کیا جس کو اگر جادو کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی اس کامیاب سعی نے کہ اسلام کے بنیادی عقائد اور مغرب کے سائنٹفک نظریات میں کوئی تصادم اور تعارض نہیں، ان کو نہ صرف بلاد اسلامیہ میں ایک مجدد اور مصلح کا درجہ دیدیا بلکہ یہی چیز متمدن ممالک میں ان کے وقار و احترام اور شہرت کا موجب ہوئی۔ بے پناہ ہمت اور مستعدی کے ساتھ انھوں نے جامعہ ازہر کی اصلاح پر توجہ کی، ایک ایسی تمنا جو مدتوں سے ان کے دل کی گہرائیوں میں پرورش پا رہی تھی اب متحقق ہونے کے لئے بے چین تھی، یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس طرح کا اقدام بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہوگا لیکن اسی کے ساتھ اس کا بھی ان کو پورا الیقین تھا کہ پورے ملک کی اصلاح اسی درسگاہ کی اصلاح پر موقوف ہے، اس کام کے لئے انھوں نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ علماء ازہر کی مخالفت کا ایک دریا امڈ آیا اور ان مفتیان شرع متین نے اسلام کے اس بے لوث خادم کی تکفیر میں اپنی تفقہ اور تورع کے جوہر دکھانے شروع کئے لیکن محمد عبدہ کی لگائی ہوئی آگ ایسی نہ تھی جو آسانی سے بجھائی جاسکتی۔ اس مخالفت نے تو اصلاح پسندوں کی ہمت کو اور بڑھا دیا اور بتدریج اس مقصد کی تحصیل کے لئے انھوں نے نئی نئی تجاویز پر عمل کرنا شروع کیا۔ انھی تجاویز کے تحت دار العلوم مصر اور مدرسہ قضاء شرعی نے وجود پایا جو آج بلاد اسلامیہ میں علوم عربیہ اور دینیہ کی تعلیم کے لئے شہرۂ آفاق ہیں۔ ازہر میں صدہا ایسے طلبہ تھے جن کی فطری قابلیتوں اور ذہنی بنوغ اور کمال کا محض ناموافق حالات کے ہاتھوں خون ہورہا تھا۔ ازہر ان کی تشنگی علم کی آبیاری سے قاصر اور اس کے نصاب اور طریق تعلیم میں کسی فوری تغیر اور اصلاح کا ہونا مشکل تھا۔ ان دونوں درسگاہوں کے قیام نے ان کے لئے موافق فضا

پیدا کر دی اور ان میں سے جس کسی نے خود میں ادبیات کی تحصیل کا میلان پایا اس کے لئے دار العلوم کے دروازے کھلے ہوئے تھے بعلوم دینیہ سے جن کو مناسبت تھی انھوں نے مدرسہ قضا شرعی کا رُخ کیا۔ ان درسگاہوں کے قیام نے مصر میں ادبیات اور دینیات کی تعلیم کو اتنے بلند معیار پر پہنچا دیا کہ بلاد اسلامیہ میں کہیں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مصر میں موجودہ ادبی اور مذہبی مباحث اور تحقیقات انھی درسگاہوں کی رہین منت ہیں۔ انھی کی چار دیواری میں اسکندری۔ علام۔ تونی۔ حمزہ فتح اللہ۔ زنانی وغیرہ نے تعلیم پائی تھی اور آج بھی وہ ہستیاں ہیں جو علوم عربیہ کی سرتاج شمار ہوتی ہیں۔ ان کے اختصاصی درجہ اور کمال کو یورپ کی جامعات نے تسلیم کیا۔ کیمبرج اور آکسفورڈ جیسی جامعات نے ان کی خدمات حاصل کیں۔ غمراوی بک، حفنی ناصف اور شیخ عبدالعزیز جادیش نے مدتوں تک ان جامعات میں ادبیات عربی کی دراست کا کام انجام دیا ہے اور آج بھی مہدی علام کیمبرج میں اس خدمت کو انجام دیر ہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان درسگاہوں کے قیام نے مصر میں مذہبی اور ادبی تعلیم کے مسئلہ کو بہت بڑی حد تک حل کر دیا تھا، تاہم یہ پورے درد کی دوا نہیں ہو سکتے تھے۔ جامعات یورپ کے معیار پر جدید علوم و فنون کی تعلیم کا مسئلہ ہنوز حل نہ ہوا تھا اس ضرورت کے شدید احساس نے جامعہ مصریہ کی بناد ڈالی۔ لارڈ کرومر کی سیاست ملک میں کسی سرکاری جامعہ کے قیام یا علوم جدید کی اعلیٰ تعلیم کی موافق نہ رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وزارت تعلیمات مصر کی قیام جامعہ سے متعلق ہر تجویز پیچیدگیوں اور مصطنعہ طوالت میں الجھ کر رہ جاتی تھی۔ وزارت تعلیمات کے تحت جو مدارس اور کلیات تھے وہ بھی اس مقصد کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ اس قومی جامعہ کے قیام نے ملک کی دیرینہ تمناؤں کو پورا کیا۔ بلند پیمانہ پر اس میں علوم جدیدہ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ یورپ کے نامور علما و اختصاصین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وسیع پیمانہ پر بحث و تحقیق کے انتظامات کے گئے۔ پرنس فؤاد کی سرپرستی اور سعد زغلول پاشا کی چانسلری میں اس نے اس میدان بحث و تحقیق میں اپنے درجہ اور مقام کو منوا کے چھوڑا اور دنیا سے یہ تسلیم کروا دیا کہ دماغی قابلیت اور کام کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے مصر، یورپ کے کسی متمدن ملک سے کم نہیں۔ آج علمی دنیا ڈاکٹر طٰہٰ حسین، منصور فہمی احمد امین، حسین ھیکل، لطفی جمعہ اور مصطفیٰ عبد الرزاق جیسے مشاہیر کے مقام بحث و تحقیق سے بخوبی واقف ہے۔ ان سب نے اسی جامعہ مصریہ کی آغوش میں تربیت پائی تھی اور آج مصر کی موجودہ ارتقائی ذہنیت میں ان میں سے ہر ایک نے وہ کام کیا ہے کہ جس کی تفصیل میرے لئے

دشوار ہے۔ اس ادارہ کی روز افزوں اور ہمہ گیر ترقی نے بالآخر حکومت کو بھی اس کی سرپرستی اور تائید پر باوجود پس پردہ شدید مخالفتوں کے مجبور کر دیا اور سب سعد زغلول مصر کی تحریک آزادی عروج کے زمانہ میں برسر اقتدار ہوئے ہیں تو انھوں نے رہی سہی مخالفت کا بھی قلع قمع کر دیا اور اس طرح کامل طور پر اس کو حکومت کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ حکومت کی اس دلچسپی نے جامعہ مصریہ کی راہ سے ہر طرح کے موانعات کو دور کر دیا ہے اور وہ ارتقائی زینوں کو بڑی تیزی سے طے کرنے میں مصروف اور مسلمانوں کے ذہنی ارتقاء و کمال کا تنہا آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔

محمد عبدہ کی تعلیمات سے پوری طرح متاثر ہونے والوں اور ان کے فیض صحبت سے کامل استفادہ کرنے والوں میں قاسم بک امین کا نام اصلاح نسواں سے متعلق اپنے شاندار کارناموں کے لئے یادگار رہیگا۔ خواتین مصر کی حالیہ بیداری اسی محب وطن کی بے لوث خدمات اور بے ریا مسائی کا نتیجہ ہے مدتوں کے جمود، مردوں کے ناروا جور و تعدی اور اپنے حقوق سے غافل رہنے کے بعد آج خواتین مصر بمقابل دیگر بلاد اسلامیہ کے زندگی کے ہر شعبہ میں تفوق اور امتیاز کی مالک ہیں۔ ان کے نصب العینی تقدم کی راہ میں اب پردہ کا مسئلہ ہارج اور مانع نہیں رہا ہے۔ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کبھی کی جاری ہو چکی ہے، ہر قسم کی اجتماعی اور سیاسی تحریکات میں بڑی مستعدی سے بہ حصہ لیتی ہیں۔ تقریر اور خطابت میں یہ نہ صرف فصیح و بلیغ بلکہ شعلہ نار ہیں۔ کوئی ایسا نہیں ہو سکتا جو ان کو کسی جلسہ میں تقریر کرتا دیکھے اور ان کی طلاقت لسانی سے مسحور ہو کر نہ رہ جائے۔ میدان تصنیف و تالیف اور شعر و شاعری میں یہ مردوں سے کم نہیں ہیں ہدا حانم سعرادی۔ باحثۃ البادیۃ، آنسۃ می، صفیۂ زغلول فوزیۃ ھانم سما، مصر کے وہ درخشاں تارے ہیں کہ مصر اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں اور سیاسی بیداری کے لئے بڑی حد تک انھی کا رہین منت ہے۔ میدان سیاست میں انھوں نے جس قابلیت اور تدبر کا ثبوت دیا ہے اس نے مُلک کی عزت اور وقار میں اضافہ کر دیا ہے۔ متعدد وسیع الانتشار جرائد ان کی ادارت میں بڑی کامیابی اور نیکنامی کے ساتھ چل رہے ہیں، مُلک کی سیاست میں ان کی رائے کو دخل ہے اور حقوق وطن کی مدافعت میں ان کے کارنامے روشن رہے ہیں، خدمت وطن کی راہ میں انھوں نے ہر طرح کے مصائب ابتلا کا بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا، اولاد، احبا، اور اقربا کی جدائی اور جیل خانوں کے تاریک کمروں نے مدافعت وطن کے راستہ میں ان کے پائے ثبات کو کبھی بھی متزلزل نہ ہونے دیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ زغلول کو

اپنی سیاسی جد و جہد میں کبھی کامیابی نصیب نہ ہوتی اگر خواتین مصر نے نادر المثال پامردی کے ساتھ اس کا ساتھ نہ دیا ہوتا۔ ملک کی سیاسی بیداری کی ترقی یافتہ شکل وہ قومی جد و جہد ہے جو جنگ عظیم کے اختتام پر سعد زغلول پاشا کی قیادت میں شروع ہوئی اور اپنی قوت و متانت کے لحاظ سے ایک دنیا کے لئے محل استعجاب ہوئی، یہ اسی بیدار مغز وطن پرست اور وقت کے بڑے مدبر کی صداقت، اخلاص، فدائیت اور عظمت دماغی کے مظاہر ہیں کہ مصر آج ترقی کے اس زینہ پر وقعت اور احترام کی نظر سے دکھائی دیتا ہے، یہ اسی کی قربانیوں کا نتیجہ تھا کہ بالآخر حکومت احتلال کو مصر کے ساتھ حالیہ معاہدہ پر مجبور ہونا پڑا۔ اسی کے ہاتھوں دستوری زندگی کی بنا پڑی۔ پارلیمنٹ کا افتتاح ہوا، اور خود سعد زغلول نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تھامی۔ محمد عبدہ کے فیض صحبت سے زغلول نے کماحقہ استفادہ کیا تھا، ان کی تعلیمات نے اس کے دل میں جگہ کر لی تھی، برسراقتدار ہونے کے ساتھ ہی اس نے ملک کی ہر جہتی ترقیات سے متعلق تجاویز پر غور کرنا شروع کر دیا۔ جامعہ مصریہ کی جدید تنظیم کی۔ ملک کی تعلیمی پالسی جو غلامی کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی سرے سے بدل دی گئی، نئی پالسی کی بنیاد نوجوانوں کی صحیح اخلاقی تربیت، قومی احساس اور وقت کی ضرورت پر رکھی گئی، عربی زبان کو اس نے ذریعہ تعلیم قرار دیا، احتفاظ حقوق نسواں پر اس نے بطور خاص توجہ کی، مخلوط تعلیم نے اس کی تائید اور حمایت سے رواج پایا۔ میدان سیاست میں اپنی کامیابی اعلان دستور اور افتتاح پارلیمنٹ کی وجہ سے جو غیر معمولی ہر دلعزیزی اس نے حاصل کی تاریخ مصر میں اس کی نظیر نہیں ملتی، اہل وطن سے اس تعلق نے اس کے صدہا کاموں کو آسان کر دیا حتیٰ کہ جامعہ ازہر کے نصاب اور طریق تعلیم میں تغیر و تبدل کے لئے جب اس نے پیش قدمی کی تو شیوخ تک نے اس کا ساتھ دیا، اور جو چیز محمد عبدہ کے لئے دشوار بنی ہوئی تھی وہ زغلول کے لیے آسان ہوگئی، چنانچہ اس نے علوم قدیمہ کے ساتھ جدید مضامین کو داخل نصاب کیا، روشن خیال اور قابل علما کو تدریس کی خدمات دیں، طلبہ کی رہائش کا معقول انتظام اور ان کی اخلاقی تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ جامعہ ازہر سے زغلول کی اس غیر معمولی دلچسپی نے اس درسگاہ کو اصلاح اور تقدم کے راستہ پر ڈال دیا ہے اور اس طرح توقع ہے کہ جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی ایک دیرینہ مراد بر آئے۔

یہ صحیح ہے کہ آج مصر زغلول کی قیادت اور رہنمائی سے محروم ہو چکا ہے لیکن زغلول کی پیدا کی ہوئی روح زندہ ہے اور برابر اپنا کام کئے جا رہی ہے۔ زغلول کے جانشینوں نے اپنے عظیم المرتبت پیشرو سے اخلاص،

صداقت اور فدائیت کا بدرجہ اتم حصہ پایا ہے وہ اس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور مُلک کے سیاسی فقدان کے حل میں وہ سب کچھ کر رہے ہیں جس کی کسی محب وطن سے توقع کیجا سکتی ہے. مصر کی حالیہ بے چینی سے آپ بخوبی واقف ہیں اس موقع پر قومی مطالبات کی شنوائی دستور مملکت کے از سر نو احیا اور افتتاح پرلمان میں زغلول کے جانشین مصطفیٰ نحاس ہی کے سیاسی تدبر، صداقت کار اور حب الوطنی کو دخل رہا ہے. برطانیہ سے معاہدہ تخالف کے بعد انھی کی ریاست میں مصر کی پہلی دستوری وزارت کا قیام ہوا تھا، اور اب انھی کی ذات سے مصر کی کامل آزادی اور اس کی ہر جہتی فلاح و بہبودی کی خوش آیند توقعات وابستہ ہیں۔

مصر کے دارالخلافہ قاہرہ میں جہاں کہیں بھی آپ کا گذر ہو، آپ عجیب و غریب طریقہ پر دلکشی اور جذابیت کے سامان مہیا پائینگے. اسٹیشن قاہرہ سے جوں ہی آپ نے قدم باہر رکھا کہ مصری قومیت اور روح حریت کے ایک زبردست مظاہرہ سے آپ دوچار ہوئے. مصری فنان محمود مختار کا فنی شاہکار یعنی حالیہ بیداری مصر کی عظیم الشان تمثال آپ کے استقبال اور آپ کو قومی تحریک کے ثبات استقلال اور عظمت سے مرعوب کرنے کے لئے تیار ملیگی. بڑی بڑی خوب صورت وسیع صاف و شفاف اور دونوں جانب استادہ سرسبز درختوں سے ڈھکی ہوئی سڑکوں کا جال شہر کے طول و عرض میں پھیلا ہوا دکھائی دیگا، ان کی دونوں جانب خوش منظر اور فلک بوس مکانات کا سلسلہ ہوگا جو ختم ہونے کا نام نہ لیگا جگہ جگہ سرسبز و شاداب آراستہ و پیراستہ باغ ملینگے، وسط شہر میں حدیقہ ازبکیہ اور اطراف میں چمنہائے قناطر خیریہ النباتات حیوانات اسماک معادی وغیرہ کا حصار ہوگا. قدیم اور نو تعمیر مساجد جو بجائے خود عربی فن تعمیر کے غیر فانی نمونے ہیں وقفہ وقفہ سے آپ کی آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کر رہی ہونگی. کہیں آپ جامع سلطان کے آگے محو نظارہ ہونگے تو کہیں جامع رفاعی، جامع ابن طولون، جامع عمرو بن العاص، آپ کو مبہوت اور ششدر کئے ہوئے ہونگے، اور کہیں جامع محمد علی، جامع سیدنا حسین اور جامع ازہر، آپ کی حیرانی اور استعجاب کا موجب بنی ہوئی ہونگی، قدم قدم پر عربی طرز تعمیر کی بے مثال یادگاریں بلند و بالا قصور و محلات جن کی پچہ کاری نقش و نگار اور بیل بوٹے آپ پر سحر آفریں کیفیت پیدا کر رہے ہونگے، راستے آباد جن پر انسانوں کا میلا لگا ہوا اور ہر طرح کی آرام دہ سواریوں کا از د حام و ہجوم، اس تمام مادی شان و شوکت کا آپ کے دل و دماغ پر صرف ایک ہی اثر ہوگا کہ با عتبار دلکشی، خوب صورتی، جذابیت اور چہل پہل کے کوئی اور شہر آپ کی نظر میں نہ جچے. شہر کی ان دلکشیوں سے کہیں بڑھ کر اہل شہر کی دلکشی ہوگی، دو ہی طرح کے انسان آپ دیکھیں گے یا تو ہشاش و بشاش

خوش مزاج، سانولی رنگت، تنومند مرد ہونگے اور یا گندمی رنگ مائل بہ سفیدی، معتدل قامت سرگیں چشم، خوش طبع بذلہ سنج عورتیں ہونگی جو ادبی اور علمی مجلسوں، تقریر گاہوں، باغوں، درسگاہوں اور تھیٹروں میں مردوں کے دوش بدوش دکھائی دینگی، ان میں زیادہ تر تو بے نقاب ہونگی اور اگر کسی کے نقاب ہوا بھی تو اس نے حُسنِ خداداد کی شاندار نمائش کا انتظام کیا ہوگا نہ کہ اخفاءِ جمال کا۔ مصر کا قابل دید اشیاء میں دارالاثار المصریہ اور دارالاثار العربیہ آپ کے لئے دلچسپی اور عبرت کا ایک دفتر ثابت ہونگے، ایک اگر قدماء مصر کی عظمت فکری کی نمایندگی کر رہا ہوگا تو دوسرا اسلامی تمدن کے غیر فانی آثار کا شاہد۔ کتب خانہ خدیویہ آپ کی علمی اور ادبی دلچسپیوں کا آماجگاہ بنا ہوگا جہاں آپ عجوبۂ روزگار علمی ذخیرہ کو تجربہ کار سنجیدہ علم دوست اور واقف کار ہستیوں کی نگرانی میں تشنگان علم کی آبیاری کرتا پائینگے۔ یہاں آپ قدیم تر مصاحف اور انمول مخطوطات و کتب کا اتنا نایاب ذخیرہ پائینگے کہ جس کی مثال شاید ہی دنیا کے کسی اور کتب خانہ میں مل سکے۔ مصر کی علمی اور ادبی مجلسوں اور سیاسی اور اجتماعی انجمنوں، دارالمطالعوں اور ہر ہر پیشہ و صنعت کی محفلوں کی کثرت و بہتات یقیناً آپ کی حیرانی اور استعجاب کا موجب ہوگی۔ جا بجا جلسے ہوتے دکھائی دینگے، علمی، ادبی اور سیاسی مسائل پر دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہونگی، مقررین میں جہاں مرد دکھائی دینگے وہیں عورتیں بھی۔ عباسیہ اور جنیرہ سے آپ کا گذر ہو تو ایک عجیب دلچسپ سماں آپ کے پیش نظر ہو جائیگا۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی صفیں آپ کو جنبش کرتے دکھائی دینگی۔ جذبۂ قومیت سے معمور، حب الوطنی میں شرابور، ملک کی عظمت و وقار کے نگہبان قومی آمال و رمانی کی پناہ گاہ یہ خوش رو شکیل صحت و شباب اور جرات و ہمت سے لبریز ہستیاں ایک ہی وضع قطع میں کامل وقار اور متانت کے ساتھ درسگاہوں، کھیل کود کے میدانوں، انجمنوں، کتب خانوں اور تفریح گاہوں کا قصد کرتے جب آپ دیکھیں گے تو یقین مانئے کہ اس سحر آفریں منظر نے کچھ ایسا گہرا نقش آپ کے دل کی گہرائیوں پر چھوڑا ہوگا کہ مٹائے نہ مٹ سکے۔ غرض زندگی کے جس شعبہ پر آپ کی نظریں پڑینگی حیات اجتماعی کے جس رُخ کا آپ جایزہ لینگے ایک عجیب جذابیت اور دلبستگی کی شان لئے ہوئے ہوگا، اور بے اختیار آپ کہہ اُٹھیں گے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می بینم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

سونے کے بندے

از

جناب دیپک رائے صاحب سکسینہ حسینی علیگ

جگا دھر نے باہر سے آکر سونی گھر کی طرف جاتے ہوئے کہا:۔

"ماں، اننت رام پانڈے اور منشی لالہ دونوں گودھوری[1] کے بعد جانے والے ہیں۔ ہم لوگ بھی اُن کے ساتھ ہو جائیں گے۔ راستہ کٹ جائیگا۔ اس کے سوائے پانڈے جی راستہ میں تمھیں جگنا تھ جی کی کتھا سُنائیں گے"!

اندر سے ایک ادھیڑ عورت نے جواب دیا۔ "بہت ٹھیک ہے بیٹا"!

جگنا تھ جی کی جاترا۔ مقدس گنگا کا اشنان اور ساتھ ہی اننت رام پانڈے اور ان کی بیوی کا ساتھ جگا دھر کی ماں کے لئے انتہا سے زیادہ مسرت انگیز خبر تھی۔

وہ ہمیشہ سے اس بوڑھے برہمن کی لانبی ڈاڑھی، اور چندن سے منقش پیشانی کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی۔ اُس کے خیال میں اننت رام دیوتا تھے اور دیوتاؤں میں رہنے کے قابل۔ لیکن نہ معلوم اتفاق سے یا گانوں والوں کی پُرجوش عقیدت سے متاثر ہو کر وہ یہیں کے ہو رہے چنانچہ پندرہ سال پہلے جب جگا دھر ابھی بچہ تھا۔ اور بوڑھی ٹھکرائن کا شوہر گانوں کا سب سے بارعب ٹھاکر سمجھا جاتا تھا۔ اننت رام اپنی آوارہ گردی ترک کر کے گانوں کے تالاب کے قریب ہی ایک مندر میں ٹک گئے تھے۔ اور اتنے سال بعد غریب گانوں والوں کی آو بھگت بھبھوتوں اور چڑھاؤں نے اُنھیں دو چار مویشی۔ ایک صفائی مکان اور کچھ زمین کا مالک بنا دیا تھا۔

شام ہوتے ہوتے بیل گاڑیاں میلا پور کی طرف نکلنے لگیں، جہاں دو روز تک جگنا تھ جی کی جاترا کا میلا لگنے والا تھا۔ میلا پور گنگا کے کنارے ایک خوب صورت گانوں تھا۔ ہر سال یہاں بڑی دھوم دھام سے جاترا منائی جاتی جس کا انتظار اطراف و اکناف کے گانوں میں اور دُور دُور تک بھی بڑی شد و مد سے کیا جاتا خصوصاً

---

[1] شام میں مویشیوں کے لوٹنے کا وقت۔

بارہ مہینوں کی انتھک محنت اور امید و بیم کی کشکش کے بعد جب ہنگام قابل اطمینان ہوتا تو گانوں کے گانوں بارش اور اناج کے دیوتا کی پوجن کے لئے جوق در جوق جمع ہونے لگتے۔

چھوٹی سی برہنہ پہاڑی کی چوٹی پر جس کے دامن سے نیم دائرہ کی شکل میں دریا بہتا تھا، ایک سنگ بستہ خوب صورت مندر کسی عہد قدیم کے فن تعمیر کا نمونہ سر اٹھائے کھڑا تھا جس کے سکھر[1] پر سرخ پرچم ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں ناچتا رہتا۔

مویشی واپس ہو چکے تھے اور پیپل کے درختوں پر کووں نے شب بسری کی تیاری میں جگہ کے لئے لڑنا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ جگا دھر نے تھان سے دو سفید بیلوں کی جوڑی کھول لی۔ نوجوان ٹھاکر کو ہمیشہ اپنے ان جانوروں پر فخر تھا جب کبھی ان کی مضطرب حرکات۔ سرخ سرخ آنکھوں میں متحرک دیدے جن سے غصہ اور شرارت کا اظہار ہوتا تھا۔ گانوں والوں کی نگاہوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے تو وہ مسکرا دینے پر مجبور ہو جاتا۔ اکثر گانوں کے فربہ اندام ساہوسے اس جوڑی کی قیمت کا اندازہ کرواتے یا حریص پٹواری سے اس کی داشت و پرداخت کے بارے میں مشورہ لینے میں اسے خاص خوشی ہوتی تھی۔

لیکن اس موقع پر تقریباً ایک ہفتہ آگے سے وہ انھیں روزانہ اپنے ہاتھوں سے تالاب میں نہلایا کرتا۔ اور اب ان کی بے داغ جلد ڈھلتی ہوئی دھوپ میں سنگ مرمر کی طرح سفید اور چمکدار معلوم ہو رہی تھی۔

آج وہ بے انتہا خوش تھا اس کی شادی ہوئے صرف ایک سال ہوا تھا۔ لیکن یہ اپنے گنے دن اس کی زندگی کو کس قدر بدل چکے تھے اور اس کے خیالات میں کتنی تبدیلی پیدا کر چکے تھے۔ اس کی نئی بیوی نینی اتنی خوب صورت تو نہ تھی، جتنی منشی لالہ کی سالی مرنالنی دیوی لیکن اس کا مقابلہ اس کی نئی بیاہتا سے کیا؟ جگا دھر محسوس کرتا تھا کہ مغرور مرنالنی کے سامنے اس کی وقعت بھیڑ سے زیادہ نہ تھی اور نہ دوسرے گانوں والے اس کی نظر میں کوئی شمار و قطار رکھتے تھے۔ اس نے یہ بھی سنا تھا کہ مرنالنی تعلیم یافتہ بھی تھی چنانچہ وہ اپنے رشتہ داروں کو ہندی اور اردو دونوں میں خطوط لکھتی تھی۔ علاوہ ازیں ــــ

نینی سے اس کی ماں کتنی خوش تھی، اور وہ خود بھی کس قدر مسرور تھا۔ اس بات کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا تھا کہ جاڑے کی راتوں میں آگ کے اطراف دیہاتیوں کے حلقہ میں یا گرما کی شاموں میں بان کی کھاٹوں پر

---

[1] مینار مندر۔

حقہ کی آہنگ دار آواز کے ساتھ گنواروں کی جو مجلسیں گرم ہوتیں ان میں اب نوجوان چوکیدار بہت کم نظر آتا تھا۔

جگا دھر ذات کا راٹھور راجپوت تھا۔ کہتے ہیں اُس کے آبا و اجداد بڑی خاندانی نجابت کے نام لیوا تھے۔ لیکن مغلیہ عہد میں کسی سیاسی انقلاب نے انھیں سرن پور میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا، اور ان کے بعد اُن کی اولاد نے اس چھوٹے سے پُر امن گانوں کو اپنا مستقل وطن بنا لیا تھا، اور اب بھی ایک عرصہ سے انگریزی سرکار نے دیہات کی چوکیداری کی معزز خدمت پر اُن کو مقرر رکھا تھا چنانچہ اسی موروثی خدمت پر جگا دھر اب بھی فائز تھا۔

باپ کے انتقال کے بعد ایک کمپنی کی ساخت کی بندوق۔ دو دیسی تلواریں جن کے میانوں پر وقتاً فوقتاً گانوں کے چمار نے پیوند لگائے تھے، اس کو ورثہ میں ملی تھیں، اس کے ساتھ غیر منقولہ ترکہ کی صورت میں تھوڑی سی زمین۔ دو باولیاں اور چند مویشی بھی اس کو ملے تھے۔ اور اب وہ اپنے آبائی مکان میں ماں اور نئی بیوی کے ساتھ زندگی کا بہترین عہد اطمینان اور چین سے گزار رہا تھا۔

شادی کے بعد جیسے ہی نبتی نے اُس کے گھر میں قدم رکھا، وہ اُس کا ہوگیا۔ گو اُس نے تعلقے کے مدرسے میں اپر پرائمری تک ہی تعلیم پائی تھی، اور گانوں کے زمین داروں کو اخبار پڑھ کر سنا سکتا تھا لیکن وہ نہ تو اتنا زیادہ پڑھا ہوا تھا، اور نہ اُس تعلیم یافتہ زمرہ میں سے تھا جس کے افراد بیوی میں کسی ناول کی ہیروئن کے حسن یا کسی ستارۂ سینما کی دلکشیاں اور دلفریبیاں دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

پھر وہ سادہ رُخ نوجوان دلھن کی شخصیت میں تیزی سے جذب ہونے لگا، اور اب اس کی ساری زندگی ایک ہی نبتی کے اطراف مرکوز ہو چکی تھی۔ چنانچہ کھیت میں کٹائی کی نگرانی کرتے، اطراف کے قصبوں کے مختصر دوروں میں، تالاب میں مویشیوں کو نہلاتے۔ غرض ہر جگہ وہ جلد از جلد گھر پہنچنے کی کھوج میں رہتا۔

ادھر نبتی ان تمام خوبیوں سے خاطر خواہ مزین تھی جو دیہاتی لڑکیوں کے روزانہ فرائض کے لئے ضروری ہیں۔ اُس کی نگرانی میں گائیں زیادہ دودھ دینے لگیں، وہ خود دودھ دُہتی اور ان کی دیکھ ریکھ بذاتہ کرتی! اس کے علاوہ نبتی کے آنے کے بعد سے گھر کا صحن آئینہ کی طرح، اور پیتل برتن سونے کی طرح چمکنے لگے تھے۔ مزید برآں وہ بوڑھی ساس کی خدمت میں ابتدا ہی سے پیش پیش رہنے لگی، اور یہی وہ چیز تھی جس نے جگا دھر کی ماں کی نظروں میں وہ بات کھٹکنے نہ دی جو اور خاندانوں میں ـــــ خواہ وہ سادہ مزاج دیہاتی ہی کیوں نہ ہوں ـــــ بڑی بڑی مصیبتوں۔ پھوٹ اور نفاق کی محرک ہوتی ہے، یعنے یہ کہ اس کا

بیٹا اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔

— ۲ —

رات بھر چاندنی میں چلتے ہوئے وہ صبح صبح میلاپور کے قریب پہنچ گئے۔

آگے پیچھے تین بیل گاڑیاں چل رہی تھیں ایک میں جو سب کے آگے تھی منشی لالہ، ان کی بیوی، اور دو بچے سوار تھے۔ وہ کائستھ تھے اور گاؤں کے واحد تعلیم یافتہ شخص ہونے کی وجہ سے ان کی بڑی عزت تھی۔ ان کی بہلی کی دونوں جانب دو بدرنگ ریشمی پردے، جو شاید کسی دیہاتی مقطع کے شملے کی باقیات تھے، لٹکتے تھے۔ لیکن پہلی منزل پر ہی جگا دھر نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی مغرور سالی مرنالنی موجود نہ تھی —— اس نے ایک بار کسی موقع پر منشی جی کی بیوی کو یہ کہتے سنا تھا کہ مرنالنی کو میلے ٹھیلے سے ہمیشہ نفرت تھی۔

دوسری میں اننت رام پانڈے، ان کی بیوی اور جگا دھر کی ماں سوار تھیں اور راستہ بھر ٹھاکر کے کانوں میں ان تینوں کے مسلسل باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ بوڑھے برہمن کے یہاں مذہبی کہانیوں کا زبردست ذخیرہ تھا، اور شاید وہ اس کی زندگی کی طرح لمبی اور دلچسپ تھیں۔

سب سے آخر میں جگا دھر کی گاڑی تھی جس میں پیال پر اندر کی طرف نینی رات کے بیشتر حصہ میں پڑی سوتی رہی، اور نیم خوابی کی حالت میں ٹھاکر، شریر بیلوں کی رسی تھامے اگلے تختہ پر بیٹھا رہا۔

صبح ہو رہی تھی اور میلاپور کی پہاڑی پر سفید مندر، نیلے آسمان کے مقابل میں ابر کے ٹکڑے کی طرح دھندلا، اور موہوم نظر آرہا تھا۔ سب سے پہلے اننت رام پانڈے نے اس کو دیکھا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور بلند آواز میں کچھ اشلوک دہرانے شروع کئے۔ جگا دھر کی ماں نے بھی اس کی تقلید کی لیکن وہ کوئی اشلوک تو پڑھ نہ سکی، البتہ اس نے اپنے اکلوتے لڑکے کی درازیٔ عمر کے لئے دعا مانگ لینے پر اکتفا کیا۔

جگا دھر خاموشی سے بیل ہانکتا رہا۔ دو ایک بار اس نے ادھر نظریں اٹھائیں جدھر میلاپور کے مندر کی اونچی سنہری دھندلی نظر آتی تھی۔ پھر اس نے بے اختیار ہی پلٹ کر گاڑی کے اندر نظر ڈالی۔

جگا دھر نے کہا "نینی میلے میں کیا لیگی؟"

نینی نے سر نیچا کر کے جواب دیا "کچھ نہیں مہاراج لونگی کیا؟ ہمارے گھر میں ایشور کا دیا سب کچھ ہے!"

ٹھاکر بولا "پھر بھی جاترا سے خالی ہاتھ تو نہ جانا چاہیئے۔"

نینی خاموش ہو رہی۔

گاڑی چلتی رہی اور سورج کی ابتدائی کرنوں میں میلا پور کا مندر اور میلے کا شور اب زیادہ صاف دکھائی اور سنائی دینے لگا۔

بڑی دیر کے بعد جگا دھر نے پھر پوچھا۔ "کہتی نہیں؟"

نینی نے کہا۔ "مہاراج مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں ہے، البتہ اگر آپ مرنالنی دیوی کے سے۔"
اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

ٹھاکر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ہاں ہاں کیا؟"

"ویسے بندے۔ جڑاوی ہرے نگینوں والے"

نوجوان چوکیدار سُن ہو کر رہ گیا۔ مرنالنی دیوی کے بندے اف! وہ تو بہت قیمتی تھے۔ اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ گذشتہ میلے میں منشی جی کی بیوی نے انھیں خرید تھا۔ اور منشی لالہ اسی زیور کی خوب صورتی اور بڑھی ہوئی قیمت کا ذکر سال تمام اپنے شاگردوں سے، پٹواری سے، چوکیدار سے غرض ہر شنا سا سے کرتے رہے تھے۔ اُن کا گھر پنگھٹ کے قریب تھا، اس لئے گانوں کی لڑکیاں شام کے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی میں مرنالنی کے کانوں میں دمکتے ہوئے بندوں کو حیرت اور تعریف کی نظروں سے دیکھتیں۔ ان میں چپکے چپکے کچھ اشارے اور سرگوشیاں ہوتیں، پھر ہر ایک اپنا پانی سے بھرا ہوا برتن ایک دوسرے کی مدد سے اٹھاتی اور اپنی قسمت پر شاکر ایک آہ سرد کے ساتھ پنگھٹ سے رخصت ہو جاتی۔

ٹھاکر سوچنے لگا۔ "لگ بھگ پچاس روپیے ـــ اس کی زمین کا ایک سال کا محاصل!"

اُس نے دبی آواز میں کہا۔ "نینی ہم غریب لوگ ہیں۔ ہمارے لئے اتنے قیمتی ـــ؟"

نینی اسی طرح سر نیچا کئے بولی۔ "اور منشی جی کونسے امیر آدمی ہیں۔ کل ہی تو بھونڈا مل کے پاس پچیس روپیوں کے اُدھار کے لئے بگون پر گرے جا رہے تھے۔"

اس کے بعد ٹھاکر اور کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ راستہ بھر سوچنے لگا۔ میلے میں شہر کے جوہریوں کی دوکانیں ضرور لگتی تھیں۔ اور ویسے ہی بندوں کا ملجانا بھی مشکل نہ تھا۔ لیکن سوال تھا تو ـــ روپیہ کا۔

اُس کے پاس صرف اکیس روپیے نقد تھے، باقی وہ کہاں سے لائیگا؟ لیکن نینی کی یہ فرمائش ـــ انکار کرنے کی اُسے ہمت نہ ہوئی۔

وہ گانوں کے قریب آ گئے تھے اور چڑھتی ہوئی دھوپ تماشے کے شیدائی دیہاتیوں کے جوش میں

کوئی کمی نہ کر سکتی تھی۔ ایک طرف ڈھول، دف اور منجیروں کی آوازیں قیامت کا سماں پیدا کر رہی تھیں اور دوسری طرف گنوار گاہکوں اور ہشیار شہری تاجروں کے درمیان ایک شور دار و گیر برپا تھا۔

کپڑوں کے عارضی سائبانوں اور چھپروں کے ناکافی سایہ میں ہمہ قسم کی سستی اور نظر فریب اشیاء مہیا تھیں۔ رنگ برنگ کی مٹھائیاں۔ غیر خالص اجزاء کی بنی ہوئی گرد اور مکھیوں کی کثرت سے بد رونق ہوئی جا رہی تھیں لیکن دیہاتی بچوں کی نظروں میں وہ بڑی نعمت معلوم ہوتیں۔ وہ انھیں للچائی نظروں سے دیکھتے اور اپنے ماں باپ کا دامن پکڑ کر ان دوکانوں کی طرف بزور کھینچے لئے جاتے۔

مٹی کے کھلونے جن میں کہیں کہیں بدیسی صنعت کی شکل بھی نظر آ جاتی، مگر سادگی پسند دیہاتی ان کو نہ پوچھتے۔ وہ اُن کے گنوار بچوں کے کس کام کے تھے!۔

ان کے علاوہ مختلف قسم کی اشیا، جن سے دیہاتی زندگی کی ضروریات رفع ہو سکتی ہیں۔ سستا کامدہ۔ ہلکے بھڑک دار رنگ کے کپڑے۔ پیتل۔ برتن۔ غرض کیا کیا۔ قریب قریب لگی ہوئی دوکانوں میں جمع کی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کی قربت اور تماشائیوں کی کثرت سے راستہ چلنا دشوار تھا۔ اس پر بھی دیہاتی اپنی بڑی بڑی وزنی گاڑیاں اس بھیڑ میں گھسائے لئے جا رہے تھے۔

ایک برگد کے درخت کے تلے منشی لالہ نے اپنی بہلی کھڑی کر دی اور اُتر کر انگرکھا جھاڑنے لگے۔ اننت رام پانڈے کی گاڑی بھی ان کے پیچھے ہی رُک گئی، اور ساتھ ہی جگا دھرنے بھی اپنے بیل کھڑے کر دیئے۔

دوسرے روز تک یہی برگد کا سایہ دار درخت، رات کی اوس اور دن کی دھوپ میں ان کا محافظ بننے والا تھا۔

— ۳ —

ایسے میلوں اور جاتراؤں میں بہ نسبت دن کے رات کو مصروفیتیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ رات میں مذہبی رسمیں بھی ادا ہونے والی تھیں اور یہی وجہ ہوئی کہ چاندنی میں میلے کا منظر دریا کے اُس پار رہنے والوں کو بھوتوں کا ایک شہر نظر آتا تھا۔ یہ وقت تھا جب خرید و فروخت کی گرم بازاری شروع ہوئی۔ دیہاتی اپنے پورے خاندان کی قوت کے ساتھ دوکانوں پر حملہ آور ہوتے۔ ہر شئے کے خریدنے سے پہلے دس بار اُن کا امتحان کیا جاتا۔ آپس میں دیر تک صلاح و مشورہ ہوتا، اس پر بھی ہر قدم پر دھوکہ اور فریب کا خوف پیچھا نہ چھوڑتا۔

ادھر ہوشیار بیوپاری نہایت اطمینان کے ساتھ بیک وقت دس گاہکوں کی نہایت خوبی سے تشفی کرتے ایک جوہری کی دوکان کے آگے سرن پور کا قافلہ نمودار ہوا۔ انھیں آتا دیکھ کر فربہ اندام جوہری چوکس ہوکر بیٹھ گیا جیسے مکڑی دور سے آتے ہوئے شکار کو دیکھ کر اپنے پیروں کو سمیٹ جھولنے لگتی ہے۔ انھوں نے دیکھا دو گیسی لیمپوں کی تیز روشنی میں بند شیشہ کے کیسوں میں رکھی ہوئی چمکدار سفید و زرد اشیاء۔ زیور اور رنگ برنگ کے پتھر آنکھوں کو چوندھیا رہے تھے۔

اننت رام۔ ان کی بیوی اور ٹھاکر کی ماں پیچھے رہ گئے۔ صرف ٹھاکر آگے تھا، اور اس کے عقب میں منشی لالہ، ان کی بیوی اور نینی ایک جانب کو خاموش کھڑے ہوگئے۔

زیور پسند کرنے بڑی دیر لگی، اس لئے کہ مشورہ ضروری تھا بعض بہت قیمتی تھے بعض بہت ہلکے۔ یا کسی کی بناوٹ اچھی نہ تھی، اور بعض مرنالنی دیوی کے بندوں سے قریبی مشابہت نہ رکھتے تھے۔ غرض کئی بار کی الٹ پھیر اور صلاح کے بعد جس میں منشی لالہ اور ان کی بیوی نے ماہرانہ حصہ لیا، ایک بندوں کی جوڑ پسند کی گئی۔ باریک سونے کی جال میں دو سبز پتھر بڑی خوب صورتی سے بٹھائے گئے تھے۔

اب قیمت کے تصفیہ کا مرحلہ باقی تھا۔ جوہری نے قسم کھاکر کہا ان کی اصلی قیمت ساٹھ [60] روپیے سے زیادہ ہی تھی۔ لیکن وہ انھیں غیر معمولی رعایت پر دینے کے لئے تیار تھا یعنے صرف ترپن [53] روپیے میں — لیکن یہ چیز ٹھاکر کی سمجھ میں نہ آئی کہ بڈھا بیوپاری جس کو اس نے اس سے پہلے کبھی دیکھا بھی نہ تھا اس قدر رعایت ان کے ساتھ کیوں کر رہا تھا — نینی نے دل میں خیال کیا "جوہری کیسا نیک آدمی ہے"۔

اب روپیہ کا حساب شروع ہوا۔ ٹھاکر نے اپنی ہمیانی سے اکیس [21] روپیے نکالے اور بقیہ کی تکمیل اننت رام پانڈے نے کردی، اور اس طرح یہ منزل بھی ختم ہوگئی۔

بندے خریدے گئے، لیکن مقدس برہمن نے آیندہ قسط اور سود کا ذکر ٹھاکر سے کردینا مناسب سمجھا۔

— ۴ —

اس واقعہ کو کئی سال ہوگئے۔

اب سرن پور میں وہ خوشگوار فضا باقی نہ رہی تھی۔ گانوں کے تقریباً سارے تنومند اور قابل کارجوان انگریز سرکار کے لئے لڑائی پر سمندر پار ولائت بھیج دیئے گئے تھے، اور ہر طرف ایک حسرت آمیز سکوت طاری تھا۔ اب میلا پور کی جاترا کے لئے ہفتہ بھر پیشتر سے وہ چہل پہل، وہ تیاریاں نہ تھیں۔ منشی لالہ کا انتقال

ہو چکا تھا، اور ان کی خوب صورت سالی مرنالنی کسی مقام نامعلوم کو چلی گئی تھی۔ اننت رام کی بینائی میں کچھ فتور آنے لگا تھا، اور چند مہینوں سے وہ بالکل نہ دیکھ سکتے تھے۔ نوجوان ٹھاکر جگا دھر بھی نئی بھرتی میں شریک کر لیا گیا تھا۔ اور نہ معلوم اب وہ کہاں کس جگہ اور کس حالت میں ہر لحظہ موت اور جان کے ڈر میں گھرا ہوا تھا — یا اس کا بھی کیا یقین تھا کہ وہ اس دنیا میں موجود بھی تھا۔

اُس کے جانے کے بعد بمبئی سے جہاز میں سوار ہوتے وقت ایک بار اور ولائت کے کسی دُور دراز مقام سے دوسری مرتبہ دو خط گھر آئے تھے۔ منشی جی اس وقت زندہ تھے اور اُن سے ہی یہ خط پڑھوائے گئے تھے۔

لیکن اس کے بعد چار سال ہوئے اب تک کوئی خبر نوجوان ٹھاکر کی یا گانوں کے کسی آدمی کی اُن کے رشتہ داروں کو معلوم نہ ہوئی تھی۔ ٹھاکر کے جانے کے ایک سال بعد ہی صوبہ میں مہلک وبا کا پھیرا ہوا تھا جس کی آگ میں ہزاروں مویشی تباہ ہوگئے۔ گانوں میں گلے کے گلے صاف ہوگئے اور کچھ عرصہ سے ہوا میں پرندوں اور خشکی پر انسانوں کے سوا دوسرے حیوان شاذ و نادر ہی نظر آنے لگے تھے۔ اسی آگ میں ٹھاکر کی مایۂ ناز جوڑی کا ایک بیل اور تقریباً سارے مویشی ختم ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی مصیبت اور افلاس کے ایام شروع ہوئے۔ جگا دھر کے جانے کے بعد زراعت کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ اس لئے زمین ایک عرصہ سے پڑاؤ تھی، اس کا محصول بڑھتا گیا، اور اس باقی میں چوکیدار کی بیشتر جائداد اور بہت سی زمین ہراج کر دی گئی۔ اننت رام پانڈے کا قرض مطلق ادا نہ ہوا تھا، اور اس کے لئے انھوں نے سخت تقاضا شروع کر دیا۔ اِدھر چار مہینوں سے جگا دھر کی ماں بیمار تھی اور وہ براہمن کا روپیہ رکھ کر مرنا نہ چاہتی تھی۔ طے ہوا کہ اس قرض کے لئے نینی کا رہا سہا زیور فروخت کر دیا جائے۔ لیکن نینی سب کچھ تو دینے تیار تھی، مگر دنیا کی کوئی قوت اُسے ان بندوں سے جُدا ہونے راضی نہ کر سکتی تھی۔

چنانچہ ہوا بھی یہی۔ سوائے ان بندوں کے اس کا سارا گہنا تیس[۳۰] روپیے اصل اور چھیانو[۹۶] روپیہ سُود کی نذر ہوگیا۔

آہ! یہ اُن بندوں کی اصلی قیمت تھی۔ نینی نے سوچا کیا "وہ جوہری اور اننت رام ——"

اس طرح اُس مقدس برہمن کا قرض پھولوں میں ادا کر دیا گیا، جس کے کچھ عرصہ بعد ہی بڑھی ٹھکرائن ہمیشہ کے لئے اس مقام کو چلی گئی جہاں کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا، اور نہ کسی کو امداد کی ضرورت ہی

ہوتی ہے۔

اب نینی دُنیا میں اکیلی تھی اور تنہا ہی اُسے دُنیا کی سختیوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس کے قریب کوئی سہارا نہ تھا لیکن صرف ایک خیال اُسے راہ حیات پر کھینچے لئے جا رہا تھا، یعنے ٹھاکر کی واپسی۔

وہ اب گھر کی مالکہ ٹھکرائن نہ رہی تھی۔ بلکہ ضروریات زندگی کے لئے اُسے مجبوراً مکان کی چار دیواری سے باہر نکلنا پڑا تھا۔ وہ ایک زمین دار کے یہاں کچھ قلیل مشاہرہ پر کام کرنے لگی گھر والے گو شریف تھے اور اس کی مالکہ نینی کی گذشتہ حالت کا خیال کرکے مہربانی سے پیش آتی، لیکن اس سے کیا، ملازمت آخر ملازمت ہی تھی۔ اور کام بھی بہت کرنا پڑتا تھا۔

پھر، ہو آنے والی امید کے تصور میں وہ انتہا استقلال سے اپنے دن گزارنے لگی۔ دن بھر وہ زمین دار کے گھر کام کرتی اور رات میں اپنے مکان کے نیم روشن کمرے میں جو، اب بھی اس کے قبضہ میں تھا سوت نکالا کرتی۔ لیکن اس پر بھی مہینے میں کئی بار فاقے ہو جاتے۔ علاوہ اس کے اور دوسری ضروریات کے لئے وہ دن بدن تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

تاہم اس افلاس اور مصیبت کے زمانہ میں بھی وہ ان بُندوں کو بیچنے پر تیار نہ ہوئی اس کے پاس یہ زیور اس زندگی کی عزیز ترین یادگار، اور اس محبت کی لاقیمت سوغات تھا جس کی یاد اُس کے قلب میں اب بھی شعلے بھڑکا تی تھی۔ اور وہ ان بُندوں کو اُس مبارک موقع کے لئے اٹھا رکھنا چاہتی تھی جب اُس کا شوہر اپنی لمبی غیر حاضری کے بعد ــــــ

کئی بار مصائب سے تنگ آکر وہ ساہوکار کے دروازے تک ان بُندوں کو لیگئی لیکن وہ کبھی گھر کے اندر نہ جا سکی اور ہر مرتبہ خاموش مصیبت برداشت کرنے کے لئے اُسے اپنے مکان واپس ہونا پڑا۔

لیکن حیرت تو یہ تھی کہ گاؤں کی کسی عورت نے جگا دھر کے جانے کے بعد سے نینی کے کانوں میں وہ بُندے نہ دیکھے تھے۔ اور گاؤں کے ساہوکار کو تعجب تھا کہ اور تمام زیور کے ساتھ وہ بُندے کیوں اُس کے یہاں نہیں آئے تھے!۔

شوہر کو گئے تقریباً چار سال ہو گئے تھے اور نینی اس کڑے افلاس میں بھی اُسی استقلال سے اپنے دن کاٹ رہی تھی۔ مگر اب بھی اُس کے مکان میں چند پھٹے ہوئے چیتھڑوں میں وہ بُندے لپیٹے رکھے تھے، اور اب بھی ایک مصائب سے لوٹے ہوئے قلب میں امید ــ آنے والی امید کی کرن موجود تھی۔

ایک دن بوڑھے نارائن نے کھیت کو جاتے جاتے رک کر نینی سے کہا :۔

"ٹھکرائن! کل شیورام آرہا ہے۔ چار روز ہوئے خبر آئی تھی کہ انگریز سرکار کی جیت ہوگئی ہے!"

جیسے کسی نے خواب سے نینی کو جگا دیا۔ شیورام آرہا ہے تو جگا دھر بھی ضرور آتا ہی ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ کئی روز ادھر سے وہ یہ بات سن رہی تھی کہ گاؤں کے وہ تمام آدمی جو انگریز سرکار کی نوکری میں ولائت گئے تھے جلد ہی اپنے وطن واپس کر دیئے جائیں گے اس لئے کہ لڑائی ختم ہو چکی تھی اور انگریزوں نے جرمن والوں کا ملک چھین لیا تھا۔

اس رات وہ زمیندار کے گھر سے بہت جلد ہی رخصت ہوگئی! اس کا قلب آج بہت تیز تیز حرکت کر رہا تھا۔ کل اس کا شوہر آئیگا۔ مصیبت کے یہ نہ کٹنے والے دن ختم ہو جائیں گے۔ وہ ان بے رحم ساہوکاروں سے بآسانی اپنی جائداد اگلوا لیگا۔ اور پھر ——

—— آہ! غریب لڑکی

گذشتہ چار پانچ سال کے واقعات نہایت تیز رفتاری سے اس کی نظروں کے آگے سے گزرنے لگے۔ اس کا قلب آج بری طرح مضطرب و پریشان تھا۔ گھر میں بالکل اندھیرا تھا۔ البتہ چاند کی پھیکی کرنیں آنگن میں اپنی میلی چادر پھیلا رہی تھی۔

دفعتاً وہ اٹھی اور پھٹے پرانے کپڑوں کی گرہ سے ان بندوں کو نکال لائی، جو ایک عرصہ دراز سے ان میں لپیٹے پڑے تھے۔ وہ انھیں ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ کل وہ ان کو پہن کر اپنے پیارے ٹھاکر کا استقبال کریگی! اس نے ان بندوں کو اپنے کانوں میں پہن لیا! ایک عرصہ بعد وہ بوجھ سے محسوس ہو رہے تھے۔ نہ معلوم وہ کیسی نظر آرہی تھی؟۔

طاق سے ایک چھوٹے سے آئینہ کے ٹکڑے کو نکال کر وہ کمرے میں چلی گئی، اور دیئے کی مدھم روشنی میں اس نے اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھا —— اف! وہ کتنی ڈراونی صورت تھی! اس میں شک نہیں کہ کئی سال بعد اسے اپنی شکل دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس لئے بدنصیب عورت اس میں وہ تبدیلیاں نہ دیکھ سکی تھی جو مصیبت اور افلاس کا لازمی نتیجہ ہیں —— پھر بھی اسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ اتنے قلیل عرصہ میں وہ اتنی بدل جائیگی۔ وہ کانپ گئی —— کیا حقیقت میں وہ وہی نینی تھی، یا آئینہ کے پیچھے سے کوئی اور بدنصیب اس کی طرف گھور رہا تھا۔

— ۵ —

دوسرے دن صبح سے ہی گانوں میں آنے والوں کے استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔
مائیں اپنی اولاد کو صحیح وسلامت دیکھنے کے لئے بے چین تھیں۔ بیویاں اپنے بچھڑے ہوئے شوہروں کو دوبارہ پانے کے لئے مضطرب، اور اقربا، اپنے عزیزوں کی دید کے مشتاق تھے، لیکن اللہ ہی بتا سکتا تھا کہ ان میں کتنے ایسے تھے جن کی امیدوں پر ہمیشہ کے لئے پانی پھرنے والا تھا کتنے ایسے تھے جن کی خوشیاں آہ وبکا میں تبدیل ہونے والی تھیں اور کتنے ایسے تھے جن کی مشتاق آنکھیں اپنے عزیزوں کو معذور اور اپاہج دیکھنے والی تھیں۔
آخر وہ وقت آگیا۔ ایک بڑی سرکاری موٹر لاری گانوں کی سڑک پر رُکی اور جنگ کے دیوتا کی قربان گاہ سے بچے ہوئے۔ بیمار۔ معذور۔ اپاہج، اور شاذ ونادر صحیح وسالم انسانوں نے ایک عرصہ دراز کے بعد اپنے وطن اور رشتہ داروں کو دیکھا، اور اس کے ساتھ ہی ایک شور وغوغا شروع ہوا جنھوں نے اپنے رشتہ داروں کو پایا وہ اُن سے لپٹنے لگے، اور جنھیں وہ نظر نہ آئے وہ آنے والوں سے اپنوں کے متعلق پے درپے سوالات کرنے لگے۔ لڑکوں نے اپنی حسرت نصیب ماؤں کو گھیر لیا، وہ بچے جو اپنے باپ کے بچھڑتے وقت ابھی گود ہی میں تھے ۔۔۔ اور جنھوں نے ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک اُن کو نہ دیکھا تھا، ہر آنے جانے والے کو پہچاننے کی کوشش کرتے تھے لیکن شاید ان معصوموں کو بھی اپنے عزیزوں کی قسمت کا علم تھا اس لئے کبھی کبھی ایک آدھ آنسو ان کی آنکھ سے ٹپک جاتا۔
تپتی نے بھی ڈھونڈنے پر آنے والوں میں ٹھاکر کو نہ پایا۔ آہ! کیا وہ ہمیشہ کے لئے نہیں آئیگا! کیا اتنے زمانہ تک انتظار کرنے کے بعد، اتنے عرصہ تک مصائب اور غربت کی سختیاں برداشت کرنے کے بعد اس کی امید اس طرح ختم ہونے والی تھی!
شیورام اپنے بچوں کو گود میں اُٹھائے جا رہا تھا، اور اس کے پیچھے اس کی ماں اور بیوی ان اہم واقعات کو جو اس کے غیاب میں رونما ہوئے تھے بیک آواز سُنا رہی تھیں۔ تپتی نے اُسے روک کر پوچھا۔
"بھیا ۔۔۔ ٹھاکر؟"
شیورام پیشانی کو ٹھونکتے ہوئے کہا "ٹھکرائن! جو کیدار ہمارے ساتھ ہی رجمنٹ میں تھے لیکن تین سال ہوئے ۔۔۔" وہ خاموش رہ گیا۔۔۔ اور سچ پوچھئے تو اس سے زیادہ وضاحت کی اب ضرورت بھی نہ تھی۔

تینی کی آنکھوں میں اب تمام دُنیا اندھیری دکھائی دینے لگی۔ وہ اُسی جگہ کھڑی ہوگئی، اور اس کا جسم پتھر کے مجسمہ کی طرح غیر متحرک اور سرد ہوگیا اُس کے کانوں میں عجیب عجیب قسم کی آوازیں گونجنے لگیں۔

تینی کے اطراف ایک شور قیامت برپا تھا۔ مائیں جو ایک زمانہ قبل ہی اپنی نوجوان اولاد کو کھوچکی تھیں لیکن جنھیں اس دل شکن سانحہ کا اب پتہ چلا تھا سر پر خاک اڑا رہی تھیں۔ بیویاں جن کو اپنے رنڈاپے کی ابھی ابھی خبر ہوئی تھی۔ دل خراش آہ و بکا کر رہی تھیں اور ان سب کے ساتھ چھوٹے چھوٹے معصوموں کی چیخ پکار ناقابل برداشت سماں پیش کرتی تھی۔

تینی رو نہ سکی اس کو اپنے اطراف کا ہوش نہ تھا، نہ اس کو اس محشرستان کے واقعات کی خبر تھی اس کی سیاہ موٹی موٹی آنکھوں میں، جو اب بھی خوب صورت تھیں ایک آنسو نہ تھا۔ نہ اس کے چہرے سے کسی غیر معمولی رنج وغم کا اظہار ہوتا تھا قسمت کی ضرب اتنی شدید تھی کہ اُس نے غریب عورت کے عالم احساس کو بالکل معطل کر دیا تھا۔

— ۶ —

بچھڑوں کو آئے تین چار روز ہوگئے تھے لیکن جو لوگ ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکے تھے اُن کے لئے گانوں میں ابھی کہرام ہورہا تھا جن خوش قسمتوں نے اپنے عزیزوں کو صحیح و سلامت یا کم از کم زندہ پالیا تھا وہ بھی گھر کی چار دیواری میں خوشیاں منا رہے تھے لیکن باہر وہ دوسرے بد قسمتوں کے سوگ میں پوری طرح شریک تھے۔

گانوں تمام اتنا مصروف تھا کہ دو روز سے کسی نے تینی کی عدم موجودگی کو محسوس نہ کیا۔ صرف ایک بار زمین دار کی بیوی نے ٹھکر اُن کی غیر حاضری کی شکایت کرتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا:-

"نہ معلوم تینی کدھر چلی گئی۔ للّو دیکھئے آیا گھر میں نہیں ہے!"

زمین دار نے کہا "بچاری دکھ میں ہے، نہ معلوم کہاں پڑی ہے!"

تیسرے دن صبح گانوں کے مچھلیارے نے طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی سنہری کرنوں میں تالاب کے کنارے جہاں کائی اور گھانس کی کثرت تھی کسی شئے کو چمکتے ہوئے دیکھا۔ پانی کی بیتاب موجوں میں کبھی وہ نظروں سے اوجھل ہوتی اور کبھی سورج کی شعاعیں اس پر سے منعکس ہوکر آنکھوں کو چوندھیا دیتیں۔

محض رفع شک کے لئے اُس نے قریب جاکر دیکھا ___ سیاہ الجھے ہوئے بالوں میں وہ چمکدار طلائی زیور سطح آب پر تیر رہے تھے اور تینی ٹھکر اُن کا پھولا ہوا جسم پانی کے اندر سے گھانس میں پھنسا ہوا نظر آتا تھا۔ للّو چارہ لئے ہوئے جارہا تھا مچھلیارے نے پکار کر اُسے مدد کے لئے بلالیا، اور دونوں نے کشتۂ انتظار تینی کے مردہ جسم کو باہر کھینچ نکالا۔

تھوڑے ہی عرصہ میں گاؤں کے لوگ تالاب کے کنارے جمع ہوگئے۔ اس نئے حادثہ نے ہر ایک کو اپنا رنج اپنی خوشی اور اپنا غم بھلا دیا تھا۔ وہ سب بدقسمت عورت کے گرد حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ غریب ٹھکرائن جس کی بھیگی ہوئی سیاہ زلفوں میں وہ خوب صورت بندے الجھے ہوئے تھے ——— اور اس کی بھولی ہوئی بد رونق آنکھیں گویا وسیع آسمانوں میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

عورتیں چشمِ نم سرگوشیاں کرنے لگیں کئی سال بعد انھوں نے آج نیتی کے کان میں وہ دلفریب بندے دیکھے تھے۔

غزل

از

کاوشؔ

(۲۹ امرداد ۱۳۴۸ف کو لاسلکی حیدرآباد سے نشر کی گئی)

یہی نہیں کہ سوئے بزمِ دوست جا نہ سکا — میں آستانۂ دل پر بھی سر جھکا نہ سکا

فلک ضمیرِ محبت کو آزما نہ سکا — وہ میری خاک نشینی کا راز پا نہ سکا

غمِ حیات سے فرصت ملی نہ دم بھر بھی — میں دردِ دل کو سکوں آفریں بنا نہ سکا

وہ میرے گوشۂ دل میں ہوا ہے جلوہ فروز — جو حسن وسعتِ کونین میں سما نہ سکا

چمن کے ناز اٹھائے صبا کے ظلم سہے! — میں بجلیوں سے نشیمن مگر بچا نہ سکا

وہ اُن کے جلوہ کی انگڑائیاں ارے توبہ! — کچھ ایسی مے تھی جسے پی کے ہوش آ نہ سکا

پہنچ گئی مرے دامن کی آگ رگ رگ میں — ہزار گرچہ بجھائی مگر بجھا نہ سکا

کسی کے آتے ہی آنکھوں میں آگئے آنسو — میں انتہائے خوشی میں بھی مسکرا نہ سکا

وہ پوچھتے ہی رہے داستانِ غم کاوشؔ
میں اُن کو اپنا فسانہ مگر سنا نہ سکا

دُنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور

عہدِ نبوی کی ایک اہم دستاویز

از

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ قانون جامعۂ عثمانیہ

متمدن اقوام ہی نہیں، وحشی باشندوں میں بھی حکمرانی اور عدل گستری کے لئے معینہ قاعدے ہوتے ہیں اور خود رائے سے خود رائے سردار بھی اپنے آپ کو اُن کا پابند پاتا ہے[1]۔ عموماً جب کبھی ایسے قواعد تحریری صورت میں مرتب ہوئے تو انھیں کتاب کا نام دیا گیا۔ (Bible) اور (Scripture) کے معنے بھی کتاب کے ہیں۔ چنگیز خاں کے "یاسہ"[2] کے معنے بھی کتاب کے ہیں۔ چنانچہ جدید ترکی میں بھی یازمک کا مصدر لکھنے کے معنوں میں ہی برتا جاتا ہے۔ اور کتاب اللہ مسلمانوں کے قرآن کا نام ہے۔

غرض عام قواعد و قوانین ملک کم وبیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں لیکن دستورِ مملکت کو عام قوانین سے علحدہ تحریری صورت میں لانا، اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے مجھے عہدِ نبوی سے پہلے نہیں مل سکی۔ بے شبہہ منوسمرتی (۵۰۰ ق م) میں راجہ کے فرائض کا بھی ذکر ہے، اور کوٹلیا کی آرتھ شاستر (۳۰۰ ق م) اور اس کے ہمعصر ارسطو کی کتابوں میں سیاسیات پر مستقل تالیفیں بھی ملتی ہیں۔ ارسطو نے تو اپنی ہمعصر شہری مملکتوں میں سے بشمول ہندوستان[3] (۱۵۸)[4] کے دستور بھی لکھے تھے جن میں سے صرف شہر ایتھنز کا دستور ابھی پچاس سال قبل مصر میں پاپیروس پر محفوظ مل چکا ہے اور ۱۸۹۱ء میں شائع ہو چکا ہے اور انگریزی اور دیگر زبانوں میں

---

[1] Grammer of Politics by H. J. Laski

[2] مسالک ابن فضل اللہ العمری، مخطوطۂ پاریس۔

[3] Aristotle on the Athenian Constitution by Kenyon Preface

[4] ایضاً Encyclopaedia of Social Sciences, Vol I p 27. نیز P XIII

ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن یہ سب یا تو درسی اور منشورتی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں یا کسی مقام کے دستور کا تاریخی تذکرہ ہیں۔ کسی مقتدر اعلیٰ کی طرف سے نافذ کردہ مستند دستور مملکت کی حیثیت ان میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں۔

سنہ ہ میں مدینہ منورہ میں ہجرت کرآنے کے پہلے ہی سال رسول کریم صلعم نے ایک نوشتہ مرتب فرمایا جس میں حکمران کے حقوق و فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے۔ خوش قسمتی سے یہ دستاویز پوری کی پوری اور بلفظہ ابن اسحاق اور ابو عبیدہ نے اپنی کتابوں میں محفوظ کی ہے اور آج اسی کا کچھ بیان مقصود ہے۔

اس دستاویز میں ترپن جملے[1] یا قانونی الفاظ میں دفعات ہیں اور اس زمانے کی قانونی عبارت اور دستاویز نویسی کا وہ ایک انمول نمونہ ہیں۔ اس کی اہمیت اسلامی مورخوں سے کہیں زیادہ یورپی عیسائیوں نے محسوس کی۔ ولہاوزن، میولر، گریم، اشپرنگر، وینسنک، کائتانی، بول وغیرہ کے علاوہ ایک انگریزی مورخ نے مختصر تاریخ عالم لکھتے ہوئے بھی اس دستاویز کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ یہاں ان جرمن، ولندیزی، اطالوی، انگریزی اور دیگر مولفوں کے بیانات کا ذکر غیر ضروری ہے۔ میں صرف اپنے ناچیز خیالات اس کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور اس کی اہمیت کی طرف اہل ملک کی توجہ منعطف کراتا ہوں۔ اس دستاویز کی تفصیلی شرح اور مغربی مولفوں کے بیانات کی تنقید کے لئے بڑا وقت چاہیئے جو اس لکچر میں ممکن نہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ اس دستاویز کے مندرجات پر کچھ عرض کیا جائے اس کا تاریخی پس منظر اور ان حالات کا ذکر ضروری ہے جن میں وہ مرتب اور نافذ ہوئی۔

رسول کریم صلعم نے جب مکہ معظمہ میں اپنے تبلیغی اور اصلاحی کام کا آغاز کیا، اور صدیوں، نسلوں کے معتقدات و رواجات کی تبدیلی چاہی تو اہل ملک نے ابتداءً حیرت اور پھر نفرت اور آخر کار مخالفت و معاندت کا برتاؤ کیا۔ یہ مشن پہلے ہی دن سے عالمگیر تھی اور معلوم دنیا، خاص کر ایران و روم (بیزنطیہ) تک اس کی فوری اور بآسانی وسعت کے امکانات نظر آنے تھے اور آنحضرت اپنی تبلیغ میں ظاہر بین دنیاداروں کو ان ممالک کی فتح کی بشارت دیتے تھے[2]۔ لیکن ایک مفلس اور کمزور قبیلے کی ایک جو ہر فرد کی حیثیت میں آپ کی

---

[1] ۔ حوالے مضمون کے آخر میں دئے گئے ہیں۔

[2] ۔ ابن ہشام صفحہ (۲۷۰)، نیز طبقات ابن سعد احوال قبل الہجرۃ۔

سرداری کا مانا جانا مشکل تھا۔ آنحضرت کی رشتہ داری طائف[1] اور مدینے[2] کے قبائل سے بھی تھی، اسی توقع میں پہلے آپ طائف کے قریب تر علاقے کو تشریف لے گئے مگر وہاں وطن سے بڑھ کر مشکلیں پیش آئیں۔ آخر حج کے زمانے میں کئی سال تگ و دو کرنے کے بعد چند مدینے والے ہی آپ کے گرویدہ بنے اور مدینہ آنے پر آپ کو اور آپ کے مکی ساتھیوں کو پناہ اور مدد دینے کا بھی وعدہ کیا۔

مکے کی مقامی حالت ناقابل برداشت ہو چکی تھی عام مخالفت سے بڑھ کر جسمانی اذیت سے بہتوں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اس لئے مسلمانان مکہ ہجرت کر کے مدینہ جانے لگے مکے والے ڈرے کہ کہیں یہ لوگ باہر جا کر انتقام کی تیاریاں نہ کریں اس لئے خود آنحضرت کے مکان کا محاصرہ اور شبخون کی تجویز پختہ کی گئی مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ آنحضرت بخیر و عافیت مکے سے نکل کر مدینہ پہنچ گئے جھنجھلاہٹ میں مکے والوں نے آپ کی اور دوسرے مہاجروں[3] کی املاک و جائداد پر غاصبانہ تسلط جما لیا۔ مدینے کے مسلمانوں اور مکے کے مہاجروں کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی، اگرچہ مدینے کی آبادی کا اس وقت اندازہ چار پانچ ہزار کیا جاتا ہے جن میں آدھے کے قریب یہودی تھے۔ مکہ اس وقت ایک منظم شہری مملکت کی صورت میں تھا وہاں فوج، محاصل، عبادت، تعلقات خارجہ، عدل گستری وغیرہ کے کوئی پچیس[4] سرکاری عہدے تھے، جن کا تفصیلی ذکر حال میں ٹرونڈرم کی موتمر مستشرقین میں پڑھے ہوئے مقالے میں کیا ہے[5]۔ اس کے برخلاف مدینے میں ابھی نراج کی کیفیت تھی اور قبائلی دور دورہ تھا۔ عرب اوس و خزرج کے بارہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے تو یہودی بنو النضیر و بنو قریظہ وغیرہ کے دس قبائل میں۔ ان میں باہم نسلوں سے لڑائی جھگڑے چلے آ رہے تھے اور کچھ عرب کچھ یہودیوں کے ساتھ حلیف ہو کر باقی عربوں اور ان کے حلیف یہودیوں کے حریف بنے ہوئے تھے۔ ان مسلسل جنگوں سے اب دونوں بھی تنگ آ چلے تھے[6] اور گو وہاں کے کچھ لوگ غیر قبائل خاص کر قریش کی جنگی امداد کی

---

[1] معارف ابن قتیبہ صفحہ ۳۴۳، کتاب المنتقیٰ من دلائل النبوۃ لابی نعیم (مخطوطہ) الفصل العشرون۔

[2] ابن ہشام ص ۱۰۷، ۲۲۶، ۳۴۶، طبقات ابن سعد ج ۱/۱ ص ۳۴، ۴۷، ۲۶۰، معارف ابن قتیبہ احوال عمومۃ، تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۱۷۸ تا ۱۱۷۹ وغیرہ۔

[3] بخاری کتاب ۲۴ باب ۵۴ حدیث ۳۔

[4] ابن ہشام ص ۳۴۹ ج ایضاً ص ۲۱۲ تا ۲۲۔ [5] مطبوعہ رسالہ اسلامک کلچر جولائی ۱۹۳۸ء

[6] ابن ہشام ص ۲۸۷، طبقات ابن سعد ج ۱/۱ ص ۱۴۷، مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۴۲۷، بخاری کتاب ۶۳ باب ۴۶/۱، ۲، ۷۔

تلاش میں تھے[1] لیکن شہر میں امن پسند طبقات کو غلبہ ہو رہا تھا اور ایک کافی بڑی جماعت اس بات کی تیاری کر رہی تھی کہ عبداللہ بن اُبَی بن سلول کو بادشاہ بنا دیں حتیٰ کہ بخاری[2] و ابن ہشام[3] وغیرہ کے مطابق اس کے تاج شہریاری کی تیاری بھی کاریگروں کے سپرد ہو چکی تھی۔ بے شبہ آنحضرت نے بیعت عقبہ میں بارہ قبائل میں بارہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے نقیب مقرر کر کے مرکزیت پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تھی مگر اس سے قطع نظر یہاں ہر قبیلے کا الگ راج تھا اور وہ اپنے اپنے سقیفے یا سائبان میں اپنے امور طے کیا کرتا تھا کوئی مرکزی شہری نظام نہ تھا تربیت یافتہ مبلغوں کی کوشش سے تین سال کے اندر شہر میں معتد بہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے مگر مذہب ابھی تک خانگی ادارہ تھا اس کی سیاسی حیثیت وہاں کچھ نہ تھی اور ایک ہی گھر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ ان حالات میں آنحضرت مدینہ آتے ہیں جہاں اس وقت متعدد فوری ضرورتیں تھیں:۔

(۱) اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین۔

(۲) مہاجرین مکہ کے توطن اور بود و باش کا انتظام۔

(۳) شہر کے غیر مسلم عربوں اور خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ۔

(۴) شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

(۵) قریش مکہ سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ۔

انھیں اغراض کے مدِنظر آنحضرت صلعم نے ہجرت کر کے مدینہ آنے کے چند مہینے بعد ہی ایک دستاویز[4] مرتب فرمائی جسے اسی دستاویز میں کتاب اور صحیفہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور جسے بظاہر اشخاص متعلقہ سے گفت و شنید کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عام قانون مُلک کتاب اللہ یا قرآن کی صورت میں جیسے جیسے نافذ یا نازل ہوتا تحریری صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا اور منکسر المزاج احتیاط پسند پیغمبر اسلام صلعم نے اس زمانے میں اپنے ذاتی اقوال و ہدایات کو لکھنے کی عام طور سے ممانعت فرما دی تھی! اس کے باوجود زیر بحث دستاویز کا

---

[1] ۔ ابن ہشام ص ۲۸۵، ۲۹۰۔

[2] ۔ بخاری کتاب ۷۹ باب ۲۰۔

[3] ۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۲۷۰، تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۵۱۱ و مابعد۔ نیز قرآن مجید سورہ ۶۳ آیت ۸۔ کی تفسیریں

[4] ۔ ابن سعد ج ۲/ ۱ ص ۱۹۔ کتاب الاموال لابی عبید ۵۱۸۔

لکھا جانا معنے خیز ہے جسے کتاب اور صحیفے کے اہم ناموں سے یاد کیا گیا ہے جن کے معنے دستور العمل اور فرائض نامے کے ہیں۔ اصل میں یہ شہر مدینہ کو پہلی دفعہ "شہری مملکت" قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتب کرنا تھا۔

روسو اپنی کتاب "معاہدۂ عمرانی" میں مملکت کا آغاز حاکم و محکوم کے عمرانی معاہدے سے قرار دیتا ہے۔ اس کی ایک بیّن اور واقعی مثال ہم کو بیعت عقبہ میں ملتی ہے جس میں مدینے والوں نے آنحضرت صلعم کو اپنا سردار مانا، اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور آپ کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث دستاویز ایک معاہدے کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرض اور ایک حکم کی صورت میں نافذ کی جاتی ہے چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتاب کے معنے فرض اور حکم کے بھی ہیں۔ انّ الصلاۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً۔ انّ کتاب الابرار لفی علیین[1]۔ کتب علیھم القتال وغیرہ میں لفظ "کتاب" اسی معنے میں برتا گیا ہے۔ جرمن لفظ Vorschrift اور فرانسیسی وانگریزی لفظ (Prescription) اطالوی (Prescrizone) ہسپانوی (Prescripcion) (بمعنے فرض وحکم) کا مادہ بھی "کتابت" ہی کے معنے رکھتا ہے۔

عرب میں عام طور پر اور مدینے میں خاص طور پر جو مرکز گریزی تھی اس کا علاج تنظیم پسند اور وحدت خواہ نبی صلعم نے یہ تجویز کیا کہ "ایک حکمران ایک قانون"۔ ابھی تک زکاۃ اور حج کے مرکزکش احکام نہیں آئے تھے جن سے مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا حق مل کر ملک میں بزور ایک نقطے پر لوگوں کو لانے کا اور ہر حصے کے لوگوں کو ایک ہی قبلے کی زیارت کا بعد میں موقعہ ملا پھر بھی ایمان و اعمال کے سلسلے میں ایک خدا کو ماننے ایک ہی نبی کے احکام کی اطاعت کرنے اور مل کر نماز پڑھنے کے ادارے وجود میں آ چکے تھے۔ اب اس دستور نے اس میں ایک نہایت اہم اور عرب کے لئے انقلابی اصلاح و ترقی یہ دی کہ لوگ اپنے حقوق اپنی یا زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کی مدد سے حاصل کرنے کی جگہ انصاف رسانی کو ایک مرکزی اور پبلک ادارہ بنا دیں۔ یہ عہد آفرین کارنامہ اسی دستاویز میں رکارڈ میں لایا گیا ہے جس نے قبائلیت کی افراتفری کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور ایک وسیع تر ادارے یعنے مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اس دستاویز میں آنحضرت صلعم نے عدالتی، تشریعی، فوجی اور تنفیذی اعلیٰ ترین اختیارات اپنے لئے محفوظ فرما لئے مگر ایک نہایت اہم اور قابل ذکر فرق اس اقتدار اور دیگر ممالک کے مستبدانہ شاہی اقتدار میں یہ تھا کہ یہاں

---

[1] ابرار کے نامۂ اعمال کا جنت میں جانا بے معنے بات ہوگی۔ میں اس کے معنے یہ لیتا ہوں کہ ابرار کے متعلق طے شدہ حکم یہ ہے کہ وہ علیین میں ہونگے۔

مادیت کو دخل نہ تھا۔ آنحضرت نے سیاست میں اخلاقی عناصر داخل کئے، اصل سرچشمۂ اقتدار خدا کو قرار دیا اور اپنے کو اس کا رسول اور نائب اور ساتھ ہی امت کے لئے لائے ہوئے احکام اپنے پر بھی مساوی طور پر واجب التعمیل قرار دیے اور عہد نبوی میں ذات اقدس کے خلاف دیوانی اور ٹارٹ (ضمان) کے جو مقدمات دائر ہوئے[1] ان نظائر کی موجودگی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے King can do no wrong (بادشاہ کسی فعل ناجائز کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا) کو مسترد کر دیا۔ اور جب مُلک کا قوی ترین شخص قانون کی خلاف ورزی نہ کر سکے تو دیگر عہدہ دار اور عام لوگ بھی تعمیل زیادہ توجہ کے ساتھ کریں گے۔ اس دستاویز کے دو نمایاں حصے ہیں:۔

حصہ اول میں (۲۵) فقرے ہیں جن کو ولہاوزن نے (۲۳) قرار دیا تھا اور جملہ یوروپی مولفوں نے ولہاوزن ہی کے نمبرات برقرار رکھے ہیں، میں نے بھی مجبوراً (۲۳) ہی نمبرات دیے، البتہ ضمن الف و ب کے ذریعہ دو دفعات کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور اس طرح ان کے (۲۵) دفعات قرار دیے تاکہ یوروپی مواد سے استفادے میں کسی کو الجھن پیدا نہ ہو۔

حصہ دوم ۲۴ تا ۴۷ پر مشتمل ہے لیکن ضمنی تقسیم متعدد فقرات میں کرنی پڑی، میرے حساب سے یہ حصہ (۲۸) فقرات پر مشتمل ہے اور جملہ دستاویز میں (۵۳) فقرات یا دفعات ہیں۔

پہلے (۲۳) دفعات مہاجرین و انصار کے متعلق قواعد پر مشتمل ہیں اور بقیہ حصہ مدینے کے یہودی قبائل کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے، ان دونوں میں ایک جملہ دہرایا گیا ہے کہ آخری عدالت مرافعہ محمد رسول اللہ کی ذات ہوگی۔ مسلمان مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی حد تک تو کوئی دشواری نہیں لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کے چند مہینوں بعد ہی ایک نو وارد اجنبی صلعم کو اتنا بڑا اقتدار غیر مسلم طبقات نے دیدینا کس طرح منظور کیا؟ مدنی عربوں کی حد تک یہ جواب ایک حد تک تشفی بخش سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ وہاں اب تک قبائلی نظام تھا اور قبائلی سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا اس لئے اُن بزرگان خاندان کا مذہب قبول نہ کرتے ہوئے بھی ان کے خورد تر رشتہ دار انھیں کی پیروی کرنے پر مجبور تھے۔ عربی سماج کے باعث وہ خاندان اور قبیلے سے الگ ہو سکتے تھے اور بیرون مُلک بھی وہ اپنے باقی رشتہ داروں کی مدد کے بغیر جان و مال کا کوئی امن نہیں پا سکتے تھے۔ دستاویز میں صراحت سے یہ بتایا گیا ہے کہ جملہ مدنی قبائل اور

---

[1] ابن ہشام ص ۳۴۴۔ نیز تاریخ ابن الاثیر ذکر احوال مرض موت آنحضرت صلعم۔ و سیرۃ شامی، بر موقع

مہاجرین مکہ وغیرہ کی مرکزائی ہوئی زبردست قوت سے انصار کے مشرک رشتہ داروں کو متمتع ہوئے کا صرف اس شرط سے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی حیثیت سے مرکزی حکومت کی پالیسی میں رکاوٹیں نہ ڈالیں چنانچہ حکم دیا گیا ہے کہ عربی قبائل میں جو مشرک یا یہودی المذہب لوگ ہیں وہ مسلمانوں کے تابع اور جنگ میں معاون ہوں اور وہ قریش مکہ کی جان و مال کو نہ تو خود کوئی امان دیں اور نہ اس بات میں آڑے آئیں کہ مسلمان کسی قریشی کی جان و مال پر حملہ کریں۔ دوسرے الفاظ میں ان کو قریشیوں سے حلیفی کو توڑنے، تعلقات کو منقطع کرنے اور مسلمان اور قریشیوں کے تعلقات میں غیر جنبہ دار رہنے کی شرط پر حقوق شہریت عطا کئے گئے اور انھیں اس کو منظور کرنا پڑا۔ ہمیں ایسے بھی بیانات عرب مؤلفوں کے ہاں ملتے ہیں کہ مدینے کے عرب برادرکشی اور باہمی لڑائیوں سے اکتا گئے تھے اور تنگ آکر اس پر آمادہ ہو چکے تھے کہ کسی اجنبی غیر جانبدار کو حکمران بنا کر آئندہ امن کی زندگی بسر کریں۔ یہ عربی غیر مسلموں کا ذکر تھا۔[1]

یہودیوں کا بھی اسی ابتدائی زمانے میں آنحضرت کے سیاسی اقتدار کو مان لینا قرین قیاس نہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دستاویز کا حصہ دوم یعنی یہودیوں کا دستور العمل، جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ ایک زبردست فتح نے مسلمانوں کی دھاک ہر طرف بٹھا دی تھی۔ اہل مدینہ نے اپنے سابقہ معاہدات حلیفی جو یہودیوں کے ساتھ تھے منسوخ کر دیئے تھے۔ آنحضرت نے آس پاس ینبوع تک کے قبائل مثلاً بنی ضمرہ، جہینہ وغیرہ سے حلیفیاں کرکے مسلمانوں کی قوت کو بے حد مضبوط اور مستحکم بنا دیا تھا۔ یہودیوں کے دو بڑے گروہ آپس کے حریف و رقیب تھے۔ ان کا مل کر رہنا اور الگ مستقل رہ کر بچت اور محفوظ رہنا ممکن نہ تھا، اور وہ ہر طرف سے بچھڑ کر بے یار و مددگار اور ہر قومی کا شکار بنے ہوئے تھے۔ ان حالات نے انھیں مجبور کیا کہ اپنی مذہبی آزادی اور اندرونی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے آنحضرت سے ماتحتانہ تعاون کریں اور جیسا کہ عرض کیا گیا میرے خیال میں یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہو سکتا ہے اس سے پہلے کا ہونا قرین قیاس نہیں۔ اگرچہ پوری دستاویز ایک ہی کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت و انداز اسلوب سے بھی ایک ہی مرتب کنندہ کا ہونا پایا جاتا ہے اور مسلمان مورخ عام طور سے یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز سنہ ۱ھ کی ابتدا میں مرتب ہوئی لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سنہ ۲ھ میں دستاویز کا

---

[1] ملاحظہ ہو اوپر صفحہ (۴۴)

حصۂ اول مرتب ہوا ہو، اور بقیہ حصہ ۲ھ میں جنگ بدر کے بعد مرتب کرکے حصۂ اول کے ساتھ شامل کردیا گیا ہو۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لسان العرب[1] میں اس دستاویز کا جہاں کہیں ذکر آیا ہے وہاں اس کو دو نام دیے گئے ہیں، ایک جملے میں اسے "فی کتابہ للمہاجرین والانصار" یعنی "دستور العمل مہاجرین وانصار" سے یاد کیا گیا ہے اور اسی سے ذرا نیچے حصہ دوم کے سلسلے میں "وقع فی کتاب رسول اللہ صلعم لیہود" یا "دستور العمل یہودیان" کی اصطلاح برتی گئی ہے۔ ایک اور زیادہ راست شہادت اس سے ملتی ہے کہ امام ابو داؤد نے اپنی سنن[2] میں یہودیوں کے اس دستور العمل کو جنگ بدر کے بعد کا قرار دیا ہے۔

جیسا کہ عرض ہوا اس دستور کے دو نمایاں اور ممتاز حصے ہیں: ایک اسلامی و عربی قبائل سے متعلق ہے اور دوسرا یہودیوں سے۔ ہر ایک کی مختصر تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی۔

سب سے پہلے فقرے میں ایک اسلامی سیاسی وحدت کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے جس میں مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور وہ لوگ جو ان سب کے تابع ولاحق رہ کر ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ ہوں اور یہ سیاسی وحدت "محمد النبی رسول اللہ" کے احکام کی اطاعت کریگی (ف ۱) اور اس اسلامی حصے کے سب سے آخری فقرے میں بھی مکرر اسی چیز کو دہرایا گیا ہے کہ منبع اقتدار تو ذات خداوندی ہے لیکن لوگ خدا کے بھیجے ہوئے حضرت محمدؐ کی اطاعت کریں گے اور اپنے جملہ اختلافوں، جھگڑوں میں ان سے رجوع ہوں گے اور اُن کے فیصلے کو آخری مانیں گے (ف ۲۳) یہ سیاسی وحدت باوجود اندرونی بوقلمونی کے اُمّت واحدہ سمجھی جائیگی اور تمام دنیا کے مقابل ایک ممتاز اور مستقل حیثیت رکھے گی اور جملہ مسلم طبقات کو یکساں حقوق و واجبات حاصل ہوں گے (ف ۲) اور باوجود کمی تعداد و کمزوری و خطرات کے ان میں خودداری اور راہ راست پر ہونے کے جذبات پیدا کئے گئے (ف ف ۱۱) جنگ وصلح کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا، اور یہ نہیں ہوسکے گا کہ چند صلح یا جنگ کریں اور باقی نہ کریں۔ جنگی خدمت جبری و لازمی ہوگی۔ اور سب اس میں برابر کا حصہ لیں گے؛ عین حالت جنگ میں بھی نوبت نوبت قومیں لڑیں گی اور آرام پائیں گی، یہ نہیں کہ پورا بار ایک ہی طبقے پر پڑے (ف ۱۷-۱۸) جنگ وصلح تو مرکزی مسئلہ ہوں گے

---

[1] تحت کلمۂ "ربع"۔

[2] سنن ابی داؤد کتاب ۱۹ باب ۲۱

البتہ حسب سابق پناہ دہی کا حق انفرادی طور سے ہر چھوٹے بڑے سب کو حاصل ہوگا اور ادنیٰ ترین شخص کے دیئے ہوئے وعدۂ پناہ کا بھی پوری امت احترام کریگی (ف ۱۵) اور اس طرح اخوت و مساوات اور آزادی عمل اس سیاسی وحدت میں عملی طور سے جاری و ساری کر دی گئی۔ پناہ دہی کی اس آزادی میں ایک شرط لگائی گئی کہ جو مشرکین عرب اس سیاسی وحدت میں حقوق رعیت حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے یہ پابندی ہوگی کہ وہ قریش کی جان و مال کو کسی طرح کی پناہ نہ دیں گے اور نہ اس بات میں آڑے آئیں گے کہ قریش کی جان و مال کو مسلمان اپنے حقوق حربیت کے سلسلے میں نقصان پہنچائیں (ف ۲۰ ب) اس دفعے کے سلسلے میں دو واقعات قابل ذکر ہیں جن کا امام بخاریؒ نے ذکر کیا اور جو دونوں جنگ بدر سے پہلے پیش آئے تھے ان دونوں میں دو بڑی مسلمان شخصیتوں نے بعض قریشی افراد سے دوستانہ تعلقات کی بنا پر اُن کی جائداد کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ بے شبہہ دفعے میں قریش کو پناہ دینے کی ممانعت صرف مشرک رعایا کو کیگئی ہے لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ مسلمان بھی اس کے پابند تھے اور بلا صراحت وہ اس پر عمل کرتے تھے اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ یہ دفعہ ابتدائی دستور میں نہ تھی بعد میں جنگ بدر کے اختتام پر یہودی قبائل سے معاہدے کے وقت یا کسی قریبی موقع پر اس اصل دستور میں اضافہ کی گئی۔ جنگ کے سلسلے میں جملہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مددگار اور دکھ درد میں حصہ دار رہنے کا حکم دیا گیا (ف ۱۹) عدل گستری کے سلسلے میں آخری عدالت مرافعہ جہاں ذات رسالت پناہی صلعم کو قرار دیا گیا وہیں ہرجے اور خونبہا (ضمان و دیت) کی ادائی کے لئے قدیم نظام کی توثیق و تشریح کی گئی کہ اگر کوئی شخص کسی رقمی ادائی کا مستوجب ہو تو اس کی مدد اس کے سب رشتہ دار کریں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دشمن کے ہاتھوں قید ہو جائے اور فدیہ ادا کرنا ہو تو اہل قبیلہ ہی اس ادائی کے ذمہ دار ہوں گے (ف ۲) اس سلسلے میں ایک طرح سے شہر کی محلہ وار تقسیم کی گئی اور ہر قبیلے کے لوگ دوسروں سے الگ یکجا ہی رہتے تھے، اور ہر محلے میں ایک میر محلہ اور متعدد نائبان میر محلہ اور اجتماع گاہ پائے جاتے تھے جن کو علی الترتیب نقیب، عریف اور سقیفہ کہتے تھے کوئی محلہ وار فنڈ یا خزانے کا تو پتہ نہیں چلتا۔ غالباً حسب ضرورت چندہ ہوتا ہوگا۔ یہ محلہ وار مجلسیں بڑی حد تک

لہ۔ بخاری کتاب ۴۲ باب ۲ نیز کتاب ۶۴ باب ۲۔

لہ۔ لیکن بنو النضیر کے یہودیوں میں قبیلہ واری بیت المال تھا چنانچہ سیرۃ شامی میں غزوہ سویق کے بیان میں لکھا ہے "سلام بن مشکم و کان سید بنی النضیر فی زمانہ ذلک وصاحب کنزھم ... یعنی بالکنز ھنا المال الذی کانوا یجمعونہ لنوائبھم وما یعرض لھم"۔

خود مختار اور خود اکتفا تھیں۔

انصار کے قبائل تو معین تھے ہی اب ان عدالتی و سماجی اغراض کے لئے جملہ مہاجرین کا بھی ایک قبیلہ قرار دیا گیا (ف ۳) اور یہ قرار دیا گیا کہ اگر کوئی محلہ وار مجلس اپنے کسی اہل محلہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل نہ ہو تو دیگر مجالس بھی ہاتھ بٹانے کی پابند ہوں گی (ف ۲۱) اور یہ بھی صراحت سے بتا دیا گیا کہ اگر کسی قبیلے میں کوئی موالی ہوں یعنے کسی فرد سے قانونی اور معاہدانی بھائی چارہ کرکے اس قبیلے کے رکن بنے ہوں تو ایسے موالی کو اپنے اصل سے اختلاف کا حق نہ ہوگا (ف ۲۲) انتظام ولاد کے سلسلے میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ ایک شخص کے مولا کو کوئی دوسرا شخص بلا اجازت اصل اپنا مولا نہ بنائے۔ (ایضاً بروایت ابن حنبل)۔ انصاف جوئی کا اختیار افراد سے لیکر جماعت یعنے مرکز کے سپرد کر دیا گیا جو ایک عظیم الشان انقلاب تھا، اور حکم دیا گیا کہ انصافی مسائل میں جانبداری کرنے اور اپنے رشتہ داروں کی پچ کرنے بلکہ خود حقیقی بیٹے کو تک بچانے کی کوشش کرنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی اور جملہ مسلمان اس بات کی کوشش کریں گے کہ ہر ضرر پہنچانے یا ضرر پہنچانے کی تیاری کرنے والے شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے میں پوری طرح ہاتھ بٹائیں (ف ۱۳) قتل عمد کی سزا قصاص مقرر کی گئی البتہ مقتول کے ولی کو اختیار دیا گیا ہے کہ دیت لیکر قصاص سے درگزر کرے اور انصاف رسانی میں مداخلت کی سختی سے ممانعت کی گئی (ف ۲۱) اسلام کی حقانیت جتانے اور اس کا بول بالا کرنے کے لئے مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ اگر ان کا کوئی غیر مسلم رشتہ دار کسی مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو قصاص پر اصرار نہ کریں اور کسی مسلمان کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد نہ کریں (ف ۱۴) اسی طرح کسی قاتل مجرم کو پناہ یا مدد دینے کی ممانعت کی گئی اور کہا گیا کہ جو خدا اور قیامت پر ایمان لایا ہے اور جس نے اس دستاویز کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا ہے اگر وہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس کی رستگاری کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

انصار کے بعض لوگ یہود دیت قبول کر چکے تھے، خاص کر بعض بچوں کو اُن کے والدین منت مان کر یہودی بنا دیتے تھے اُن کے متعلق بھی ایک خصوصی دفعہ رکھ دی گئی کہ اگر وہ مانحتانہ انحا عمل پہ آمادہ ہوں تو انھیں سب مسلمان کے برابر حقوق رعیت حاصل ہوں گے، ان کی حفاظت و مدد کی جائیگی اور ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا جائیگا (ف ۱۶)۔

یہاں تک ان امور کا ذکر ہوا جو حصہ اول میں مندرج ہیں اور جو مدینے کے عربوں سے متعلق ہیں۔

حصہ دوم یہودیوں کے قبائل سے متعلق ہے۔

اوپر اس امر سے بحث ہو چکی ہے کہ آیا یہودیوں کا یہ دستور انصار و مہاجرین کے قواعد کے ساتھ ہی بنایا گیا یا بعد اس حصے کی مختصر تحلیل کے سلسلے میں عرض ہے کہ اس کی پہلی دفعہ مشترک ہے کہ کسی جنگ کی صورت میں اگر مسلمان اور یہودی اتحادِ عمل کریں تو ہر حلیف اپنے مصارف جنگ خود برداشت کرے گا اور یہ حکم نہ صرف ف۲۴ میں بیان ہوا ہے بلکہ ف۳۷ الف اور ف۳۸ میں بھی دہرایا گیا ہے اور غالباً ف۴۵ ب کی مبہم عبارت کا بھی یہی منشا ہے کہ (علی کل اناس حصتہم من جانبہم الذی قبلہم) جس کو ابو عبید نے "حصتہم من النفقۃ" لکھا ہے اس تکرار کی وجہ غالباً یہی تھی کہ مالی معاملات میں یہودی بہت بد نام تھے ان کی بد معاملگی کو "لیس علینا فی الامیین سبیل" اور "منہم من ان تامنہ بدینار لا یؤدہ الیک" وغیرہ آیات قرآنی میں بھی طشت از بام کیا گیا ہے جب مصارف برداشت کرنے کی ذمہ داری تھی تو ظاہر ہے کہ انھیں مال غنیمت کو پانے کا بھی حق حاصل تھا جیسا کہ ابو عبید نے اپنی شرح میں صراحت بھی کی ہے[۱] یہودیوں نے بھی آنحضرت کے سیاسی اقتدار کو مان لیا تھا اور ہر اختلاف میں آنحضرت کے فیصلے کو آخری تسلیم کر لیا تھا، جیساکہ ف۴۲ میں نہایت صراحت سے قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ف۲۵ میں "یہودی اپنے مذہب پر اور مسلمان اپنے مذہب پر" کہہ کر دینی آزادی اور رواداری کا اعلان کرنے کے باوجود ف۴۲ میں ابن اسحاق کی روایت میں محمد رسول اللہ اور ابو عبید کی روایت میں محمد النبی کے الفاظ برتے گئے ہیں اور ف۴۷ میں ابن اسحاق کے ہاں محمد رسول اللہ کا کلمہ مکرر آیا ہے گو ابو عبید کی روایت میں یہ جملہ حذف کر دیا گیا ہے اس کے معنے غالباً یہ تو نہیں ہوں گے کہ ان یہود نے آنحضرت کی رسالت یا نبوت مان لی بلکہ ان تاریخی کتابوں کے کسی با ادب کاتب نے یہ لفظ بڑھائے ہوں گے (کیوں کہ ابن اسحاق کے ہاں دونوں جگہ آخر میں صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھا ہے جو خود آنحضرت کا اپنے متعلق لکھنا قرین قیاس نہیں ہے) یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نبی" یا "رسول اللہ" کا لفظ آنحضرت نے خود لکھا تھا اور یہودیوں نے اپنی خطرناک سیاسی و جنگی حالت کے مد نظر اس پر اعتراض کی جراءت نہ کی۔ "صلی اللہ علیہ وسلم" کے استعمال کے متعلق سیرۃ ابن ہشام ص۹۹۲ س۳ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطبے وغیرہ میں آنحضرت اس کا بطور دعا خود بھی اپنے متعلق استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اس ذیلی بحث کے قطع نظر اس دستاویز میں دس یہودی قبائل کا فرداً فرداً اور نام بنام ذکر

---

[۱] روض الانف للسہیلی ج ۲ ص ۱۷۔ کتاب الاموال لابی عبید ۱۸۵

کیا گیا، اور ان کے حقوق کی مساوات تسلیم کی گئی۔ اس کا منشا بظاہر یہ ہے کہ یہودیوں نے ایک جماعت بن کر اس وفاقی شہری مملکت مدینہ میں شرکت نہیں کی بلکہ ہر قبیلہ ایک علیحدہ وحدت کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے چند یہودی قبائل سے جنگ کی یا انھیں مدینہ کی سرزمین سے نکل جانے کا حکم دیا تو نہ صرف باقی قبائل خاموش رہے بلکہ بعض مواقع پر انھوں نے مسلمانوں کی جنگی مدد بھی کی اور اس جنگ کے باوجود یہ معاہدہ یا دستور دیگر یہودی قبائل کی حد تک باقی رہا منسوخ نہیں سمجھا گیا چنانچہ اس دستور میں خونبہا کی ادائی میں اہل قبیلہ اور موالی متنہ کے طور پر ذمہ دار قرار دیے گئے تھے اور بنی قینقاع کے اخراج کے بعد بنو النضیر سے اسی قرارداد مندرجہ ف۲۵ و ف۳۱ کے تحت آنحضرت نے ایک موقع پر چندہ دینے کا مطالبہ کیا تھا[1]۔ یہودیوں کو مسلمان رعایا کے ساتھ سیاسی و تمدنی حقوق میں صراحت سے مساوات دی گئی (ف۱۶) اور یہودیوں کے معاہداتی رشتہ داروں کو جنھیں موالی البطن اور بطانہ کا نام دیا گیا ہے حقوق اور ذمہ داریوں میں عام اور اصلی یہود کے برابر مان لیا گیا ہے (ف۳۲ ف۳۵ ف۳۴ ف۴۵ ف۴۶) البتہ پناہ گزیں بلا اجازت پناہ دہندہ کسی اور کو پناہ نہیں دے سکتا (ف۴۱)۔ یہودیوں سے اصل میں ایک جنگی حلیفی کی گئی تھی چنانچہ ف۲۷ ف۴۴ اور ف۴۵ میں صراحت سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں اور ان سب سے صلح کریں گے جن سے مسلمان صلح کریں اور مدینے کی مدافعت میں مشترکہ حصہ لیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ آور ہو تو یہود مسلمانوں کو مدد دیں گے اور یہود پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان یہودیوں کو مدد دیں گے، البتہ دینی جنگوں میں جو مسلمان اختیار کریں یہودیوں کو ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری نہ ہوگی (ف۴۵) نیز مسلمان کے ساتھ فوج میں شرکت آنحضرت کی اجازت پر منحصر رکھی گئی (ف۳۶ الف) اس دفعہ کی عبارت کسی قدر مبہم ہے اور یہ معنے بھی نکلتے ہیں کہ یہودی آنحضرت کی اجازت کے بغیر خود بھی مستقلاً کسی سے جنگ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو آنحضرت کے سیاسی اقتدار کی مزید وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ اس اہم قرارداد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مکے کے قریش متاثر ہوئے ہوں گے جو مسلمانوں کے خلاف مدد دے سکنے والے ایک اہم حلیف یعنے یہودیوں کی اعانت سے محروم کر دیئے گئے جیسا کہ ف۴۳ میں قرار دیا گیا ہے کہ یہودی، قریش اور قریش کے مددگاروں کو کوئی پناہ نہیں دیں گے، گو بدقسمتی سے عمل اس پر نہ ہوا

---

[1] ۔ ابن ہشام ص ۶۵۲ ۔ ابن سعد ج ۲/۱ ص ۳۰ تا ۴۱ ۔ تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۴۴۹ تا ۵۰

اور یہودی سردار برابر قریش سے سازش کرتے رہے اور جنگ بدر کی شکست کے بعد اس کا سلسلہ جو شروع ہوا تو بنو قریظہ کی بلا شرط اطاعت تک برابر جاری رہا۔[1] بہر حال صلح و جنگ کو وفاق کا بلا شرط ایک مرکزی مسئلہ قرار دے دیا گیا، اور جنگ کی کمان آنحضرت کو حاصل ہوگئی جو آنحضرت کی زبردست سیاسی کامیابی تھی۔

سماجی اور اندرونی مسائل میں آنحضرت نے کوئی مداخلت نہیں کی اور رفدیہ، دیت اور جوار یا پناہ دہی اور معاہداتی رکنیت قبیلہ کے ادارات اور رواجات کو برقرار رکھا گیا (دفعہ ۲۵ و ۳۱ و ۴۰) اس فرزانہ سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کو ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ نہیں ہوئی اور یہودیوں نے خوشی سے اس کو منظور کر لیا کہ آنحضرت اُن کی بھی آخری عدالت مرافعہ کے فرائض انجام دیں (دفعہ ۴۲) نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے مقدمات میں آنحضرت ان کے شخصی قانون ہی کے مطابق فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ جنگ و صلح کی طرح یہودیوں کی عدل گستری کو بھی (دفعہ ۳۶ ب میں) صراحت کے ساتھ مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا اور انصاف میں رشتہ داری وغیرہ کے باعث دخل دہی کی قطعی ممانعت کی گئی اور قدیم زمانے کے انتقامات اور انتقام کے انتقامات کا لامتناہی سلسلہ یک تخت روک دیا گیا۔ آنحضرت کا یہودیوں پر عدالتی اقتدار اعلیٰ بھی مسلمانوں کے لئے بڑی سیاسی فتح تھی یہ یہودیوں نے نہ صرف آنحضرت کو اپنا مقتدر اعلیٰ تسلیم کر لیا بلکہ شہر مدینہ و مضافات (جوف) کو ایک حرم بھی تسلیم کیا دفعہ ۳۹ بلکہ ایک حرم تھا شہر طائف کی حرمت کو ۹ھ کے معاہدۂ طائف میں بھی تسلیم اور برقرار رکھا گیا (دیکھئے کتاب الاموال لابی عبید دفعہ ۵۰۶) یہ یہودیوں سے ایک نیم عرب شہر کو حرم مقدس منوا لینا بھی آنحضرت صلعم کا ایک سیاسی کارنامہ تھا اور اس طرح ایک چھوٹی سی بستی کو جو بیس[2] ایک محلوں پر مشتمل تھی شہری مملکت کی صورت میں منظم کیا گیا، اور اس کی قلیل لیکن بوقلمون و کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابل عمل دستور کے تحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا، اور ان کے تعاون سے شہر مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا کہ وہ بعد میں ایشیا یوروپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہت کا بلا کسی دقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔ یورپ کے لفظ پر آپ حیران نہ ہوں، عہد بنی امیہ سے بہت پہلے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ۲۷ھ میں

---

[1] البدایہ والنھایہ لابن کثیر ج ۴ ص ۶ - ابن ہشام ص ۶۸۱ نیز -
Jewish foundation of Islam by Torrey P. 130.

مسلمانوں کی فوجیں اندلس میں داخل ہوگئیں اور مزید کمک نہ ملنے کے باوجود وہیں مقیم اور ملک کے ایک حصے پر قابض رہیں تا آں کہ بہت دنوں کے بعد طارق آتا ہے اور اندلس کی فتح کو مکمل کرتا ہے، عہد عثمانی کی اس مہم کا ذکر طبری[1] اور گبن[2] نے بھی کیا ہے، اور سب جانتے ہیں کہ عہد عثمانی تک مدینہ ہی مرکز خلافت تھا۔

اس دستاویز میں ایک جگہ لفظ "دین" بھی برتا گیا ہے اس لفظ میں بیک وقت مذہب اور حکومت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا اہم امر ہے کہ اس کو پیش نظر رکھے بغیر مذہب اسلام اور سیاسیات اسلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہاں اس دستور کے متن کا ترجمہ بے محل نہ ہوگا۔

اصل متن دستور کے ماخذ

۱۔ سیرۃ ابن ہشام (طبع یوروپ) ص ۳۴۱ تا ۳۴۴۔

۲۔ سیرۃ ابن اسحاق (ترجمۂ فارسی، مخطوطۂ پاریس) ورق ۱۰۱۔

۳۔ کتاب الاموال مولفۂ ابو عبید قاسم بن سلام (طبع مصر) فقرہ ۵۱۷۔

۴۔ البدایہ والنہایہ مولفۂ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶۔

۵۔ سیرۃ ابن سید الناس۔ احوال بعد ہجرت کے ضمن میں۔

متن کے اقتباسات کے ماخذ

۱۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب ۱۹۔ باب ۲۱۔

۲۔ مسند احمد بن حنبل۔ ج ۱ ص ۲۷۱۔ ج ۲ ص ۲۰۴۔ ج ۳ ص ۲۴۲۔

۳۔ تاریخ الطبری (طبع یوروپ سلسلۂ اول) ص ۱۲۶۲، ۱۳۵۹۔

۴۔ لغت لسان العرب مولفۂ ابن منظور تحت مادہ "بدر، دسع، عقب، عقل، فرح، وتغ"۔

---

[1] تاریخ طبری ص ۲۸۱۷۔

[2] Decline and fall of Roman Empire, V, P. 555.

ھ طبقات ابن سعد ج ا قسم دوم ص ۱۷۲۔

اس موضوع پر یوروپی زبانوں کے مضامین

1. Wellhausen, Skizzen und Vorarbeiten, Vol. 4 Nr. 2:- "Gemeindeordnung von Medina."
2. Caetani, Annali dell'Islam, anno 1, § 43.
3. Wensinck, Mohammed en de Joden te Medina, pp. 78 et seq.
4. Buhl, Das Leben Mohammeds, pp. 210-212.
5. Sprenger, Das Leben und die Lehre des Mohammed, Vol. 3, pp. 20-30.
6. Mueller, Der Islam in Morgen- und Abendland, Vol. 1. pp. 15-18
7. Grimme, Mohammed, pp. 75-81.
8. Islamic Culture (Hyderabad quarterly), Vol. XI, pp. 163-172. "Administration of Justice in Early Islam"

ترجمہ دستور مملکت مدینہ بعہد نبویؐ

(کوشش کیگئی کہ ترجمہ واضح ہو اور سمجھنے کیلئے کسی حاشیے کی ضرورت نہ رہے۔ اور فقرات پر نمبر بھی لگادئے گئے ہیں تاکہ حوالے میں سہولت رہے۔ یہ نمبر چونکہ معین ہوچکے ہیں اور جرمنیؔ، ہالینڈؔ، اٹلی وغیرہ ہر جگہ ایک ہی ہیں اسلئے جہاں مجھے اختلاف کرنا پڑا وہاں الف، ب کرکے ذیلی تقسیم کیگئی ہے اور بین الاقوامی نمبروں کو باقی رکھا گیا ہے)

رحم والے اور مہربان خدا کے نام سے۔

ف ۱۔ یہ ایک حکمنامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمدؐ کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہوجائیں اور انکے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

ف ۲۔ تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (امت) ہوگی۔

ف ۳۔ قریش سے ہجرت کرکے آنیوالے اپنے محلے کے (ذمہ دار) ہونگے اور اپنے خونبہا باہم ملاکر دیا کرینگے اور اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائینگے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۴۔ اور بنی عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۵۔ اور بنی الحارث بن خزرج اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۶۔ اور بنی ساعدہ اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۷۔ اور بنی جشم اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۸۔ اور بنی النجار اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۹۔ اور بنی عمرو بن عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ

اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۱۰۔ اور بنی النبیت اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۱۱۔ اور بنی الأوس اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۱۲۔ الف۔ اور ایمان والے کسی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کو مدد دیے بغیر چھوڑ نہ دینگے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۱۲۔ ب۔ اور یہ کہ کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولا (معاہداتی بھائی) سے خود معاہدہ برادری نہیں پیدا کریگا۔

ف۱۳۔ اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھینگے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اٹھینگے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ف۱۴۔ اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کریگا اور نہ کسی کافر کی کسی ایمان والے کے خلاف مدد کریگا۔

ف۱۵۔ اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان (مسلمانوں میں) کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عاید کر سکیگا۔ اور ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں کے مقابل۔

ف۱۶۔ اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کریگا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائیگا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائیگی۔

ف۱۷۔ اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کریگا جب تک کہ (یہ صلح) ان سب کیلئے برابر اور یکساں نہ ہو۔

ف۱۸۔ اور ان تمام ٹکڑیوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دلائی جائیگی۔

ف۱۹۔ اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لینگے جو خدائی راہ میں ان کے خون کو پہنچے۔

ف۲۰۔ الف۔ اور بے شبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستہ پر ہیں۔

ف۲۰۔ ب۔ اور یہ کہ کوئی مشرک (غیر مسلم رعیت) قریش کی جان اور مال کو کوئی پناہ نہ دیگا اور نہ اس سلسلہ میں کسی مومن کے آڑے آئیگا۔

ف۲۱۔ اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائیگا بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خونبہا پر راضی ہو جائے۔ اور تمام ایمان والے اس (کی تعمیل) کیلئے اٹھینگے اور اسکے سوا انہیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی۔

ف۲۲۔ اور کسی ایسے ایمان والے کیلئے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کرچکا اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لاچکا ہو یہ بات جائز نہ ہوگی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے۔ اور جو اسے مدد یا پناہ دیگا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہونگے اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہوگا۔

ف۲۳۔ اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمد سے رجوع کیا جائیگا۔

ف۲۴۔ اور یہودی اس وقت تک مومنین کیساتھ اخراجات برداشت کرتے رہنگے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

ف۲۵۔ اور بنی عوف کے یہودی مومنین کے ساتھ ایک سیاسی وحدت (یا امت) تسلیم کئے جاتے ہیں یہودیوں کو ان کا دین اور مسلمانوں کو ان کا دین۔ موالی ہوں کہ اصل۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑیگا۔

ف۲۶۔ اور بنی النجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۲۷۔ اور بنی الحارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو

ف۲۸۔ اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو

ف۲۹۔ اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو

ف۳۰۔ اور بنی الأوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو

ف۳۱۔ اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑیگا۔

ف۳۲۔ اور جفنہ جو (قبیلۂ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے اسے بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو اصل کو۔

ف۳۳۔ اور بنی الشطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ اور وفا شعاری ہونہ کہ عہد شکنی۔

ف۳۴۔ اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو اصل کو۔

ف۳۵۔ اور یہودیوں (کے قبائل) کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو اصل کو۔

ف۳۶۔ الف۔ اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد کی اجازت کے بغیر (مسلمانوں کی فوج میں بھرتی ہوکر) نہیں نکلیگا۔

ف۳۶۔ ب۔ اور کسی مار، زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائیگی اور جو خونریزی کرے تو اسکی ذات اور اس کا گھرانہ ذمہ دار ہوگا ورنہ ظلم ہوگا۔ اور خدا اسکے ساتھ ہے جو اس (دستور العمل) کی زیادہ سے زیادہ وفاشعارانہ تعمیل کرے

ف۳۷۔ الف۔ اور یہودیوں پر ان کے خرچے کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کا خرچہ۔

ف ۳۷ ب۔ اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم امداد عمل میں آئیگی اور ان میں باہم حسن مشورہ اور بہی خواہی ہوگی اور وفاشعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

ف ۳۸۔ اور یہودی اسوقت تک مومنین کیساتھ اخراجات برداشت کرتے رہینگے جب تک کہ وہ مل کر جنگ کرتے رہیں

ف ۳۹۔ اور یثرب کا جوف (یعنی میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہو) اس دستور والوں کیلئے ایک حرم (اور مقدس مقام) ہوگا۔

ف ۴۰۔ پناہ گزین سے وہی برتاؤ ہوگا جو اصل (پناہ دہندہ) کیساتھ۔ نہ اسکو ضرر پہنچایا جائیگا اور نہ خود وہ عہد شکنی کریگا۔

ف ۴۱۔ اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دیجائیگی (یعنی پناہ دینے کا حق پناہ گزین کو نہیں)

ف ۴۲۔ اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو تو اسے خدا اور خدا کے رسول محمد سے۔ جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔ رجوع کیا جائیگا۔ اور خدا اس شخص کے ساتھ جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

ف ۴۳۔ اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائیگی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے۔

ف ۴۴۔ اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم مدد دہی ہوگی اگر کوئی یثرب پر ٹوٹ پڑے۔

ف ۴۵۔ الف۔ اور اگر ان کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کرینگے اور اسمیں شریک رہینگے اور اگر وہ کسی ایسے ہی امر کیلئے بلائیں تو مومنین کا بھی فریضہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا ہی کریں بجز اسکے کہ کوئی دینی جنگ کرے

ف ۴۵۔ ب۔ ہر گروہ کے حصے میں اسی رخ کی (مدافعت) آئیگی جو اس کے بالمقابل ہو۔

ف ۴۶۔ اور (قبیلہ) الأوس کے یہودیوں کو، موالی ہوں کہ اصل، وہی حقوق حاصل ہونگے جو اس دستور والوں کو اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفاشعاری کا برتاؤ کرینگے اور وفاشعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی جو جیسا کریگا ویسا خود ہی بھریگا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس دستور کی مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صداقت اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

ف ۴۷۔ اور یہ کہ یہ حکمنامہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئیگا۔ اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہوگا اور جو مدینے میں بیٹھ رہے تو بھی امن کا مستحق ہوگا ورنہ ظلم اور عہد شکنی ہوگی۔ اور خدا اس کا نگہبان ہے جو وفاشعاری اور احتیاط (سے تعمیل عہد) کرے اور اللہ کے رسول محمد بھی جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔

ایجادات کے پانچ دور

از جناب حبیب احمد صاحب فاروقی بی۔اے، ڈپ مددگار ٹکنیکل کالج

تمہید ایجادات کی تاریخ دراصل انسان کے ذہنی ارتقاء اور تہذیب و تمدن کی نشو ونما کی تاریخ ہے۔ اس کی ابتدا زمانہ تاریخ سے بھی بہت پہلے ہوئی پہلا برتن پہلا ہل، یا پہلا پہیہ ایسی ایجادات ہیں جن کو کوئی محفوظ نہ کرسکا۔ ہم نہیں جانتے کہ جھاڑی پیڑ کو کریدکر کس نے پہلی ناؤ بنائی؟ اور نہ اس کا صحیح اندازہ لگاسکتے ہیں کہ کونسی ضرورت اس ایجاد کا باعث ہوئی؟ پانچ ہزار سال پہلے ایک مصری نے شیشے کے زیورات بنائے تھے جو اب بھی نمائش گاہ میں محفوظ ہیں اور اپنی خوب صورتی سے ہم کو ششدر کردیتے ہیں مگر ہم کو اس شخص کا کچھ بھی حال معلوم نہیں جس کے سر اس ایجاد کا سہرا ہے۔ اسی طرح ماہرین آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے دست کاری کے جو عجیب و غریب نمونے حاصل ہوئے ہیں ان سے ہم اس عہد کے متعلق صرف کچھ قیاس کرسکتے ہیں جس عہد میں ان کی ایجاد متعین کی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ ان اشیاء سے ہم اُن ادوار کا ایک سرسری اندازہ لگاسکتے ہیں جن کی یہ نشانیاں ہیں یہ دراصل ایجادات کی ان منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں جو انسان نے اپنے سفرِ زندگی میں طے کیے۔

ابتدائی ایجادات اوقاتِ فرصت کے صحیح استعمال کے باعث دست کاریاں، صنعتیں اور دوسری ایجادات وجود میں آئیں، جن کی وجہ سے ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا بار کم ہوتا گیا۔ اگرچیکہ بعد کی ایجادات مرد کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں، مگر ابتدائی ایجادات کا سہرہ عورت ہی کے سر ہے۔ عورت نے پہلی مرتبہ اُون کاتا، اور پہلا لباس بنایا، پہلی مرتبہ غلہ پیس کر اس کی روٹی پکائی اور کیا عجب ہے کہ اپنے شوہر کو شکار میں مدد دینے کے لیے پہلا بھدّا چھرا بھی اسی نے بنایا۔ گھر کو سجانے اور جسم کو سنوارنے کی تمام اشیاء اور اسی قسم کی دوسری ایجادات عورت ہی کی ممنونِ احسان ہیں۔ ایجادات کا یہ سلسلہ کئی صدیوں تک اپنی ایسی معمولی رفتار کے ساتھ قایم رہا کہ اس زمانے میں ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ صدیوں بعد جو ایجادیں

ظہور میں آئیں وہ کئی سو سال پہلے ہی کیوں پیش نہ کی جاسکیں۔ ازمنۂ وسطیٰ نے کیوں کوئی قابلِ ذکر ایجاد پیش نہیں کی؟ انسان نے برق اور بھاپ پر قابو پانے میں کیوں اتنی دیر لگائی؟

ضروریاتِ زمانہ

واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم ہر زمانے اور عہد کے حالاتِ زندگی کا صحیح حال معلوم نہ کرلیں ایجاد کی اس سست ترقی کی وجہ سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ہم جانتے ہیں کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔ ضروریاتِ زندگی اور معاشی و سماجی حالات کچھ ایسے تھے کہ پچھلے زمانے میں ان ایجادات کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ حالانکہ اس زمانے کے بعض مفکرین نے بعض ایجادات کے امکانات پر پیش قیاسی کی تھی، مگر ایک ایسی دنیا میں جہاں سادگی کارفرما تھی اور کشمکشِ حیات کے پیچیدہ مسایل پیدا نہ ہوئے تھے، ان ایجادات کی ضرورت ہی کیا ہوسکتی تھی؟ جب کوئی ایجاد ہوتی ہے وہ یا تو کسی زندگی کی اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے، یا معاشی و سماجی حالات میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے۔ تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ یورپ میں اٹھارھویں صدی کا صنعتی انقلاب دراصل اس عہد کے سماجی ارتقا کا نتیجہ تھا۔ مختلف ممالک میں چند طبقوں کی زرعی زندگی سے بیزاری اور دست کاریوں کی طرف میلان کی وجہ سے شہری آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ آبادی کی کثرت، مصنوعات کی نکاسی، باہمی مقابلے غرض کشمکشِ حیات کے بہت سے پیچیدہ مسایل پیدا ہوئے۔ اس سماجی تغیر اور معاشرتی پیچیدگیوں کے باعث اٹھارھویں صدی کا صنعتی انقلاب واقع ہوا، جو ایجادات کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

دخانی انجن اپنے وقت پر ایجاد ہوا، اسی طرح گیسی انجن، ریل گاڑی اور موٹر گاڑی بھی زمانے کے حالات اور ضروریات کے تحت وجود میں آئے۔

عوام کی مخالفت

اگرچہ کہ ہر نئی ایجاد اپنے افادات کے باعث آگے چل کر مقبول ہوجاتی ہے مگر ابتداءً ہر ایجاد کی مخالفت ضرور ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی جدید چیز کو قبول کرنے کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایک یا چند ایسی قدیم چیزیں ترک کریں جن سے ہمارے جذبات اور وجدانات وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہر مرتبہ جدید و قدیم کا ایک تصادم ہوتا ہے۔ مرڈاک اور اسٹیفن سن کو اپنی ایجادات پیش کرنے میں جن دقتوں کا سامنا ہوا ان کی تفصیل پڑھنے سے واضح ہوگا کہ یہ جھگڑے کسی تاریخی لڑائی سے کچھ کم معرکہ آرا نہ تھے۔ قدیم اشیاء سے وابستگی اور جدید سے جو نفرت ہوتی ہے اس پر غالب آنا ہر زمانے میں کچھ غیر معمولی طور پر مشکل پایا گیا۔ اس زمانے میں شاید ہم ان مخالفتوں کو حیرت اور استعجاب سے دیکھیں گے

اور محسوس کریں گے کہ ہٹ دھرمی کے سوا اس مخالفت کی کوئی بنیاد ہی نہ تھی مگر ہم میں سے بہت کم اتنی جرأت یا صداقت رکھتے ہیں جو ایسے نئے مواقع پر خود انھیں غلطیوں میں مبتلا نہ ہوں جن کو ہم پچھلوں کی ہٹ دھرمی اور جہالت سے تعبیر کرتے ہیں۔

سمسن موجد کلوروفارم اپنی اس ایجاد کی وجہ سے انسانی محسن شمار کیا جاتا ہے، مگر کس قدر عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ہم عصروں نے اس کی بے انتہا مخالفت کی اور مذہبی اشخاص نے اس کو مُرید شیطان، زندیق اور مردود ٹھیرایا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ بیماری خدا کی دی ہوئی چیز ہے اور اس کی ساری تکلیفیں انسان کو برداشت کرنی چاہئیں، اب اگر کوئی شخص ان تکالیف کو کم کرنے کی کوشش کرے تو وہ (معاذاللہ) خدا کی مرضی کے خلاف انسان کو آرام پہنچا رہا ہے جو عبودیت کی خلاف ورزی اور شیطان کی مددگاری کے مرادف ہے۔

اگر دُنیا ساری بیماریوں کو خدا کے حکم کا نتیجہ اور ناقابلِ علاج تسلیم کر لیتی، دوا، اور تیمارداری کو داخلِ گُناہ شمار کرتی تو غور کیجیے کہ آج انسانی زندگی کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہوتی۔ شکر ہے کہ ہم اس زمانے سے گذر چکے ہیں جبکہ نئی ایجادات اور سائنسی ترقیاں خدا کی مُقدّس مرضی کی مخالفت کرنے اور خدائی قوانین کو توڑنے کے مترادف سمجھی جاتی تھیں۔ ہم جانتے ہیں کہ خدا نے اپنے "خلیفہ" کو وہ علم و حکمت عطا فرمائی ہے جس کو وہ اپنی زندگی کے موانعات پر غالب آنے، ضروریات اور جائز مسرتوں کے حاصل کرنے کے لیے کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے! اور اس کو کرنا ضروری بھی ہے، کیوں کہ خدا کی عنایت کی ہوئی قوتوں سے کام نہ لینا بڑی ناشکری ہے۔ سائنس دانوں نے جہالت، مرض اور دوسرے موانعات پر غلبہ حاصل کر کے نوعِ انسانی کی جو خدمت انجام دی ہے وہ کسی طرح قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی نہیں کہلائی جا سکتی۔

آج سے چالیس سال پہلے انگلستان کی سڑکوں پر کسی سواری کو چار میل سے زیادہ رفتار سے چلنے کی اجازت نہ تھی اور چار میل کی رفتار پر یہ قید تھی کہ سواری کے سامنے ایک سوار سُرخ جھنڈی لیا ہوا رہا کرے۔ ابتدا میں عوام موٹر میں بیٹھنا اس لیے گُناہ سمجھتے تھے کہ "تعجیل کارِ شیاطین بود" اور نیک انسان وہ ہے جو سست رفتاری پر قناعت کرے۔ اطباء کی طبیعتوں پر بھی اس جدید ایجاد کے خلاف ایسا تنفر تھا کہ انھوں نے فنی نقطۂ نظر سے اعلان کیا کہ انسانی اعصاب کے لیے دس میل سے زیادہ رفتار ناقابلِ برداشت ہے۔ باوجود مذکورۂ بالا قسم کے اعتراضات اور مخالفتوں کے نئی نئی ایجادات یکے بعد دیگرے پیش کی گئیں اور اپنی افادیت کے باعث

مقبول خاص و عام ہوئیں۔ انسان نے جب دیکھا کہ جدید اشیاء نے اس کی ضروریاتِ زندگی کے حصول میں سہولت پیدا کردی ہے اور ان کے استعمال سے وقت اور سعی کی کفایت کے ساتھ ساتھ فرصت کے خوشگوار گھڑیوں میں اضافہ ہوتا ہے تو اس نے پوری قوت کے ساتھ نئی نئی ایجادات کے لیے جد و جہد شروع کردی۔

عہد اور دَور

پہلی ایجاد زمانۂ تاریخ سے بھی ہزار ہا سال پہلے ہوئی ہوگی لیکن ہم کو مصریوں اور چینیوں کی ایجادات کا بھی حال معلوم ہے۔ ارشمیدس کی ایجادات جو تین سو سال قبلِ مسیح پیش کی گئی تھیں آیندہ ایجادات کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اسی طرح اٹھارھویں صدی تک یہ سلسلہ قایم رہا مگر یہ سب ایجادات کی تاریخ کے قدیم عہد سے متعلق ہیں ان ایجادات کا اثر انسانی زندگی، معاشرت اور سماج پر اتنا گہرا نہیں پڑا جیسا کہ بعد کی ایجادوں کا ہوا اثرات کے لحاظ سے اٹھارھویں صدی سے جدید عہدِ ایجادات کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس عہد کو سہولت کے لحاظ سے پانچ دَوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:-

۱۔ دُخانی دور

۲۔ فولاد کا دور

۳۔ کرگے کا دَور

۴۔ برقی دَور

۵۔ پرواز اور لاسلکی کا دَور

ادوار کی تقسیم سے متعلق اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ دراصل تاریخِ ایجادات میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی میں یکایک تغیرات پیدا نہیں ہوتے بلکہ ہر دَور میں بعض اہم رجحانات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی نشان دہی کے لیے اَدوار قایم کیے جاتے ہیں جس طرح عام تاریخ میں پتھر کا زمانہ، دھاتوں کے زمانے سے ممیز طور پر علحدہ واقع نہیں ہے اسی طرح ایجادات کی تاریخ میں بھی ایک دَور اور دوسرے دَور میں کوئی امتیازی حدِ فاصل نہیں ہے الغرض یہ دَور ایک دوسرے میں متداخل ہیں مگر ہر دَور میں ایک خاص ایجاد کا ایسا وسیع استعمال ہوا ہے جس کا اس دَور کی زندگی پر نمایاں اثر رہا ہے۔

بعض ایجادات کی تفصیل تو سوں میں کی گئی ہے مگر اس حصّے کو ترک کردینے سے مضمون کے تسلسل میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔

---

(۱)

دُخانی دَور

تمہید بھاپ کے مختلف کرشمے اب بھی ہمارے پیشِ نظر ہیں، مگر جس وقت دُنیا نے حرار ی انجن اور برق پر قابو نہ پایا تھا، سارے کاروبار بھاپ ہی کی برکت سے چلتے تھے۔ دخانی کشتیوں اور دخانی جہازوں کے ذریعے بیرونی تجارت ہوتی تھی اور اندرونی تجارت اب بھی دخانی انجن ہی کی ممنونِ احسان ہے۔ بھاپ سے تو قدیم یونانی اور مصری بھی واقف تھے۔ اس کو وہ ایک عجیب و غریب چیز سمجھتے تھے اور اس پر انھوں نے چند تجربات بھی کیے تھے، مگر ان کی کوششوں کا کوئی عملی نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا۔ اس زمانے میں بھاپ پر عملی تسلط حاصل کرنے کی کوئی خاص ضرورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ طلب و رسد کا قانون ہمیشہ سے دُنیا میں جاری ہے اور جب تک ضروریاتِ زمانہ کا دباؤ نہ پڑا کوئی ایجاد پیش نہیں کی جا سکی۔

ابتدائی کوششیں ورسٹر کے نواب نے سترھویں صدی میں بھاپ پر چند تجربے کیے جس کا عملی نتیجہ انھوں نے اپنی تالیف کے ذریعے ۱۶۶۳ء میں پیش کیا۔ موصوف نے بھاپ کے استعمال سے پانی کو اُوپر چڑھانے کی پہلی کامیاب کوشش کی (ایک بڑے بند برتن میں دو نلیاں لگائی گئیں۔ ان نلیوں پر صمام یا کھلن دن تھے جو پانی کو صرف ایک طرف گذرنے دیتے تھے۔ اندر کھلنے والی نلی کا دوسرا سرا باؤلی میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور باہر کھلنے والی نلی کو ایک ٹونٹی لگا دی گئی تھی۔ اس بڑے برتن میں بھاپ گذاری جاتی اور جب برتن بھاپ سے اچھی طرح بھر جاتا اس کو فوراً ٹھنڈا کر دیا جاتا۔ بھاپ ٹھنڈی ہو کر تھوڑے سے پانی کی صورت میں مُبدّل ہو جاتی۔ اس طرح جو خلا پیدا ہوتا اس کو بھرنے کے لیے باؤلی کا پانی اُوپر چڑھ آتا اور برتن کو بھر دیتا۔ اب پھر برتن میں بھاپ گذاری جاتی جس کے دباؤ کی وجہ سے پانی دوسری نلی سے باہر آجاتا)۔

ورسٹر کی یہ ایجاد ہمارے موجودہ مفہوم کے اعتبار سے دخانی نہ تھی کیوں کہ اس میں بھاپ کے

پہیلاؤ کی قوت کا استعمال نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اس کا عمل ہوا کے دباؤ پر منحصر تھا۔ یہ ایجاد بہت مقبول ہوئی کیوں کہ اس سے ایک بڑی صنعتی ضرورت کی تکمیل ہوئی کوئلے کی کانوں میں سطح سے تھوڑی ہی گہرائی پر پانی جمع ہو جاتا تھا، اور اس میں سے مزید کوئلہ نکالنا ممکن نہ ہوتا تھا، اس ایجاد کی بدولت پانی کی نکاسی آسانی سے ہونے لگی چنانچہ ایک صدی تک ورسٹر کی اس ایجاد کا وسیع استعمال ہوتا رہا۔ البتہ مختلف موقعوں پر حسب ضرورت اس کی کچھ ترمیم ہوئی۔ سیبورے نے ۱۶۹۸ء میں اور نیوکامن نے ۱۷۰۵ء میں مناسب ترمیم کے ساتھ کچھ اضافے بھی کیے۔ ایک عرصہ دراز تک نیوکامن کے انجن کانوں سے پانی کے اخراج کے لیے استعمال ہوتے رہے۔ واٹ نے جو دخانی انجن ایجاد کیا وہ دراصل اسی قسم کی ایک مشن کی مرمت اور ترمیم کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

جیمس واٹ

واٹ ایک تاجر کا لڑکا تھا جسمانی کمزوری کی وجہ سے والدین نے اس کو مدرسہ نہیں بھیجا بلکہ گھر پر ہی تعلیم کا انتظام کیا۔ جب بڑا ہوا تو ریاضیاتی اور سائنسی آلے بنا کر اپنی روزی کمانے لگا۔ اس کام میں اس نے اتنی شہرت حاصل کی کہ جامعہ گلاسگو میں آلات کی مرمت اور ساخت کے لیے متعین کیا گیا جہاں اس کے تحت ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی تھا۔ جامعہ کے دارالتجربے میں نیوکامن کے انجن کا ایک نمونہ تھا جس میں کچھ خرابی آگئی تھی، مرمت کے لیے واٹ کے پاس بھیجا گیا۔ اگرچہ یہ کام اس کے فرائض سے زاید تھا اور وہ اس فن سے چنداں واقف بھی نہ تھا مگر وہ اس کو درست کرنے میں کامیاب رہا۔ اس نے اس مشین کی خرابیوں پر غور کیا، اور ارادہ کیا کہ ان نقائص کو دور کر کے اس کو زیادہ مفید بنائے گا۔

نیوکامن کے انجن میں ایک ہی برتن استعمال کیا جاتا تھا، اس کو ہر مرتبہ ٹھنڈا کیا جاتا تھا اور پھر اس میں بھاپ گذاری جاتی تھی۔ اس طرح حرارت کی ایک بڑی مقدار ضائع ہو جاتی تھی چنانچہ اس نے معلوم کیا کہ صرف (۲۵) فیصدی (یعنے ایک ربع) حرارت مفید کام انجام دیتی ہے اور (۷۵) فیصدی حرارت ٹھنڈے برتن کو پھر گرم کرنے میں ضائع ہوتی تھی۔

اس نے پہلی ترمیم یہ کی کہ بجائے ایک بڑے برتن کے دو استعمال کیے جن میں سے ایک صرف بھاپ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مخصوص تھا۔ علاوہ ازیں اس نے دوسرے برتن کی گرمی کو محفوظ رکھنے کی بھی چند عملی تدابیر اختیار کیں۔

دوسری ترمیم ہماموں کے ایسے منظم استعمال پر مشتمل تھی جس کی وجہ سے بھاپ دونوں رخوں پر دباؤ ڈال کر متحرک حصے سے ٹکراتی تھی اس طرح دونوں سمتوں میں مفید عملی حرکت ہونے لگی۔ حاکم (گورنر) کے

استعمال سے انجن کی رفتار پر قابو حاصل ہوا اب تک جتنے انجن ایجاد ہوئے ان سے صرف اُوپر نیچے کی حرکت حاصل ہوتی تھی۔ واٹ نے سلاخ اور پہیئے کے استعمال سے اس حرکت کو دوری حرکت میں تبدیل کیا۔ اس اہم تبدیلی کی وجہ سے جو انجن پہلے صرف پانی نکالنے کے لیے استعمال ہوتا تھا وہ اب دوسرے کاموں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔

مرڈاک کی ایجاد واضح رہے کہ اس وقت تک بھاپ کی مدد سے کام کرنے والے جو انجن پیش کیے گئے وہ استادہ انجن تھے جو ایک جگہ قائم رہ کر پانی کا اخراج کیا کرتے تھے۔ اب تک بھاپ سے حرکت کرنے والی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۷۷۷ء میں واٹ کی ملاقات مرڈاک سے ہوئی۔ مرڈاک نے کئی ایجادات پیش کیں مگر بدقسمتی سے اس کی قدر نہیں کی گئی۔ اس کی ایک مشہور ایجاد جلنے والی گیس ہے جو برقی روشنی سے پہلے عام طور پر استعمال کی جاتی رہی اور اب بھی ریل کے ڈبوں میں بکثرت استعمال کی جاتی ہے۔ مرڈاک کو بھاپ کی مدد سے چلنے والی گاڑی بنانے کا خیال ہوا کئی سال کی خاموش اور خفیہ کوشش کے بعد اس نے ایک تین پہیوں کی گاڑی بنائی جس کا اگلا پہیہ رُخ بدلنے کے لیے تھا اس نے گاڑی میں پانی کا ایک برتن بنایا اور اس کے نیچے آگ رکھنے کا انتظام کیا اندھیری رات میں جب اس نے خیال کیا کہ کوئی سڑک پر نہ ہوگا اس نے پہلی مرتبہ اپنی اس سواری کی آزمائش کی اتفاق سے اس قصبے کا پادری ادھر سے گذر رہا تھا جب اس نے دیکھا کہ اندھیری رات میں سڑک پر شعلے اچھالتے ہوئے ایک چیز آگے بڑھ رہی ہے تو وہ بہت گھبرایا اور اُدھ بدا کر تیز تیز گھر کا رُخ کیا اور دوسرے دن گرجا میں اس واقعے کو وجود شیطان کے ثبوت میں پیش کیا۔ مرڈاک پھر اس گاڑی کو باہر لانے کی ہمت نہ کر سکا البتہ اس نے واٹ اور چند دیگر احباب سے اپنی اس ایجاد کا ذکر کیا۔ انھوں نے اس کی قدر کی اور اس میں کچھ ترمیم و اضافے بھی کیے۔

اُس زمانے میں کوئلوں کی کان سے گودام تک کوئلہ پہنچانے کے لیے گھوڑے بڑی بڑی واگنوں میں جوتے جاتے تھے۔ ان وزنی گاڑیوں سے سڑکیں بہت جلد خراب ہو جاتی تھیں اس لیے راہِ آہن تیار کی گئی یعنے لوہے کی پٹریاں بچھائی گئیں۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پٹری کا استعمال نہایت ہی قدیم ہے چنانچہ اہلِ روما نے بھی سڑکوں پر اس کا استعمال کیا ہے۔ ان پٹریوں سے ایک تو سڑک خراب ہونے سے محفوظ ہو گئی اور دوسرے گھوڑوں پر بھی واگن کھینچنے کا بار کم ہو گیا۔ پٹری کے یہ راستے عوام کے لیے بھی کھلے ہوئے تھے چنانچہ کچھ اُجرت دے کر ہر شخص اپنی گاڑی اس راہ سے لے جا سکتا تھا۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں مرڈاک کے ایک شاگرد نے پہلی مرتبہ بھاپ کی گاڑی کو آہنی راہ پر چلایا۔ اس پر اس کا خوب مضحکہ اُڑایا گیا۔ بوڑھوں نے اس حماقت پر وعظ کہہ ڈالے اور پادریوں نے اس کو شیطانی کارنامہ قرار دیا۔ بہرحال ہر طرف سے لعنت ملامت ہونے لگی اور بہت کم ایسے تھے جو یہ تصور کر سکے کہ یہ چیز ایک بڑی ایجاد کا

بیش قیمت ثابت ہو گی۔ پھر بھی بعض بیرونی حالات ایسے پیش آئے جس کے باعث اس سلسلے میں کوشش ناگزیر پائی گئی۔

جب نپولین کی جنگوں کا طویل سلسلہ شروع ہوا تو سارے گھوڑے میدانِ جنگ کے لیے محفوظ ہو گئے، صرف ٹٹوؤں اور خچروں سے بار برداری کا کام لیا جا سکتا تھا جو گھوڑوں کے برابر کام تو نہ کر سکتے تھے مگر خوراک میں ضرور ہم پلّہ تھے۔ جنگ کی ضروریات کے تحت دانہ چارہ بہت مہنگا ہو گیا۔ کانوں اور کارخانوں کے مالکوں نے سوچا کہ کسی طرح ایسی کل ایجاد کی جائے جس سے گاڑیاں چلائی جا سکیں، کیوں کہ کوئلے اور پانی کی کوئی کمی نہیں تھی، البتہ دانے چارے کی غیر معمولی قلّت تھی۔

بلاکٹ ایک کان کا مالک تھا، اس کا گودام کان سے چھ میل کے فاصلے پر تھا، اس نے مرڈاک کی بھاپ گاڑی کا حال تو سنا ہی تھا لگا خود اس پر تجربے کرنے۔ کوئی دس سال کی کوششوں اور متعدد ناکامیوں کے بعد اس نے دو بڑی بڑی بھاپ گاڑیاں بنائیں جو اب تک لندن کے عجایب خانے میں محفوظ ہیں۔ یہ نہایت ہی بھدّے اور عجیب و غریب نمونے ہیں۔ ان کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے، مگر یہ واضح رہے کہ یہی گاڑیاں ریلوے انجن کی پیش رو ہیں جس کو ۱۸۱۸ء میں جارج اسٹیفن سن نے ایجاد کیا۔

اسٹیفن سن اسٹیفن سن ایک ایسی جھونپڑی میں پیدا ہوا جس کے سامنے سے بلاکٹ کی بھاپ گاڑی گذرتی تھی۔ بچپن سے اس کے کان اس کی مہیب آوازوں کے عادی ہو گئے تھے۔ بڑا ہوا تو اسی کان میں ملازم ہوا۔ سترہ سال کی عمر تک اس کی کوئی تعلیم نہ ہو سکی جب اس نے محسوس کیا کہ بغیر لکھے پڑھے ترقی ممکن ہی نہیں تو اس نے مستعدی کے ساتھ تحصیل شروع کی۔ مشاہدہ اور حافظہ دونوں قوی تھے انجن اور اس کے متعلقات کو غور سے دیکھا کرتا تھا اور اس کے تمام حرکات اور پرزوں کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد اس کو محسوس ہوا کہ اس انجن میں کچھ نقایص ہیں جن کو دور کرنے سے کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔ اس عرصے میں اس نے ترقی کی اور ایک دوسری کان میں ملازم ہو گیا جہاں اس کو لارڈ رینسورتھ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ نئے مالک نے جب اسٹیفن سن کے خیالات معلوم کیے تو ضروری رقم فراہم کر دی اور ۱۸۱۴ء میں اس نے اپنی کوششیں شروع کر دیں چنانچہ اس نے مناسب ترمیم اور اضافوں کے ساتھ ریلوے انجن بنایا۔ اب تک یہ گاڑیاں صرف بار برداری کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ یہ اس قدر ہلتی تھیں کہ سوائے کوئلے کے اور کوئی چیز ان میں محفوظ نہیں رہ سکتی تھی، مگر اسٹیفن کے ریلوے انجن میں یہ خرابی نہ تھی۔

انگلستان کے شمال مشرقی حصے میں معاشی حالات میں کچھ ایسا تغیر ہوا کہ وہاں تیز رفتار سواری کی حقیقی طلب پیدا ہو چکی تھی اس لیے یہ خیال پیدا ہوا کہ مشہور تجارتی مقامات اسٹاکٹن اور ڈارلنگٹن کے درمیان ریل گاڑی چلائی جائے۔ ابتدا میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ پارلیمان نے تیز سواریوں پر حدود عاید کر دیے تھے اور بہت سے ارکان نہ تو ریل گاڑی پر اعتماد رکھتے تھے اور نہ اس کو مفید سمجھتے تھے۔ بڑی دقتوں سے جب یہ موانعات دُور کیے گئے تو ۱۸۲۵ء میں ان دونوں تجارتی مقامات میں ریل کی آمد و رفت شروع ہوئی۔

پہلا دن اسٹیفن سن کے لیے عجیب معرکے کا تھا۔ پہلے سے اعلان ہو چکا تھا اس لیے دونوں اسٹیشنوں پر غیر معمولی مجمع تھا، اور درمیان میں بھی دونوں کناروں پر سب لوگ اس نئی ایجاد کے منتظر تھے۔ ایک طرف اطبا اپنی اس رائے کا اظہار کر رہے تھے کہ دس میل سے زیادہ رفتار انسانی اعصاب کے لیے ناقابلِ برداشت ہے تو دوسری طرف عوام کو خواہ مخواہ بھی اس کی ناکامی کا یقین تھا، اور آئے بھی اس غرض سے تھے کہ مضحکہ اڑانے کا ایک اچھا موقع ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے مگر اسٹیفن سن اپنی دُھن کا پکا تھا، اس نے پورے اہتمام کے ساتھ پیش بینی کی اور تمام ضروریات سے لیس ہو کر ٹھیک وقت پر روانہ ہوا۔ کئی ڈبے کوئلے اور آٹے سے بھرے ہوئے تھے اور دو ڈبے مسافروں کے لیے محفوظ تھے۔ نظام العمل کے مطابق صرف ایک جگہ پانی لینے کے لیے ٹھیرنا پڑا۔ اوسط رفتار (۸) میل رہی جو بعض جگہ (۱۲) میل تک پہنچ جاتی تھی۔ اس طرح وقت مقررہ پر سفر ختم ہوا تو سارا ملک ششدر ہو کر رہ گیا۔

موجودہ ریلوے انجن، اسٹیفن سن کے انجن کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے مگر دونوں کے اصول اور عمل ایک ہی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ حالات و ضروریات کے لحاظ سے اس میں کچھ ترمیم اور اضافے ہوئے۔ وزن کے لحاظ سے آج کل کا صرف انجن اسٹیفن سن کی پوری ریل گاڑی کا ہم پلہ ہوتا ہے۔ رفتار کا یہ حال ہو گیا ہے کہ روزانہ اڈنبرا سے لندن تک راست چار سو میل کی دَوڑ برسوں سے جاری ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اسٹیفن کی ایجاد کو سو سال سے زیادہ عرصہ ہوا، اور ایک صدی میں ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے اتنی ترقی کوئی غیر معمولی چیز نہیں سمجھی جانی چاہیئے۔

برق پر قابو حاصل کرنے کے چند ہی سال بعد برقی ریل ایجاد ہوئی جو بعض خصوصیات میں دخانی انجن پر فوقیت رکھتی ہے مگر باوجود اس کے حالات بتا رہے ہیں کہ مستقبل بعید میں بھی دخانی انجن کا ترک کیا جانا ممکن نہیں۔ یہ ایک ایسی خوش وضع، مفید اور مکمل کل ہے جو ہمیشہ اپنے فیوض سے دُنیا کو مستفیض کرتی رہے گی۔

تربان ہم جانتے ہیں کہ بہتے ہوئے پانی میں خاص وضع کا پہیہ رکھا جائے تو پانی کی رَو اس کے چپٹے حصّوں سے ٹکرا کر اس کو گھماتی ہے۔ چنانچہ اس عمل سے پن چکیوں میں کام لیا جاتا رہا ہے۔ سر چارلس پارسنس نے

خیال کیا کہ اگر یہی کام بھاپ سے لیا جا سکے تو بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی۔ دخانی انجن کی پیچیدہ ساخت بہت سے پرزوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی رگڑ کے باعث بہت سی توانائی ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر بھاپ کی ٹکر سے راست دوری حرکت حاصل ہو سکے تو توانائی ضائع ہونے سے بچ رہے گی۔

پارسنس نہ صرف ایک کامیاب انجینیر تھا بلکہ ایک پیدائشی موجد و محقق بھی یعنے فطرتاً وہ صحیح سائنسی تفکر کے لیے خاص موزونیت رکھتا تھا۔ اس کا باپ ارل راس اپنے زمانے کی سب سے بڑی دوربین کا موجد تھا۔ اس طرح بچپن ہی سے وہ تحقیق و ایجاد کی فضا میں پلا۔ پارسنس نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہیں لگائی۔ ۱۸۸۴ء میں جب اس کی عمر صرف (۳۰) سال کی تھی اپنی حسب منشاء تربان بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس کی یہ ایجاد اس کے نظریئے کے عملی پہلو کو واضح کرنے کے لیے کافی تھی مگر عملی دنیا میں اس کو کامیاب بنانے کے لیے ترمیم کی ضرورت ہوئی۔ بدقسمتی سے بعض اختلافات کی وجہ سے پارسنس اپنی کمپنی سے مستعفی ہو گیا۔ سارے حقوق کمپنی اس کے حق میں محفوظ تھے اس لیے پارسنس کو مزید تحقیق کا موقع کئی سال تک نہ مل سکا۔ آخر کار ۱۸۹۱ء میں پہلی مرتبہ تربان ایک جہاز میں استعمال کیا گیا۔ باوجودیکہ تربان کا پہیہ نہایت تیز رفتار تھا مگر جہاز کی رفتار توقع سے بہت کم ثابت ہوئی۔ اس نقص کو رفع کرنے میں (۵) سال سے زیادہ صرف ہوئے اور آخر کار ۱۸۹۷ء میں جب جہازوں کا مقابلہ ہوا تو تربانی جہاز سب سے تیز رفتار ثابت ہوا۔ اس تجربے کے بعد سے اس کا شمار ہمارے بڑے بڑے تیز رفتار جہازوں میں ہونے لگا چنانچہ ۱۹۰۱ء میں برطانیہ کا سب سے بڑا جہاز "وکٹورین" جس میں تربان استعمال کیا گیا تھا پہلی مرتبہ بحر اطلانتک کو عبور کیا۔ "مارٹینیا" نے ۱۹۲۵ء میں نیویارک سے لندن تک کا فاصلہ صرف پانچ دن میں طے کیا۔

تکوین برق تربان کا زیادہ مفید استعمال برق کی پیدائش کے لیے کیا جاتا ہے۔ ہم آیندہ کسی باب میں تفصیل سے معلوم کریں گے کہ کس طرح مقناطیسی میدان میں حرکت سے برقی رَو پیدا ہوتی ہے۔ بڑے پیمانے پر برق پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ حرکت نہایت ہی تیز ہو۔ تربان سے زیادہ تیز رفتار اور کوئی کل نہیں اس لیے برق کی تکوین (پیدائش) کے لیے اس کو استعمال کرتے ہیں۔ شہر حیدرآباد کے محکمہ برقی میں جو تربان استعمال کیا گیا ہے اس کی رفتار تین ہزار فی منٹ یعنے (۵۰) دور فی ثانیہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ رفتار کے تربان بھی بنائے جا چکے ہیں جن سے بڑے بڑے جہازوں میں کام لیا جاتا ہے۔ جدید وضع کے جہاز میں تربان کی حرکت سے راست فایدہ نہیں اٹھایا جاتا بلکہ تربان کی گردش سے ڈائنمو (برق پیدا کرنے والی کلیں) چلائے جاتے ہیں اور اس برقی قوت سے جہاز چلائے جاتے ہیں۔ پی اینڈ او کمپنی کا مشہور اور عظیم الشان جہاز "وائسرائے ہند" اسی قسم کا تربانی برقی جہاز ہے۔ برطانیہ کا عظیم الشان جہاز "ملکہ میری" بھی اسی اصول پر بنایا گیا ہے۔

(۲)

فولاد کا دَور

تمہید زمانۂ گذشتہ کی ایجادات کے اولین نمونے اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے نمایش گاہوں میں محفوظ رکھے گئے ہیں اُسی قسم کی موجودہ کلوں سے مقابلہ کیجیئے تو ان کا بھدا پن مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ اگلے موجدین اور صنّاعوں کو قدیم وضع کے آلوں سے کام لینا پڑتا تھا مثلاً دیہاتی لوہار کے بھدے آلے، کھلی بھٹّی اور بھتّہ، ایرن اور ہتوڑیاں اور خام لوہا جو ملوث ہوتا تھا۔ سلاخوں کو گول بنانے اور پٹریوں میں سُوراخ ڈالنے کے لیے بھی نہایت ہی معمولی درجے کے آلے تھے۔ بگر کلوں کو بڑے بڑے پُرزے تو ڈھالنے ہی پڑتے تھے جن کو لوہار اپنی دستکاری سے آخری صورت بخشتا تھا۔ الغرض ۱۸۲۰ء تک صحیح پیمایش اور پیمایشی آلات تک رسائی حاصل نہ ہوسکی تھی جن کے بدون سائنسی ایجادات وجود میں نہ آسکے۔

سائنسی ایجادات اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ سائنسی ایجادات سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے ایسی ایجادات مراد ہیں جن کو سائنس سے تعلق ہو۔ "سائنس" کے لفظی معنے "علم" کے ہیں، مگر یاد رہے کہ ہر قسم کے علم پر سائنس کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ بے ترتیب معلومات کی ایک بڑی مقدار کو سائنس کہنا درست نہیں اور نہ بڑے بڑے مشکل ناموں سے واقف ہونا سائنس ہے۔ سائنس دراصل صحیح، ٹھیک اور منظم معلومات کا نام ہے۔ اور چونکہ سائنسی معلومات نہایت ٹھیک اور صحیح ہوتے ہیں اس لیے پیمایش میں انتہائی صحت کی ضرورت ہوتی ہے۔

صحیح اور معیاری پیمایش معمولی حالات میں کسی چیز کے طول یا دَور کی پیمایش میں ہمارا پیمانہ تقریبی ہوتا ہے۔ مثلاً مکان کی چھت کے لیے ۱۵ فٹ کی نالیں بنوائی جائیں تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ بالکل ۱۵ ہی فٹ کی ہوں، ایک آدھ انچ کی کمی یا زیادتی کا خیال نہیں کیا جاتا۔ مگر جب کلوں اور مشینوں کے پُرزوں کی تیاری کا سوال ہوتا ہے تو ایسے تقریبی پیمایشات سے کام نہیں چل سکتا۔ ان کے لیے

نہایت صحیح پیمائشات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس زمانے میں جبکہ تقسیم کار کا اصول عملی دُنیا میں مسلّم ہو چکا ہے اور مختلف پُرزے مختلف کارخانوں میں بنائے جاتے ہیں۔ پیمائش میں انتہائی صحت ضروری ہوگئی ہے۔

پہلے یہ حال تھا کہ ہر پیچ اور نٹ پر ایک ہی قسم کے نشان لگا دیے جاتے تھے تاکہ مشین کھولنے کے بعد لگانے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اگر اتفاقاً ایک کھو جاتا تو اس کے ساتھ دوسرا ملنا محال ہوتا۔ ان دقتوں پر غالب آنے کے لیے صحیح پیمائشات کی ضرورت پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں ماڈسلے کا نام بہت اہم ہے کیوں کہ اس نے پہلی مرتبہ ایسے پیچ اور نٹ بنائے جو نہایت صحیح پیمائش کے تھے۔ اس زمانے میں تمام نٹ اور پیچ اس قدر معیاری ہو گئے ہیں کہ ان میں $\frac{1}{10,000}$ انچ سے بھی کم فرق ہوتا ہے۔ برطانوی ہوائی جہاز آر ۱۰۱ کی تعمیر میں صحت پیمائش کا انتہائی کمال ظاہر ہوا۔ اس جہاز کا طول ۷۰۰ فٹ تھا اور اس کا سارا ڈھانچہ کئی میل لمبی فولادی نلیوں پر مشتمل تھا۔ لچکدار فولاد کی سلاخوں کو احتیاط سے جوڑ کر ۴۵ فٹ لمبی نلیاں بنائی گئیں۔ جہاز کارخانے سے کئی میل کے فاصلے پر بنایا جا رہا تھا اور ضرورت تھی کہ ساری نلیاں بالکل ایک ہی ناپ کی ہوں۔ ہزارہا نلیاں بنائی گئیں اور انتہائی صحت و نزاکت کے ساتھ پیمائش کی گئی اور معلوم ہوا کہ انتہائی فرق $\frac{3}{10,000}$ انچ سے بھی کم ہے یعنے ۴۵ فٹ کے طول میں معمولی کارڈ کی موٹائی کے برابر۔

خام مادہ ابتدائی انیسویں صدی میں موجدین اور صنّاع معمولی لوہا استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ فولاد بہت کم یاب اور گراں تھا اس لیے اس کا وسیع استعمال ممکن نہ تھا۔ غور کرنے سے واضح ہوگا کہ حرکت کرنے والی کلوں کے پُرزوں پر جو غیر معمولی بار اور دباؤ پڑتا ہے وہ معمولی لوہے کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی زمانے میں اکثر ریل گاڑی کے پہیئے اور پٹریاں ٹوٹ جانے سے حادثے پیش آئے۔ جہاں ایجادات کے متعلق نئے خیالات پیدا ہوئے وہاں زیادہ پائیدار دھات کی تلاش بھی جاری رہی۔ ان کوششوں کا نتیجہ فولاد کی صنعت کی صورت میں ظاہر ہوا جس نے ساری صنعتی دُنیا میں ایک تازہ روح پھونک دی۔

فولاد ساری تاریخ ایجادات میں فولاد سے زیادہ وسیع استعمال کی کوئی چیز پیش نہیں کی جا سکتی۔ اطراف و اکناف کی مختلف چیزوں پر نظر ڈالنے سے اس کے کثرتِ استعمال کا خود اندازہ

ہو جاتا ہے۔ چھری۔ چاقو سے بندوق اور توپوں تک ایک طویل فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ بسکٹ کے ڈبے جیسی معمولی چیز سے لے کر عظیم الشان جنگی جہاز تک ہزارہا چیزیں فولاد ہی کی رہین منت ہیں۔ ہر طرف فولاد کے بنے ہوئے پل۔ مشینیں۔ نلوے اور ریل گاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ گھڑیال کی بال کمان فولاد ہی کی ہے اور شہر نیویارک میں لارکن کی ایک سو دس منزلہ عمارت بھی فولاد ہی کی بنی ہوئی ہے۔ فولاد کی ہزارہا قسمیں تیار کی گئی ہیں۔ ایک قسم ایسی نرم ہے کہ اس کو صرف دو انگلیوں سے موڑا جا سکتا ہے۔ دوسری انتہائی سخت جس کو کوئی چیز کاٹ نہیں سکتی۔ ایک قسم ایسی کہ اس سے مختلف وضع کی اشیا ڈھالیں۔ ایک ایسی کہ اس کو پیٹ کر پتلی تختیاں بنالیں، اور ایک ایسی جو پتھر سے بھی زیادہ مضبوط اور پائدار رہے۔

یہ عجیب و غریب شئے لوہے سے حاصل کی جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ زمین میں لوہے کا خزانہ پھیلا دیا ہے، جو دنیا کے ہر حصے میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ خام لوہے میں بہت سے لوث ہوتے ہیں، خصوصاً کاربن ضرور شامل ہوتا ہے۔ فولاد بنانے کے لیے پہلے خام لوہے کو تمام لوثوں سے پاک کرنا پڑتا ہے۔ جب خالص لوہا حاصل ہو جائے تو خاص تناسب میں کاربن پھر شریک کرنا پڑتا ہے۔ لوہے کو صاف کرنے کے لیے بلاسٹ بھٹی میں ڈال دیا جاتا ہے جہاں وہ ایک بڑی تپش پر پگھل جاتا ہے اور اس حالت میں اس کو علیحدہ کر کے ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

بھٹی معمولی بھٹی کے ذریعے بلند تپش تک گرم کرنا ممکن نہیں اس لیے بلاسٹ بھٹی (جھکڑ بھٹی) ایجاد کی گئی۔ یہ بھٹی بھی جدید ایجادات کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ آبادی سے بہت دور بڑے بڑے فولادی مینار ہوتے ہیں جن میں سے دن بھر دھواں نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور جو شب کو آتش فشاں پہاڑ کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔ ٹرالیوں کے ذریعے خام لوہا مینار کے اوپری حصے میں ڈالا جاتا ہے۔ اندر کی بے پناہ تپش اس لوہے کو سرخ و سیال بنا دیتی ہے۔ صاف لوہے کا یہ بہتا ہوا دریا بڑے بڑے خانوں میں جا گرتا ہے اور ٹھنڈا ہو کر منجمد ہو جاتا ہے۔ اس طرح حاصل کیا ہوا خالص لوہا نرم ہوتا ہے۔ اس میں بہ لحاظ ضرورت سختی پیدا کرنے کے لیے کاربن کی آمیزش ضروری ہے۔ لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر چاروں طرف خالص کاربن کی تہ جما دی جاتی ہے اور یہ سب ایک خاص قسم کی بھٹی میں رکھے جاتے ہیں جہاں ایک ہفتے تک ان کو ایک ایسی خاص تپش پر رکھا جاتا ہے کہ لوہا پگھلنے نہیں پاتا بلکہ کاربن سے اس کی آمیزش ہو جاتی ہے اور سطح پر آبلے سے نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے یہ آبلہ دار فولاد کہلاتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ لوہا پگھلتا نہیں پھر بھی کاربن کو جذب

کرلیتا ہے مگر یہ انجذاب متجانس نہیں ہوتا سطح کے قریب کے حصّے میں کاربن کی زیادہ مقدار جذب ہوتی ہے اور اندرونی حصّے میں بہت کم ایک ہی قسم کا متجانس فولاد تیار کرنے کے لیے اس پر اور کئی عمل کرنے پڑتے ہیں۔ ان عملوں کے دوران میں مختلف قسم کے فولاد کے لیے مختلف دھاتیں شریک کی جاتی ہیں تاکہ ضروری خاصیت پیدا ہو جائے۔ تجربوں سے معلوم کیا گیا کہ کم یاب دھاتیں مثلاً کرومیم۔ ٹنگسٹن۔ نکل۔ الیومنیم وغیرہ فولاد میں مخصوص خاصیتیں پیدا کرتی ہیں اس طرح فولاد کی صدہا قسمیں وجود میں آئیں۔

مذکورۂ بالا پیچیدہ طریقے سے جو فولاد تیار ہوتا تھا وہ دُنیا کی بڑھتی ہوئی ضرریات کے لیے بالکل ناکافی تھا سر ہنری بے سیمر نے ایک نیا طریقہ معلوم کیا جس کی وجہ سے ہر سال (۱۰) کروڑ ٹن فولاد تیار ہوتا ہے۔ اس انکشاف کی وجہ سے صنعتی دُنیا میں ایک نیا انقلاب ہوا اور جدید فولادی دَور شروع ہوا جس سے فولاد کے وسیع استعمال سے ہماری زندگی کے مختلف شعبے متاثر ہوئے۔

بے سیمر کا باپ ایک فرانسیسی حُسن کار تھا جو انگلستان میں مقیم ہو گیا تھا۔ نپولین نے فرانس میں اعلان کیا کہ بندوق کے لیے عمدہ لوہے یا فولاد کی ایجاد کرنے والے کو وہ ایک بیش بہا انعام دے گا۔ اس زمانے میں بندوقوں اور توپوں کے لیے جو دھات استعمال ہوتی تھی وہ اس قدر کمزور اور ناقابلِ اعتماد ہوتی تھی کہ بعض اوقات بندوقیں اور توپیں پھٹ کر جانی نقصان کا باعث ہوتی تھیں۔ نپولین چاہتا تھا کہ بہتر دھات ایجاد کی جائے تاکہ وہ اپنی فوج کشی زیادہ سہولت کے ساتھ جاری رکھ سکے۔ دراصل اس کا اعلان ہی بے سیمر کو اس ایجاد کی طرف مائل کیا۔ ابتداء میں اس نے ایک فولادی بندوق تیار کی اور فرانس جا کر نپولین کے نذر کی۔ شہنشاہ نے اس کے لیے ایک کارخانہ قائم کرنے میں مدد دی جہاں بے سیمر نے بڑے پیمانے پر فولاد تیار کرنے کے لیے کئی تجربے کیے۔

بعض ایجادات محض حُسنِ اتفاق سے وجود میں آئے چنانچہ بے سیمر کی ایجاد بھی اس کی ایک مثال ہے۔ بے سیمر کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ خام لوہے کو خوب گرم کیا جائے اور اس میں گرم ہوا کی رَو گذاری جائے تو ممکن ہے کہ لوہے کے لوث اس گرم ہَوا سے جل جائیں اور خالص لوہا حاصل ہو۔ پھر اس میں حسب ضرورت کاربن ملا کر عمدہ قسم کی فولاد حاصل کی جا سکتی ہے۔ ۱۸۵۵ئ میں بے سیمر نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کامیابی حاصل کی، چند ہی دنوں میں وہ بڑے پیمانے پر عمدہ فولاد تیار کرنے لگا حُسنِ اتفاق سے اس نے جو خام لوہا خریدا وہ بھی اس تجربے کے لیے خاص طور پر موزوں ثابت ہوا۔ اس زمانے میں دھاتوں کا علم

اس قدر باقاعدہ نہ تھا اس وجہ سے خام لوہے کے مختلف نمونوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر بے سیمر کو یہ خاص قسم کا خام لوہا حُسنِ اتفاق سے نہ ملتا تو معمولی خام لوہے سے اس کو مایوس ہونا پڑتا کیوں کہ اُس پر یہ عمل کارگر نہیں ہوتا۔

۱۸۵۶ء میں بے سیمر نے اپنے طریقے کو رجسٹر کروالیا۔ یورپ کے پانچ بڑے بڑے کارخانوں کے مالکوں نے ایک ایک لاکھ روپیہ دے کر بے سیمری طریقے سے فولاد بنانے کی اجازت حاصل کی اس طرح بے سیمر کا شمار ان چند سائنسی موجدوں میں ہونے لگا جن کے لیے اپنی ایجاد سے عینِ حیات دولت اور شہرت پانا مقدر کیا گیا تھا۔

دو ماہ بعد ہی بے سیمر کو کارخانوں سے خطوط وصول ہوئے کہ اس کے طریقے سے جو فولاد تیار کیا گیا وہ محض بے کار ہے۔ یہ بہت پریشان ہو کر وہاں پہنچا اور دیکھا کہ نہایت ہی ناقص فولاد کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے پاس کا خام لوہا منگوایا اور ان سب کے سامنے فولاد تیار کیا، یہ نہایت ہی اچھا اور مضبوط نمونہ تھا۔ اب بے سیمر کو یقین ہو گیا کہ خام لوہے کی قسمیں بھی مختلف ہوتی ہیں کیمیا دانوں کی مدد سے اس نے معلوم کیا کہ عام طور پر جو خام لوہا ملتا ہے اس میں فاسفورس اور گندک بھی خفیف سی مقدار میں موجود ہوتے ہیں اور ان لوثوں کے باعث عمدہ فولاد نہیں بن سکتا۔ اس کے پاس جو خام لوہا آگیا تھا وہ اتفاق سے ان دونوں لوثوں سے پاک تھا اس وجہ سے اس کو کامیابی ہوئی۔ کیمیا دانوں کی مدد سے اس نے خام لوہے سے فاسفورس اور گندک دُور کرنے کا طریقہ معلوم کیا اور اس طرح اس کی تحقیقات مکمل ہوئی۔

دو سال بعد ان کارخانوں میں فولاد کی غیر معمولی مقدار تیار ہونے لگی۔ صنعتی دنیا میں اس دیرپا اور مضبوط مادھات کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ بجائے معمولی لوہے کے فولاد کا استعمال وسیع طور پر ہونے لگا۔ ریل کی پٹریاں اور انجن وغیرہ فولاد ہی کے بنائے جانے لگے اگرچہ کہ اس کی قیمت معمولی لوہے کی بہ نسبت دوگنی تھی، مگر دیرپا اور مضبوط ہونے میں یہ دس گنا بہتر ثابت ہوئی جب مانگ کروڑہا ٹن تک بڑھ گئی تو کئی بڑے بڑے کارخانے کھولنے پڑے۔ بے سیمر نے صنعتی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا جس کی وجہ سے اس کا نام صنعتی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہیگا بے سیمر ان چند خوش نصیب موجدوں میں سے تھا جن کی قدر ان کی زندگی ہی میں کی گئی۔ اس نے اپنی ایجاد کے صلہ میں ایک کروڑ روپے پائے۔

بے سیمر نے یہ ایجاد ۱۸۵۶ء میں پیش کی تھی اس طریقے کے مطابق یہ ضروری تھا کہ خام لوہا

فاسفورس اور گندک سے بالکل پاک ہوئیں خام لوہے کی غیر معمولی مقدار جس میں فاسفورس اور گندک کے لوث پائے جاتے تھے اب تک بے مصرف تھے۔ سنہ ۱۸۷۸ء میں طامس اور گلکرسٹ نے ایک ایسی ترمیم پیش کی جس کے باعث غیر خالص خام لوہا بھی فولاد بنانے کے کام آنے لگا۔ بھٹی کی دیواروں پر ایک خاص قسم کی مٹی کا دل لیپ دیا جاتا تھا۔ خام لوہے کا فاسفورس اور گندک اس سے ترکیب کھا جاتے اور لوہا ان سے پاک ہو جاتا تھا۔ فاسفورس اور گندک کے مرکبات علیحدہ کر لئے جاتے تھے جو بطور کھاد کے بہت مفید ثابت ہوئے۔

صنعت فولاد کی ترقی کے سلسلے میں کارل سیمنس کا کام بہت مفید ثابت ہوا۔ یہ جرمنی باشندہ انگلستان میں آکر بس گیا تھا۔ اس کے کارنامے صنعت کے مختلف شعبوں میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ حرارت اور فلزیات میں اس نے جو تجربے کئے اس کے نتائج آج تک رہبری کرتے ہیں۔ وہ برقیات کا بھی ماہر تھا۔ چنانچہ سمندر میں تار کیبل بچھانے کے کام کی ابتدا اسی نے کی تھی۔ اس نے برقی تپش پیما بھی ایجاد کیا۔ اس کا سب سے اہم کارنامہ "باز آتشیں بھٹی" کی ایجاد تھی۔ ان ایجادات کے صلہ میں اس کو شاہ انگلستان نے سنہ ۱۸۸۳ء میں "سر" کا خطاب عطا فرمایا۔

"باز آتشیں بھٹی" میں کئی چھوٹی بھٹیوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ درمیانی بھٹی گرم گیسوں کو اطراف میں پھیلاتی ہے۔ پھر یہ گیس ادھر سے ادھر اس طریقے سے متحرک کی جاتی ہیں کہ ان کے اثر سے بہت بلند تپش حاصل ہوتی ہے۔ اس ایجاد سے ایک ایسا طریقہ ہاتھ آیا جس کی مدد سے بعض ایسی دھاتیں پگھلائی جانے لگیں جو ناقابل گداخت سمجھی جاتی تھیں۔ اگرچہ سیمنس نے تو اس طریقے کو شیشہ سازی کی صنعت کے لئے استعمال کیا تھا مگر یہ اس قدر مفید ثابت ہوا کہ فولاد سازی کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔

صنعتی کارخانوں میں بعض ناکارہ چیزیں جمع ہو جاتی ہیں۔ سائنس دانوں کے لئے یہ مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے کہ ان ناکارہ چیزوں کا کوئی مصرف تلاش کریں۔ ان دنوں میں بے سیمبری کارخانوں میں فولاد کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور باریک ریزوں کے انبار لگ گئے تھے۔ سب پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ اس ناکارہ مادے سے کسی طرح چھٹکارا مل جائے۔ جب سیمنس کی بھٹی ایجاد ہوئی تو اس کی تپش بے سیمبری فولاد کو پگھلانے کے لئے بھی کافی ثابت ہوئی۔ اس طرح یہ بے کار انبار مفید دھات کی شکل میں منتقل ہو گئے۔ (باقی)

موضع دو پلی کی معاشی تحقیق

از

جناب محمد ناصر علی صاحب۔ ایم۔اے (عثمانیہ)

مقدمہ

موضع دُوپلی تعلقہ بودھن ضلع نظام آباد صوبہ میدک سمت تلنگانہ ایک قدیم آبادی ہے۔ اس کی قدامت کا اندازہ ہیں ان برجوں سے ہوسکتا ہے جو اس وقت منہدم[1] صورت میں وہاں موجود ہیں۔ یہ موضع مستقر بودھن اور ضلع نظام آباد کے تقریباً درمیان واقع ہے۔ ہر دو مقامات سے اس کی مسافت تقریباً (۹) میل ہے بس اسٹیج پوچارم سے اس کا فاصلہ تقریباً (۲) میل ہے۔

اس موضع کے شمال میں موضع کلیاپور۔ جنوب میں پوچارم و جھنیاپور۔ مشرق میں جانکم پیٹھ واباپور اور مغرب میں رنجل و برہمن پلی واقع ہیں۔

اس کا جملہ رقبہ (۳۰۲۵) مربع میل ہے۔ ۲۱ف دم اکتوبر ۱۹۴۷ء کی مردم شماری[2] کے مطابق یہاں کی آبادی (۱۱۵۴) نفوس پر مشتمل ہے۔

آئندہ فصلوں میں ہم موضع ہذا کے معاشی حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بتائینگے کہ یہاں کے باشندے کس معیار پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر معیار زندگی ادنیٰ ہے تو یہ دریافت کرینگے کہ آخر اس ادنیٰ معیار کے کیا وجوہ ہیں۔ بعدازاں ان تدابیر پر غور کرینگے جن کے ذریعہ موجودہ معیار زندگی کو بلند کیا جاسکتا ہے۔ گویا موجودہ مقالہ کا اصلی مقصد باشندگان موضع دوپلی کے ادنیٰ معیار زندگی کا مطالعہ کرنا، اس کے وجوہ معلوم کرنا، اور اس کو بلند کرنے کے لئے موزوں و مناسب تدابیر پیش کرنا ہے۔

---

[1] دیکھئے تصویر ۱ دُوپلی کا ایک منہدم برج۔

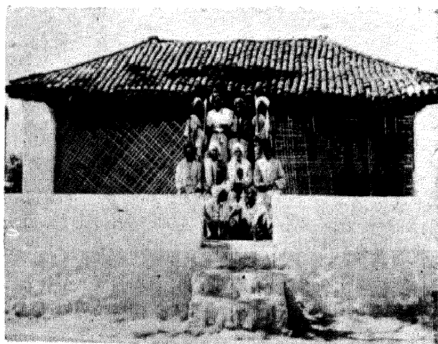
[2] مردم شماری بذات خود کیگئی ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر آئندہ فصل میں ہم مسئلہ آبادی (جس کو نہ صرف موضع ہذا بلکہ تمام ہندوستان میں نمایاں اہمیت حاصل ہے) کا مختلف نقاط نظر سے مطالعہ کرینگے۔ جس سے اگر ایک طرف ہمارا اصلی مقصد پورا ہوگا تو دوسری طرف موضع ہذا کی آبادی سے متعلق دیگر ضروری امور کی تشریح بھی ہو جائیگی۔



(۱) موضع دو پلی کا ایک منہدم برج





(۲) موضع دو پلی کی چاوڑی

پہلی فصل

زرعی آبادی[1]

سنہ ۱۳۲۳ف تا سنہ ۱۳۲۹ف مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء تا اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء

۱۔ تاریخی پہلو | موضع ڈوپلی کی آبادی سے متعلق ہمیں سب سے پہلے اعداد سنہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء) سے ملتے ہیں۔ اس سال موضع کی جملہ آبادی (۱۰۳۲) بتلائی گئی ہے لیکن چھ سال بعد یعنے سنہ ۱۳۲۹ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) میں آبادی میں غیر معمولی تخفیف ہوگئی، اور وہ (۱۰۳۲) سے گھٹ کر (۸۸۷) ہوگئی۔ بالفاظ دیگر سنہ ۱۳۲۳ف (م ۱۴؍ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء) کے مقابل سنہ ۱۳۲۹ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) میں (۱۴۵) یا ۱۴ فیصد کی کمی ہوئی۔

اس تخفیف کی اہم وجہ سنہ ۱۳۲۷ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء) سنہ ۱۳۲۸ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) اور سنہ ۱۳۲۹ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) کی قحط سالی تھی۔ قلت خوراک کی وجہ سے اگر ایک طرف شرح پیدائش میں نسبتاً تخفیف ہوگئی تو دوسری طرف شرح اموات میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ زیر بحث چھ سالوں میں بحیثیت مجموعی (۵۴) نفوس پیدا ہوئے اور (۱۲۵) نفوس فوت ہوئے[2]۔ آبادی میں اگر ایک طرف شرح پیدائش کے مقابل

---

[1] موضع ہذا میں ۹۵،۴ فیصد افراد کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ جزاً یا کلاً زراعت سے ہے لہذا اس فصل کا عنوان زرعی آبادی رکھا گیا ہے۔

[2] حالانکہ سنہ ۱۳۴۱ف تا سنہ ۱۳۴۸ف کے معمولی سالوں میں بحیثیت مجموعی ۹۸ نفوس پیدا ہوئے اور ۶۲ نفوس فوت ہوئے۔

رمی آبادی شرح اموات کی زیادتی کی وجہ سے تخفیف ہوئی تو دوسری طرف توطن داخلی کے مقابل توطن خارجی (گو عارضی ہی) کی زیادتی کی بنا، پر کمی ہوئی۔ قلت غذا سے مجبور ہو کر باشندگان موضع کی ایک کثیر تعداد نے تلاش معاش کے لئے ترک مقام کیا۔ لہٰذا متذکرہ دو مخالف اسباب کی بنا، پر آبادی میں سرعت کے ساتھ تخفیف شروع ہوئی اور وہ ۱۳۲۳ف (م کٹوبر ۱۴-۱۹۱۳ء) کے مقابل ۱۳۲۹ف (م اکٹوبر ۲۰-۱۹۱۹ء) میں ۱۴ فیصد گھٹ گئی۔

۱۳۲۹ف تا ۱۳۴۰ف مطابق اکٹوبر ۲۰-۱۹۱۹ء تا اکٹوبر ۳۱-۱۹۳۰ء

۱۳۲۹ف (م ۲۰-۱۹۱۹ء) کے اختتام پر قحط سالی کے اثرات زائل ہونے لگے اور وہ افراد جو قحط سالی کے زمانہ میں فکر معاش کی خاطر ترک مقام کئے تھے، واپس ہونا شروع ہوئے۔ نتیجتہً آبادی میں پھر اضافہ ہوگیا چنانچہ ۱۳۳۰ف (م اکٹوبر ۲۱-۱۹۲۰ء) کی مردم شماری کے وقت یہاں کی جملہ آبادی (۹۰۷) تھی۔ لیکن جب ۱۳۴۰ف (م اکٹوبر ۳۱-۱۹۳۰ء) میں دوبارہ مردم شماری کی گئی تو اس وقت تک جملہ آبادی ۱۳۳۰ف (م اکٹوبر ۲۱-۱۹۲۰ء) کے مقابل (۹۰۷) سے بڑھ کر (۱۲۸۰) ہوگئی گویا آبادی میں تقریباً (۴۱) فیصد کا اضافہ ہوا لیکن یہ حقیقی اضافہ نہ تھا۔

مقدمان دیہی کا بیان ہے کہ آبادی میں اس غیر معمولی اضافہ کی اہم وجہ یہ تھی کہ ۱۳۴۰ف (م اکٹوبر ۳۱-۱۹۳۰ء) کی مردم شماری کے وقت نہر نظام ساگر کی تعمیر کا کام جاری تھا، اور اس کے سلسلہ میں وڈروں (مزدور پیشہ افراد کی ایک ذات) کی ایک کثیر تعداد موضع کی سواد میں مقیم تھی۔ لہٰذا ان تمام وڈروں کا شمار موضع ہٰذا کی آبادی میں کر لیا گیا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت وڈروں کی کوئی (۸۰) جھونپڑیاں تھیں۔ اگر ہم فی جھونپڑی ۵ نفوس فرض کریں تو منجملہ (۱۲۸۰) نفوس کے (۴۰۰) کی آبادی وڈروں پر مشتمل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس کا تعلق موضع کی حقیقی آبادی سے نہیں۔ اس مفروضہ کے تحت ۱۳۴۰ف (م اکٹوبر ۳۱-۱۹۳۰ء) میں موضع کی حقیقی آبادی (کم و بیش) ۸۴۰ تھی۔ اس لحاظ سے ۱۳۳۰ف (م اکٹوبر ۲۱-۱۹۲۰ء) کے مقابل ۱۳۴۰ف (م اکٹوبر ۳۱-۱۹۳۰ء) میں ۴۱ فیصد کے بجائے ۷ فیصد کا اضافہ ہوا۔

۱۳۴۰ف تا ۱۳۴۷ف مطابق اکٹوبر ۳۱-۱۹۳۰ء تا اکٹوبر ۳۸-۱۹۳۷ء

اگر ہم ۱۳۴۰ف (م اکٹوبر ۳۱-۱۹۳۰ء) کے اعداد کا مقابلہ ۱۳۴۷ف کے اعداد سے کریں تو

زرعی آبادی

آبادی میں مزید اضافہ نظر آتا ہے۔ سنہ ۱۳۴۷ف (م اکٹوبر سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء) کی مردم شماری کے مطابق موضع کی جملہ آبادی (۱۱۵۴) ہے۔ اس طرح سنہ ۱۳۴۰ف (م اکٹوبر سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء) کے مقابل موجودہ آبادی میں ۱۱۴ نفوس یا ۱۱ فیصد کا اضافہ ہوجاتا ہے۔

اس اضافہ کے دو وجوہ ہیں۔ پہلا شرح اموات کے مقابل شرح پیدائش کی زیادتی۔ دوسرے توطن خارجی کے مقابل توطن داخلی کی زیادتی۔ جہانتک کہ اموات و پیدائش کے اعداد کا تعلق ہے وہ حسب ذیل ہیں :۔

سنہ فصلی	سنہ عیسوی	پیدا شدہ	فوت شدہ	اضافہ (+) یا تخفیف (-)
۱۳۴۱	اکٹوبر ۱۹۳۱-۳۲	۸	۱۲	-۴
۱۳۴۲	〃 ۱۹۳۲-۳۳	۵	۲	+۳
۱۳۴۳	〃 ۱۹۳۳-۳۴	۹	۷	+۲
۱۳۴۴	〃 ۱۹۳۴-۳۵	۲۰	۲	+۱۸
۱۳۴۵	〃 ۱۹۳۵-۳۶	۱۰	۶	+۴
۱۳۴۶	〃 ۱۹۳۶-۳۷	۳۰	۹	+۲۱
۱۳۴۷	〃 ۱۹۳۷-۳۸	۱۶	۲۴	-۸
جملہ		۹۸	۶۲	+۳۶

مندرجہ بالا اعداد کے دیکھنے سے واضح ہے کہ سوائے سنہ ۱۳۴۱ف (م اکٹوبر سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء) و سنہ ۱۳۴۷ف (م اکٹوبر سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء) کے باقی تمام سالوں میں شرح پیدائش، شرح اموات سے کچھ نہ کچھ بڑھی رہی خصوصاً سنہ ۱۳۴۴ف و سنہ ۱۳۴۶ف (م اکٹوبر سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء، اکٹوبر سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء) میں شرح اموات کے مقابل شرح پیدائش میں غیر معمولی زیادتی کی وجہ سے علی الترتیب (۱۸) اور (۲۱) نفوس کا اضافہ ہوا۔ بحیثیت مجموعی گذشتہ سات سالوں میں جملہ ۹۸ نفوس پیدا ہوئے اور ۶۲ نفوس فوت ہوئے۔ اس طرح شرح اموات کے مقابل شرح پیدائش کی زیادتی کی وجہ سے جملہ ۳۶ نفوس یا ۳ فیصد سے کچھ زاید اضافہ ہوا لیکن اب یہ دیکھنا ہے کہ توطن خارجی کے مقابل توطن داخلی کی وجہ سے کس قدر زیادتی ہوئی۔

توطن داخلی وخارجی سے متعلق ہمیں کسی قسم کے اعداد نہیں ملتے، لہذا اس وقت کو رفع کرنے کے لئے

زری آبادی ہر بزرگ خاندان سے یہ دریافت کیا گیا کہ گذشتہ سات سالوں میں کتنے افراد ان کے مکان سے دیگر بیرونی مقامات کو مستقلاً منتقل ہوئے۔ اس منتقلی کی کیا وجہ تھی۔ اسی طرح یہ بھی دریافت کیا گیا کہ گذشتہ سات سالوں میں کتنے افراد دیگر بیرونی مقامات سے ان کے مکان کو دائماً منتقل ہوئے۔ اس منتقلی کی کیا وجہ تھی۔

مذکورہ سوالات کی بناء پر گذشتہ سات سالوں میں توطن داخلی وخارجی کے متعلق ہمیں حسب ذیل معلومات فراہم ہوئے:-

۱۔ وہ افراد جو موضع ہذا سے گذشتہ سات سالوں میں تلاش معاش کی خاطر دیگر بیرونی مقامات کو مستقلاً منتقل ہوئے .... (۴)

۲۔ وہ افراد جو موضع ہذا سے گذشتہ سات سالوں میں شادی بیاہ کی وجہ سے دیگر بیرونی مقامات کو مستقلاً منتقل ہوئے .... (۲۸)

جملہ منتقل شدہ افراد .... (۳۲)

۱۔ وہ افراد جو گذشتہ سات سالوں میں تلاش معاش کی خاطر دیگر بیرونی مقامات سے آکر موضع ہذا میں مستقلاً قیام پذیر ہوئے .... (۳۸)

۲۔ وہ افراد جو گذشتہ سات سالوں میں شادی بیاہ کی وجہ سے دیگر بیرونی مقامات سے آکر موضع ہذا میں مستقلاً مقیم ہوئے .... (۳۵)

جملہ واردین .... (۷۳)

مندرجہ صدر تشریح سے ظاہر ہو رہا ہے کہ گذشتہ سات سالوں میں توطن خارجی کے مقابل توطن داخلی کی زیادتی (۷۳-۳۲) کی وجہ سے ۱۳۴۰ف (م ۳۱-۱۹۳۰ء) کے مقابل موضع ہذا کی موجودہ آبادی میں ۴۱ یا تقریباً ۴ فیصد (نفوس) کی زیادتی ہوئی۔

بحیثیت مجموعی شرح پیدائش و شرح اموات، توطن داخلی و توطن خارجی کے باہمی فرق کی بناء پر (۳۶+۴۱) ۷۷ یا (۳+۴) ۷ فیصد کی زیادتی ہوئی لیکن فی نفسہ اضافہ ۱۴۴ نفوس یا تقریباً ۱۱ فیصد کا ہے۔ گویا مزید ۶۷ افراد یا تقریباً ۴ فیصد اضافہ کے وجوہ دریافت طلب ہیں۔ اس اضافہ کو ہم اضافہ بوجہ نامعلوم قرار دے سکتے ہیں اس لئے کہ اس کے کوئی وجوہ معلوم نہ ہو سکے۔

زرعی آبادی

یہانتک تو ہم نے یہ معلوم کیا کہ سنہ ۱۳۴۰ف (م اکتوبر ۱۹۳۰-۳۱ء) کے مقابل سنہ ۱۳۴۷ف (م اکتوبر ۱۹۳۷-۳۸ء) میں آبادی میں جو اضافہ ہوا اس کے کیا وجوہ تھے لیکن اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی سنہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) کے مقابل موجودہ آبادی کس قدر زاید ہے۔ واضح رہے کہ سنہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) میں جملہ آبادی (۱۰۳۲) تھی۔ لیکن اب (۱۱۵۴) ہوگئی ہے۔ گویا گذشتہ ۲۴ سال میں (۱۱۵۴-۱۰۳۲) ۱۲۲ نفوس یا ۱۱٫۸۲ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ بالفاظ دیگر فی سال اوسطاً ۵٫۰۸ نفوس کی زیادتی ہوئی۔ اس ادنیٰ رفتار اضافہ کی اہم وجہ سنہ ۱۳۴۰ف (م اکتوبر ۱۹۳۰-۳۱ء) اور اس سے قبل کے قحط سالیاں اور وبائیں ہیں جب کہ نہ صرف شرح پیدائش کے مقابل شرح اموات بالعموم غیر معمولی طور پر بڑھی رہتی تھی بلکہ توطن داخلی کے مقابل توطن خارجی (گو عارضی سہی) زیادہ ہوتا تھا۔ اور یہ دونوں اثرات سرعت کے ساتھ آبادی کو گھٹا دیتے تھے۔ اعلیٰ شرح پیدائش کی وجہ سے اگر آبادی میں اضافہ کا امکان ہوتا ہے تو اعلیٰ شرح اموات کی بدولت یہ امکان بالعموم تقریباً معدوم ہوتا رہتا ہے، لہٰذا آبادی کا حقیقی اضافہ موثر طور پر رونما نہیں ہونے پاتا۔ نتیجہ یہ کہ آبادی کی رفتار ترقی بہت سُست رہتی ہے[۱]۔

۲۔ موجودہ نوعیت

آبادی کے تاریخی پہلو پر روشنی ڈالنے کے بعد اب ہم اس کی موجودہ نوعیت معلوم کرینگے۔

تقسیم آبادی بلحاظ مذہب:۔ موضع ہذا میں جملہ چار مذہب کے لوگ آباد ہیں:۔ ۱۔ ہندو، ۲۔ اچھوت، ۳۔ مسلمان، ۴۔ عیسائی۔ ان مذاہب کے خاندانوں اور افراد کی تقسیم حسب ذیل ہے:۔

تفصیل مذہب	تعداد خاندان	فیصد	تعداد نفوس	فیصد
۱۔ ہندو	۱۷۳	۷۰٫۳	۸۴۷	۷۳٫۴
۲۔ اچھوت	۶۵	۲۶٫۴	۲۶۷	۲۳٫۱
۳۔ مسلمان	۷	۲٫۹	۳۶	۳٫۱
۴۔ عیسائی	۱	۰٫۴	۴	۰٫۴
جملہ	۲۴۶	۱۰۰٫۰	۱۱۵۴	۱۰۰٫۰

[۱] سنہ ۱۳۲۳ف (م سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء) کے مقابل موجودہ آبادی میں جس قدر زیادتی ہوئی وہ بیشتر سنہ ۱۳۴۰ف (سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء) کے بعد عمل میں آئی ہے ورنہ اس سے قبل بالعموم شرح پیدائش شرح اموات سے بڑھی ہوئی رہتی تھی۔

مذہبی آبادی

مندرجہ صدر اعداد سے ظاہر ہے کہ بلحاظ خاندان اور بلحاظ افراد ہندو مذہب کے لوگ سب سے زیادہ ہیں۔ واضح رہے کہ ہندو مذہب میں مختلف فرقوں :- کولی، دھنگر، جلاہے، موٹرواڑ، بھوئی، دیمرواڑ، دھوبی، حجام، برہمن، کومٹی، بڑھئی، سنار، لوہار، کلال، درزی، منوروار، ایاوار، بڑوڑ، اور کمار کے شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر فرقے ایک دوسرے کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاتے۔ خصوصاً برہمن کسی کے ہاتھ کی پکی ہوئی غذا نہیں استعمال کرتے۔ البتہ برہمنوں کی دی ہوئی غذا سب لوگ استعمال کرتے ہیں۔

اچھوت افراد میں دھیڑ اور مانگ شامل ہیں۔ سماجی نکتہ نظر سے مانگوں کو سب سے ادنیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ برعکس اس کے دھیڑوں کا رتبہ مانگوں سے بہتر ہے۔ لیکن جہاں تک کہ چھوت کا مسئلہ ہے ان دونوں فرقوں کو بالکل علٰحدہ رکھا جاتا ہے۔

تقسیم آبادی بلحاظ جنس :- بلحاظ جنس آبادی کو دو طرح پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مذکر اور مونث۔ (۱۱۵۴) افراد میں سے (۵۶۷) ذکور، اور (۵۸۷) اناث ہیں۔ گویا فی ہزار ذکور، اناث کی تعداد (۱۰۳۵) ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد میں بعض اہم فرقوں میں ذکور و اناث کی تعداد دیگئی ہے۔ نیز یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ ہر فرقے میں ذکور اور اناث کا کیا تناسب ہے :-

نام فرقہ	جملہ تعداد نفوس	ذکور	اناث	فی ہزار ذکور واناث کی تعداد
دھیڑ	۱۸۲	۸۴	۹۸	۱۱۶۷
کولی	۱۵۶	۸۰	۷۶	۹۸۰
دھنگر	۱۱۵	۵۵	۶۰	۱۰۹۱
جلاہے	۹۸	۵۱	۴۷	۹۲۳
موٹرواڑ	۱۰۱	۵۰	۵۱	۱۰۲۰
بھوئی	۹۰	۴۴	۴۶	۱۰۴۶
مانگ	۷۹	۳۹	۴۰	۱۰۲۶
دیمرواڑ	۸۴	۳۹	۴۵	۱۱۵۴
دھوبی	۴۴	۲۸	۱۶	۵۷۱

زرعی آبادی

حجام	۳۲	۱۴	۱۸	۱۲۸۵
منفرق[له]	۱۷۳	۸۳	۹۰	۱۰۸۴

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ سوائے چند فرقوں کے باقی تمام فرقوں میں ذکور کے مقابل اناث کی تعداد زیادہ ہے۔ لیکن جب ہم عمر کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہر دو کا باہمی تناسب بتدریج گھٹتا جاتا ہے۔ (جوں جوں عمر کے مدارج بڑھتے جاتے ہیں) چنانچہ ذیل کے اعداد سے اس بیان کی تشریح ہوتی ہے:۔

سال	ذکور	اناث	فی ہزار ذکور، اناث کی تعداد
۰ تا ۵	۶۶	۷۲	۱۰۹۲
۵ تا ۱۰	۶۹	۷۸	۱۱۳۰
۱۰ تا ۱۵	۵۹	۵۵	۹۳۲
۱۵ تا ۲۰	۴۴	۴۴	۱۰۰۰
۲۰ تا ۲۵	۳۲	۵۷	۱۷۸۱
۲۵ تا ۳۰	۸۰	۹۷	۱۲۸۱
۳۰ تا ۳۵	۵۳	۵۴	۱۰۱۹
۳۵ تا ۴۰	۴۶	۲۵	۵۴۴
۴۰ تا ۴۵	۴۸	۴۳	۸۹۶
۴۵ تا ۵۰	۳۱	۱۱	۳۵۵
۵۰ تا ۶۰	۲۶	۲۶	۱۰۰۰
۶۰ تا ۷۰	۱۱	۱۴	۱۲۷۳
۷۰ تا ۸۰	۲	۱۱	۵۵۰۰

مندرجہ صدر اعداد سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ۲۰ تا ۲۵ سال کے بعد سے ۵۰ تا ۶۰ سال فی ہزار مرد کے مقابل عورتوں کی تعداد بالعموم گھٹتی جاتی ہے۔ ۲۰، اور ۲۵ سال کے درمیان فی ہزار مرد

له منفرق فرقوں میں مسلمان۔ عیسائی۔ برہمن۔ کومٹی۔ کلال۔ سنار۔ درزی وغیرہ شامل ہیں۔

لدیٰ آبادی

عورتوں کی تعداد ۱۸۱۷ ہے لیکن ۲۵ ، اور ۳۰ سال کے درمیان یہ تعداد گھٹ کر ۱۲۸۱ ہوجاتی ہے۔ خصوصاً ۳۵ ، اور ۴۰ سال کے درمیان فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی کمی ہوجاتی ہے اور اب وہ صرف ۵۴۴ رہ جاتی ہے۔ ۴۵ تا ۵۰ سال کے درمیان اس تعداد کا تناسب بہت ہی کم ہوجاتا ہے یعنے یہ کہ فی ہزار مرد، عورتوں کی تعداد صرف ۲۵۵ رہتی ہے۔

اس تخفیف کی اہم وجہ یہ ہے کہ آغاز شباب (۱۲ تا ۱۴ سال) کے بعد سے موضع ہذا کی عورتوں کو مختلف تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے چونکہ عام طور پر بچپن ہی میں شادی ہوجاتی ہے، لہٰذا آغاز شباب کے ساتھ ہی زن وشوہر میں ازدواجی تعلقات قائم ہوجاتے ہیں نتیجتاً نہ صرف مرد کمسنی میں باپ بن جاتے ہیں بلکہ عورتوں کو بھی کمسنی میں (۱۴ تا ۲۰ سال) ماں کا رتبہ ملجاتا ہے جلد جلد زچگیوں کی وجہ سے عورتوں کے قویٰ سرعت کے ساتھ مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ ایک طرف تو انھیں دودھ پلانا پڑتا ہے اور دوسری طرف تمام دن محنت شاقہ کرنی پڑتی ہے۔ ان دو حالتوں کی موجودگی میں قلت غذا اُن کے لئے اور مضر ثابت ہوتی ہے۔ ان ہی واقعات کی بناء پر ترقی عمر کے مدارج جوں جوں بڑھتے جاتے ہیں ایک عمر معینہ (۴۵ تا ۵۰) تک فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ۵۰ تا ۶۰ سال کے بعد سے فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد میں پھر غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے چنانچہ ۶۰ ، اور ۷۰ سال کے درمیان فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد ۱۲۷۳ رہی ہے۔ ۷۰ ، اور ۸۰ سال کے درمیان فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے چنانچہ عمر کے اس درجے میں فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد ۵۵۰۰ ہے۔

اس زیادتی کی وجہ یہ ہونی چاہیئے کہ عورتوں کے آرام کا زمانہ ۴۵ سال کے بعد سے شروع ہوجاتا ہے۔ امور خانہ داری سے یوں سبکدوشی ہوجاتی ہے کہ گھر کی بہو بیٹی اس کو انجام دینے لگتی ہیں۔ جہانتک کہ مزدوری کو جانے کا تعلق ہے اس میں بھی پہلی سی پابندی باقی نہیں رہتی۔ ۵۰ سال کے بعد سے مزدوری کا کام کلیتاً بند ہوجاتا ہے۔ البتہ بچوں کی سنبھال کا کام ان کے سپرد ہوجاتا ہے ممکن ہے کہ اس آرام کی وجہ سے ان کی شرح اموات میں کمی ہوجاتی ہے، اور اس طرح عمر کے آخری مدارج میں فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

تقسیم آبادی بلحاظ شادیاں وغیرہ :۔ آبادی کی ایک اور تقسیم شادی بیاہ کے لحاظ سے

زرعی آبادی

کیجا سکتی ہے۔ ۱،۱۵۴ افراد میں سے ۶۷۰ شادی شدہ، ۳۰۷ غیر شادی شدہ اور ۱۷۷ بیوہ اور بے زن ہیں۔ بالفاظ دیگر مجموعی آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے ۵۸ فیصد افراد شادی شدہ اور ۱۵ فیصد بیوہ و بے زن ہیں۔ ذیل میں شادی شدہ اور بیوہ و بے زن افراد کا تجزیہ بلحاظ تذکیر و تانیث دیا گیا ہے:۔

	تعداد ذکور	فیصد	تعداد اناث	فیصد
۱۔ شادی شدہ	۳۴۰	۶۰٫۰	۳۳۰	۵۶٫۲
۲۔ غیر شادی شدہ	۱۶۰	۲۸٫۲	۱۴۷	۲۵٫۱
۳۔ بے زن و بیوہ	۶۷	۱۱٫۸	۱۱۰	۱۸٫۷
جملہ	۵۶۷	۱۰۰٫۰	۵۸۷	۱۰۰٫۰

ان اعداد سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ۵۶۷ ذکور میں سے ۳۴۰ یا ۶۰ فیصد اور ۵۸۷ اناث میں سے ۳۳۰ یا ۵۶٫۲ فیصد شادی شدہ ہیں۔ بالفاظ دیگر فی ہزار ذکور تقریباً ۶۰۰ شادی شدہ ہیں اور فی ہزار اناث شادی شدہ نفوس کی تعداد تقریباً ۵۸۰ ہے، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موضع زیر بحث میں شادی بیاہ کو کس قدر عمومیت حاصل ہے۔ ذیل میں شادی شدہ ذکور و اناث کا عمروار تجزیہ پیش کیا گیا ہے جس کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مختلف مدارج عمر میں شادی شدہ افراد کی تعداد کیا ہے:۔

عمر	شادی شدہ ذکور کی تعداد	فیصد	شادی شدہ اناث کی تعداد	فیصد
۰ تا ۵	۳		۲	۹
۵ تا ۱۰	۷	۹	۲۷	
۱۰ تا ۱۵	۲۱		۴۱	۱۲
۱۵ تا ۲۰	۴۱	۱۲	۴۱	
۲۰ تا ۲۵	۳۳	۳۰	۴۹	۴۹
۲۵ تا ۳۰	۷۲		۷۲	
۳۰ تا ۳۵	۳۹		۴۶	

زرافزدی آبادی

عمر	ذکور	فیصد	اناث	فیصد
۳۵تا۴۰	۳۹	۳۵	۲۳	۲۸
۴۰تا۴۵	۳۷		۲۲	
۴۵تا۵۰	۲۸	۱۴	۲	۲
۵۰تا۶۰	۱۲		۴	
۶۰تا۷۰	۸		۱	
جملہ....	۳۴۰	۱۰۰	۳۳۰	۱۰۰

مندرجہ صدر اعداد سے واضح ہے کہ ۳۴۰ شادی شدہ ذکور میں سے ۹ فیصد افراد کی شادی ۱۵سال سے کم عمر میں کیگئی ہے اسی طرح ۹ فیصد اناث کی شادیاں ۱۰سال سے کم عمر میں کیگئی ہیں۔ بچپن اور کمسنی کی شادی سے اس میں شک نہیں کہ والدین کی آرزو پوری ہوتی ہے لیکن قرض کی بدولت ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ مزید برآں آغاز شباب کے ساتھ ہی زن وشوہر میں ازدواجی تعلقات قائم ہوجانے کی بدولت ہر دو میں وقت مقررہ سے قبل آثار اضمحلال پیدا ہوجاتے ہیں خصوصاً کمسنی کی زچگیوں کی بدولت اناث کی حالت سرعت کے ساتھ خراب ہونے لگتی ہے۔

تقسیم آبادی لحاظ پیشہ :— آبادی کی ایک دوسری تقسیم پیشوں کے لحاظ سے کیجاسکتی ہے پیشہ کے لحاظ سے موضع زیر بحث کے افراد کو دو طرح پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ غیر زراعت پیشہ ۲۔ زراعت پیشہ۔ اولاً ہم غیر زراعت پیشہ افراد کی تشریح کرینگے :—

تفصیل غیر زراعت پیشہ	خاندان	فیصد لحاظ مجموعی خاندان	نفوس	فیصد لحاظ مجموعی آبادی
۱۔ خالص دستکار	۱۰	۴٫۱	۴۵	۳٫۹
۲۔ خالص ملازم سرکار	۲	۰٫۸	۴	۰٫۳
۳۔ خالص تجار	۲	۰٫۸	۶	۰٫۵
۴۔ بھیک منگے[1]	۴	۱٫۶	۱۰	۰٫۹
جملہ.......	۱۸	۷٫۳	۶۵	۵٫۶

---

[1] بنظر سہولت بھیک منگے خاندانوں کو غیر زراعت پیشہ میں شامل کیا گیا ہے۔

سابقہ اعداد سے واضح ہے کہ غیر زراعت پیشہ افراد ۱۸ خاندانوں یا ۶۵ نفوس پر مشتمل ہیں مجموعی خاندانوں کا لحاظ کرتے زرعی آبادی ہوئے غیر زراعت پیشہ خاندان ۷٫۳ فیصد ہیں بلحاظ مجموعی آبادی ان افراد کا فیصد صرف ۵٫۶ ہے۔

جہانتک کہ زراعت پیشہ آبادی کا تعلق ہے مجموعی آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا فیصد ۹۴٫۴ ہے۔

ذیل میں جملہ زراعت پیشہ خاندانوں کی تفصیل دیگئی ہے :-

تفصیل زراعت پیشہ	خاندان	فیصد بلحاظ مجموعی خاندان	نفوس	فیصد بلحاظ مجموعی آبادی
۱۔ خالص زراعت پیشہ	۷۱	۲۸٫۹	۳۶۰	۳۱٫۲
۲۔ اصل پیشہ زراعت ذیلی طور پر دیگر پیشے	۷۲	۲۹٫۳	۳۷۵	۳۲٫۵
۳۔ اصلی طور پر دیگر پیشے ذیلی طور پر زراعت	۴۹	۱۹٫۹	۲۲۸	۱۹٫۸
۴۔ خالص زرعی مزدور	۳۶	۱۴٫۶	۱۲۶	۱۰٫۹
جملہ	۲۲۸	۹۲٫۷	۱۰۸۹	۹۴٫۴

کارگذار و غیر کارگذار آبادی :— بلحاظ پیشہ آبادی کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد اب ہم یہ دریافت کرینگے کہ موضع زیر بحث میں کارگذار[1] و غیر کارگذار افراد کی کیا تعداد ہے۔

کارگذار آبادی کو ہم دو طرح پر تقسیم کرینگے (الف) مذکر کارگذار آبادی (ب) مونث کارگذار آبادی۔

(الف) مذکر کارگذار آبادی کو معلوم کرنے کے لئے ہم نے ان تمام افراد خاندان کو جنکی عمر ۱۰ سال سے کم ہے غیر کارگذار قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض فرقوں میں اور خصوصاً اچھوت خاندانوں کی اکثریت میں مذکر افراد خاندان ۸ سال ہی کی عمر سے کچھ نہ کچھ کمانے لگتے ہیں لیکن ہم اس آمدنی کو نظر انداز کر دینگے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ سب اچھوت خاندانوں کے لڑکے ۸ برس سے کمانے نہیں لگتے۔ دوسرے یہ کہ جن خاندانوں میں اس عمر کے لڑکے اگر ملازمت کرتے بھی ہیں تو ان کی ملازمت مستقل اور مسلسل نہیں ہوتی۔ تیسرے یہ کہ اپنی محنت سے جو آمدنی کہ وہ حاصل کرتے ہیں بہت ہی قلیل ہوتی ہے جو حقیقتاً نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔

جہانتک دس اور پندرہ سال کے درمیانی عمر کے افراد کا تعلق ہے ہم نے انھیں نیم کارگذار قرار دیا ہے۔ ۱۰، ۱۱ اور ۱۰ برس کے بعد اس موضع میں شاید ہی کوئی ایسا لڑکا ہو جو اپنا پورا وقت کھیل کود میں گذارے۔ اگر دل سے نہیں تو مجبوراً والدین کے ڈر سے اپنے طفلانہ کھیلوں کو خیرباد کہہ کر کام کی طرف راغب ہونا پڑتا ہے۔ ۱۱ تا ۱۵ سال کے

---

[1] کسی کارگذار فرد سے ہماری مراد وہ فرد ہے جو کہ عمل پیدائش میں مشغول رہ کر کم از کم اتنی آمدنی حاصل کر سکتا ہو کہ اس کی بقا کے لئے عموماً کافی ہو سکے۔

زرعی آبادی

لڑکے عموماً جانور چراتے ہیں۔ جانور یا تو ذاتی ہوتے ہیں یا کسی مالک کے۔ جو لڑکے دوسروں کے ہاں طازم ہوتے ہیں وہ بحیثیت مجموعی اتنی آمدنی حاصل کرتے ہیں کہ جس کے ذریعہ موجودہ معیار زندگی پر کم ازکم نصف ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ہم نے ان کو نیم کارگذار افراد میں شامل کیا ہے۔ جب کہ ان لڑکوں کو جو دوسروں کے ہاں ملازم ہیں نیم کارگذار قرار دیا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں جو ان ہی کے ہم عمر لڑکوں کو جو کہ ذاتی جانور چراتے ہیں اس زمرے میں شامل نہ کیا جائے۔

۱۵ تا ۵۰ سال کے درمیان جملہ افراد کو (بہ استثنائے معذورین و گداگراں) کارگذار قرار دیا گیا ہے۔ پندرہ سال کے بعد لڑکے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسب معاش میں کلّی طور پر بزرگ خاندان کا ہاتھ بٹائے۔ پچاس سال کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ اس عمر تک قوائے جسمانی مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جانداری باقی نہیں رہتی جو کہ ایک ۳۰ تا ۳۵ سالہ شخص میں پائی جاتی ہے۔

۱۵ تا ۵۰ سال کے درمیانی عمر والے افراد کو کارگذار قرار دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ افراد جنکی عمر ۵۰ سال سے تجاوز کر گئی ہے کارگذار نہیں ہیں۔ کارگذار ضرور کہلائے جا سکتے ہیں لیکن کلّی معنی میں نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ۵۰ سال کے بعد اعضا سرعت کے ساتھ کمزور ہونے لگتے ہیں حتیٰ کہ ۷۰ سال بعد وہ بالکل ہی از کار رفتہ ہو جاتے ہیں اس لئے ہم نے ۵۰، اور ۶۰ سال کے درمیانی عمر والے افراد کو نیم کارگذار قرار دیا ہے۔

۶۰، اور ۶۰ سال سے زاید عمر والے افراد کو غیر کارگذار قرار دیا گیا ہے، اس لئے کہ ۶۰ سال بعد قویٰ بہت ہی مضمحل ہو جاتے ہیں، اور کام کرنے کی قوت بالعموم مطلق باقی نہیں رہتی۔

مندرجہ صدر مفروضات کے تحت موضع ہذا کی ذکور کارگذار، نیم کارگذار اور غیر کارگذار آبادی حسب ذیل ہے:-

	تعداد	فیصد
۱۔ ذکور کارگذار افراد	۳۲۹	۵۸
۲۔ ذکور نیم کارگذار افراد	۸۵	۱۵
۳۔ ذکور غیر کارگذار افراد	۱۵۳	۲۷
جملہ	۵۶۷	۱۰۰

(ب) مونث کارگذار آبادی:—— مذکر کارگذار آبادی کو معلوم کرنے کے بعد اب ہم مونث کارگذار آبادی کی نوعیت دریافت کرینگے۔

مونث کارگذار آبادی کو معلوم کرنے کے لئے اُن تمام بچیوں اور لڑکیوں کو غیر کارگذار قرار دیا گیا ہے

زرعی آبادی

جنکی عمر ۱۳ سال سے کم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ۸ سال سے کم عمر والی جتنی بچیاں ہیں عام طور پر اپنا پورا وقت کھیل کود میں گذارتی ہیں ۸ تا ۱۳ سال کی عمر والی لڑکیاں خانہ داری کا مفید کام ضرور انجام دیتی ہیں لیکن مقامی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم ان کی محنت کا اندازہ زر کی شکل میں نہیں لگا سکتے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر اس کا اندازہ لگا بھی لیا جائے تو جو آمدنی کہ وہ اس عمر میں حاصل کر سکتی ہیں وہ بہت ہی قلیل ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی پرورش کلیتہً ماں باپ کی کمائی پر ہوتی ہے۔ لہذا تیرہ سال سے کم عمر والی تمام لڑکیوں اور بچیوں کو غیر کارگذار قرار دیا گیا ہے۔

۱۳ تا ۵۴ سال کے درمیان تمام عورتوں کو (سوائے معذورین۔ نقرا اور خالص خانہ دار عورتوں کے) کارگذار قرار دیا گیا ہے۔

۵۴ تا ۶۰ سال کی درمیانی عمر والی عورتیں نیم کارگذار قرار دی گئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ناکافی خوراک۔ غیر اصولی طریقہ رہائش کمسنی کی زچگیوں اور کثرت کار کی وجہ سے اس عمر تک ان کی قوت کارگذاری بہت کچھ کم ہو جاتی ہے۔

۶۰ سال کے بعد جملہ عورتوں کو غیر کارگذار تصور کیا گیا ہے جس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔

مذکورہ مفروضات کے تحت موضع ہذا کی کارگذار، نیم کارگذار اور غیر کارگذار مونث آبادی کا تجزیہ حسب ذیل ہے:۔

	تعداد	فیصد
۱۔ مونث کارگذار آبادی	۲۳۵	۴۰
۲۔ مونث نیم کارگذار آبادی	۱۱	۲
۳۔ مونث غیر کارگذار آبادی	۳۴۱	۵۸
جملہ	۵۸۷	۱۰۰

اس سلسلہ میں مونث اور مذکر کارگذار آبادی کا مقابلہ بھی ضروری ہے چنانچہ مندرجہ ذیل اعداد کے ذریعہ یہ بتلایا گیا ہے کہ ہر صنف آبادی میں کتنے کارگذار، کتنے نیم کارگذار اور کس قدر غیر کارگذار افراد ہیں:۔

	مذکر	فیصد	مونث	فیصد
۱۔ کارگذار افراد	۳۲۹	۵۸	۲۳۵	۴۰
۲۔ نیم کارگذار افراد	۸۵	۱۵	۱۱	۲
۳۔ غیر کارگذار افراد	۱۵۳	۲۷	۳۴۱	۵۸
جملہ	۵۶۷	۱۰۰	۵۸۷	۱۰۰

مندرجہ بالا اعداد کے تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہے کہ مونث کارگذار آبادی کے مقابل مذکر کارگذار آبادی زیادہ ہے۔ فیصد ۵۸ مذکر کارگذار ہیں تو مونث کارگذار افراد کی تعداد ۴۰ فیصد ہے۔ گویا مذکر کارگذار آبادی کے مقابل مونث کارگذار آبادی ۱۸ فیصد کم ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ موضع ہذا میں کوئی ۱۴ فیصد عورتیں صرف خانہ داری کا کام انجام دیتی ہیں اور انھیں غیر کارگذار مونث آبادی میں شامل کیا گیا ہے۔ دیگر عورتوں کی طرح

زرعی آبادی اگر یہ عورتیں بھی خانہ داری کے علاوہ کھیتوں پر کام کریں تو مونث کارگذار آبادی کا فیصد ۳۴ سے بڑھ کر ۴۵ ہو جاتا۔

جہانتک کہ نیم کارگذار مونث آبادی کا تعلق ہے وہ بھی مذکر نیم کارگذار آبادی کے مقابل کم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تیرہ سال سے کم عمر والی جملہ بچیوں اور لڑکیوں کو غیر کارگذار قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ دس سال کی عمر والے لڑکے نیم کارگذار تصور کئے گئے ہیں۔ مونث نیم کارگذار آبادی اس لئے بھی کم ہے کہ ۴۵ اور ۶۰ سال کے درمیانی عمر والی عورتوں کی تعداد کم ہے اور اسی عمر والی عورتوں کو نیم کارگذار قرار دیا گیا ہے۔

جب ہم غیر کارگذار آبادی کا مقابلہ کرتے ہیں تو اس میں مونث غیر کارگذار آبادی زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ۱۳ سال سے کم عمر والی لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ تمام لڑکیاں غیر کارگذار قرار دیگئی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عمر کے آخری دو درجوں میں مذکر کے مقابل مونث زیادہ ہیں جو کہ ہمارے مفروضہ کے تحت غیر کارگذار آبادی میں شامل ہیں۔

اگر بلحاظ مجموعی موضع ہذا کی کارگذار، نیم کارگذار اور غیر کارگذار آبادی کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ جملہ ۴۹ فیصد کارگذار، ۸ فیصد نیم کارگذار اور ۴۳ فیصد غیر کارگذار ہیں۔

اگر ہم دو نیم کارگذار افراد کو ایک کارگذار فرد کے مساوی تصور کرلیں تو موضع کی جملہ کارگذار آبادی ۵۳ فیصد اور غیر کارگذار آبادی ۴۷ فیصد ہو جاتی ہے۔

موضع زیر بحث میں کارگذار آبادی کا فیصد اس لئے زاید ہے کہ یہاں کے باشندوں کی قوت پیدا آوری بحیثیت مجموعی بہت محدود ہے۔ یہاں کا ایک کارگذار فرد زیادہ سے زیادہ اس قدر آمدنی حاصل کرسکتا ہے جو اس کی شدید ضروریات زندگی کے لئے مکتفی ہوسکے۔ قوت پیدا آوری کی تحدید افراد خاندان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ جہانتک ہوسکے جلد کمانے کے قابل بنیں اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ عمر تک کام کرتے رہیں۔

کارگذار آبادی کی اس زیادتی کی بناء پر اگر ایک طرف یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی باشندوں کی قوت پیدا آوری محدود ہے تو دوسری طرف یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں کا معیار زندگی بحیثیت مجموعی پست ہے۔ کیوں کہ پست معیار زندگی کی ایک اہم نشانی یہ ہے کہ افراد خاندان بہت جلد کمانے کے قابل ہوتے ہیں اور اپنی کمائی سے نہایت ہی ادنیٰ معیار پر اپنا اور اپنے چند متعلقین کا پیٹ پال سکتے ہیں۔

معیار زندگی کا مسئلہ چونکہ بہت اہم ہے اس لئے اس کا مفصل حال دوسری فصل میں بیان کیا جائیگا۔

رفتارِ زمانہ

مشرقِ بعید

ایسے ملک جو اپنی توسیع کے خواہش مند ہیں چین کی سرزمین کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں خصوصاً جاپان کے آہنی ہاتھ اس کم زور ملک کو اپنے قابو میں لانا چاہتے ہیں۔ جاپان کی آبادی ہر سال دس لاکھ کے حساب سے بڑھ رہی ہے اور اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے نئے ملک اور زیادہ غذا کی ضرورت ہے۔ جاپان کے ارباب سیاست ملک کی توسیع کو ہی اپنے معاشی مسائل کا حل سمجھتے ہیں چنانچہ منچو کو پر قبضہ کے بعد بھی ان کی تشفی نہیں ہوئی اور ملک گیری کی ہوس میں وہ برابر آگے بڑھتے گئے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جاپان کے علاوہ تین مملکتیں اور ایسی ہیں جن کو چین کے معاملات سے راست تعلق ہے۔ چین کے جنوب میں برطانیہ ہانگ کانگ پر قابض ہے۔ ممالک متحدہ جزائر فلپائن پر اور روس منچو کو کی شمالی سرحد پر قدم جمائے ہوئے ہے۔ پھر ان ملکوں کا سرمایہ بھی چین میں لگا ہوا ہے اس طرح ظاہر ہے کہ چین میں دنیا کی تین اور طاقتوں کا مفاد ہے اگرچہ برطانیہ اور امریکہ چین کے قائد چیانگ کائی شک کی اخلاقی اور مالی مدد کرتے ہیں مگر وہ کھلم کھلا جاپان سے مخالفت مول لینا نہیں چاہتے۔ جو لوگ موجودہ صورت حال سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ روس، چین کی مدد کر رہا ہے اور لڑائی در اصل چین و جاپان کی نہیں بلکہ روس اور جاپان کے درمیان ہو رہی ہے۔ دوسری طرف امریکہ اور برطانیہ کے مسلک پر جاپانی ان کو ستا رہے ہیں خصوصاً انگریزوں کی تو بہت ہی بے عزتی ہو رہی ہے۔ اس کا جواب کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اور روس چین کے دنگل میں کیوں کود پڑا ہے؟ پچھلے چند دنوں کے

واقعات میں تلاش کرنا چاہیئے۔

کوئی تین سال پہلے چین میں دو علحدہ علحدہ حکومتیں تھیں۔ ایک شمالی چین کی حکومت تھی جس کا صدر مقام نانکنگ تھا، اور دوسری جنوبی چین کی جو کانٹن کو اپنا مرکز بنائے ہوئے تھی۔ جنوبی چین کی حکومت جاپان کی بہت دشمن تھی لیکن شمالی چین کے قائد چیانگ کائی شک کا اس زمانے میں خیال تھا کہ جاپان کی مخالفت مفید نہیں ہے۔ ان کو ڈر تھا کہ جاپان سے لڑائی مول لیں تو چینی ہار جائیں گے۔ اس کی بجائے ان کا خیال تھا کہ جاپان کو مشرق بعید کا رہنما بنا لینے میں چین امن سے رہ سکے گا۔ چنانچہ چین میں شمال اور جنوب کے اسی اختلاف کی وجہ سے جون ۱۹۳۶ء میں کچھ خانہ جنگی ہوگئی تھی۔

جاپان اور چین کی دشمنی بہت پرانی ہے۔ اس کی ابتدا ۹۵-۱۸۹۴ء سے ہوتی ہے جبکہ جاپانیوں نے دریائے یالو پر جو کوریا اور منچوریا کو جدا کرتا ہے۔ چینی بحریہ کو شکست دی تھی۔ اس کے بعد ۰۵-۱۹۰۴ء میں جاپانیوں نے روسیوں کو شکست دی اور منچوریا میں گھس آئے اور پھر ۱۹۱۰ء میں کوریا کا جاپان سے الحاق کرلیا۔ چین کی بدقسمتی سے ۱۹۱۱ء کے چینی انقلاب کے بعد لکھوکھا چینی منچوریا جانے لگے تھے۔ جاپان نے مناسب موقع دیکھ کر ۱۹۱۵ء میں چین کے سامنے (۲۱) مطالبات پیش کردئے۔ جاپان کا بڑا مطالبہ یہ تھا کہ منچوریا بالکل اس کے حوالے کردیا جائے اور منگولیا میں بھی اس کا عمل دخل ہو جائے۔

اس کے بعد ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۱ء تک کا طویل زمانہ عجیب طرح کا تھا۔ چینی تو اپنے پرانے ڈگر پر چل رہے تھے اور وہ ہنوز جاپان سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوئے تھے لیکن جاپانیوں نے وہ سب کچھ کیا جو اپنے مفاد کے لئے کرسکتے تھے۔ انھوں نے منچوریا میں ریل بنائی۔ کوئی (۲۲) کروڑ پونڈ ملک میں صرف کئے۔ بالآخر منچوریا میں دو کروڑ ستر لاکھ چینیوں اور دس لاکھ کوریوں کے ساتھ جاپانیوں کی تعداد چوبیس لاکھ تک پہنچ گئی۔

غرض ان واقعات کی وجہ بہت دنوں سے چینیوں کے جذبات بھڑک رہے تھے، اور وہ جاپانیوں سے نفرت کرنے لگے تھے لیکن ۱۹۳۱ء میں تین واقعات ایسے ہوئے جن کی وجہ جاپانی اور چینی دونوں بہت مشتعل ہوگئے۔ پہلا واقعہ تو یہ تھا کہ وان پاؤشن کے مقام پر چینیوں نے کوریوں پر حملہ کیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ کوریا کے بہت سے چینی تاجر کوریوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ دوسرے، جاپانی فوج کا کپتان ناکامورا منچوریا کے چینی سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اور اس سال کا تیسرا اہم واقعہ یہ تھا کہ جاپانی فوج دریائے یالو کو عبور کرکے منچوریا پر چڑھ دوڑی۔

اس کے بعد چین کے حالات بہت دلچسپ صورت اختیار کرنے لگے۔ چین نے مجلس اقوام سے شکایت کی تو

مجلس نے ایک طویل مدت کے بعد لارڈ لٹن کے تحت ایک استفساری کمیشن بھیجا استفسار میں منچوریا کے داخل کر لئے جانے کی جاپان نے شکایت کی ستمبر ۱۹۳۲ء تک کمیشن نے اپنی رپورٹ تیار کرلی اور وہ اکتوبر میں شائع ہو گئی۔ جاپانیوں نے گفت و شنید کے لئے ۱۴ نومبر تک مہلت مانگی اور اس سے بہت پہلے یعنے ستمبر ہی میں انھوں نے منچوکو کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس کا ردعمل شنگ ہائی میں ہوا۔ چینی طالب علموں نے منچوریا کا بدلہ لینا چاہا اور انھوں نے جاپانی اشیاء کے خلاف بائی کاٹ شروع کردی۔ شنگ ہائی میں بوڑھے غلاموں اور بندر لوگوں کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے اور جاپانی مدرسے کے بچوں اور بدھ مذہبوں پر حملے ہونے لگے۔ بالآخر جاپانی باشندوں نے ٹوکیو سے شکایت کی اور ان کی مدد کے لئے بہت سے سپاہی آپہنچے۔ جاپانی جہازوں نے بہت بھڑکی دکھلائی مگر ان کو ہار ماننی پڑی اس کے بعد انھوں نے چیپ (Chape) پر بمباری شروع کی۔ غریب مزدوروں کے گھر ویران ہو گئے اور تجارتی مطبع تباہ کر دیا گیا جس کی وجہ سے ہزاروں چینی مزدور بے روزگار ہو گئے لیکن جاپانیوں کے پیہم حملوں اور ان کی زبردستیوں سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ چینی جن کے قائد آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے، اب آہستہ آہستہ متحد ہونے لگے اور ادھر ۱۹۳۴ء میں جاپانیوں نے اپنے ایک آدمی کو منچوریا کا بادشاہ بنایا جو ان کے ہاتھ میں ایک کٹ پتلی تھا اس طرح منچوکو کی آزادی اور اس پر تسلط کے بعد جاپان نے دوسرا قدم اٹھایا چین کے شمالی صوبے میں ایک تحریک شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اسے بھی آزادی مل جائے۔ ماہ جون ۱۹۳۶ء میں تانگھو اور ٹین ٹسین کے درمیان ریلوے پل پر بم برسائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہوپئی کے مشرق میں رہنے والے چینی باشندے جاپان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ چینی فوج جمع ہونے لگی اور کوانگ تنگ اور کوانگ سی (جنوبی چین) کے فوجی افسروں نے کانٹون کی حکومت کا ساتھ دیا۔ جنرل چن چی تانگ اور جنرل لی چنگ ین، کوانگ سی کے کمان دار مقرر ہوئے اور ایک بڑی جنگ کا خطرہ محسوس ہونے لگا چنانچہ نان کنگ کوانگ سی کے صوبے نے ۹ جون کو جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اس کے دوسرے ہی دن جنوبی فوج ہنگ چو کی طرف روانہ ہو گئی۔ ۱۱ جون کو کانٹون کی حکومت نے لی یانگ پر جو ہنگ چو کے جنوب میں ۵۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے قبضہ کر لیا۔ اسی اثناء میں جنرل چیانگ کائی شک نے اپنی فوجوں کو ہونان کی طرف بھیج دیا تھا اور اس کی وجہ سے جنوبی چین کی یہ نقل و حرکت بند ہو گئی مگر اس کے چند دنوں بعد جنرل چیانگ کائی شک بھی جاپان کے دشمن ہو گئے اور منتشر چینیوں کو جمع کرکے ایک متحدہ محاذ بنانے لگے۔

۷ جولائی ۱۹۳۷ء سے چین میں پھر گڑبڑ شروع ہوئی۔ کوپائی پنگ سے کوئی ۳۰ میل مغرب کی طرف ایک جاپانی اور ایک چینی فوج میں کچھ جھڑپ ہو گئی۔ جاپانی فوج کی تعداد بڑھنے لگی اور انھوں نے جنگ کا ایک مکمل نقشہ اپنے سامنے

دکھا اور باضابطگی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ یہ دست درازی یہاں تک بڑھی کہ چینی دارالسلطنت ان کے قبضے میں آگیا اور اب چین کے دوسرے دو سیاسی اور تہذیبی مرکز یعنے کان ٹون اور ہانکاؤ کی طرف بھی پیش قدمی ہونے لگی یہاں تک کہ فتح تک جاپان کا مقصد یہ تھا کہ چین کے شمالی صوبے یعنے چاہار، سوئی یوآن، شانسی اور شان تنگ اس کے قبضے میں آجائیں۔ ان صوبوں کے بعد شنگ ہائی کی مہم باقی تھی اور یہ پوری ہوئی تو نان کنگ کی طرف رُخ کیا گیا۔ اب تک جنگ کے چار محاذ تھے لیکن چین کسی جگہ بھی جم کر مقابلہ نہ کر سکا۔ مشکل یہ تھی کہ غریب چینیوں میں ہمت تو تھی مگر ان کے پاس ساز و سامان کی کمی تھی۔ شانگ ہائی اور نان کنگ کی فتح کے بعد جاپانی دریائے یانگ ٹسی کے ساتھ ساتھ ہانکاؤ کی طرف بڑھنے لگے اور کان ٹونگ پر حملہ کردیا۔

یہ ایک باضابطہ جنگ تھی جو ۷ جولائی ۱۹۳۸ء تک مسلسل جاری رہی۔ اس ایک سال کی مدت میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ ہوانگ ہو کا سیلاب جاپانیوں کے لئے ایک بلائے آسمانی کی طرح نازل ہوا اور اب تک نہیں تھما تھا۔ اس کی وجہ سے جاپانیوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ چین کو باہر سے سامان جنگ پہنچ رہا تھا۔ چینیوں کے سب ٹوٹے پھوٹے ہوائی جہاز تو شانگ ہائی کو بچانے کی کوشش میں ختم ہوگئے اور ایک زمانہ تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ صرف جاپان ہی ہوائی طاقت سے کام لے سکتا ہے اور چین اس معاملے میں بے بس ہے مگر اب دُنیا کو معلوم ہوا کہ چینی بھی جاپانیوں سے ہوا میں لڑتے ہیں اور ان کے ہوائی مرکزوں پر دھاوے کرتے ہیں۔ جاپانی اس کی مزاحمت کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ انھوں نے چین کو سامان پہنچنے کے راستے بند کرنے چاہے لیکن منغولیا کا راستہ جہاں سے روسی سامان چین آتا تھا، ان کی زد سے باہر تھا، اور دوسری طرف ہانگ کانگ واقع تھا جس پر جاپانیوں کا قابو نہیں چلتا تھا۔ اس زمانے میں جاپانیوں نے ہانگ کانگ کی دو مشرقی بندرگاہوں یعنے اَخوئی اور سواتاؤ پر قبضہ کرلیا تھا، اور وہ اس سے آگے بڑھ کر غالباً جزیرۂ ہائی نان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن ہانگ کانگ پر جاپانیوں کا عمل دخل برطانیہ کو گوارا نہ تھا، اور پھر جزیرۂ ہائی نان بھی چینیوں کی مرضی سے فرانس کے زیر اقتدار آگیا تھا چنانچہ فرانس اور انگلستان نے مل کر جاپان کو دھمکی دی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس طرح رُخ نہ کر سکا۔

ان حالات میں جاپانی سیاست بڑی مشکل میں پھنس گئی۔ آگے بڑھ کر ہان کاؤ تک پہنچنے میں بہت سی دشواریاں تھیں۔ وہ ماتنگ سے آگے پیش قدمی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کے سامنے پہاڑیوں میں مورچہ بندی کی گئی تھی کہ یہ آگے نہ بڑھیں۔ اور ان کی تمام تدبیریں بیکار معلوم ہوتی تھیں چونکہ

چینیوں کو روسی امداد ملتی تھی اس لئے ان کو مقابلے کی اور ہمت ہوگئی۔ روس کو چین سے زیادہ ہمدردی تو نہ تھی مگر وہ اب جاپان کو گھائل کرنے کے لئے چین کی سرپرستی کر رہا تھا۔ پھر اس زمانے میں اٹلی اور جرمنی خود اپنے معاملات میں الجھے ہوئے تھے اور جاپان کی طرف ان کی توجہ زیادہ نہ تھی۔ یہ حالات جاپان کے لئے ہمت افزا نہ تھے کیوں کہ جاپان کی سرگرمیاں اٹلی اور جرمنی کے بل بوتے پر ہوئی تھیں اور اب ان کو مسدود کرنے پر جاپانی مجبور ہو رہے تھے۔

لیکن شاید جاپان کو اپنی بے عزتی گوارا نہ تھی اس نے چین کے میدان کو چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا جاپانی وزارت میں فوجی عنصر نے زور ڈال کر اپنا کام نکال ہی لیا۔ اب ان کو روس سے منچوکو کی سرحد پر مقابلہ کرنا تھا۔ چنگ کو فنگ اور شاٹ سوپنگ پر دونوں کے درمیان سخت معرکہ ہوگیا۔ روس کے بیس ہزار سپاہی ۲۰۰ مخزن اور ۲۰۰ ہوائی جہاز اپنی قوت آزمار ہے تھے اور بہت دنوں تک یہ جنگ زور دوں پر چلتی رہی۔ بالآخر روس اور جاپان کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوگیا اور یہ لڑائی ختم ہوئی لیکن اب سرحد کا تصفیہ باقی تھا چنانچہ دو روسی اور دو منچوکو کے جاپانی نمایندوں کی ایک کمیشن صورت حال پر غور کرنے کے لئے بیٹھ گئی۔

اسی سال اگست کے دوسرے ہفتے میں جاپانیوں نے ہان کاؤ پر حملہ کیا تھا لیکن دریائے زرد کے سیلاب سے ان کو ہار ماننی پڑی۔ جاپانی فوج کو جو سیلابی خطے کے شمال میں پڑی ہوئی تھی چینیوں نے قزاقانہ جنگ سے بہت پریشان کر دیا۔ اب جاپانی فوج کی توجہ دو طرف بٹ گئی تھی۔ تھوڑی سی فوج تو یانگ ٹسی کے کنارے پڑی ہوئی تھی اور باقی فوج منچوکو کی سرحد پر روسیوں کی نقل و حرکت دیکھ رہی تھی۔ ان دو فوجوں کے درمیان ایک وسیع سرزمین تھی جس پر جاپان کا برائے نام قبضہ تھا۔ یہاں کم زور چینیوں کو اپنی قوت آزمانے کا موقعہ ملا۔ انھوں نے قزاقانہ جنگ سے جاپانیوں کا قافیہ تنگ کر دیا اور جاپانی فوج کو جنوب سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ اس طرح جاپان، ہان کاؤ کی مہم پر مزید سپاہی بھیجنے کے قابل نہ تھا۔ پھر دوسری طرف چینی فوج یانگ ٹسی کے بائیں کنارے ڈٹی رہی اور شمال سے آنے والی جاپانی فوج کی روک تھام کرتی رہی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہان کاؤ کی نواح میں سخت معرکہ ہوا اور فریقین کو بہت نقصان پہنچا۔

اوائل اکتوبر میں جاپانی وزیر خارجہ جنرل اوگاکی نے استعفی دے دیا اور اب جاپان نے برطانوی دوستی کے مسلک کو چھوڑ دیا۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ ٹوکیو، روم، برلن محور، کو مضبوط کر لے۔ اس سے جاپانیوں کی نقل و حرکت میں ایک نئی جنبش پیدا ہوگئی۔ یعنے جاپانی فوجوں نے یانگ ٹسی کو عبور کیا اور جوکیان پر جو ہان کاؤ اور

کان ٹون سے (۷۰) میل جنوب مشرق میں واقع ہے، قبضہ کرلیا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ ۷ ر اکتوبر کو ان لوگوں نے پی ینگ ہان کاؤ ریل کاٹ دی۔ یہ ریل ہان کاؤ سے (۱۰۰) میل شمال پر تھی اور اب جاپانی ہان کاؤ کی طرف برابر بڑھتے جا رہے تھے۔ چنانچہ ۱۲ ر اکتوبر کو خبر آئی کہ جنوبی چین پر انھوں نے قبضہ کرلیا اور ادھر سے چینیوں کی رسد بند کردی۔ اس کے دوسرے ہی دن جاپانی ہوائی جہاز وائی چاؤ اور دوسرے اہم شہروں پر دل کھول کر بم برسائے یہاں تک کہ کان ٹون خطرے میں آگیا۔ پھر یورپ کی فضا کو موافق دیکھ کر ان کے حوصلے اور بڑھتے گئے۔ میونچ کی مصالحت کے بعد جاپانیوں کو اور گھمنڈ ہوگیا اور ان کو یقین ہوگیا کہ اب برطانیہ نہیں لڑے گا۔ اس لئے وہ پوری قوت کے ساتھ کان ٹون کی طرف بڑھنے گئے۔ ۱۵ ر اکتوبر کو تو انھوں نے اعلان بھی کردیا کہ ہم نے وائی چاؤ کو فتح کرلیا ہے۔ پھر ہانکاؤ کی جانب شمال اور جنوب، دونوں طرف سے جاپانی فوجیں بڑھتی گئیں اور ان کو توقع تھی کہ کان ٹون پہنچنے تک ان کی زیادہ مزاحمت نہ ہوگی۔ بالآخر ۲۱ ر اکتوبر کو کان ٹون بھی فتح ہوگیا اور اس کے چھ دن بعد جاپان نے ہان کاؤ پر بھی قبضہ کرلیا۔

اواخر نومبر میں جاپانیوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ یہ اب تک تو صرف چینیوں پر ہاتھ صاف کرتے تھے لیکن اب باہر کی قوموں سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی۔ ہانگ کانگ کے قریب انھوں نے چند ناکوں پر قبضہ کرلیا۔ پھر ۲۴ ر دسمبر کو ہانگ کانگ ڈلٹا پر قابض ہوگئے۔ یہاں سے وہ مغرب کی طرف بڑھنے لگے اور چینیوں کو اس طرف سے جو اسلحہ پہنچتے تھے ان کو روک دیا۔ ۱۵ ر دسمبر کو ہان کاؤ کے فرانسیسی مراعاتی علاقے میں ایک نیا گل کھلا۔ یعنے جاپانیوں نے ان کے غلّہ اور پانی کی رسد بند کردی۔

یہ تھی چین اور جاپان کی خونیں داستان۔ اس جھگڑے کو شروع ہوئے ۷ ر جولائی ۱۹۳۹ء تک پورے دو سال ہوگئے مگر نہ چینی ہار مانتے ہیں اور نہ جاپانی تھکتے ہیں۔ اس دوران میں جاپان نے چین کے پانچ بڑے صوبوں پر قبضہ کرلیا۔ ان میں سات نہایت اہم شہر بھی ہیں۔ شمال سے جنوب کی طرف آئیں تو جاپان کے مفتوحہ صوبے اور شہر یہ ہیں:- ہوپی (پی ینگ، ٹین ٹسن)، کیانگ سو (شنگ ہائی، نان کنگ)، ہوپے (ہان کاؤ) کوان تنگ (کان ٹون) اور شیج وان۔ شیج وان کے صوبے میں چین کا نیا صدر مقام چنگ کنگ بھی واقع تھا مگر جب صوبے پر جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا تو چنگ کنگ اس سے الگ ہوگیا اور وہ اب تک چینیوں کے قبضے میں ہے۔ ان تمام صوبوں میں کوئلہ پایا جاتا ہے۔ چین میں تیل کا سب سے بڑا مخزن ہوپی ہے اور ہوپی اور آن ہوئی میں لوہا موجود ہے۔ شمالی چین خصوصاً شان تنگ، ہوپی اور شانسی میں روئی خوب پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب جاپانیوں کے قبضے میں

آگئے ہیں۔ ہانگ کانگ کو چھوڑ کر چین کی تمام بندرگاہیں اور اہم صنعتی مرکز سب جاپانیوں کے قبضے میں ہیں اس لئے چین کی بیرونی ملکوں سے تجارت بھی ختم ہو گئی ہے۔

اس دار وگیر کے باوجود جنگ اب تک جاری ہے! اس طویل جنگ وجدل کے باوجود اب تک جاپان نے چین میں اپنے قدم نہیں جمائے یہ جنگ تو اس یقین کے ساتھ شروع کی گئی تھی کہ چینیوں میں مقابلے کا دم خم نہیں ہے بلکہ جاپانی یہ سمجھتے تھے کہ وہاں چینی ان کا خیر مقدم کریں گے اور بعض جگہ زبردستی اور کہیں اتحاد عمل سے ان کی مشکلیں آسان ہو جائیں گی لیکن ان توقعات کے برخلاف مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔ یوں تو جاپانیوں نے ہر مورچہ فتح کر لیا اور چینی حکومت جنوب مغرب کے پہاڑوں میں بند ہو گئی ہے مگر متواتر شکستوں کے باوجود چینیوں نے قزاقانہ جنگ سے جاپانیوں کو اتنا دق کیا ہے کہ وہ مفتوحہ چینی علاقوں کو ابھی اپنا نہیں کہہ سکتے! اب اگرچہ چینی اپنی شکست سے انکار نہیں کر سکتے لیکن ان میں قومیت کا جذبہ بہت کچھ موجزن ہو گیا ہے اور ان کے دلوں سے جاپانی ناسور جلد اچھا نہیں ہو گا۔ اگر موجودہ چینی سلطنت کا خاتمہ بھی ہو جائے تو جاپانیوں کو پورے ملک میں فوج رکھنا اور اس پر کافی روپیہ خرچ کرنا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں جاپانی ضرور تشویش میں ہیں پھر چینی سلطنت بھی کچھ ایسی سخت جان ہے کہ اس کا جلد خاتمہ نہیں ہوتا! ادھر روس مجبور ہے کہ چین کی مدد کرے اور روس سے آخر کبتک جاپان ٹالتا رہیگا؟

جاپان کی اندرونی حالت دیکھئے تو وہ بھی ان کے لئے پریشانی سے خالی نہیں ۱۹۲۵ء کے تہلکہ کے بعد سے جاپان میں برابر انتشار ہے اس میں شک نہیں کہ جاپان کی ایک سخت جان قوم ہے ان لوگوں میں وطنی جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے لیکن چین کی جنگ میں جاپانیوں پر بھی کچھ کم آفتیں نہیں آئیں جنگ کے اخراجات کے لئے حکومت کو مجبوراً قومی قرضے کی مد کھولنی پڑی سونے اور چاندی کے محفوظات بھی اب ختم ہو رہے ہیں ملک کی اندرونی معاشی حالت برابر خراب ہوتی جا رہی ہے شہزادہ کونائے جو صدر اعظم تھے مستعفی ہو گئے اور ایک جدید کابینہ کی تشکیل ہوئی جس کے وزیر اعظم بیرن ہیرانما ہیں اس نئی کابینہ میں مسٹر ارتی ٹا وزیر خارجہ مسٹر اٹاگاکی وزیر جنگ اڈمیرل یونیا وزیر بحریہ، مارکوئس کائڈو وزیر داخلہ اور مسٹر اشو اناری وزیر مالیہ ہیں۔ جاپانی کابینہ میں فوجی عنصر ابتک غالب ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کے اندرونی اختلافات مٹ گئے۔ اگر چین کی جنگ زیادہ عرصے تک جاری رہی اور جاپانی مالیہ پر برابر بار پڑتا رہا تو بہت ممکن ہے کہ خود جاپان میں ایک نیا فتنہ جاگ اٹھے۔

ابھی حال میں روسی وزیر خارجہ موتوتاف نے روس کے مسلک کو واضح کیا ہے۔ بیرونی منگولیا کو جاپان نے جو دھمکیاں دی ہیں اس کی وہ مذمت کرتے ہیں انھوں نے اعلان کیا ہے کہ "اس بدتمیزی کی کوئی حد ہونی چاہیئے اب وقت آگیا ہے کہ جاپان اپنی بیہودگیاں ختم کر دے"۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "ہم بیرونی منگولیا کی سرحد کی پوری طرح مدافعت کریں گے"۔ اس کے بعد انھوں نے اسٹالن کے اعلان کا تذکرہ کیا کہ روس آزادی کی حفاظت کے لئے ہر قوم کی مدد کرنے تیار ہے اور صاف صاف بتا دیا کہ روسی حکومت اب چین کی عملی طور پر مدد کر رہی ہے۔

آج کل یورپ کے تمام اعضائے سیاسی ڈانزگ کے مسئلے پر نگاہ لگائے ہوئے ہیں اور دُنیا حیران ہے کہ ہٹلر ڈانزگ کو بغیر لڑے کس طرح ہضم کرے گا۔ ابھی حال کا واقعہ ہے کہ پولستان کے ایک افسر کو سرحد پر مار دیا گیا اور پچھلے چند دنوں سے تو عجیب طرح کی خبریں آرہی ہیں۔ پولستانی سرحد کے عہدہ داروں کو کھانے پینے کی چیزیں دقت سے مل رہی ہیں اور وہ مختلف طریقوں سے ستائے جا رہے ہیں پھر اطالوی اور جرمنی منادر سے بھی خطرے سے خالی نہیں۔ پولستانی سرحد پر ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ جرمن فوج جمع ہوگئی ہے۔ ان حالات میں ڈانزگ اور پولستان کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن عملی طور پر فرانس اور برطانیہ نے پولستان کی حمایت میں اب تک کچھ نہیں کیا۔ پولستانی فوج کے انسپکٹر مارشل اسمگلی رٹز نے ۶ راگست ۱۹۳۹ء کو ایک تقریر کی تھی اور پولستان کا مسلک واضح کیا تھا کہ وہ ڈانزگ کے لئے لڑنے پر بھی آمادہ ہے۔ اس جرات پر فرانس اور برطانیہ نے اظہار خوشنودی تو کیا ہے لیکن ابھی وہ روس کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف ہیں جس کا نتیجہ آج تک نہیں نکلا۔ چوں کہ انگریز روسی گفت و شنید میں الجھے ہوئے ہیں اس لئے جاپانیوں کو اس سے فائدہ اُٹھانے کا اچھا موقعہ مل گیا چنانچہ وہ انگریزوں کو ٹین ٹسن میں بہت ستا رہے ہیں۔ اگرچہ مسٹر اریتا اور رابرٹ کریجی اس معاملے میں بات چیت کر رہے ہیں لیکن اب تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکا۔ ابھی چند روز پہلے مسٹر چیمبرلین نے پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ: "ممکن ہے کوئی بحری بیڑہ مشرق بعید کی طرف بھجوانا پڑے۔" اس کو جاپانی دھمکی سمجھ رہے ہیں اور ٹین ٹسن کے انگریزوں کی مصیبتوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جاپانیوں کے اس غصے کا ٹوکیو کی گفت و شنید پر بھی اثر پڑے اور گفتگو کا کوئی خوش گوار نتیجہ نہ نکلے۔ غالباً جاپانی یہ سمجھتے ہیں کہ انگریز مشرق بعید کی طرف کچھ زیادہ توجہ کرنے کے قابل نہیں ہیں! اس لئے وہ جتنا ہوسکے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ رہا امریکہ سو وہ اس بات کا تصفیہ نہیں کرسکا کہ آیا اس کو غیر جانبداری کے مسلک پر قائم رہنا ہوگا یا باہر کے معاملات میں الجھنا پڑے گا! اگرچہ پریسیڈنٹ روزویلٹ نے جاپان کے تجارتی معاہدے کو آئندہ کے لئے ختم کر دیا ہے اور امریکہ کے تجارتی نمائندے مسٹر ارنلڈ نے جو ابھی ایک سال کے بعد چین واپس آئے ہیں، چینیوں کو یقین دلایا ہے کہ امریکہ کو چین کے ساتھ بہت ہمدردی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر روزویلٹ کی کوششوں کے باوجود امریکہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوگا کہ باہر کے معاملات میں حصّہ لے۔ امریکہ اور برطانیہ تو دُنیا کی دوسری طرف ہیں لیکن اب جاپانیوں کا صرف روس سے مقابلہ ہے۔ آئندہ واقعات کی رفتار سے معلوم ہوسکے گا کہ ان دونوں فریقوں میں جیت کس کی ہوگی۔

یورپ

یورپ کی تمام سیاسی بے چینی جو اس وقت یورپ اور ایشیا کو ڈرا رہی ہے، جنگ عظیم کا نتیجہ ہے۔
یہ جنگ جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک رہی اپنے پیچھے بہت سی یادگاریں چھوڑ گئی ہے ظاہر ہے کہ جنگ میں ہر فریق کا نقصان ہوتا ہے لیکن جو طاقتیں اس جنگ میں مغلوب ہوئی تھیں ان کا تو بیحد نقصان ہوا۔ جانی اور مالی نقصان کے علاوہ ان پر اور بھی بہت سی مصیبتیں آئیں چنانچہ ان مفتوح قوموں پر بڑی بڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ان کے ملکوں کے حصے بخرے کئے گئے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان پر تاوان جنگ بھی اس طرح سے عائد کر دیا گیا کہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ غرض ان قوموں نے جن کی جنگ میں جیت رہی خوب فاتحانہ شان دکھلائی اور ہر طرح مفتوح قوموں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ان فاتحوں کا جن میں انگریز اور فرانسیسی زیادہ نمایاں ہیں اصلی منشا یہ تھا کہ شکست خوردہ قوموں کو اس طرح کچل کر رکھ دیں کہ وہ دوبارہ ابھر نہ سکیں چنانچہ ترکی کو جس سے ان کی دیرینہ مخاصمت تھی ایسا کچل دیا کہ بظاہر وہ آخری سانس لے رہا تھا۔ جرمنی کی حالت دوسرے درجہ پر تھی صلحنامہ ورسائے کے ذریعہ جو ۱۹۱۹ء میں طے پایا تھا، اس کو سخت مجبور کر دیا گیا۔ اس ورسائے کے صلح نامہ کو جنگ عظیم کی سب سے بڑی یادگار سمجھنا چاہیئے کیونکہ یورپ کی موجودہ سیاسی بے چینی کا ذمہ دار بڑی حد تک یہی صلح نامہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سیاست اور اخلاق دو جداگانہ چیزیں ہیں لیکن کسی ہارے ہوئے فریق پر اتنا بوجھ ڈالنا کہ وہ سر نہ اٹھا سکے یقیناً زیادتی ہے۔ یوں تو جنگ عظیم میں ہر فریق نے برابر کا حصہ لیا تھا اور اس کے نتائج کے دونوں ذمہ دار تھے لیکن ورسائے میں فاتح فریق نے سارا الزام ہزیمت خوردہ فریق کے سر تھوپا اور اس سے جتنا ہوسکا بدلہ لے لیا چنانچہ ورسائے کے صلح نامے میں جو امن کی شرطیں طے کی گئی تھیں، ان کی رو سے جرمنوں نے اپنے ملک کے بہت سے علاقے کھو دیئے۔ الساک اور لورین، فرانس نے چھین لئے، سرحد کے بہت سے اضلاع بلجیم کے حصے میں آئے، کچھ علاقہ ڈنمارک کو دیا گیا سیلیشیا کا جنوبی حصہ پولستان کو ملا اور ضلع میمل لیتھونیا کو دیا گیا۔ رہائن کے ساحلوں سے جرمن فوجیں ہٹا دی گئیں۔ جرمنی کا علاقہ سار ایک بین قومی کمیشن کے تحت کر دیا گیا پھر اتحادیوں نے جرمنوں سے ان کی تمام نو آبادیاں بھی چھین لیں اور جرمنی کو تحدید اسلحہ کے لئے مجبور کیا جرمنی کے

بحری اور برّی راستے بھی چھین لئے گئے اور اس پر غیر معمولی قرضہ عائد کیا گیا۔ ترکی کو بھی جو جنگ میں جرمنی کا ساتھی تھا اس سے زیادہ نقصان پہنچا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں سیورے کا جو معاہدہ طے پایا اس کی رو سے ترکوں کے تمام علاقے چھین لئے جانے کے بعد ترکی سلطنت سمٹ سمٹا کر صرف ایشیائے کوچک میں محصور ہوگئی۔ ان تمام زیادتیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی اور ترکی کو جو اس طرح جنگ کے شکار ہوئے تھے ایسے افلاس سے دوچار ہونا پڑا کہ اگر غیر معمولی حالات نہیں پیدا ہوتے تو ان کا پھر دنیا میں اُبھرنا ناممکن تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ زیادتیاں رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ ہزیمت خوردہ قومیں فاتحوں کی اور دشمن ہوگئیں۔ اور یورپ میں مطمئن اور غیر مطمئن قوموں کے دو فریق بن گئے۔ غیر مطمئن مملکتیں یعنی وہ جنھیں صلح نامہ ورسائے وغیرہ سے سخت نقصان اُٹھانا پڑا مطمئن مملکتوں کی مخالفت پر آمادہ ہوگئیں۔ ایسے ملک جو جنگ میں ہار گئے تھے یعنے ترکی، جرمنی، وہ تو غیر مطمئن تھے ہی لیکن بعد کو ان کے گروہ میں اٹلی اور روس کے جیسے ممالک بھی شامل ہو گئے جو اگرچہ جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ تھے لیکن جنگ کے بعد کے صلح ناموں سے ان کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔ پھر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا غیر مطمئن گروہ انگلستان اور فرانس کی راست مخالفت کرنے لگا۔ اس طرح یورپ میں مطمئن اور غیر مطمئن مملکتوں کے دو فریق بن گئے جو برابر ایک دوسرے کے دشمن رہے۔

جنگ کی ایک اور یادگار یہ تھی کہ ساری دُنیا کو جنگ کے بعد ایک بڑی معاشی پستی سے دوچار ہونا پڑا۔ جنگ کے مصائب اور معاشی پستی کے اثرات سرمایہ داروں کے مقابلے میں اوسط اور ادنیٰ طبقے پر زیادہ پڑے تھے اسی لئے ان طبقوں میں معاشی اور سیاسی بیداری پیدا ہوگئی۔ چنانچہ یہ طبقے سرمایہ داری کے خلاف سربکف ہوگئے اور انھوں نے شاہی، شہنشاہیت اور سرمایہ داری کو ختم کر دینا چاہا۔ یورپ کی شاہیاں سب سے پہلے ان کا نشانہ بنیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے سرمایہ دار طبقے کمزور پڑ گئے۔ شخصی حکومتیں بالکل ختم کر دی گئیں۔ کہیں جمہوریت کو جگہ ملی اور کہیں اشتراکیت کا تخیل پیدا ہوا۔ اشتراکی انقلاب کا بڑا مخزن روس تھا۔ روس میں سرمایہ داری کو ختم کر کے حکومت کا ایک نیا تجربہ کیا گیا یعنے طبقہ ارزلیہ کو حکومت میں شامل کیا گیا۔ اس نئی تحریک کا اثر دوسرے ملکوں پر بھی پڑنے لگا اور سرمایہ داری کے مخالف زور پکڑنے لگے۔ چنانچہ خود انگلستان میں ۱۹۲۴ء میں لیبر جماعت کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ دوسرے ملکوں میں جہاں اشتمالیت کی تحریک کا اثر پڑا تھا، سرمایہ دار اور اشتمالی دو فریق پیدا ہو گئے تھے۔ یورپ میں سرمایہ دار اور اشتمالی نکتہ خیال کے دو مختلف گروہ بن گئے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں تصادم لازمی تھا۔ چنانچہ پچھلے چند سال میں دونوں

فرقوں نے یورپ کی سیاست میں ایک ہنگامہ برپا کیا تھا جسے اب وسطی یورپ کے آمروں نے کچھ کم کردیا ہے۔
جنگ کا ایک اور نتیجہ یہ تھا کہ اس طوفان میں پارلیمنٹی حکومتیں بے دست و پا ہوگئیں۔ اس کا علاج آمریت تھا کیونکہ جب ملک میں جمہوریت ناکام ہوجائے ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانے لگے اور سیاسی فرقے آپس میں لڑنے لگیں تو اس موقعہ پر کسی ایسی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک ڈنڈے کے ذریعہ تمام افراد مملکت کو ایک کردے۔ چنانچہ اطالیہ میں یہی ہوا۔ ملک کے حالات ایسے ہوگئے تھے کہ اگر مسولینی کی فاشسٹ جماعت حکومت پر قبضہ نہ کرتی تو اطالیہ کہیں کا نہ رہتا۔ مسولینی نے تمام افراد مملکت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کیا اور ان کو ایک متحد قوم بنادیا۔ فاسیت کا اثر جرمنی پر بھی پڑا اور وہاں ہٹلر برسر اقتدار آگیا۔ فاسیت اور اس کا متخرج نازیت کا فلسفہ اشتمالیت کے بین الاقوامی اور عالمگیر تخیل کے برخلاف بہت زیادہ قومی ہے۔ اس طرح فاسیت اور نازیت کے حامی ایک ہی برادری میں آگئے اور اطالیہ اور جرمنی دونوں متحد ہوگئے۔ چونکہ اشتمالیت اور فاسیت کے عقیدے میں بنیادی فرق ہے اس لئے یہ دونوں ازل سے ایک دوسرے کے دشمن رہے۔ پھر فاسیت کا فرقہ انگلستان اور فرانس کا بھی بہت دشمن ہے کیونکہ اس کو معاہدہ ورسائی کے ذریعہ نقصان پہنچایا گیا تھا۔ چنانچہ انگلستان اور فرانس سے اطالیہ اور جرمنی کی موجودہ پرخاش اسی دشمنی کا نتیجہ ہے اور گذشتہ جنگ ہی اس صورت حال کی ذمہ دار ہے۔

اس طرح یورپ میں سیاسی نظریوں کے لحاظ سے تین فریق ہوئے یعنے روس کا اشتمالی فریق، اطالیہ اور جرمنی کا فاشسٹ فریق، اور تیسرا انگلستان، فرانس اور بلجیم کا فریق جو جمہوریت کا علمبردار ہے۔ نازیت اور فاسیت کے حامی ان دونوں فرقوں یعنے اشتمالی اور جمہوری ملکوں سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اشتمالی گروہ سے اس لئے کہ اس کے بنیادی عقائد سے ان کو اختلاف ہے اور جمہوریت کے فریق سے اس لئے کہ گذشتہ جنگ کی زبردستیوں کا اس سے بدلہ لینا ہے۔ اشتمالی فریق فاسیت کا تو مخالف ہی ہے لیکن اسے جمہوری مملکتوں سے بھی کد ہے کیونکہ وہ سرمایہ داری کی علمبردار ہیں لیکن بہت ممکن ہے کہ اشتمالی فریق فاسیت کی مخالفت میں فاشسٹ فریق کو کچلنے کے لئے جمہوریت کا ساتھ بھی دے دے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یورپی قوموں کی یہ فرقہ بندی محض نظریوں کے اختلاف پر مبنی ہے۔ ملک گیری کی ہوس اور اپنے مفاد کے لئے دوسری قوموں کا گلا کاٹنے کی حرص ہر فرقے میں موجود ہے اور اپنے حصول مقصد کے لئے کسی فریق کو اچھی اور بری بات کی تمیز نہیں ہوتی۔ اپنے مقصد کے لئے وہ کبھی تنہا کوشش کرتا ہے کبھی کسی فریق کی قوت کو

زیادہ دیکھ کر اس سے دب جاتا ہے اور کبھی تیسرے فریق کو ملا کر اپنے حریف کی جڑیں کاٹنی چاہتا ہے۔ بہر حال یورپی سیاست کی موجودہ رفتار کو سمجھنے کے لئے ان تین فریقوں اور ان کی حکمت عملی کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔

روس

اشتمالی انقلاب سے جو ۱۹۱۷ء میں ہوا روس کی تاریخ بالکل بدل گئی جس کو ازمنہ ماضی سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ اشتمالیت کا ایک معاشی نظام ہے جس کی داغ بیل جرمنی کے مشہور مفکر کارل مارکس نے ڈالی تھی۔ اس کا منشا سرمایہ داری کو ختم کرکے جو مختلف اخلاقی اور سیاسی بے اطمینانیوں کا باعث ہوتی ہے ملک میں دولت کی ہموار تقسیم کرنا ہے۔ سرمایہ داری کا بھوت ملک کے ذیلی طبقوں کو جن کی تعداد بہت ہوتی ہے خوش حال نہیں بنا سکتا۔ ایک طرف سرمایہ داروں کا ظلم اور زبردستی اور دوسری طرف ذیلی طبقوں کی بے بسی ایک کشاکش پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ چنانچہ روس میں یہی ہوا یعنے یہ طبقہ واری کشمکش ایک بڑے انقلاب کی صورت میں رونما ہوگئی اور دیکھتے دیکھتے تمام ملک اشتمالی ہوگیا۔ روس کی اس اشتمالی تحریک کو ایک بڑے معاشرتی اور معاشی نظام کا تجربہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں مشرقی اور مغربی دونوں خصوصیتیں پائی جاتی ہیں اس کے متعلق یہ خیال نہیں ہوسکتا تھا کہ یہاں کسی سیاسی عقیدے کو عملیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کامیاب ہوسکے گی۔ پرانے نظام معاشرت اور روایات کو توڑنا آسان نہیں ہے کیونکہ جب زندگی ایک مرتبہ اپنی پرانی روش چھوڑ دیتی ہے تو پھر کسی ڈھرے پر لگتے لگتے بہت سے پلٹے کھاتی ہے۔ روس کی کشتی ابھی بھنور سے نکلی نہ تھی کہ اس کے ناخدا بیرونی معاملات میں الجھ گئے اور ظاہر ہے کہ اس طرح روس کی اندرونی گتھیاں ابھی اچھی طرح نہیں سلجھیں۔

اس جدید نظام معاشرت و سیاست کا مختصر خاکہ یہ ہے:۔ یعنے روس میں اب بوڑھے آدمی باقی نہیں رہے کیونکہ جو قدامت پرست تھے وہ ملک سے خارج کردیئے گئے اور جو بچے کھچے تھے وہ پچھلے بیس بائیس برس کی مصیبتوں کا شکار ہوئے۔ روسیوں کے پاس مذہب کوئی چیز نہیں۔ اشتمالیت ہی ان کا مذہب ہے اور ایک زمانے میں تو لینن ان کا خدا تھا اور اب اسٹالن ان کا رب ہے۔ ان کے پاس مملکت یا اسٹیٹ کا بھی کوئی تخیل نہیں۔ یہ لوگ تمام بین مملکتی تعلقات ایک انسانی اخوت کے رشتے میں

منسلک کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے سامنے قومی اور جغرافی بندشیں ٹوٹ جائیں۔ اگر روسی اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوں تو ان کے خیال میں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دُنیا میں دولت کی تقسیم ضرورت اور حق کے لحاظ سے مناسب طور پر ہو سکے گی۔ مزدور سرمایہ داری کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے اور جب سرمایہ دار باقی نہ رہیں گے تو جنگ وجدل کا نام ہی دُنیا سے مٹ جائے گا۔ روس میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں رکھا گیا اس لئے لوگ یہاں صاحب جائداد نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ یہاں جنس اور طبقے کا امتیاز بھی مفقود ہے۔ یعنے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا اور مُلک کے تمام افراد "مزدور" ہیں اور ان کو مزدور بننا پڑتا ہے۔ کیونکہ قانون کی رو سے ہر شخص کو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے۔ روس کی ۸۰ فی صد آبادی لکھنا پڑھنا جانتی ہے اور وہاں بے روزگاری بھی نہیں ہے۔ بیمار مزدوروں کے ساتھ بہت رعایت کی جاتی ہے اور بیماری کے زمانے میں انھیں پوری مزدوری ملتی ہے اور ہر شخص کو پوری تنخواہ پر سال میں تین چار ہفتے کی چھٹی دی جاتی ہے۔ بڑوں کی سکونت کے لئے اچھے کیمپ اور بچوں کے لئے پرورش گاہیں اور کھیل کود کے میدان مہیا ہیں۔ جہاں تک جرائم کا تعلق ہے روسی چوری اور قتل کو ایسے جُرم نہیں سمجھتے جو مجرم کے لئے باعث شرم ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ چوری اور قتل اس وقت سرزد ہوتے ہیں جبکہ نظام معاشرت اور تربیت خراب ہو۔ اس کے برخلاف روسیوں کے ہاں سب سے بڑی بُرائی سیاسی جُرم یا غداری ہے۔

لینن نے جو اشتمالی اصول قرار دیئے تھے وہ پہلے بہت خوشگوار معلوم ہوتے تھے لیکن عملی طور پر یہ خشک اصول مفید مطلب ثابت نہیں ہوئے کیونکہ ملکیت کو غائب کرنے سے پیدائش دولت کا محرک ہی فنا ہوگیا۔ جب مزدوروں اور دوسرے حکومت کے عمال کی ضرورتیں سرکار سے پوری ہو جاتی ہیں تو ان کو زیادہ جفاکشی اور انہماک کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب کوئی شخص اپنی چیز کا خود مالک ہو تو اس کو ترقی دیتا ہے۔ اس لئے پچھلے اصولوں میں بہت سی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ چنانچہ ان خشک اصولوں کی نظر ثانی کر کے اب حکومت نے اجتماعی کاشت میں انفرادی حق بھی داخل کر دیا ہے۔ جدید قواعد کی رو سے کھیتوں کے انتظام میں کسان کو زیادہ آزادی اور شخصی ملکیت کا حق عطا کیا گیا ہے پھر ہر شخص کی آمدنی اس کی ملکیت قرار دی گئی ہے جو قانوناً محفوظ اور موروثی مانی گئی ہے۔ اس نئے مسلک سے اب لوگوں کو اپنی ملک پیدا کرنے کی تحریص ہونے لگی اور وہ پورے شوق کے ساتھ کام کی طرف مائل ہو گئے۔ تعلیمی اور معاشی مسلک میں بھی بہت کچھ تغیر ہو گیا۔ ماں باپ کو اپنے بچوں پر بہت کچھ اختیارات دیئے گئے۔ نئے دستور میں قومی نمائندگی کا اصول بھی جاری کیا گیا ہے جس میں مرد اور عورتیں غیر مشروط

طور پر رائے دے سکتے ہیں اور مُلک کی نمائندہ جماعت حکومت کرتی ہے۔ نئے دستور میں اشخاص کی آزادی کا خاص خیال رکھا گیا ہے چنانچہ کوئی روسی بلا حکم عدالت گرفتار نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کی تلاشی لی جا سکتی ہے۔

شروع سے اشتمالیت کو ایک عالمگیر تحریک بنانے کی کوشش کی گئی کیونکہ جب تک یہ عالمگیر نہ ہو جائے آس پاس کی مملکتیں بھی اشتمالی نہ ہو جائیں اس وقت تک یہ نظام معاشی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے لئے مزدوروں کو متحد کر کے ان کو سرمایہ دار اور امتیازی طبقوں کے خلاف بر سر پیکار کرنا ضروری ہے۔ لہذا یہ طبقہ واری کشمکش ہر جگہ شروع ہو گئی اور روسیوں نے ایک عالمگیر انقلاب کی کمیٹی بھی بنا لی تاکہ کسی باضابطہ نظام العمل کے تحت انقلابی کارروائی کی جا سکے لیکن اشتمالیت کا بین الاقوامی تخیل صرف اصول کی حد تک ہا عملی لحاظ سے خود روس ہی میں قومیت کی تنگ نظری موجود ہے اور اس کی برائیاں مُلک میں سرایت کر رہی ہیں۔ اگر روس میں جو اشتمالیت کا گہوارہ ہے اس کے نظریوں کو پوری عملیت حاصل نہ ہو تو ظاہر ہے کہ دوسرے مُلکوں پر اشتمالیت کا اثر دیرپا نہیں ہو سکتا چنانچہ جہاں کہیں اشتمالیت پسند طبقے حکومت پر حاوی ہوئے، ان کا پلہ کبھی بھاری نہیں ہوا بلکہ ان کو ہمیشہ اپنے مخالفوں سے مرعوب ہونا پڑا اسی وجہ سے وہ قوم کی اصلاح اور ترقی کا کوئی نیا راستہ دریافت نہ کر سکے چنانچہ جرمنی میں یہی ہوا جنگ عظیم کے بعد وہاں مزدوروں کی کوشش سے ایک نیم اشتراکی حکومت قائم ہوئی تھی مگر چار سال بعد خود اسی حکومت نے ہنڈن برگ کو جو قیصر کی فوج کا سپہ سالار اور ایک بڑا زمین دار تھا مملکت کا صدر منتخب ہونے دیا۔ انگلستان کی لیبر جماعت کے رہبر بھی ایک مرتبہ شکست کھانے کے بعد قدامت پسند فرقوں کے سامنے جھک گئے۔ باہر کے ان نیم اشتراکی فرقوں کی کمزوری کے علاوہ ان کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ روسی ان سے خوش نہ تھے چنانچہ انہی وجوہات سے اشتمالیت کی تحریک آگے نہ بڑھ سکی اور انگلستان میں لیبر جماعت کی پہلی حکومت اور جرمنی میں انتہا پسند اشتراکیوں کی زندگی اسی بنا پر ختم ہو گئی۔ اس کے علاوہ یورپ کے موجودہ صنعتی نظام نے بھی کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ مزدور طبقے کی قدر و منزلت گھٹتی جا رہی ہے۔ تقریباً ہر مُلک میں متوسط طبقے کی قوت بڑھ گئی ہے اور وہ سرمایہ داروں سے مل کر مزدوروں کی طاقت توڑ رہے ہیں۔ ان تمام چیزوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اب مزدور سرمایہ داروں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے۔

جب استالن نے مُلک کے تعمیری کاموں کی طرف اپنی توجہ وقف کر دی، روس کے عالمگیر انقلاب کی کمیٹی کے معاملات پیچھے پڑ گئے۔ چنانچہ کئی سال تک اس کا اجلاس نہیں ہوا لیکن ترونسکی کے اخراج کے بعد

اس کمیٹی نے دوبارہ حرکت کی۔ مگر اس نے یورپ کی بجائے ایشیا پر زیادہ توجہ کی چونکہ اب چین میں روس کا بہت سرمایہ لگا ہوا ہے اور پھر جاپانی منچوکو کی سرحد روس سے ملتی ہے اس لئے چین اور جاپان کی جنگ میں روسی الجھ گئے ہیں۔ ان کو یہ گوارا نہیں ہوسکتا کہ چین پر جاپان کا اثر بڑھتا جائے۔ لیکن یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ روسیوں کو چین سے کوئی ہمدردی ہے بلکہ وہ سب کچھ اپنے مفاد کی خاطر کر رہے ہیں۔ چونکہ جاپانی بیرونی منگولیا کو دھمکیاں بھی دے رہے ہیں اس لئے روسیوں کا فرض ہے کہ وہ منگولیا کی سرحد کی مدافعت کریں۔ چین اور جاپان کی لڑائی ۷ جولائی ۳۷ء سے شروع ہوئی تھی جو اب تک جاری ہے۔ چونکہ اب یہ لڑائی چین اور جاپان کے درمیان نہیں بلکہ روس اور جاپان کے درمیان ہو رہی ہے، اس لئے نتیجے کی جلد توقع بھی نہیں ہوسکتی۔ اس بات کا تصفیہ کہ ان دونوں فریقوں میں جیت کس کی رہے گی آئندہ واقعات ہی کریں گے۔

ابھی مشرقِ بعید کے تصفیے سے روس کو چھٹکارا نہ ہوا تھا کہ اسے وسطی یورپ کے سیاسی طوفان کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ ہٹلر اور مسولینی ملک گیری کی ہوس میں برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جرمن ڈانزگ کو بغیر لڑائی کے ہضم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خطرہ روس کے لئے بھی تشویش سے خالی نہیں۔ پھر انگلستان اور فرانس اپنی "امن پسند برادری" میں روس کی شرکت ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک عرصے سے ان جمہوری ملکتوں کے نمائندے روس کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف ہیں لیکن بدقسمتی سے اب تک کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں نکلا۔ ترکوں اور انگریزوں کے میثاق سے جو ابھی مئی میں ہوا، انگریز بہت خوش ہوگئے تھے کیونکہ یہ خیال تھا کہ روس بھی ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کرے گا۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ روسیوں کے ترکوں سے خوشگوار تعلقات ہیں، روسی اب تک اس اشتراکِ عمل کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکِ عمل کی اس گفت و شنید میں بحر بالٹک کا مسئلہ سنگ راہ ہے۔ روس یہ چاہتا ہے کہ اس اشتراکِ عمل میں اس کی تمام مغربی سرحدیں بھی شامل رہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ انگلستان، فرانس اور روس تینوں مل کر بالٹک کی ریاستوں یعنی فن لینڈ، استھونیا اور لٹویا کی بقا کا ذمہ لیں۔ ۱۹۱۸ء میں ان ریاستوں کی تشکیل ہوئی تھی اور اس کے لئے جرمنی اور روس کے بہت سے حصے لئے گئے تھے۔ اب یہ تینوں ریاستیں آزادی کا دم بھرتی ہیں اور جغرافی و تجارتی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ان ریاستوں سے روس اور جرمنی دونوں کا لین دین ہے لیکن روس کے نزدیک ان کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ وہ موسم سرما میں انھی بندرگاہوں سے کام لیتا ہے کیونکہ صرف یہی ایسی بندرگاہیں جو برف سے خالی رہتی ہیں۔ بالٹک کے مسئلے کے علاوہ

ایک یہ بات بھی ہے کہ ہر فریق متضاد سیاسی نظریوں کا علمبردار ہے۔ یعنے انگریز اور فرانسیسی سرمایہ داری کے حامل ہیں تو روسی اشتمالیت کے قائل ہیں چنانچہ اسی وجہ سے یہ سلطنتیں پچھلے کئی سال سے متحد نہیں ہوئیں اور وہ ایک دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اب موجودہ رفتار واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں اور فرانسیسوں کو روسی اشتراک عمل کی توقع ہے۔ اگر روس نے "امن پسند برادری" کے ساتھ واقعی اشتراک عمل کرلیا تو اسے لازمی طور پر وسطی یورپ کی سیاست میں حصہ لینا پڑے گا اور چین کے میدان کے علاوہ روس کو یورپ کے نئے محاذ جنگ کے لئے بھی تیاری کرنی ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر روس انگلستان اور فرانس کے ساتھ معاہدہ نہ کرے تو قرائن یہ ہیں کہ شاید ہٹلر سے لڑائی نہ ہو اور ڈانزگ چپ چاپ جرمنوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔

فرانس

فرانس یورپ کا ایک جمہوری ملک ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر تک یہاں ایک شاہی تھی جو انقلاب فرانس کے بعد ختم ہوگئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ فرانس کی سیاسی تاریخ اٹھارھویں صدی سے تلاطم خیز رہی ہے۔ یہاں ایک نہیں کئی انقلاب ہوئے اور حکومت کے بے شمار تجربے کئے گئے چنانچہ انقلاب فرانس کے بعد ۱۷۹۳ء میں جمہوریت قائم کی گئی لیکن چند ہی روز میں نپولین نے اپنی شہنشاہیت قائم کردی نپولین کے بعد اس کے جانشین بھی خود سرانہ حکومت کرتے رہے مگر ۱۸۴۸ء میں اس شخصی حکومت کا خاتمہ کردیا گیا اور دوبارہ جمہوریت قائم کی گئی۔ لیکن یہ جمہوریت بھی کچھ عرصے کے لئے معطل رہی اور شہنشاہ نپولین سوم نے ۱۸۷۰ء تک عنان حکومت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ بالآخر ۱۸۷۰ء میں تیسری مرتبہ جمہوریت قائم ہوئی جو تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔

انقلاب کی نوعیت اور اس کے نتائج اہل انقلاب کے مزاج اور سیاسی شعور پر منحصر ہوتے ہیں۔ فرانسیسی بہت جذباتی ہیں۔ اسی لئے اس قوم نے بہت انقلاب کئے اور ان میں کئی سیاسی فرقے پائے جاتے ہیں۔ گو فرانس کا سیاسی دستور بڑی حد تک انگلستان کے دستور کی نقل ہے یعنے وہ ایک پارلیمنٹی نظام ہے لیکن متلاطم طبیعتوں کی وجہ سے فرانس میں اتنے سیاسی فرقے بن گئے ہیں کہ پارلیمنٹی نظام میں سنجیدہ اختلاف کے

خوشگوار نتائج جو انگلستان میں دیکھے جاتے ہیں، فرانس میں نہیں ہیں۔ اس فرقہ بندی میں کابینہ کی تشکیل بہت مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ کئی فرقوں کو یکجا کر کے کثرت بنانی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کثرت زیادہ دن تک باقی نہیں رہ سکتی کیونکہ جب کسی فرقے کو وزارت سے اختلاف ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک وزارت ٹوٹتی ہے اور دوسری وزارت کا قیام عمل میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ عظیم کے بعد سے فرانس میں کوئی دو درجن سے زیادہ وزارتیں بدل چکی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں انتہا پسندوں کا زور تھا اور اشتراکی برسر اقتدار تھے۔ لیکن حکومت پر رفتہ رفتہ اعتدال پسندی کا رنگ چڑھتا گیا۔ چنانچہ جب کبھی وزارتیں ٹوٹیں اور ان کی جگہ نئی وزارتیں مرتب ہوئیں، ان میں اعتدال پسندوں کا عنصر بھاری ہو گیا۔ پھر بعد میں اشتراکی اور اشتمالی خیال کے آدمی وزارت سے بالکل خارج کر دیئے گئے۔ اشتراکی جماعت کی حکومت اس لئے ناکام رہی تھی کہ سرکاری بنک نے ان کی مخالفت کی اور بعد کو جب اعتدال پسند وزارتیں مرتب ہوئیں تو ان کے لئے یہ دقت تھی کہ مزدور ان کی مخالفت کرتے رہے۔ فرانس کی یہ اندرونی بے چینی اس وقت بھی کم نہ ہوئی جبکہ دشمن کے حملے کا خطرہ سر پر آ گیا۔ فرانس کی خارجی سیاست پر اس کا اثر پڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ جرمنی اور آسٹریا کے "اتحاد" اور چکوسلوواکیا کی تقسیم کے موقعوں پر فرانس کو برطانیہ کی خوشامد کرنے اور ہٹلر کو خوش رکھنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

گو سولھویں اور سترھویں صدی میں فرانس اور برطانیہ ایک دوسرے کے رقیب تھے لیکن بعد کو ان دونوں میں ایسی گہری دوستی ہوئی کہ فرانس ہر بات میں برطانیہ کا دم بھرنے لگا۔ جنگ عظیم میں فرانس اور برطانیہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور جنگ کے بعد مفتوح قوموں کو دونوں نے مل کر لوٹا۔ جنگ میں جو ملک ہار گئے تھے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان دونوں نے آپس میں بانٹ لئے اور دوسروں کی نوآبادیاں بھی چھین لی تھیں۔ چنانچہ معاہدہ ورسائے سے برطانیہ اور فرانس دونوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ "غیر مطمئن گروہ" جسے معاہدہ ورسائے سے نقصان پہنچا تھا برطانیہ کے ساتھ فرانس کا بھی دشمن ہو گیا۔ اور اب فرانس کو پچھلے کرتوت کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اندرونی بے چینیاں تو ایک طرف رہیں، اب فرانس کو ان تمام مسائل کا مقابلہ کرنا ہے جو برطانیہ کو بھی پریشان کئے ہوئے ہیں۔ مشرق بعید میں جاپان ایک قوی دشمن ہے۔ پھر فرانس کے پڑوسی یعنی جرمنی اور اٹلی اسے چین لینے نہیں دیتے۔ مغرب میں اسپین کی ایک نئی طاقت

کھڑی ہوگئی جو فاسیت کے اثر میں ہے اور یہ یقیناً فرانس کی دشمن ہے! ان حالات میں فرانس کو برطانیہ کی قیادت قبول کرنی پڑتی ہے۔ فرانس اور برطانیہ دونوں نے مل کر پولستان اور دوسری ریاستوں کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر لیا ہے لیکن یہ ضمانت اس وقت تک بے معنے ہے جب تک کہ روس ان کے ساتھ اشتراک عمل نہ کرے۔ ابھی حال میں فرانس نے ترکوں سے دوستی کرلی ہے اور اس اتحاد کا نتیجہ یہ ہے کہ اسکندرونہ ترکوں کو واپس مل گیا لیکن اس واقعہ سے اٹلی اور جرمنی فرانس کے زیادہ مخالف ہوگئے۔ اسکندرونہ کی تحویل کو وہ برا سمجھ رہے ہیں۔ شمالی افریقہ اور شام کی عرب آبادیاں علٰحدہ فرانس کے حق میں وبال جان ہیں۔ یہ ہیں فرانس کی سیاسی گتھیاں جو انگریزوں کی امداد کے بغیر سلجھ نہیں سکتیں اور نیز اس کا حل روس کے اعتماد پر منحصر ہے جس کے لئے گفت وشنید ہو رہی ہے۔

برطانیہ

برطانیہ عمومیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ یہ مملکت جو دنیا کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی ہے، تقریباً ہر براعظم میں اپنا عمل دخل رکھتی ہے! اس کا نظام حکومت پارلیمنٹی ہے اور وہ انگریزوں کی طبیعت کے لحاظ سے کچھ ایسا موزوں اور کامیاب ثابت ہوا ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں بھی اس کی نقل کرنا چاہتی ہیں۔ نازک سے نازک موقعوں پر بھی برطانوی وزرا نے اپنی سیاست کی کشتی اس کامیابی کے ساتھ بھنور سے صحیح سالم نکال لی کہ اس کی تعریف کرنی ہی پڑتی ہے۔ اگر یہی حالات کسی دوسرے ملک میں پیدا ہوتے تو ایک بڑا انقلاب ہو جاتا لیکن انگلستان میں پارلیمنٹی حکومت کی کامیابی اس چیز میں مضمر ہے کہ انگریز صلاحیت پسند اور ٹھنڈے دل سے معاملات پر غور کرنے کے عادی ہیں! اس نظام حکومت کے ساتھ حالات اور وقت نے بھی انگریزوں کا بہت ساتھ دیا چنانچہ ان موقعوں سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے خوب جولانیاں دکھائیں اور دنیا کی سب سے بڑی قوم بن گئے اور اپنی تجارت کے ذریعہ ساری دنیا کے بازاروں پر حاوی ہوگئے۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ انگریزوں میں برتری کا احساس پیدا ہوتا۔ چنانچہ وہ ساری دنیا کی قیادت کے دعویدار ہو گئے۔

لیکن اسے اتفاق ہی سمجھنا چاہیئے کہ پچھلے چند سال سے برطانوی مدبروں کو چاروں طرف سے

پریشانیوں کا سامنا ہے۔ جن قوموں کو انگریزوں نے مغلوب کرکے اپنی شہنشاہت میں داخل کیا تھا وہ ان کی دشمن ہوگئیں اور ہر قدم پر ان کی مخالفت کرنے لگیں۔ چنانچہ جنگ عظیم سے نجات حاصل کرنے کے بعد انگریزوں کے لئے ایک نیا شاخسانہ پیدا ہوگیا۔ اس کے علاوہ جنگ عظیم اور صلح نامہ ورسائے میں انگریزوں نے کمزور رقیبوں پر جو جنگ میں شکست کھا گئے تھے، بیجا سختیاں کرکے ان کو علٰحدہ دشمن بنا لیا چنانچہ جرمن اور ترک، انگریزوں کے سخت دشمن ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دُنیا کے ہر حصے سے انگریزوں کی مخالفت میں آوازیں اُٹھنے لگیں اور برطانیہ بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ آج برطانیہ کا مسلک یہ ہے کہ وہ دُنیا کے امن اور سلامتی کی کوشش میں سب سے پیش پیش ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برطانوی سامراج پھیلا ہوا ہے اور اس کی حفاظت آسان نہیں ہے۔ چنانچہ اس امن پسندی کے مسلک کے لئے انگلستان کو اپنا سیاسی وقار بھی کھونا پڑا۔ دُنیا کہتی ہے کہ پچھلے چند دنوں سے انگلستان نے غیروں سے دب کر اپنی آبرو کھوئی۔ حبش اور البانیہ کے معاملے میں وہ اطالیہ سے دب گیا۔ جرمنی نے صلح نامہ ورسائے کی علانیہ خلاف ورزیاں کیں اور آسٹریا، چکوسلواکیا وغیرہ ہضم کرلیا تو اس سے برطانیہ نے چشم پوشی کی۔ مشرق بعید میں جاپانیوں نے طرح طرح کی بے عزتی کی اس کو گوارا کرلیا۔ لیکن بات یہ ہے کہ سب کچھ محض امن پسندی کی خاطر نہیں بلکہ اس بات کی احتیاط بھی ہے کہ اگر جنگ سر پر آپڑے تو اس کا کامیاب مقابلہ بھی ہونا چاہئے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء سے انگلستان نے اپنی جنگی قوت کو بڑھانا شروع کیا ہے۔ بحر روم اور سنگاپور میں بحری مرکز قائم کرلئے۔ ہندوستان، آسٹریلیا، نیوزیلینڈ، جنوبی افریقہ اور کناڈا میں اپنے کاروبار کو وسعت دی۔ مصر کو آزادی کی ہوا دکھلا کر اور ہندوستان کو نئے دستور میں الجھا کر مشرق سے اطمینان حاصل کرلیا ہے۔ اسے گھر میں بھی اطمینان ہے۔ تمام سیاسی فرقے ملک کی مدافعت کے لئے متحد ہیں۔ مزدور طبقوں کو مطمئن کر دیا گیا ہے اور آئرستانی شورہ پشت کارکنوں کو خارج کرکے انگلستان نے اس فتنے سے بھی نجات حاصل کرلی ہے لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود برطانیہ کو لڑائی سے صرف نقصان ہی کا اندیشہ ہے اس لئے انگریز ارباب سیاست جنگ کی مصیبت سے اپنا دامن چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس وقت دشواری یہ ہے کہ برطانیہ کے سرکاری ملازم بے پروا، ٹھیکے دار، بد دیانت اور کارخانے سست ہیں۔ اسی وجہ سے مُلک میں ضرورت کے مطابق اسلحہ اور طیارے تیار نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ پچھلی مرتبہ امریکہ کو طیاروں کا ٹھیکہ دینا پڑا تھا۔ نیز انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین کی کبرسنی بھی سیاسی راستے میں حائل ہے۔ ان کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو

رانو بنا کر رکھتے ہیں، اس سے بھی نقصان کا اندیشہ ہے۔ شاید انہی اسباب کی بنا پر دنیا یہ سمجھتی رہی ہے کہ انگریز لڑنا نہیں چاہتے اور ان میں لڑائی کا دم خم بھی نہیں ہے! ور سچ تو یہ ہے کہ مسٹر چیمبرلین بھی یہ چاہتے ہیں کہ بغیر لڑائی کے یہ مشکلات حل ہو جائیں، یعنے روٹھی ہوئی قومیں مطمئن ہو جائیں۔ اس کمزور مسلک کا ایک حالیہ نتیجہ یہ ہے کہ جرمنی کو مارچ ۱۹۳۸ء میں آسٹریلیا اور اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سڈٹین علاقے دلوا دیئے گئے اور اپریل میں اٹلی سے سمجھوتا کر لیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلے ستمبر میں مسٹر چیمبرلین نے یورپ کو ایک جنگ عظیم کے خطرے سے بچا لیا، مگر اس کے ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے ہٹلر اور مسولینی کی رفتار ترقی کے لئے تمام راستے کھول دیئے کیونکہ ہٹلر اور مسولینی کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ وہ دوسرے کمزور ملکوں پر قابو پانے کے بعد بحر روم اور فرانس کی افریقی نوآبادیوں پر بھی چھاپہ ماریں گے اس کے علاوہ ان آمروں کا ایک بہت بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلقانی ریاستوں کو ختم کرکے ایشیا میں بھی پیش قدمی کریں اور اپنی ایک عالمگیر طاقت بنالیں اور ظاہر ہے کہ ان کی روک تھام آسان نہیں ہے۔ غالباً انگلستان کے ارباب سیاست یہ سمجھتے ہیں کہ اب "امن پسند برادری" کو قوی بنانے سے ان کی روک تھام ہو جائے گی۔ چنانچہ ترکی سے معاہدہ کرکے اسے اسکندرونہ دلایا گیا اور بحر روم کی طرف سے کسی قدر اطمینان حاصل کر لیا گیا ہے۔ لیکن مسٹر چیمبرلین کی یہ کوشش کہ روس بھی "امن پسند برادری" میں شامل ہو جائے، اب تک بارآور نہیں ہوئی، اس کی کوشش جاری ہے۔ اگر روس انگریزوں کے ساتھ معاہدے میں شریک ہو جائے تو شاید انگلستان کے لئے ایک نئی راہ کھل جائے۔

وسطی یورپ کے طوفان کے علاوہ برطانیہ کے لئے ایشیائی الجھنیں بھی ہیں۔ فلسطین کا مسئلہ اب تک حل نہیں ہوا ہے۔ فلسطینی عربوں کا مسئلہ ایک دنیائے اسلام کا مسئلہ ہے۔ اگر انگلستان عربوں کے خلاف فیصلہ کرے تو عجب نہیں کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں اور خصوصاً عربی دنیا کو اپنا سخت دشمن بنالے! ور پھر ترک بھی عربوں کے خلاف فیصلے کو گوارا نہیں کرسکتے۔ دوسری طرف انگریزوں کے لئے ایک اور الجھن یہ ہے کہ وہ یہودیوں کو بھی منانا چاہتے ہیں۔ اگرچہ اب برطانیہ کو یہودیوں سے قرضہ لینے کی ضرورت نہیں اور وہ اس طرح یہودی سرمایہ داروں کے دباؤ میں نہیں ہے لیکن ان کو شاید پچھلے وعدوں کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ پھر مشرق بعید میں جاپانیوں نے الگ ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آئے دن انگریزوں کی بے عزتی ہو رہی ہے اور وہ ہر طرح ستائے جا رہے ہیں۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لئے رابرٹ کریگی ایک عرصے سے ٹوکیو میں جاپانی ارباب سیاست سے گفتگو کر رہے ہیں لیکن اب تک کوئی

باعزت سمجھوتہ نہیں ہوا۔ گو برطانیہ کے سامنے امریکہ کی مثال ہے کہ اس نے جاپان کے تجارتی معاہدے کو ختم کردیا اور جاپان کے خلاف سخت کارروائی کی لیکن ابھی چند روز ہوئے مسٹر چیمبرلین نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ وہ امریکہ کی مثال پر نہیں چل سکتے کیونکہ امریکہ اور برطانیہ کے حالات جداگانہ ہیں۔ نیز مشرقِ بعید میں اتنا طاقتور جنگی بیڑہ بھی نہیں ہے جو جاپانیوں کا مقابلہ کرسکے۔ اگر ٹوکیو کی گفت و شنید سے کوئی خوشگوار نتیجہ نہ نکل سکے تو یہ سوال رہ جاتا ہے کہ مشرقِ بعید میں جاپانیوں کے مقابلے کے لئے برطانیہ سے تازہ دم بحری بیڑے اور جنگی جہاز روانہ کئے جائیں گے یا یہ سامان پولستان کی سرحد پر جمع رہے گا۔ اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ انگریز مشرقِ بعید میں اپنی عزت بچانے کی کوشش کریں گے یا پولستان کی حفاظت کریں گے جس کی ضمانت دی گئی ہے۔ غالباً ٹوکیو کی بات چیت اور روس سے معاہدے کے بعد برطانیہ کے صحیح مسلک کا اندازہ ہو سکے گا۔

اطالیہ

جب یورپ پر جنگ عظیم کی گھٹائیں چھا گئیں تو اطالیہ میں چند ایسے افراد کا ایک فرقہ پیدا ہوگیا جو اس وقت کے حالات سے مطمئن نہ تھے۔ یہ لوگ ایک ایسی تحریک کے علمبردار تھے جو ۱۹۱۹ء میں سیاسی اور سماجی شکل میں شروع ہوئی اور فاسیت کہلانے لگی۔ فاسیت کی تحریک بالکل فوجی بنیاد پر قائم تھی اور یہ فرقہ ابتدا میں صرف ایسے افراد پر مشتمل تھا جنھوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا لیکن بعد میں اس تحریک کے بہت سے حامی پیدا ہوگئے اور فاشست گروہ بہت طاقتور ہوگیا۔ ابتدا میں فاسیت کا رجحان اشتراکی جمہوریت کی طرف تھا مگر جب فاشست تحریک کے روحِ رواں مسولینی نے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے ۱۹۲۲ء میں اطالیہ کی حکومت پر قبضہ کرلیا تو اس نے آمری شکل اختیار کرلی اگرچہ یہ آمریت ذمہ دار دستوری حکومت کے منافی تھی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسولینی کی قیادت میں ملک نے ایک بلند اور اعلیٰ مرتبہ حاصل کرلیا۔ اطالیہ کی فاشست تحریک کا اثر جرمنی پر بھی پڑا اور ان دونوں ملکوں کا مسلک بالآخر ایک ہوگیا۔ اطالیہ اور جرمنی کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی فاسیت نے اپنے لئے جگہ پیدا کرلی چنانچہ ہنگری، اسپین، پرتگال اور بیشتر بلقانی ریاستوں پر بھی اس تحریک کا اثر ہے اگر غور سے

دیکھا جائے تو خود انگلستان میں بھی برطانوی فاشسٹوں کی ایک انجمن قائم ہے۔

اطالیہ کی جغرافی حیثیت اور اس کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ مسولینی اپنے خارجی مسلک کو بہت دنوں تک معین کرنے کے قابل نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۶ء تک مسولینی کا دماغ دو مرکزوں کے درمیان گھومتا رہا کبھی تو وہ خیال کرتا تھا کہ برطانیہ اور فرانس کے ساتھ دوستی کرنی ضروری ہے اور کبھی وہ سوچتا تھا کہ جرمنی کے ساتھ رشتہ جوڑا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسولینی ۱۹۲۲ء میں جرمنی کا مخالف تھا، مگر چند دنوں بعد جب حالات بدل گئے تو مسولینی کی روش بھی بدل گئی اور اس نے جرمنی سے اتحاد کر لیا۔ اور جب جرمنی میں ہٹلر برسراقتدار آگیا تو اس نے بھی مسولینی کی دوستی غنیمت سمجھی اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ جرمنی کی طرف سے مسولینی کو اطمینان دلایا گیا کہ جنوبی ٹیرال پر جو اطالوی عملداری میں ہے جرمنی کوئی دست درازی نہیں کرے گا۔ ہٹلر نے ۳۰ رجنوری ۱۹۳۴ء کو جو رائش تاغ میں تقریر کی تو اس بات کا اظہار کیا کہ اس سال اطالیہ سے جرمنی کے تعلقات بہت اچھے رہے اور ہم کو اطمینان ہے لیکن یہ دوستی کچھ دیرپا ثابت نہیں ہوئی، کیونکہ جب آسٹریا کا سوال پیدا ہوا اور جرمنوں نے آسٹریا کو ہضم کرنا چاہا تو مسولینی نے اتفاق نہیں کیا۔ چنانچہ جب جرمن پیش قدمیوں سے خائف ہو کر ڈاکٹر ڈالفس نے اطالیہ سے معاہدہ کر لیا تو اب مسولینی آسٹریا کا محافظ بن کر میدان میں آگیا، اور جب ۲۵ رجولائی ۱۹۳۴ء کو آسٹریا کا بدقسمت چانسلر قتل ہو گیا اور اس سازش میں ہٹلر کا ہاتھ نظر آیا تو مسولینی نے اعلان کر دیا کہ: "اگر نازیوں کی نقل و حرکت ایسی صورت اختیار کرے جس سے آسٹریا کا وجود خطرے میں پڑ جائے تو اطالوی فوجیں آسٹریا میں داخل ہو جائیں گی اور پھر میونخ کا رخ کریں گی"۔ اس دھمکی نے اس وقت آسٹریا کو بچا لیا کیونکہ جرمنی ابھی اس قابل نہ تھا کہ اطالیہ سے جھگڑا مول لے لیکن اس کے بعد سے دونوں آمروں کے کان کھڑے ہو گئے۔ وسطی یورپ میں جرمنی کا بڑھتا ہوا اثر مسولینی کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ یہ حالات ایسے تھے کہ حبش کی جنگ تک اطالیہ اور جرمنی کے تعلقات میں برابر کشیدگی رہی۔

مارچ ۱۹۳۵ء میں جب ہٹلر نے معاہدہ ورسائے کو توڑا اور جو فوجی پابندیاں جرمنی پر عائد کی گئی تھیں ان کی خلاف ورزی کی تو برطانیہ اور فرانس نے مسولینی کو فراہم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اسٹرے سا میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں فرانس، برطانیہ اور اطالیہ نے آپس میں اتحاد کیا۔ اور اس طرح جرمنی کے بڑھتے ہوئے خطرے کے خلاف ایک محاذ قائم کیا گیا۔ لیکن اسٹرے سا کانفرنس کے بعد جو سرکاری بیانات

شائع ہوئے اس سے مسولینی کی تشفی نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس کی توقعات کے خلاف تھے چند مہینوں کے بعد مسولینی نے حبش پر حملہ کر دیا اور اس طرح بین قومی قوانین کی خلاف ورزی کی اور دنیا کی باون قوموں کے خلاف سربکف ہو گیا لیکن وہ دنیا میں تنہا نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ جب مجلس اقوام نے اس کو علیحدہ کیا تو ان حالات میں مسولینی کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا یعنے وہ جرمنی سے دوستی کرنے پر مجبور ہو گیا اور دونوں میں دوستی کے پیام سلام شروع ہو گئے۔ اب چونکہ مسولینی حبش کی لڑائی میں الجھ گیا تھا اس لئے ہٹلر نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ پہلے تو اس نے ۷ مارچ ۳۶ء کو وادی رہائن میں فوجیں بھیج دیں اور پھر ۱۱ جولائی ۳۶ء کو آسٹریا کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کے متعلق مسولینی کو مجبوراً اپنی رضامندی ظاہر کرنی پڑی۔ گو حبشہ کے ساتھ دوسری طاقتوں کی ہمدردیاں صرف زبانی تھیں اور کسی نے اس کا عملی طور سے ساتھ نہیں دیا تھا، تاہم اخلاقی حد تک سب لوگ حبش کے ہمدرد تھے اور اطالیہ کو برا بھلا کہتے تھے۔ یہ ایسے حالات تھے کہ مسولینی جرمنی سے بگاڑ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے مجبوراً آسٹریا سے چشم پوشی کر لی اور ہٹلر کے ساتھ رہا۔ اکتوبر ۳۶ء میں کونٹ چیانو میونچ اور برلن بھیجا گیا اور اس نے بیرن نیوراتھ سے گفتگو کی۔ اس بات چیت کے بعد جرمنی اور اطالیہ بالکل متحد ہو گئے اور دونوں نے ایک مسلک پر چلنا شروع کیا۔ پہلی چیز یہ طے پائی کہ اسپین میں اطالیہ اور جرمنی دونوں مل کر کام کریں۔ دوسری چیز یہ تھی کہ جب تک حبش پر اطالیہ کا قبضہ تسلیم نہ کر لیا جائے جرمنی اور اطالیہ مجلس اقوام میں دوبارہ شریک نہیں ہوں گے۔ تیسری چیز یہ تھی کہ رہائن لینڈ سے متعلق اطالیہ جرمنی کی حمایت کرے گا اور اگر ضرورت پڑے تو اس سلسلے میں فرانس اور اس کے ساتھیوں کے خلاف متحدہ طور پر مقابلہ بھی کرے گا۔ اس متحدہ مسلک کے چند روز بعد یعنے نومبر ۳۶ء کو مسولینی نے ملان میں ایک تقریر کی جس میں روم برلن محور کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد یہ ظاہر ہو گیا کہ مسولینی نے اپنے خارجی مسلک کا تعین کر لیا ہے اور وہ ہمیشہ جرمنی کا ساتھ دے گا۔ اس کے بعد مسولینی نے ہٹلر کو اور خوش کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ہٹلر کے مستعمراتی مطالبہ کی بھی تائید کی۔ نیز روس کے خلاف ہٹلر کو آمادۂ مخالفت کر دیا۔ جرمنی کی حمایت میں آسٹریا اور چکوسلواکیا سے دست برداری کا اعلان کیا لیکن ان مراعات کا معاوضہ بھی کم نہیں تھا، یعنے مسولینی نے یہ خواہش کی کہ ہٹلر اسپین میں اطالوی حقوق تسلیم کرے اور بحر روم میں اس کو وسیع اقتدار مل جائے۔

اسپین کا قضیہ ۱۷ جولائی ۳۶ء سے شروع ہوا۔ دیکھنے کو تو یہ اندرونی خانہ جنگی تھی لیکن حقیقت میں یہ ایک بین قومی جنگ ہو گئی کیونکہ حکومت کی طرف سے روس اور فرانکو کی طرف سے اطالیہ و جرمنی میدان جنگ میں حصہ

لے رہے تھے۔ دوسری طرف یورپ کی "امن پسند مملکتیں" یعنے انگلستان، فرانس وغیرہ "عدم مداخلت" کے مضحکہ خیز مسئلے میں الجھی ہوئی تھیں جب اسپین کے حالات بہت پیچیدہ ہوگئے تو فرانس اور برطانیہ کو بھی ڈر ہوا کیونکہ اس سے ان کی تجارت اور بحر متوسط کا مسئلہ نازک ہوجاتا تھا چنانچہ انھوں نے نیون میں ایک کانفرنس کی جس میں بلغاریہ، یونان، رومانیہ، ترکی، یوگوسلاویہ، روس، مصر، اطالیہ اور جرمنی کو شرکت کی دعوت دی۔ مگر اطالیہ اور جرمنی نے اس میں شرکت سے انکار کردیا اس کے باوجود برطانیہ اور فرانس نے متفق الملائک اور بحر روم کی مختلف گذرگاہوں کو اپنے اور دوسری مملکتوں کے درمیان تقسیم کرلیئے اطالیہ اس فیصلے سے ناخوش تھا کیونکہ اس کو وہ حیثیت نہیں دی گئی تھی جو وہ چاہتا تھا۔ اطالیہ کی ناراضی تکلیف دہ تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ انگلستان اور فرانس نے بالآخر بحر روم کے بہت سے حقوق اطالیہ کو دے دیئے۔ مگر برطانیہ اور فرانس اپنی اس کوشش کے باوجود مسولینی کو فراہم نہ کرسکے۔ وہ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد بدستور جرمنی سے ملا رہا۔

روم برلن محور کے ذمہ دار عدم مداخلت کے مسائل اور اطالیہ وجرمنی کے مشترک مفادات ہیں اور یہ محور سیاست یورپ کا ایک نیا کرشمہ ہے۔ یہ دراصل ان آمروں کے منصوبے ہیں جو محور کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور آج ان پر یورپ کی تمام سیاست گھومتی ہے یورپی سیاست پچھلے تین سال سے اس کے گرد چکر لگاتی رہی اور اب کئی نشیب و فراز کے بعد اس کو مستقل بنادیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ دونوں آمر یعنے ہٹلر اور مسولینی ہم آواز اور ہم زبان ہیں لیکن یہ بات بھی ذہن نشیں رہنی چاہیئے کہ ہٹلر کا اقتدار اس قدر بڑھتا جارہا ہے کہ شاید آئندہ مسولینی کسی معاملے میں ہٹلر سے اختلاف نہ کرسکے۔ تاہم دوسری مملکتوں کے مخالفانہ طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اطالیہ جرمنی کا ہمنوا رہے گا۔ گو البانیہ پر قبضہ جمانے کے بعد اطالیہ نے کوئی نیا قدم نہیں اٹھایا مگر اب اس کا مسلک یہ ہے کہ ڈانزگ کے مسئلے میں ہٹلر کا ساتھ دے۔ چنانچہ پولستان کی سرحد پر جرمن فوجوں کے ساتھ اطالوی فوجوں کی مشقیں بھی ہوئیں۔ کونٹ چیانو، برشٹس گاڈن میں ہٹلر سے گفتگو کرکے اب روم واپس آگئے ہیں اور ابھی ۱۵ راگست ۱۹۳۹ء کو اطالیہ نے صاف صاف بتادیا ہے کہ اطالیہ اور جرمنی کا مفاد ایک ہے۔ غرض آجکل ان دونوں آمروں کی توجہ ڈانزگ کی طرف مبذول ہے اس کے حصول کے لئے ہٹلر کو جو قدم بھی اٹھانا پڑے مسولینی اس کے ساتھ رہے گا۔ ڈانزگ کے قبضے کے بعد ممکن ہے کہ مسولینی کسی نئے شکار کی تلاش میں نکلے اور جرمنی اس کی مدد کرے۔

جرمنی

جنگ عظیم کے فاتحوں نے صلح نامہ ورسائے کے ذریعہ جن طاقتوں کو نقصان پہنچایا ان میں جرمنی بھی ہے لیکن یہ زبردستیاں خالی جانے والی نہ تھیں۔ ان زبردستیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتحوں نے شکست خوردہ جرمنی کو پھر اپنا دشمن بنالیا۔ اور وہی معاہدہ ورسائے جس کو فاتح خوانِ یغما سمجھتے تھے اب ان کے لئے زہر ہلاہل ہوگیا جو ملک اس معاہدے کے ذریعے پامال کئے گئے وہ پھر قیامت بن کر اُٹھ گئے۔ معاہدہ ورسائے کو ٹھکرانے لگے اور فاتحوں سے دوبارہ لڑنے کے لئے زندہ ہوگئے۔

ہٹلر ۱۹۳۳ء میں جرمنی کا چانسلر ہوا تھا۔ اسی تاریخ سے اس کی آمریت شروع ہوتی ہے۔ اس کے اسباب جرمنی کے سیاسی اور معاشی حالات میں تلاش کرنے چاہئیں۔ ملک کی معاشی حالت بہت ابتر تھی۔ کئی سال سے معاشی حالات کی خرابی اور جرمن سیاست کی بے بسی نے جرمنی میں تمام پُرانی جماعتوں کی طرف سے مایوسی پیدا کردی تھی اور عوام کو پُرانی تدبیروں پر اعتماد نہ تھا۔ اس مایوسی میں ہٹلر نے ملک کو امید کی جھلک دکھلائی اور دعویٰ کیا کہ وہ جرمنوں کے ہر دکھ کی دوا مہیا کرسکتا ہے۔ اس آواز کا اثر یہ ہوا کہ ملک کے اکثر طبقے جو موجودہ حالات سے مایوس ہوچکے تھے ہٹلر کے ساتھ ہوگئے اور اس طرح ہٹلر نے اپنی ایک قوت پیدا کرلی مگر جب ہٹلر برسرِ اقتدار ہوگیا تو یہ اختلافات اُبھر گئے۔ معاشی الجھنوں کے علاوہ ہٹلر کو بہت سی مخالف قوتوں کا بھی مقابلہ کرنا تھا۔ ابتدائی مرحلے تو ہٹلر نے یوں طے کئے کہ پہلے یہودیوں کو حکومت سے بے دخل کیا اور پھر اشتمالیوں کا قلع قمع کردیا۔ مگر خود اس کی جماعت کے اندر اختلافات تھے۔ قومی اشتراکی جماعت جس نے اپنی قوت سے ہٹلر کو اتنا بڑھایا تھا اب ہٹلر کی مخالف ہوگئی تھی۔ اس جماعت میں ایک نیم فوجی تنظیم تھی اور اس "بھوری فوج" کا افسرِ اعلیٰ رویم تھا جو اشتراکی نظام کا بڑا حامی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مہاجنوں اور سرمایہ داروں کی ملک ضبط کرلی جائے اور ملک کی اہم صنعتوں کو قومی تصرف میں لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ہٹلر کے حامی جو سرمایہ دار اور زمین دار طبقے تھے اس اشتمالی تخیل کے قائل نہ تھے اور ہٹلر کا تمام سہارا انہی پر تھا۔ "بھوری فوج" اپنا اثر بڑھا رہی تھی اور یہ سرمایہ دار طبقے کو گوارا نہ تھا۔ دوسری طرف سرکاری فوج تھی جس کے تجربہ کار قائد اس ہیجانی عنصر کو اپنے میں ضم نہیں کرسکتے تھے۔ غرض اس طرح جرمن سیاست میں دو فریق پیدا ہوگئے تھے۔ ایک طرف رویم اور اس کے

اشتراکیت پسند ساتھی تھے اور دوسری طرف ہٹلر گوئرنگ اور گوئبلز کا اتحاد ثلاثہ تھا جس کی حمایت میں سرکاری فوج اور سرمایہ داروں کا روپیہ تھا ہٹلر کے لئے "بھوری فوج" کا خاتمہ ضروری تھا چنانچہ ۱۹۳۴ء میں رو ہیم اور اس کے ساتھی گولی کا نشانہ بنے لیکن ان کے ساتھ ہٹلر نے قدامت پسند حلقوں کے بعض لوگوں کو بھی سازش کے بہانے سے کچل دیا اور اس طرح اپنے راستے سے تمام مزاحمتیں دور کردیں۔ اس کے بعد ہٹلر کا اقتدار زیادہ مضبوط ہوگیا چنانچہ اس کی قوت کا ظہور اس وقت ہوا جب ہنڈنبرگ کے مرنے کے بعد ہٹلر نے اساسی دستور کے بالکل برخلاف صدارت اور وزارت عظمیٰ کے عہدوں کو ملا کر دونوں کام اپنے ہاتھ میں جمع کر لئے۔ اب وہ جرمنی کا مطلق العنان آمر ہے۔

جب ہٹلر نے جرمنی کی مطلق العنان آمریت اپنے ہاتھ میں لے لی تو اس نے جرمنی کے سدھار کی طرف توجہ کی اور اپنا خارجی مسلک بھی معین کر لیا۔ اصل میں ہٹلر کا مطمح نظر ان قوموں سے بدلہ لینا تھا جنھوں نے معاہدہ ورسائے کے ذریعہ جرمنی کی کھال کھینچی تھی۔ پہلے جرمنی کو مضبوط بنانے کی کوشش کی یعنے جرمنی نے بہت بڑے پیمانہ پر تجدید اسلحہ کا کام شروع کردیا۔ ملک کی فوجی قوت بڑھانے کے مختلف طریقے اختیار کئے اور چند ہی روز میں اتنی طاقت حاصل کر لی کہ بڑی سے بڑی سلطنتیں اس سے گھبرانے لگیں۔ ہٹلر نے جرمنی کی جو خدمتیں انجام دیں ان کی تفصیل تو بہت ہے مگر پچھلے چند سال کے کارنامے مختصر طور پر یہ ہیں:۔ سب سے پہلے اس نے معاہدہ ورسائے کو ٹھکرا دیا اور اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ ڈالفس کے قتل کے بعد اس نے آسٹریا میں اپنی سیاست کا جال پھیلا دیا۔ پھر ہائن لینڈ پر قبضہ، اور سار کا استشارہ ہوا۔ روم برلن محور کی تشکیل ہوئی، اشتمالیت کے خلاف اطالیہ، جرمنی اور جاپان کا اتحاد عمل میں آیا۔ آسٹریا، چکوسلواکیا اور میمل پر قبضہ اور یہودیوں کا جرمنی سے اخراج ہوا۔ یہ سب ہٹلر کے کارہائے نمایاں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جرمنی دُنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

معاشیات کے ماہر یہ ثابت کرتے ہیں کہ جرمنی کا آسٹریا اور سڈٹین علاقوں پر قبضہ ہو جانے سے جرمنی کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا بلکہ جرمنی کے معاشی مسائل اور زیادہ پیچیدہ ہو گئے۔ ان کا خیال ہے کہ بلقان سے جرمنی کو پیداوار غام بھی خاطر خواہ نہیں مہیا ہو سکتی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بلقان کی ریاستوں سے جرمنی کا تجارتی تعلق زیادہ مضبوط ہو رہا ہے۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ اگر بلقان والے چاہیں بھی تو جرمنی سے تجارتی رشتہ نہیں توڑ سکتے۔ دریائے ڈینیوب کی آمد و رفت پر جرمنی کو پورا اختیار ہے اور پھر مغرب میں ٹرئیسٹ کی بندرگاہ اور بحر اڈریاٹک کے ذریعہ اسے بحر روم پہنچنے کا ایسا راستہ مل گیا ہے جو اس کے تجارتی تسلط کو بہت پائدار کر رہا ہے۔ اب بلقانی تجارت کا

معاملہ ڈاکٹر شانت کے حوالے بھی کیا گیا ہے۔ ان مشاہدوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلقان پر جرمنی کا کم از کم معاشی تسلط تو ہو گیا ہے۔

ان مسلسل کامیابیوں سے ہٹلر کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ اب وہ اپنے قدم اور آگے بڑھاتا جا رہا ہے اور یکے بعد دیگرے ان تمام مطالبات کی تکمیل میں لگا ہوا ہے جو اس نے اپنی کتاب "میری کشمکش" میں بیان کئے ہیں۔ نئے علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کر کے اس نے بڑی حد تک اپنی قوم کی ایک پرانی خواہش پوری کر دی، یعنے خواہش یہ تھی کہ جرمن نسل اور جرمن زبان بولنے والے افراد سب ایک ہی سیاسی دائرے میں آجائیں مگر ابھی مشرقی فرانس، جنوبی ڈنمارک، شمالی اور مغربی پولستان، ہنگری، سوئستان اور شمالی اطالیہ میں جرمن زبان بولنے والے موجود ہیں جنھیں جرمنی قوم میں شامل کرنا ضروری ہے! اس کے لئے نازی سیاست کوشش کر رہی ہے۔ میمل تو جرمنی سے ملحق ہو گیا ڈنمارک میں سازشیں ہو رہی ہیں، ہنگری کے جرمن نازی اصولوں کے جال میں آگئے ہیں اور پولستان سے جارحانہ چھیڑ چھاڑ بھی شروع کر دی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ ٹیرال کے جرمن باشندے جو ابھی اطالوی حکومت کی طرف سے خارج کر دیئے گئے ہیں، جرمنی میں ضم کر لئے جائیں۔ ٹیرال کا مسئلہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہٹلر کے منصوبوں کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس وقت پولستان کا مسئلہ ساری دنیا کے لئے جاذب نظر ہے اور جرمن سیاست نے بھی اپنی پوری توجہ اسی طرف مبذول کر دی ہے۔

پچھلے چند دنوں سے ہٹلر نے پولستان کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ ہٹلر کے آئندہ ارادوں کا آئینہ دار ہے۔ اگرچہ چند سال پہلے جرمنی نے پولستان کے ساتھ صلح و آشتی کا معاہدہ کیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف دھوکے کی ٹٹی تھی۔ بات یہ ہے کہ ہٹلر اب تک مشرقی، مغربی، جنوبی مخمصوں میں پھنسا ہوا تھا۔ جب ان سے فراغت ہو گئی تو پھر اس نے پولستان کی طرف توجہ کی چنانچہ گزشتہ مئی میں ہٹلر نے جو تقریر کی اس میں یہ کھلے مطالبے تھے کہ ڈانزگ واپس ہونا چاہیئے۔ اور "گذرگاہ" میں سے جرمنی کے لئے راستہ ملنا چاہیئے۔ پھر جب سانحہ میونچ کے بعد انگلستان اور فرانس نے پولستان کو اس کی حفاظت کی ضمانت دی تو ہٹلر کو ایک بہانہ مل گیا اور اس نے فوراً صلح و آشتی کے پچھلے دہ سالہ معاہدے کو منسوخ کر دیا۔ اور یہ اس بات کی آزمائش تھی کہ صلح پسند اور امن کے حامی کتنے پانی میں ہیں۔

پولستان کی جنگ عظیم کے زمانے میں تشکیل ہوئی تھی چونکہ اس نئی مملکت کی سمندر تک رسائی نہ تھی اس لئے اتحادیوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ ایک Corridor یعنے ایک "گذرگاہ" پولستان کے حوالہ کیا تاکہ

بحر بالٹک تک اس کو راستہ مل جائے ۔ پھر پولستان کے لئے بندرگاہ کا انتظام بھی کیا گیا یعنے مجلس اقوام کی نگرانی میں ڈانزگ کا ایک ”آزاد شہر“ قائم کیا گیا۔ اس ”آزاد شہر“ کی نوعیت اور صورت حال کے متعلق مختلف رائیں ہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اب وہ نہ تو جرمنی کا کوئی حصہ ہے اور نہ پولستان کی سرحد میں داخل ہے البتہ اس آزاد شہر کا پولستان سے اتنا تعلق ضرور ہے کہ معاہدہ ورسائے کی رو سے پولستان کو ڈانزگ کی بندرگاہ استعمال کرنے کا حق دیا گیا اور نیز اس شہر کے خارجی تعلقات کے متعلق پولستان کو اختیارات دیئے گئے چونکہ ڈانزگ میں جرمنوں کی کثرت ہے، اس لئے وہ بالکل پولستان کے حوالے نہیں کیا گیا۔ ڈانزگ میں مجلس اقوام کی طرف سے ایک نمائندہ مقرر کیا جاتا تھا جو ہائی کمشنر کہلاتا تھا۔ اس انتظام سے بہت سے جھگڑے پیدا ہو گئے اور بالآخر جولائی ۳۹ء میں مجلس نے اپنی ضمانت ختم کر دی اور ڈانزگ کے معاملات سے دست بر داری حاصل کر لی چونکہ یہاں ۹۵ فی صد باشندے جرمن ہیں، اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ ڈانزگ جرمنی میں شامل ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے وہاں پروپگنڈا ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ ڈانزگ کے شہری فوجی تعلیم کے لئے جرمنی جاتے تھے اور جو تعلیم خود ڈانزگ میں ہوتی تھی اس پر نازی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ آزاد شہر بالکل نازی ہو گیا۔

بعض ماہرین سیاسیات کا خیال ہے کہ ڈانزگ کو پولستان کی ضرورت ہے۔ ڈانزگ سینٹ کے سابق صدر ڈاکٹر راؤشننگ کا بھی یہی خیال تھا اور ان کو ۱۹۳۵ء میں اسی خیال کے باعث اپنے عہدے کو چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ دوسری طرف پولستان کے مدبروں کا یہ ایقان ہے کہ پولستان کو ڈانزگ کی ضرورت ہے چنانچہ پولستان کے ایک مشہور مدبر ڈاکٹر ہنرک اشٹراس برگ اپنی کتاب ”مسئلہ ڈانزگ“ میں لکھتے ہیں:۔ ”یہ ہمارا ایقان ہے کہ اگر ڈانزگ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو نہ صرف پولستانی گذرگاہ کا اہم ترین علاقہ توموروز چلا جائے گا بلکہ خود ڈانزگ کی آزادی بھی ختم ہو جائے گی“۔ ابھی مئی ۳۹ء میں پولستان کے وزیر خارجہ کرنل بک نے وارسا میں ایک تقریر کی انھوں نے ہٹلر کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ:۔ ”اگرچہ ڈانزگ میں جرمنوں کی کثرت ہے لیکن اس کی بقا اور ترقی کا دارومدار پولستان پر ہے بیرونی تجارت اور جہازرانی کے حقوق جو ڈانزگ میں پولستان کو حاصل ہیں ان کی ہم پوری حفاظت کریں گے۔“ مگر اس قضیے کا حل بہت مشکل ہے کہ ڈانزگ کو پولستان کی ضرورت ہے یا پولستان کو ڈانزگ کی۔ ادھر پولستان نے احتیاط کے مد نظر ایک نئی بندرگاہ گڈینیا بنائی ہے جو اس کے کامل اقتدار میں ہے تاکہ اگر خدا نخواستہ ڈانزگ ہاتھوں سے نکل جائے تو اس نئی بندرگاہ سے بحری ضروریات پوری کی جا سکیں اور ادھر ڈانزگ کے نازی یہ کہتے ہیں کہ ان کو پولستان کی ضرورت نہیں بلکہ جرمنی کی ضرورت ہے۔ آئندہ واقعات ہی اس کا فیصلہ کر سکیں گے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ جرمنی کی طرف سے مسلح آدمی اور اسلحہ ڈانزگ کی طرف بہے آرہے ہیں۔ اطالوی اور جرمن فوجوں کی منتقلیں ہو رہی ہیں اور اس بہانے سے پولستان کی سرحد پر جرمن فوجیں جمع کر دی گئی ہیں ابھی ڈانزگ کی نازی جماعت کے رہنما ہر فورسٹر ہٹلر سے مل کر واپس آئے اور ڈانزگ میں خوب تقریریں کر رہے ہیں۔ انھوں نے صاف صاف بتا دیا کہ ڈانزگ جرمنی میں ضم ہو جائے گا۔" ابھی ۱۹ راگست کی خبر ہے کہ ڈانزگ میں نازی فوج مظاہرے کر رہی ہے۔ دو مہینے پہلے تو یہ کہا جاتا تھا کہ ڈانزگ میں کسی قسم کی فوجی تیاریاں نہیں ہو رہی ہیں۔ مگر اب علی الاعلان ہر فورسٹر کہہ رہے ہیں کہ :۔ "ہماری فوج کافی طاقتور ہے۔ چونکہ ہم کو پولستان سے خطرہ ہے اس لئے ضرورت کے وقت جرمنی کی فوجیں بھی ہماری مدد کریں گی۔" ممکن ہے کہ یہ سب حرکات دفعہ (۵) دستور ڈانزگ کی رو سے غیر قانونی سمجھی جائیں مگر مجلس اقوام کا وجود باقی نہیں ہے اس لئے ان کارروائیوں کو خلاف قانون کہنے کی کون جرأت کرتا۔ یہ دیکھ کر انگریز چاروں طرف سے پریشان ہیں، غالباً ہٹلر اس کو ایک سنہری موقعہ سمجھتا ہے اور اس کا یہ ارادہ ہے کہ بغیر جنگ کے ڈانزگ کو ہضم کر جائے لیکن اگر پولستان اس خطرے کو محسوس نہ کرے تو اس کو بدقسمتی ہی سمجھنا چاہیئے۔ اطالیہ کا یہ اعلان بھی معنے خیز ہے کہ ڈانزگ کا مسئلہ خود اطالیہ کا مسئلہ ہے اور جرمنی اور اطالیہ دونوں اس معاملے میں متحد ہیں۔ ادھر برطانیہ کی ٹوکیو اور ماسکو سے گفت و شنید ہو رہی ہے اب تک اس کا کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں نکلا اگر یہی صورت رہی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چکوسلواکیا کی طرح ڈانزگ بھی چپکے سے رائش میں ضم کر لیا جائے گا کیونکہ انگریزوں کو مشرق بعید میں بھی اپنے وقار کا تحفظ کرنا ہے اور اگر ماسکو کی بات چیت سے کوئی معاہدہ طے نہ پا سکے تو قرائن یہ ہیں کہ انگریز پولستان کی خاطر اپنے وجود کو خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ اور اگر ماسکو میں انگریزوں کو کامیابی ہو گئی اور ان طاقتوں نے یورپ کے بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنا چاہا تو پھر مشرقی خطرہ توجوں کا توں رہا۔ بہرحال یہ ایسی نازک صورت حال ہے کہ برطانیہ کے آئندہ مسلک کے متعلق کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اس موقعہ پر یہ سوال تو قبل از وقت ہے کہ ڈانزگ کے بعد جرمنی کا دوسرا قدم کیا ہوگا؟ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ڈانزگ کے ساتھ پولستان اور رومانیہ کا وجود بھی خطرے میں ہے۔ مگر اس وقت ڈانزگ پر ہی یورپ کی ساری سیاست کا دارومدار ہے۔ ایک زمانے میں بسمارک نے کہا تھا کہ :۔ "بوہیمین سلسلے پر جس طاقت کا قبضہ ہوگا وہی سارے یورپ کی حاکم ہوگی۔" اس قول کی صداقت کو پرکھنے کے لئے ہمیں آئندہ حالات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

تاثیرِ صحبت

از
جناب سید علی نواز رضوی صاحب امانت خانی تصور

صلاحِ نیک دے صحبت ہو ایسی ادب آموز ہو ایسا ہو ہمدم
نہ اپنے واسطے وہ ڈھونڈھ ساتھی جو کر دے خُلق کا شیرازہ برہم
کہ کہتے ہیں جناب شیخ سعدیؒ ہے تمثیل ایک یہ اُن سے منظّم
"گلے خوشبوئے در حمام روزی رسید از دستِ محبوبی بدستم"
جو تھی سرتاپا تصویرِ صحبت

تعالی اللہ اُس کی عطر بیزی معطّر تھا مشامِ جانِ عالم
ہوئی تھی واگرہ غنچے کے دل کی یہ عقدہ باغِ ہستی میں تھا مبہم
ہوا میں نکہتِ گل یا اُڑی تھی کُھلی تھی یا کہ زلفِ عنبریں دم
"بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری کہ از بوی دلاویزِ تو مستم"
ہے تجھ میں کس کی یہ تاثیرِ صحبت

کہا یہ پند سن رہ شاد و خُرّم جو غمگیں کے قریں بیٹھے ہو پُر غم
دَنی کی ہمنشینی کا نہ بھر دم سخی کی ہمدمی کرتی ہے حاتم
شمولِ لئیم سے ہو خود انگبیں سم شکر ہو شیر گر دونوں ہوں باہم
"بگفتا من گلِ ناچیز ہستم ولیکن مدتے با گل نشستم"
میں ہوں اک پرتوِ تنویرِ صحبت

اگر اعلیٰ گھرانے کا ہے تو فرد بڑوں میں بیٹھ کر کیا ہو معظّم
اثر لے خوئے نیکاں کا جو ہے مرد کہیں انساں تجھے تا ابنِ آدم
زمیں کی ہوں وہی بیقدر یں گرد ولے کسبِ خصالِ نیک کردم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم
تصور ہے یہی تفسیرِ صحبت

تنقید و تبصرہ

عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیانِ ریاست ۔ قیمت (عام) دو روپے ۔

یہ علی محسن صاحب ام ۔ اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ کا امتحانی مقالہ ہے جو موصوف نے اپنے امتحان ام۔ اے کے لیے پیش کیا تھا، اور اب یہ کتاب کی شکل میں پیش ہے۔ بڑی تختی اور دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو انجمن طیلسانئین کا بڑا قابل قدر کام سمجھنا چاہیئے جو ایسے علمی مقالوں کو روشنی میں لا رہی ہے۔ اس میں مولف اور ناظرین دونوں کا فائدہ ہے۔ لائق مولف نے اس میں بڑی محنت کی ہے اور اس دور کو جو بظاہر بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل بہت پیچیدہ ہے بڑی قابلیت سے واضح کیا ہے اور اصل ماخذوں سے تمام مواد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ علی عادل شاہ اول کے عہد میں دکن کے حالات بہت پیچیدہ تھے، کیونکہ اس فرمانروا نے اپنے حرص و آز سے دکن میں ایک سیاسی تلاطم برپا کر دیا تھا۔ دوسری سلطنتوں کو اس کا مقابلہ اور اپنی مدافعت کرنی پڑتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب تک علی عادل شاہ زندہ تھا دکن میں بین المملکتی لڑائیوں کا تانتا بندھا رہا۔ اس میں دکن کی اسلامی سلطنتوں کے ساتھ جنوب سلطنت وجیانگر کو بھی دعوت دی جاتی تھی اور اس سے دکن کی یکجہتی کو بہت نقصان پہنچا تھا چنانچہ یہ آگ علی کے انتقال کے بعد بھی سلگتی رہی جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں بڑی مشکل سے فرو ہوئی۔ اس کے فرو کرنے میں دکن کے حکمرانوں کے ساتھ بیجاپور کے متولیان ریاست کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس زمانے کی تمام سیاسی الجھنوں کو روشنی میں لانا آسان نہیں ہے۔ خود بیجاپور کی اندرونی سیاست بھی بہت پیچیدہ تھی۔ لائق مولف نے بڑی خوبی سے ان کو واضح کیا ہے۔ اگرچہ تاریخ بیجاپور سے متعلق یہ اردو میں پہلا کام نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی اردو تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ بہت عرصہ ہوا کہ مولوی بشیر الدین احمد اور مولوی غلام صمدانی خاں گوہر نے عادل شاہی خاندان کی تاریخیں لکھی ہیں۔ بشیر الدین صاحب کی تاریخ تو تین ضخیم جلدوں میں ہے لیکن ان تالیفوں میں

مضمون کی ترتیب اور اسلوب بیان بہت پرانا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ نئے اسلوب پر عادل شاہی خاندان کی ایک مبسوط تاریخ لکھی جائے۔ کتاب زیر نظر ایک حد تک اس کمی کو پورا کرتی ہے اور آیندہ کام کرنے والوں کے لئے ایک اچھا نمونہ ہے۔

لیکن اس تالیف میں دو ایک چیزوں کی کمی ضرور ہے۔ اول تو اس کا نام موضوع کے مطابق نہیں ہے، اس نام سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد ابراہیم کے متولیوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے ابراہیم کے ابتدائی عہد میں ملک کی سیاسی رہنمائی کی تھی، حالانکہ یہ ابراہیم کے ابتدائی عہد کی تاریخ ہے، اس کا نام "ابراہیم عادل شاہ ثانی کا ابتدائی عہد" زیادہ مناسب ہوتا۔ جس تمہید سے اس کی ابتدا ہوئی ہے وہ بہت تشنہ معلوم ہوتی ہے کہ گویا وہ ایک غیر متعلق عبارت ہے۔ تمہید سے ناظرین کو موضوع کتاب سے روشناس کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہاں یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اگر ابتدائی سطروں میں عادل شاہی سلطنت کا ضروری رنگ و روپ بتایا جاتا تو اچھا ہوتا۔ اس کے علاوہ ابواب کی بڑی تقسیم شخصیتوں سے ہوئی ہے۔ حالانکہ تاریخ کی رفتار واقعات شخصیتوں تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ایک زمانے پر ختم ہوتی ہے۔ نیز ابواب میں جو ذیلی سرخیاں ہیں مثلاً "اخلاص خاں کا قتل کیا جانا" اور "ابوالحسن کا قید کیا جانا" وغیرہ بے محل معلوم ہوتی ہیں اور یہ بہت پرانا طریقہ ہے۔ بڑے بڑے موضوع قائم کرکے ان کی اچھی سرخیاں قرار دینی چاہئیں۔

سلطان احمد شاہ بہمنی۔ یہ بھی مولوی ظہیرالدین صاحب ام اے کا امتحانی مقالہ ہے جو موصوف نے اپنے امتحان ام اے کے لئے پیش کیا تھا۔ اگرچہ اس سے بہت پہلے مولوی غلام صمدانی خاں گوہر اور عبدالجبار خاں آصفی نے سلاطین بہمنی کی تاریخ لکھی تھی۔ آخرالذکر نے اس موضوع پر محبوب الوطن کے نام سے ایک مستقل تالیف لکھی تھی جس میں تمام سلاطین بہمنی کے حالات درج ہیں لیکن ان تالیفوں میں مضمون کی ترتیب اور اسلوب بیان اس قدر پرانا ہے کہ وہ موجودہ ضرورتیں پوری نہیں کرتا، یعنے یہ فارسی تاریخوں کی ایک نقل ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں چند سرسری حالات کے سوا سیاست و معاشرت کی کوئی وضاحت نہیں ہے لیکن کتاب زیر نظر جدید اسلوب سے لکھی گئی ہے۔ اس میں نہ صرف سیاسی واقعات ترتیب کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں بلکہ اس عہد کے دستور، معاشرت اور سیاست پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے بعد تمدنی ترقیوں کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت بہمنی کے کسی عہد اور دور پر روشنی ڈالنا آسان کام نہیں ہے کیونکہ اس سلطنت کی ہمعصر تاریخیں جو سلاطین بہمنی کی سرپرستی میں تالیف ہوئی ہیں اب دستیاب نہیں ہوتیں۔ عیون التاریخ، سراج التاریخ اور تحفۃ السلاطین اور بہمن نامہ کے صرف نام رہ گئے ہیں۔ خود احمد شاہ بہمنی نے شیخ آذری سے بہمن نامہ لکھوایا تھا جس کا اب کہیں پتہ نہیں۔ اس لئے

سلاطین بہمن پر قلم اُٹھانے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اور متناقض ماخذوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طریقے سے کوئی چیز وثوق سے نہیں کہی جا سکتی، اور بعض متعاقب ماخذ بھی ایسے تھے جو آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ مثلاً برہان مآثر جو اس مقالے کی تالیف کے وقت بہت کمیاب تھی مولوی ظہیر الدین صاحب نے ان تمام دشواریوں کو عبور کر کے بڑی محنت سے یہ کتاب تالیف کی ہے اس طرح یہ بڑا قابل قدر کام ہے۔ مضمون کی ترتیب بہت اچھی اور زبان بہت شستہ ہے۔ اگرچہ یہ صرف ایک عہد کی تاریخ ہے تاہم اس کو بہمنی دَور کا سب سے پہلا کام سمجھنا چاہیئے اور آیندہ کام کرنے والوں کے لیے ایک اچھا نمونہ ہے۔

اس سلسلے میں دو ایک چیزوں کا ذکر ضروری ہے یعنے یہ زیادہ اچھا ہوتا کہ پہلے باب کو جس میں احمد شاہ سے پہلے کا دَور دکھایا گیا ہے مقدمہ بنایا جاتا، اور اس میں ذرا اختصار سے کام لیا جاتا کیونکہ اس کا مقصد صرف ناظرین کو مضمون سے روشناس کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اصل موضوع سمجھنے کے لیے پس منظر سے واقف ہوں۔ اس میں غالباً زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ چوتھے باب میں جو "احمد شاہ کے انتظامات سلطنت" کی سرخی سے لکھا گیا ہے بے جوڑ مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ نظام حکومت کو "دستور" کی سرخی سے ایک جگہ جمع کیا جاتا، اور تعلیم اور علمی سرپرستی وغیرہ کے مسائل تمدنی کارناموں کی سرخی سے علحدہ رکھے جاتے۔ نیز پانچواں باب جس میں احمد شاہ کی فتوحات بیان کی گئی ہیں وہ چھٹے باب کے تابع ہے۔ کیونکہ خارجی حکمت عملی اور اس کی تشکیل ہمسایہ طاقتوں کے ساتھ پرخاش کا باعث ہوئی اس لیے اس باب کو فتوحات سے پہلے ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک مرید اپنے مرشد کا تذکرہ لکھ رہا ہے۔ حالانکہ تاریخ کا اسلوب بیان اس سے مختلف ہوتا ہے۔ احمد شاہ کے ولی ہونے میں کسی کو شبہہ نہیں ہے لیکن جہاں اس کو بہ حیثیت ایک فرمانروائے مُلک اور سیاس کے پیش کیا گیا ہے۔ وہاں مریدانہ انداز بیان مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ برخلاف اس کے اگر احمد شاہ کی ولایت کا تذکرہ کیا جائے تو غالباً یہ انداز زیادہ موزوں ہوگا۔

ع۔م۔ص

مندرجۂ بالا دونوں کتابیں دفتر انجمن طیلسانئین عثمانیہ حیدرآباد دکن
سے
دستیاب ہوسکتی ہیں۔

مسیح الملک:۔ ماہوار رسالہ (اگست ۱۹۳۹ء) ڈمی سائز۔ چندہ سالانہ ایک روپیہ، اعلیٰ ایڈیشن عمہ۔
پتہ:۔ قرول باغ دہلی۔

مسیح الملک ماہوار طبی رسالہ ہے جو جامعہ طبیہ دہلی کے ترجمان کی حیثیت سے زیر ادارت حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی سابق ہاوس فزیشین جامعہ طبیہ شائع ہورہا ہے۔ حکیم محمد طاہر صاحب تسلیم حیدرآبادی اس کے نائب مدیر ہیں۔ زیر نظر رسالہ پہلی جلد کا پانچواں نمبر ہے۔ اس رسالہ کے اجرا کا مقصد جیسا کہ اغراض و مقاصد میں بتایا گیا ہے یہ ہے کہ "اطباء میں عروج وارتقاء کا جذبۂ ملی پیدا کیا جائے اور ان کے سکون و جمود کو اضطراب و بیقراری سے تبدیل کردیا جائے۔" اس میں جدید و قدیم طب کے مختلف فیہ مسائل پر نتیجہ خیز مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ اس میں اطباء کے لئے امراض کی تحقیقات اور ان کے معالجات وغیرہ پر بحث کی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کی دلچسپی کے لئے سہل اور عام فہم طبی مسائل کے علاوہ حفظان صحت کے متعلق چیدہ اور اہم امور کے بیان کئے جانے کا بھی اہتمام ہے اس لئے یہ رسالہ اطباء اور عوام دونوں کے لئے مفید ہے۔ کتابت طباعت بھی اچھی ہوتی ہے اور ان خوبیوں کے مقابلہ میں چندہ نہایت قلیل ہے۔

رسید کتب

۱۔ **رسول پاک:** عبدالواحد صاحب سندھی ۸؍
۲۔ **دنیا کی کہانی:** پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن عہ
۳۔ **تاریخ ہند کی تمہید:** " " (قیمت) ؟
۴۔ **ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک اجمالی نظر** غلام یزدانی صاحب۔ (قیمت) ؟
۵۔ **مضامین محمد علی:** مرتبہ پروفیسر محمد سرور صاحب عہ؍
۶۔ **گئودان (ناول):** منشی پریم چند آنجہانی عہ؍ ۸؍
۷۔ **قتیل اور غالب:** سید اسد علی انوری فرید آبادی ۸؍
۸۔ **محکومیت نسواں:** ترجمہ معین الدین صاحب انصاری عمہ
۹۔ **سیاسیات کی پہلی کتاب:** پروفیسر محمد عاقل صاحب ام اے ۴؍
۱۰۔ **اجتماعی زندگی کی ابتدا** " " " " ۸؍
۱۱۔ **روح غالب بالتصویر:** ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب قادری زور عہ؍
۱۲۔ **تاریخ گولکنڈہ بالتصویر:** پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ۸؍

(نوٹ: نمبر ۱ تا ۱۰ مکتبۂ جامعہ دہلی سے، نمبر ۱۱ و ۱۲، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہیں)

بزم طیلسانئین

اراکین انجمن سے

چونکہ ارکان انجمن کے ذمہ چندہ رکنیت کا بقایا ہوگیا ہے اور اس کی ادائی میں دقت پیش آتی ہے اس لئے انجمن کے جلسہ عام کاروباری منعقدہ ۲۵ خورداد ۱۳۴۸ف نے طے کیا ہے کہ ارکان انجمن اپنے ذمہ کا بقایا بسہولت ادا فرماسکتے ہیں۔ اس سال وہ جو چندہ ادا فرمائینگے اولاً سال حال کی بابت جمع کرلیا جائیگا۔ سال ہائے گذشتہ کی بابت بقایا آہستہ آہستہ ادا فرمایا جاسکتا ہے۔ سال حال کا چندہ جمع ہوجائے تو بقایا کی وجہ کوئی رکن رائے دہی اور انجمن کے دوسرے کاروبار میں حصہ لینے سے محروم نہ کردیا جائیگا۔

انجمن کے اسی جلسہ میں یہ بھی طے پایا ہے کہ ارکان انجمن کے چندہ میں ایک روپیہ سالانہ کا اضافہ عمل میں لایا جائے اور "مجلہ" ان کی خدمت میں بلا کسی مزید چندہ کے روانہ کیا جائے۔ "مجلہ" کی حیثیت انجمن کے ارگن کی ہے اس کو مستحکم بنیاد پر قائم کیا جائے تو انجمن کا اثر مزید وسعت حاصل کرسکیگا۔

مکتبۂ طیلسانئین کے قیام کی ضرورت

فرزندان جامعہ عثمانیہ کی علمی و ادبی فتوحات، کی انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی ہر سالانہ کانفرنس کے موقع پر نمایش کی گئی جس سے ملک کے نونہالوں کا ایک خوش آیند اثر مترتب ہوا علم و فن کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں عثمانیین کی جماعت نے اپنی ذہنی کاوش سے اضافہ نہ کیا ہو جو کتابیں طبع ہوچکی ہیں ان کی نکاسی کی اب تک صرف انفرادی کوششیں کی گئی ہیں جن سے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ اور بہت سے علمی کارنامے اس وجہ سے کہ خود مصنفین، مولفین اور مترجمین وغیرہ کے لئے ایسے ذرائع حاصل نہیں ہیں کہ اپنی تصنیفات اور تالیفات و تراجم کو منظر عام پر لاسکیں، ابھی زیور طبع سے آراستہ ہی نہیں ہوئے ہیں۔

ایک طرف تو شایع شدہ کتابوں کی نکاسی کی صورتیں پیدا کرنے اور دوسری طرف مسودات وغیرہ کو شایع کرکے ان کو منظرعام پر لانے کے لیے محسوس کیا جاتا ہے کہ ایک باقاعدہ تنظیم کی شدید ضرورت ہے، یہ کمی ممکن ہے کہ "مکتبۂ طیلسانئین" کے نام سے ایک ادارہ کے قیام سے پوری ہوسکے جو مجلۂ طیلسانئین کے تحت قائم کیا جائے اور جو مذکورۂ بالا مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرزندان جامعہ عثمانیہ کے علمی کارناموں کی اشاعت کا کام انجام دے۔

ہم بہت ممنون ہوں گے اگر برادران طیلسانئین اس بارے میں اپنی بیش قیمت رائے سے جلد از جلد "مہتمم مجلہ" کو مطلع فرمادیں تاکہ اس سلسلہ میں ضروری امور پر غور کیا جاسکے۔

مترجمین کی ضرورت

سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی میں جملہ مضامین مثلاً تاریخ (ہند، انگلستان، یورپ، یونان، روما و اسلام)، جغرافیہ، سیاسیات، دستور انگلستان، معاشیات، عمرانیات، فلسفہ، نفسیات، منطق، مابعد الطبیعات، اخلاقیات، قانون، ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، نباتیات، حیوانیات، طب اور انجینیری وغیرہ کے متعلق مستند مترجمین کی فہرستیں مرتب اور موجود ہیں تاکہ جب ضرورت پیش آئے ان سے بطریق اجرت کام کا مناسب انتظام ہو۔ مترجمین کی علمی اسناد کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے انتخاب میں سابقہ کام یا نمونہ کا کام جو پیش ہے وہ بھی ملحوظ رہتا ہے۔

جو طیلسانئین اس قسم کا کام کرنے آمادہ ہوں ان کے نام مع پتے اور ضروری صراحت علمی قابلیت وغیرہ کے دفتر انجمن طیلسانئین عثمانیہ پر روانہ فرمائے جائیں تاکہ ان کی نسبت سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ میں سفارش کی جاسکے۔

محمد ناصر علی صاحب ایم اے (عثمانیہ) رکن انجمن کا مقالہ موضوع "دہلی کی معاشی تحقیق" جو مادر جامعہ کی ایم اے کی ڈگری کے لیے پیش ہو کر منظور ہوا ہے، اس شمارہ سے بالاقساط شایع کیا جارہا ہے موصوف جامعہ عثمانیہ کے ممتاز اور قابل ترین سپوتوں میں سے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کے ہر امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی بسنہ ۱۳۴۵ف میں موضوع پٹنہ کی معاشی تحقیق پر آپ کو جامعہ کی جانب سے میکنزی پرائز عطا ہوا تھا۔

آپ کا تقرر جامعہ عثمانیہ میں جائیداد لکچراری معاشیات پر عمل میں آیا ہے۔ ہم موصوف کو مبارکباد دیتے ہیں۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی ۲۶ سال قبل بنیاد رکھی گئی اور دنیا کے دوسرے بڑے کاموں کی طرح اس کا آغاز بھی عجز وانکسار کے ساتھ شروع ہوا تھا لیکن اخلاص اور مسلسل کوشش وسعی کی بدولت کانفرنس نے حقیقی خدمت ملک کے ایسے روایات قائم کردئے جو کسی نہ کسی امتیاز کے موجب ہوسکتے ہیں۔ کانفرنس کو ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے خدمت کا عام احساس پیدا کرنے میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اس نے ایک طرف تعلیمی معاملات میں بلند نظری کے ساتھ رائے عامہ پیدا کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف (۵۰۰) مستحق اور ہونہار طلبہ کی امداد واعانت میں (۸۰) ہزار روپیے صرف کئے جس کی بدولت غیر معمولی ذہین مگر تہیدست نوجوان میدان علم میں بلندی پر پہنچ سکے۔ ملک بھر میں شاید ہی کسی دوسرے تعلیمی ادارہ کو یہ عزت نصیب ہوئی ہے کہ اس کی مالی اعانت سے ملک میں اس قدر کم مدت میں ایسے قابل اور صاحب کمال افراد پیدا ہوسکے ہوں اس وقت ماہانہ دوسو روپیے اس کام میں صرف ہو رہے ہیں۔

اب اس امر کا عام طور سے احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ کانفرنس رائے عامہ کی صحیح تشکیل اور اعانت طلبہ کے علاوہ دوسرے ضروری امور کو بھی اپنے دائرۂ عمل میں شامل کرے مثالاً تعلیم بالغان اور اضلاع وتعلقات میں مطالعہ گھر اور کتب خانوں کے قیام کو بیان کیا جاسکتا ہے۔

کانفرنس کا موجودہ سرمایہ کام کو پھیلانے میں مانع ہے کانفرنس کی یہ خواہش ضرور ہے کہ دولتمند ارباب خیر کا دست کرم کافی عطیوں کے ساتھ آگے بڑھے لیکن ساتھ ہی اگر کانفرنس کی رکنیت بڑھتی جائے تو اس کی فائدہ رسانی کافی طور سے وسعت حاصل کریگی۔

کانفرنس کی رکنیت کا سالانہ چندہ اس قدر قلیل ہے کہ اس کو ادا کرکے ہر شخص ملک کی تعلیمی خدمت کے فرض سے ایک گونہ سبکدوش ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص صرف تین روپیے سالانہ سے کوئی ایسا

کام نہیں انجام دیسکتا جو نمایاں ہوسکے برخلاف اس کے اگر ایک ہزار اصحاب سال حال یہ چندہ ادا فرمائیں تو کانفرنس کے کار و بار نہ صرف وسعت حاصل کرینگے بلکہ ان میں کافی استحکام پیدا ہو جائیگا۔

ایجوکیشنل کانفرنس کا بارھواں سالانہ اجلاس بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں بتواریخ ۲۱ و ۲۲ آبان ۱۳۴۸ف مطابق ۱۳ و ۱۴ شعبان ۱۳۵۸ھ روز چہارشنبہ و پنجشنبہ تعطیلات انت چنور دشی اور شب برات میں بہ صدارت جناب ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر ام۔اے۔ال ال ڈی بیرسٹرایٹ لا منعقد ہوگا۔

کانفرنس کو تحت ف ۲۶ قانون کمپنی ہائے سرمایہ مشترکہ سرکار عالی رجسٹر کرا دیا گیا ہے۔

اس غرض سے قدیم ضابطۂ کانفرنس کو از سرنو ڈھالا گیا ہے۔ جدید ضابطہ کی رو سے آیندہ ارکان کانفرنس کو معاملات کانفرنس میں زیادہ اثر حاصل ہوگا۔

کانفرنس کا چندہ رکنیت یا تو دوامی ایک سو روپیہ ہے یا صرف تین روپیہ سالانہ۔

امید ہے کہ علم دوست حضرات کانفرنس کی رکنیت قبول فرما کر ممنون اور اپنے حلقۂ اثر میں بھی توسیع ارکان کے لئے کافی کوشش عمل میں لا کر مزید ممنونیت کا موقع مرحمت فرمائینگے۔

دنیا کے ہر حصہ میں پیش روی کے لئے اس وقت عظیم ہل چل اور کشمکش جاری ہے عصر حاضر میں انفرادی کوششوں سے بڑھ کر اجتماعی سعی و کوشش کو کامیابی کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہر سچا حیدرآبادی محب وطن منظم اور پُرخلوص کوششوں میں اپنی اعانت و امداد کا پورا حق ادا کرے۔

کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں اضلاع و تعلقات سے شریک ہونے والے اصحاب کے لئے نظام ریلوے نے کرایہ ریل میں بہت کافی رعایت کی ہے۔ درجۂ اول و دوم میں سفر کرنیکے لئے صرف ایک طرفہ کرایہ ادا کرنا پڑے گا اور درجہ سوم میں ۱½ اکرایہ بشرطیکہ پورے کرایہ کی مقدار دو روپیہ بارہ آنے ہو! اس کے علاوہ سرکار عالی نے اس امر کی منظوری صادر فرمائی ہے کہ ملازمین سرکار اگر اضلاع سے شریک کانفرنس ہونے کے لئے بلدہ آئیں تو زاید از حساب دو روز کی رخصت اتفاقی دی جائے۔ تفصیلات معتمد سے معلوم ہوسکتی ہیں۔

سکریٹری محمد مظہر

صنعتی و تجارتی ڈائرکٹری

دوسری صنعتی نمائش

معاشی کمیٹی انجمن طیلسانئین عثمانیہ حیدرآباد جس نے ماہ آذر ۱۳۴۸ف میں مصنوعات ملکی کی شاندار نمائش کا انعقاد کرکے ملک میں کافی تعارف حاصل کرلیا ہے ایک نہایت جامع اور مفید صنعتی اور تجارتی ڈائرکٹری شایع کررہی ہے۔ یہ ڈائرکٹری صرف نمائش کی حد تک محدود نہ ہوگی بلکہ اس میں ممالک محروسہ سرکار عالی کی قدیم و جدید گھریلو اور اعلیٰ پیمانہ کی صنعتوں کی کیفیت بھی پیش کیجائیگی اور ان صنعتوں کو اہل ملک اور دیگر ممالک کے افراد سے روشناس کیا جائیگا اور حیدرآباد کی عام صنعتی ترقی کی تدابیر اور اس کے ممکنہ وسائل پر فنی لحاظ سے بحث کیجائیگی۔

ڈائرکٹری کے خاص ابواب پارچہ بافی۔ فلزاتی و چوبی صنعتیں انجینیرنگ۔ ہیڈرو الکٹرک۔ ذرائع نقل و حمل۔ شکر۔ سیمنٹ۔ کوئلہ۔ طلاء۔ لوہا و فولاد۔ کاغذ۔ چمڑا۔ سگریٹ۔ دیاسلائی۔ روغنیات۔ کیمکلز اور دیگر گھریلو صنعتوں پر مشتمل ہوں گے۔ عام صنعتی واقفیت کے لئے سرکاری محکمہ جات میں محکمہ صنعت و حرفت، ریل و روڈ ٹرانسپورٹ، محکمہ زراعت، محکمہ تعمیرات، محکمہ معدنیات، محکمہ دیہی ترقیات، محکمہ امداد باہمی، محکمہ صنعتی تعلیم، محکمہ اعداد و شمار و محکمہ کروڑگیری وغیرہ کے نظم و نسق اور کارگذاری کی تفصیل بیان کیجائیگی اور ان محکمہ جات سے متعلق احکام و قوانین کے ضروری اقتباسات بطور ضمیمہ شامل کئے جائینگے۔

شہر حیدرآباد و سکندرآباد اور اضلاع سرکار عالی کے ایسے اہل حرفہ، دستکار، صناع، گتہ دار، تاجر، معمار، نقاش و مصور وغیرہ کے نام و پتے ترتیب وار درج کئے جائینگے جو باداءی فیس مندرجہ نرخ نامہ ضروری ہدایات کی تکمیل کریں۔

دوسری صنعتی **نمائش** جو ماہ بہمن ۱۳۴۹ف مطابق ماہ ڈسمبر ۱۹۳۹ء میں حیدرآباد میں

منعقد ہونے والی ہے اس کے متعلق بھی ضروری معلومات اس ڈائرکٹری میں شریک کئے جائیں گے۔ ڈائرکٹری مذکور کے مضامین و تصاویر وغیرہ کی ایک تفصیلی فہرست علٰحدہ طور پر شایع کی گئی ہے جس کے ملاحظہ سے چھ سو صفحے کی اس کتاب کی وسعت اور جامعیت کا کسی قدر اندازہ ہوسکے گا۔

ڈائرکٹری کی اشاعت میں ملک کا کاروباری طبقہ ہمارے ساتھ پوری طرح تعاون کررہا ہے

ماہ دے ۱۳۴۹ف مطابق ماہ نومبر ۱۹۳۹ء تک ڈائرکٹری شایع کرنے کی تجویز ہے۔ ڈائرکٹری مذکور بزبان اُردو و انگریزی کثیر تعداد میں طبع ہورہی ہے اور اس کے لئے اگر قبل از قبل آرڈر رجسٹر نہ کروائے جائیں تو بعد میں عدم گنجایش کی وجہ سے مایوس ہونا پڑے گا۔

ڈائرکٹری کی قیمت (للعہ) چار روپیے علاوہ (۱۲/ر) محصول ڈاک ہوگی

دیگر معلومات و تفصیلات دفتر صنعتی ڈائرکٹری معظم جاہی مارکٹ اسٹال نمبر ۵ حیدرآباد دکن سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

پراسپکٹس

مرکز مصنوعات ملکی معاشی کمیٹی حیدرآباد امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

مجوزہ سرمایہ (۲۵۰۰۰) پچیس ہزار روپیے سکۂ عثمانیہ، جو دس روپیے کے (۲۵۰۰) حصص پر مشتمل ہوگا۔ حصص کی ادائی حسب ذیل طریقہ پر ہوگی:—

(۱) درخواست کے ساتھ مبلغ دو روپیے آٹھ آنہ فی حصہ۔

(۲) درخواست منظور ہونے پر ″ ″ ″ ″ ″

(۳) پہلا مطالبہ ″ ″ ″ ″ ″

(۴) دوسرا مطالبہ ″ ″ ″ ″ ″

مجلس نظماء

(۱) مولوی محمد فاروق صاحب بی اے۔ ایچ سی ایس۔ مددگار بلدیہ۔ میر مجلس

(۲) پنڈت پریم جی لال جی صاحب .... نائب میر مجلس

(۳) مولوی محمد علی صاحب بی ایس سی۔ ایم اے (عثمانیہ) ..... معتمد

(۴) مولوی محمد علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ) نائب معتمد
(۵) مولوی تجمل حسین صاحب ایم ایس سی رکن
(۶) مولوی محمد یعقوب صاحب مالک روز بسکٹ فیکٹری ؍؍
(۷) نواب میر اکبر علی خاں صاحب بی اے ال ال بی بیرسٹر ایٹ لا ؍؍
(۸) مولوی میر محمود علی صاحب ایم اے لکچرار نظام کالج وصدر معاشی کمیٹی رکن (بحیثیت عہدہ)
(۹) مولوی شرف الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی رکن (؍؍ ؍؍)
(۱۰) مولوی مشتاق احمد خاں صاحب مددگار محکمہ ریلوے ۔ رکن
(۱۱) ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے۔ پروفیسر جامعہ عثمانیہ ۔ رکن

بنکرس

(۱) مملکتی بنک امداد باہمی محدود حیدرآباد (۲) سنٹرل بنک آف انڈیا حیدرآباد

مشیر قانونی: مولوی سید محمد احسن صاحب بی اے ال ال بی وکیل ہائیکورٹ

رجسٹری شدہ پتہ :- عابد روڈ حیدرآباد دکن

وجوہ قیام

کسی ملک کی حقیقی ترقی اور خوش حالی اس کے معاشی استحکام پر منحصر ہے اور ملک کی معاشی بہتری اس کی صنعتی ترقی پر۔ اس لئے صنعتی ترقی کے حصول کے ذرائع اور مسائل پر غور کرنا اور انھیں بروئے عمل لانا۔ ملک کے ہر فرد اور ہر جماعت کا فرض اولین ہے۔ یہ واضح رہے کہ ملکی صنعتوں کو ترقی دینے سے اولاً ملک کی دولت ملک ہی میں رہیگی ثانیاً ملک کے افراد کے لئے روزگار مہیا ہو جائیگا، اور ثالثاً مال برآمد کرنے کی صورت میں ملک کی مجموعی دولت میں اضافہ ہوگا۔

انجمن طیلسانئین عثمانیہ نے ملک کی اس اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے معاشی کمیٹی حیدرآباد کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام مصنوعات ملکی کی ایک عظیم الشان نمائش باغ عامہ میں منعقد کیگئی تھی جس کی یاد ہنوز اہل وطن کے دلوں میں تازہ ہے۔ اس نمائش کے انعقاد کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ ملک میں کئی مفید چھوٹے پیمانے کی صنعتیں ایسی ہیں جن سے اہل ملک ناواقف ہیں۔ نیز ملک میں معدنی ذخائر

اور خام پیداوار کی کثرت ہونے کے باوجود یہاں اکثر صنعتوں کا وجود ہی نہیں ہے۔ موجودہ مصنوعات کی ترقی اور جدید صنعتوں کو قائم کرنے میں چند رکاوٹیں ہیں مثلاً فن تشہیر اور اس کے فوائد سے ناواقفیت، نکاسی کے ذرایع کی عدم موجودگی، سرمایہ وغیرہ اور ملکی احساس کی کمی۔

چنانچہ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاشی کمیٹی حیدرآباد نے امداد باہمی کے اصول پر ایک ادارہ مرکز مصنوعات ملکی معاشی کمیٹی امداد باہمی محدود کے نام سے قائم کیا ہے جس کی رجسٹری بھی بہ ثبت نشان (۳۹۰۸) امداد باہمی سرکار عالی عمل میں آچکی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:-

(۱) ملکی مصنوعات کی ترقی اور اس کے استعمال کے انفرادی اور اجتماعی فوائد کا پرچار کرنا۔

(۲) ملکی مصنوعات کو مقبول بنانے کے لئے مرکزی طور پر تشہیر کے لئے جدوجہد کرنا۔

(۳) ملکی مصنوعات کی فروخت کے لئے ایک دوکان کا قیام عمل میں لانا اور سفر کرنے والے فروخت کنندوں کا تقرر کرنا۔

(۴) مصنوعات کی نمائش کے لئے مستقل نمائش گاہ کا قیام عمل میں لانا

(۵) قابل امداد صناعوں کو سرمایہ فراہم کرنا

پراسپکٹس، ادر درخواست کے نمونے ذیل کے مقامات سے حاصل کئے جاسکتے اور تفصیلاً معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ مرکز مصنوعات ملکی معظم جاہی مارکٹ (۹) حیدرآباد دکن

۲۔ دفتر معاشی کمیٹی (انجمن طیلسانئین عثمانیہ) مصطفےٰ بازار، عابد روڈ، حیدرآباد دکن

دردمندوں اور مایوس صحت مریضوں کی امیدگاہ

مجلس اطباء دہلی

زیر نگرانی و سرپرستی عالیجناب حکیم محمد کبیر الدین صاحب مدظلہ شیخ الجامعہ جامعہ طبیہ دہلی ہمرکز طب باہر رفیق الاطباء کی یہ مجلس بالا ممدوح کی سرپرستی اور حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی پروفیسر جامعہ طبیہ و مدیر رسالہ "مسیح الملک" کی صدارت میں قائم ہوئی ہے۔

پتہ: سکریٹری مجلس اطباء نمبر ۱ باغ نبی دہلی

رجسٹر ۲۹۱



کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست
راستی موجب رضائے خداست

اگر آپ کو نقصان سے بچنا ہے اور صاف سچا معاملہ کرنا ہے تو ہم سے اپنے زیورات تیار کرائیے یا
تیار شدہ خاطر خواہ مال خرید فرمائیے۔

نکلیس، ایر رنگ، چوڑیاں، انگوٹھیاں، جڑاؤ، جالی اور مینا کاری کی
یا دیگر چاندی سونے کے زیورات جو درکار ہوں سونے کی گیارنٹی کے ساتھ
ہر وضع کے تیار کئے جاتے ہیں۔

یہ فرم محض اپنی سچائی اور صاف معاملگی کی وجہ سے ہی ہردلعزیز ہو گئی ہے
اور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ایک دفعہ آزمائش شرط ہے۔

مخفی نہ رہے کہ نمایش مصنوعات ملکی حیدرآباد ۱۳۴۸ف میں عمدہ اور فینسی کاریگری
کیلئے طلائی تمغہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

اس کارخانہ میں مختلف مقامات کے کاریگروں سے ایک لائق تجربہ کار مہتمم کی زیر نگرانی
جو خود بھی اپنے کام میں ماہر ہیں زیورات تیار کئے جاتے ہیں۔

اگر ناپسند مال ہو تو اندرون میعاد تین یوم بلا کسی نقصان کے واپس کیا جا سکتا ہے۔
اور اس کے بعد کبھی بھی لیکن اس صورت میں اجرت کی قیمت وضع کر لی جائیگی۔

سونی جے۔ موتی لال جوہری، چارکمان اردو شریف
حیدرآباد دکن
شاخ:۔ کالی کمان

مکتبہ کی چند قابل دید کتب

آخری رسولؐ۔ سلسلہ مطبوعات مکتبہ علمیہ نمبر (۱)۔ اگر آپ اپنی اولاد کو سچا مسلمان اور عاشق رسولؐ بنانا چاہتے ہیں تو مولانا ماہر القادری کی تصنیف "آخری رسولؐ" پڑھنے کے لئے دیجئے۔ کوثر میں دُھلی ہوئی زبان سچے حالات۔ قیمت ۸ر

۲۔ **غازی مصطفےٰ کمال اتاترک کی سوانح عمری** جس کی مسیحائی نے یورپ کے مرد بیمار کو شفا بخش کر تنومند بہادروں کی صف میں نمایاں جگہ دی۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۲۴۸ صفحے لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت مجلد ۳/ ۲ر

۳۔ **البدر**۔ پروفیسر مولانا عبدالواسع صاحب مرحوم کی وہ محققانہ تصنیف ہے جس میں "جنگ بدر" کے تمام حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ سائز ۱/۱۶ حجم ۱۲۸ صفحے لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت عصہ ۸ر

۴۔ **حکمت اسلامیہ**۔ حضرت علامہ عبدالقدیر صاحب صدیقی کی تصوف و حقائق اور فلسفہ و کلام پر ایک بہترین تصنیف ہے۔ قیمت ۱۰ر۔

۵۔ **نغمات سماع**۔ مولانا نورالحسن صابری نے سماع پر مبسوط بحث کرتے ہوئے مشہور شعراء کا اُردو، فارسی کلام جمع کیا ہے قیمت عہ ۹ر

۶۔ **فطرت انسانی**۔ عہد حاضر کے مشہور علماء نفسیات کی تصانیف کا نچوڑ جسے مولوی سید اسداللہ صاحب نے مرتب کیا ہے، جس میں نفسیات، اخلاقیات، حیاتیات سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت (۳ے)۔

۷۔ **قادیانی مذہب**۔ مولانا الیاس برنی کی وہ محققانہ تصنیف ہے جس میں قادیانی مذہب کی حقیقت کو بہت واضح طور پر بے نقاب کیا گیا ہے۔ قیمت (۳ے)۔

۸۔ **قانون بین الممالک** یعنے سلطنتوں کے باہمی برتاؤ کا دستور العمل۔ از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب قیمت عہ ۱۲ر

۹۔ **بادۂ مشرق**۔ شعر و ادب کا نظر افروز صحیفہ حضرت ساغر نظامی کی رنگین نظموں کا وجد آفریں مجموعہ پڑھیئے اور وجد کیجئے۔ طباعت کتابت لاجواب حجم (۲۵۰) صفحات جلد اعلیٰ قیمت ۔۔۔۔ (۴ عہ)

ان کے علاوہ ڈاکٹر سر اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، راشد الخیری، حضرت خواجہ حسن نظامی، سراج الدین طالب مرحوم، پروفیسر میر ولی اللہ صاحب الٰہ آبادی، پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، مولوی سید محمد صاحب ایم اے، پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب۔ مکتبہ جامعہ ملیہ، اردو دہلوی و دیگر مشہور ادیبوں کی جملہ تصانیف ہم سے طلب فرمائیے۔

مہتمم مکتبۂ علمیہ چار مینار حیدرآباد دکن

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ:- از جناب ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب، مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ)
یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔

دیہی صنعتیں:- دیہی صنعتیں اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے...... از جے۔ سی کمال رپا صاحب قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ:- از جناب ڈاکٹر زین العابدین صاحب، ترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُن کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

شہری آزادی:- اس کتاب میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے ان کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۴ر

ہندوستان میں برطانوی حکومت:- از جناب ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جا رہا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھیئے، جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اور مالی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

ہندوستان میں دیہی قرض:- مصنفہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے اس چھوٹی سی کتاب میں قرضہ کے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کسان کی کیا حالت ہے، ایک گاؤں کی مفصل تحقیقات پیش کی گئی ہے۔
قیمت ۴ر

اجتماعی زندگی کی ابتدا:- سیاسیات و معاشرت اور دوسرے علوم اجتماعی کی معلومات کیلئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ قیمت ۸ر

سیاسیات کی پہلی کتاب:- مرتبہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے۔ اس میں اُردو جاننے والے طبقہ کو سیاسیات کی مبادیات کو آسانی اور اختصار سے سمجھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

صدر دفتر — مکتبۂ جامعہ۔ نئی دہلی **شاخیں** — دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی



مجلۂ طیلسانین

حیدرآباد دکن

تجرباتی تعلیم

از حبیب احمد صاحب بی۔اے ڈپ۔ایڈ لکچرار عثمانیہ ٹکنیکل کالج

ایک جدید موضوع پر اردو زبان میں پہلی کوشش ہے۔ جدید تعلیمی اصولوں، تجربوں اور ان کے مفید عملی نتائج کی تشریح کرتے ہوئے تعلیم کے ہر پہلو کو مثلاً شماریات کا استعمال، ذہنی و درسی آزمائشات، قوانین اکتساب اور انفرادی تفرقات وغیرہ پر قابلیت اور جستجو سے جدید ترین معلومات اور تحقیقات پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ مولوی سجاد مرزا صاحب ام۔اے پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج نے تحریر فرمایا ہے جس میں کتاب کی افادیت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ (منظورۂ محکمۂ تعلیمات سرکار عالی)

حجم ۲۰۶ صفحات مجلد ؎

لاسلکی نشر از حبیب احمد صاحب فاروقی بی۔اے ڈپ اڈ (لکچرار عثمانیہ ٹکنیکل کالج)

لاسلکی (ریڈیو) کا آج کل خوب چرچا ہے۔ اس کتاب میں آواز، برق لاسلکی نشر کے تاریخی ارتقاء، ریڈیو سٹ کے اجزا، جدید ترقیاں اور لاسلکی کے مستقبل پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے

حجم ۸۷ صفحات چھوٹی سائز مجلد عص

ملنے کے پتے۔ انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن

از مصنف کاچی گوڑہ حیدرآباد دکن

مکتبۂ ابراہیمیہ و دیگر کتب فروشان

جلد سوم
شمارۂ چہارم

آبان ۱۳۴۸ف
اکتوبر ۱۹۳۹ء

مجلۂ طیلسانین

انجمن طیلسانین عثمانیہ کا علمی و ادبی
سہ ماہی رسالہ

مجلسِ ادارت

مطبوعہ محمودیہ مشین پریس چار مینار حیدرآباد دکن

مقاصد

۱۔ علمی و ادبی مضامین، معیاری نظمیں اور جامعہ عثمانیہ کے ایم اے اور ایم ایس سی کی ڈگریوں کیلئے پیش شدہ تحقیقاتی مقالات بالاقساط شائع کرنا

۲۔ اردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ شائع کرنا۔

۳۔ انجمن طیلسانین عثمانیہ کی مختلف سرگرمیوں کی روداد کی اشاعت۔

۴۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گی۔

قواعد

۱۔ یہ رسالہ بہمن، اردی بہشت، امرداد اور آبان مطابق جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

۲۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم ایک سو صفحے ہوگی۔

۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ کا آنا ضروری ہے۔

چندہ مجلہ طیلسانین

خریداران حیدرآباد سے عالہ سالانہ، فی پرچہ ۸ر

خریداران بیرون حیدرآباد سے عالہ ۱۲ر سالانہ فی پرچہ ۱۲ر

مع محصول ڈاک

اراکین انجمن طیلسانین عثمانیہ سے عہ سالانہ

علاوہ محصول ڈاک ۱۲ر

نرخ اشتہارات

مقدار		سال بھر	فی اشاعت
پورا صفحہ	سرورق	عسہ	سے
	اندرونی	معہ	عالہ
آدھا صفحہ	سرورق	ہ	عہ ۸ر
	اندرونی	ہے ۱۲ر	عہ ۲ر
پاؤ صفحہ		عالہ	۱۰ر
فی سطر		۸ر	۳ر

مضامین

اداریہ

ہمارے مجلہ کا تیسرا سال ختم ہو رہا ہے کو ہم نے ناظرین کی خدمت میں کل تین ہی شمارے پیش کر سکے جن میں سے ایک ضخیم تھا تاہم مجموعی طور پر ان کی خدمت میں چار سو صفحات کا مواد پیش کیا گیا ہے جس سے نہ تو ان کا نقصان ہوا ہے اور نہ مجلہ کا فائدہ۔ یہ سال اس کا دم واپسیں تھا۔ لیکن اس کے "حسنِ اہتمام" نے مسیحائی کا کام کیا۔ یہ مجلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ "حسنِ روز افزوں" کا مظاہرہ کرتا رہا۔ آگے کام انشاء اللہ اگر اسی انداز سے جاری رہا تو کیا عجب ہے کہ آپ سے نسبت رکھنے والا مجلہ نہ صرف آپ کے شایانِ شان ہو بلکہ آپ بھی اس سے تعلق رکھنے میں کسی دن فخر اور خوشی محسوس کرنے لگیں۔

اس سال انجمن طیلسانین کے "انتخابات" "ہنگامہ خیز" رہے۔ جوشِ "مقابلہ" نے معاملہ دو آتشہ کر دیا۔ کابینہ انتخاب کے نتیجہ کے طور پر دورنگی سی ہو گئی۔ "گھر کی رونق" کو "ہنگامہ پر" "موقوف" سمجھنے والے بہرحال اس کشمکش انتخاب کو مفید سمجھتے ہیں۔ ہر جماعت کے کامیاب امیدواروں کو مبارکباد دیتے ہیں اب ہموئے جانے کے بعد امید ہے کہ تعمیری کام مجروح نہ ہونگے۔ اگرچہ کہ مقابلہ ہر بات کو پہلو دار بنا دیتا ہے۔

کچھ ہو، انتخابات کی اس ٹکر میں انجمن کا مالیہ اور "مجلہ" کا خزانہ "غنی تر" ہو گیا۔ جنگ کے باعث کاغذ کی مہنگائی میں یہ مالی استواری لایق شکر ہے۔

ابھی ابھی ڈاکٹر فرائڈ کے انتقال سے "نفسیات" کی دنیا اپنے ایک اہم کارکن اور فاضل سے محروم ہو گئی۔ اس علم کی تاریخ اسکا نام بھولنے نہ پائیگی۔ نفسیاتی تحلیل کو اس نے بھی پایۂ اعتبار بخشا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں اس نے

اپنی مشہور کتاب تعبیر خواب شایع کی۔

اس نے کوشش کی کہ آدمی کا نفس صرف جسم اور جسمانیات کی زنجیروں میں قید نہ سمجھا جائے۔ خود جسم تابع نفس کس طرح ہے، اس پہلو کو بھی سمجھا جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس نفسیاتی ماہر کی شخصیت کو "خشک" بیان کیا جاتا ہے۔

اس نے اخیر میں اپنے نظریہ سے متعلق حیاتیاتی اور مابعد الطبیعاتی پیچیدگیوں اور الجھنوں کی طرف اپنے خیال اور فکر کی باگ موڑ دی۔ اس کا اظہار اس کی ۱۹۲۲ء کی شائع شدہ "اصول تلذذ سے پرے" والی کتاب (BEYOND THE PLEASURE PRINCIPLE) سے ہوتا ہے۔ وہ اپنی اس اہم علمی چوک پر چونک سا گیا کہ اس نے ایک جزئی محرک کو انسانی جد و جہد کا کلّی محرک قرار دیا۔

ہر چند علم اور تجربہ کی وسعت نے اس کو اس نظریہ کی کوتاہی کی طرف متوجہ کیا لیکن اسکے علم اور فکر کی شہرت کا مرکز اس کا یہی نظریہ رہا کہ انسانی جد و جہد اور کشمکش حیات کا اصل مرکزی محرک صنفی میلان یا جنسی جذبہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے سفر حیات کے محرکات میں اس فطری میلان اور احتیاج کو اپنے محل پر بڑا دخل ہے لیکن یہ یافت اور بصیرت کی بڑی غلطی ہے کہ ہماری زندگی کی دوڑ دھوپ کا کلّی اور اصلی محرک صرف جنسی خواہش اور میلان کو قرار دیا جائے۔ حالانکہ یہ صرف ایک اہم جزئی محرک ہے۔ اڈلر نے اسی طرح غلبہ کی خواہش کو اصلی محرک قرار دیا۔

ایسی ہی غلطی مارکس نے بھی کی کہ صرف پیٹ اور پیٹ کو کشمکش حیات کا واحد محرک قرار دیا، حالانکہ یہ احتیاج بھی محرکات نفس میں ایک اہم محرک ہے مگر یہ غلط ہے کہ اسی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے اور دیگر اہم محرکات اور ان کے آثار اور نتائج سے یکقلم نظر پھیر لیجائے۔

مشہور حقیقت بیں اور آدم شناس شاعر حکیم سنائی نے اپنے "حدیقہ" میں انسانی علم کی اس کوتاہی کی ایک دلچسپ تمثیل لکھی ہے۔ اس کا عنوان ہے "اندھوں کی جماعت اور احوال فیل" قصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ غور کے حدود میں ایک شہر تھا وہاں سب لوگ اندھے تھے۔ اتفاقاً

ایک بادشاہ کا ادھر گذر ہوا۔ اس کے ساتھ باہیبت ہاتھی بھی تھے ہاتھی کا نام سنکر لوگوں کو شوق ہوا۔ ان میں سے چند اندھے ہاتھی کے پاس پہونچے اور لگے ہاتھی کو ٹٹولنے۔ خلاصہ یہ کہ ہر ایک نے ایک عضو پر ہاتھ ڈالا اور ہاتھی کے کسی کسی جزو سے باخبر ہوئے اسی جزو کو کل پر قیاس کیا ؎

ہر یکے را بلمس بر عضوی اطلاع او فتاد بر جزوی

واپسی پر دوسروں نے ہاتھی کا حال پوچھا۔ جسکے ہاتھ ہاتھی کے کانوں تک پہونچے۔ اس نے کہا ہاتھی گلیم کی مانند چوڑا چکلا ہے۔ جس نے اسکے پیر چھوئے تھے اس نے دعویٰ کیا کہ ہاتھی ایک مخروطا عمود کی شکل کا ہے۔ کل اجزا میں سے ایک جزو سے باخبری پر ان کے دعویٰ کی بنیاد اور باہمی مقابلہ تھا۔ ان کی نظر کی خطا یہی تھی کہ کل سے کوئی آگاہ نہ تھا۔ اور اندھا کل پر نظر کرے تو کیوں کر کرے۔

خدائی اور انسان کی حیات اور حقیقت کے متعلق بلا کم وکاست ان جزئی قیاسات رکھنے والے علماء اور ماہرین کا یہی حال ہے کوئی صرف جنسی کشمکش کا شکار ہوگیا کوئی صرف پیٹ سے انسانی تاریخ اور سماج کی پوری تشریح اور توجیہہ کرتا ہے کوئی صرف غلبہ کی خواہش کو دیکھتا ہے اور پیٹ اور جنسی میلان کو نظرانداز کرتا ہے۔ دیگر حرکات تو تیز الگ ہیں۔

انسان اور حیات کے ایک صحت بخش کلی نقطۂ نظر کے بغیر علم اور عمل کی صحت ممکن نہیں۔

پچھلے مہینے ہندوستانی عورتوں کی صف میں لیڈی نرل سرکار کی وفات حسرت آیات ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی سے ثابت کیا کہ اعلیٰ تعلیم اور تربیت سے بے لگام اور آوارہ زندگی کی بجائے ایک نیک خیال خاتون شوہر کی سچی رفیقۂ حیات بننے میں کسقدر مدد دے سکتی ہے۔

اپنے نامور شوہر ڈاکٹر نیل رتن سرکار کی بنگال کی صنعتی ترقی میں وہ دست راست ثابت ہوئیں۔ معاشرتی خدمات اور خدمت خلق کے اعلیٰ خدمات کا انہوں نے قحط طوفان زلزلے کے مختلف مواقع پر پورا پورا عملی ثبوت دیا۔ لیکن انکے اس سارے کردار کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اپنی گھریلو زندگی کا مرکز اور مستقر کبھی نہ چھوڑا۔ (قرن فی بیوتکن) اپنے گھروں کو اپنی زندگی کا مرکز بناؤ پر عامل تھیں۔ اپنے شوہر اور شہریوں کو اپنی اسی خلوت کے مرکز سے روح بخشی۔ بڑے اہتمام اور توجہ سے وہ نمود اور نمایش والی جلوت اور مظاہرہ سے

اپنا دامن بچاتی تھیں۔ زندگی انکی سادہ اور تصنع والی شوکت سے دور تھی انکا عقیدہ اس بات میں قوی تھا کہ صرف پلیٹ فارم کی ہو رہنے سے عورت ایک اچھی ماں اور سچی بیوی نہیں رہ سکتی۔ حالانکہ ان حیثیتوں میں عورت کے اصلی اور ممتاز جوہر کھلتے ہیں۔ ہماری جامعہ کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کیلئے ان کی زندگی میں ایک بلیغ درس ہے۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ہمارے ملک کا ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے۔ وہ مخلصانہ پیہم کوششوں کی ایک یادگار کے طور پر قائم ہے۔ درمیانی وقفہ کے بعد اب وہ "یعنی آگے چلیں گے دم لیکر" پر کاربند ہے۔ اس سال بھی اس کا اجلاس کامیاب رہا۔

تعلیمی اور تعمیری اداروں کی کامیابی کیلئے مختلف عناصر کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اس کانفرنس کی بھی یہی خصوصیت نمایاں رہی اس میں سرکاری اور غیر سرکاری مختلف سیاسی جماعتوں کے افراد نے حصہ لیا۔

گرم اور نرم تقریروں کے علاوہ بہتیری مفید تحریکات پیش ہوئیں۔ مدارس نسواں کیلئے صحت بخش عمارتوں اور ستھرے کھانے کے مقامات پر بھی بطور خاص توجہ کیگئی۔ یو۔ پی اور پنجاب کی حکومتوں کیطرح اعلیٰ تصانیف پر انعامات مقرر کرنیکی حکومت سے خواہش کیگئی۔ کانفرنس کی سالانہ روداد میں تفصیل سے اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ پچھلے سال کی تحریکات کے سلسلہ میں کیا کاروائیاں ہوئی ہیں اور سرکار سے انکے کیا جوابات ملے۔

معمول کی اس کاروائی کے علاوہ ڈاکٹر نظام الدین صاحب صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ، خواجہ محمد احمد صاحب مہتمم عجائب خانہ، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پروفیسر قانون کے مناظری قندیل کے ذریعے مفید لکچر ہوئے۔ پہلے دن شام کے اجلاس میں مسٹر محمد علی جناح نے اپنی شرکت سے کانفرنس کی عزت افزائی فرمائی۔

یہ مہینہ حیدرآباد میں ہماہمی کا رہا۔ چنانچہ اس کانفرنس کے بعد یونانی اطبا کی کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کا کامیاب اجلاس ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک طبی نمایش اور ڈنر کا بھی اہتمام ہوا۔

حیدرآباد میں یونانی طبی کالج نئی راہ پر لگ گیا ہے اور ہندوستان میں یہ طب یونانی کی منزل امید ہے

ان سرکاری کوششوں کے ساتھ ساتھ اطباء کی اپنی خانگی جد وجہد بھی جاری رہی تو یہ فن شایان شان ترقی کرسکیگا۔

ہماری جامعہ کے طلباء قدیم کی انجمن نے مسٹر محمد علی جناح کے اعزاز میں ایک شاندار عشائیہ ترتیب دیا جو عثمانیین کے معاشرتی سلیقہ کا آئینہ دار تھا۔ کھانے کے بعد کسی قدر رنگین سیاسی نوک جھونک اور سخن گسترانہ باتوں کا سلسلہ رہا۔

انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ کے ایک شاندار اجتماع میں مسٹر جناح نے ایک بلند پایہ تقریر "جمہوریت اور ہندوستان" کے موضوع پر فرمائی۔ بعض بنیادی نقاط کو اپنے روایتی قوی اور صحیح استدلال کے ساتھ واضح کیا۔ ان کے بلیغ استدلال میں اصولی فکر کیلئے چند باتیں دلیل راہ ہیں۔

اصلی اور اصولی جمہوریت کی سیاسیات میں اکثریت اور اقلیت سے مراد مشترک تخیل و تمدن (نہ کہ معاندانہ و متضاد) اور ہم رنگ باشندگان ملک کی اکثریت اور اقلیت ہے۔

یہ اکثریت اور اقلیت سیاسی اور معاشی پروگرام کی بناء پر مبنی ہے اور قابل تغیر ہے۔

اصولی جمہوریت میں دوامی ناقابل تغیر فرقہ وارانہ اکثریت اور اقلیت نہیں ہوتی بدنصیبی سے ہندوستان میں یہ صورت حال نہیں۔ اسلئے فرقہ وارانہ دوامی اکثریت یا اقلیت والی حکومت جمہوری نہیں اس سے صرف فرقہ وارانہ استبداد اور دستبرد کی حکومت بن جاتی ہے۔ کیوں کہ ہمارے ملک میں مشترک مفاد کی تہ میں بھی بدترین فرقہ پرستی کام کرتی ہے۔ اسکا عملی حل یہ ہے کہ ہر فرقہ کے نمائندہ ادارہ سے تحفظات کا معاملہ کیا جائے۔ تب اس میں کچھ جمہوریت کی خو بو پیدا ہوسکتی ہے۔

اسلام میں سیاسی جمہوریت یا خلافت اسکی معاشرتی جمہوریت پر مبنی ہے۔ وہ اس سوسائٹی میں اپنا مقصد پورا کرتی ہے جس کے افراد میں اسلامی اخوت، اور مساوات اور آزادی پائی جائے جو جمہوریت کی ایک لازمی شرط ہے اسلامی تمدن کے مختلف پہلو آپس میں مربوط اور مشروط ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا نفاذ ممکن نہیں۔

ذات پات، چھوت چھات کی تفریق والے ملک میں اسلامی جمہوریت کا کیا محل ہے؟ ہندوستان کی تمثیل سے انہوں نے اپنے مطالب کی توضیح کی۔

رشید

حیدرآباد کے کتب خانوں میں تاریخ ہند کے فارسی مخطوطات

از جناب محمد غوث صاحب ام۔اے۔ال ال۔بی۔ (عثمانیہ)

ہندوستان کی تاریخ کو صحیح ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھنے کیلئے سعی و کوشش کے مراتب ابھی بہت کچھ طے ہونے ہیں۔ اس موضوع پر کام کرنے کیلئے جو وسعت موجود ہے وہ غیر محدود ہے۔ نہ صرف گذشتہ ڈیڑھ دو صدی بلکہ اس سے پہلے کی تاریخ کی تحقیق اور تنقید کے لئے ارباب تاریخ کے ذہن و دماغ کی توتوں کو ابھی بہت کچھ محنت و مشقت برداشت کرنی ہے۔ خود عام ملکی تاریخ اور حکمرانوں کے عزل و نصب کی داستان بھی باوجود اسکے کہ اسکو بہت دھرایا جاچکا ہے تحقیق کی کسوٹی پر پوری طرح جانچی نہیں گئی ہے۔ واقعات کے اسباب و علل کا صحیح سلسلہ بتانے اور درست طور پر نتائج اخذ کرنے کے لئے ابھی کافی غور و تلاش کی ضرورت ہے۔ عام تمدنی امور سیاست و انتظام ملک، علمی سرگرمی، اخلاقی و روحانی تنظیم معاشی اور معاشرتی حالات کی جانچ پڑتال کا میدان تو بڑی حد تک محض بن جاتا ہے۔

ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے جس قسم کا مواد موجود ہے اس میں فارسی کتابوں اور فارسی کاغذات کو جو اہمیت حاصل ہے حقیقت میں اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا، واقعہ یہ ہے کہ فارسی کاغذوں پر دسترس حاصل کئے بغیر کوئی شخص تاریخ ہندوستان کے کسی بھی پہلو پر قلم اٹھانا چاہے تو اسکو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہونا قطعی طور سے ناممکن ہے۔ تاریخ کی فارسی کتابوں، یا بطور عام فارسی ادب سے تاریخ نویسی میں اب تک جیسے چاہیے ویسے کام نہیں لیا گیا قدیم فارسی کاغذات اور فارسی [illegible] کو ماخذ قرار دے کر تاریخ لکھنے پر تو اور بھی کم توجہ ہوئی ہے

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور مطبع نولکشور نے ہندوستان کی تاریخ پر واقعی بڑا احسان کیا کہ بعض معیاری کتابیں چھاپ دیں۔ بعض دوسرے ہندوستانی اور یوروپین اداروں اور اصحاب ذوق کے ذاتی شوق کی بدولت ایک ایک دو کتابیں چھپ کر عام دسترس میں آگئی ہیں، لیکن کامل ایک سو دس[۱] سال کی اس جد و جہد کے باوجود فارسی تاریخی ادب عام طور سے مہیا ہوا ہے وہ اس مواد کا عشر عشیر بھی نہیں جو ابھی آنکھوں سے اوجھل کتب خانوں اور لوگوں کے گھروں میں محفوظ ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے تقریباً بیس کتب خانوں کی ایسی فہرستوں سے مدد لیکر جو عصری معیار پر مرتب ہوئی ہیں سررشتۂ آثار قدیمہ ہند کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل خان بہادر مولوی ظفر احسن صاحب بی۔ اے نے بڑی محنت و کاوش سے تاریخ ہند کے عہد اسلامی کے فارسی کتابی ماخذوں کی جو بہت اچھی فہرست مرتب کی ہے اسکے مندرجہ ۳۰۷ کتابوں کے منجملہ اب تک صرف ۵٦-۷۵ کتابیں چھپی ہیں۔ اس سلسلہ میں صحیح اندازہ قائم کرنے کے لئے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اپنے موضوع کے لحاظ سے خود یہ فہرست مختتم نہیں کہی جاسکتی، تذکرہ، سوانح، ادب اور انشا کی کتابیں تو اس فہرست میں بہت ہی قلیل تعداد میں شامل کی گئی ہیں علاوہ ازیں اس فہرست میں صوبہ داری تاریخ کی کتابوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے بحالیکہ شمالی ہند اور گجرات کو چھوڑ کر صرف دکنی حکمران خاندان مثلاً عادل شاہی، عماد شاہی، قطب شاہی اور آصف جاہی خاندانوں کے متعلق جو تاریخی ادب وجود میں آیا ہے وہ اپنی کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے ہر طرح وسیع اور معتبر ہے اسی طرح میسور و کرناٹک اور دوسرے دکنی نوابوں اور راجوں کے متعلق بھی بہت کافی تاریخی ادب موجود ہے۔[۲]

ف ۱۔ تا بجد علم غالباً فارسی تاریخی کتابوں میں عبدالکریم کی تالیف زبدۃ التواریخ جو سیر المتاخرین کا خلاصہ ہے ۱۸۲۱ء میں بمقام کلکتہ شائع ہوئی، ملاحظہ ہو ببلوگرافی آف انڈو مسلم ہسٹری تالیف خان بہادر ظفر حسن مطبوعہ ۱۹۳۲ء صفحہ ۲

ف ۲۔ کرناٹک کے تاریخی فارسی ماخذوں کے متعلق راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ معارف اعظم گڈھ جلد ۳۷ نمبر ۲ بابتہ فروری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا سرسری طور سے ۳٦ کتابیں شمار کرائی ہیں۔

اس سے یہ اندازہ خود بخود قایم ہو سکتا ہے کہ صرف کتابوں کے سلسلہ میں کسقدر وافر اور قیمتی ذخیرہ ہنوز عام دست یابی سے باہر ہے۔

تاریخ ہند کو حقیقت کے نئے سانچے میں ڈھالنے کیلئے جو نئی امنگ پیدا ہوئی ہے اسکو قوی تر کرنے کیلئے کم از کم یہی مناسب ہے کہ ایسی کتابیں مسلسل روشنی میں لائی جائیں جو معلومات کا مستند ماخذ ہوں اور جن سے حالات اور واقعات کا کماحقہ حقیقی علم حاصل ہو سکے۔ آں جہانی سرہنری ایلیٹ نے جس محنت اور انہماک سے اس قسم کی کوشش شروع کی اور ان کے بعد ڈوسن نے جس وفا شعاری سے سرہنری کے مسودات مرتب اور شایع کئے اسکی ممنونیت سے تاریخ ہندوستان کے شایقین کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس کتاب کی ضخیم جلدوں میں بھی صرف ایسی کتابوں کا تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے جو مرکزی حکمرانوں سے متعلق ہیں، علاوہ ازیں تذکرہ و سوانح، ادب و انشاء کی کتابوں کا ذکر کرنے کا حق پورے انصاف کے ساتھ ادا نہیں ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں ان تفصیلی فہرستوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جو عصری معیار پر ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر مرتب ہوئی ہیں۔ طلبۂ تاریخ کو ان فہرستوں سے جو مدد ملتی ہے اسکی احسان مندی سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ ان سے ایک مفصل ببلوگرافی کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا کہ ہر فہرست کا موضوع صرف ایک خاص ذخیرہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ بعض وقیع ارباب تاریخ نے اپنی تالیفوں میں اپنی کتاب کے موضوع کی حد تک اپنے ماخذوں کو شمار کرا دیا ہے۔ ان سے ایک مفصل ببلوگرافی کی ضرورت رفع نہیں ہو جاتی۔ بہر حال ان حالات میں بڑی ضرورت ہے کہ ایک ایک کتب خانہ دیکھکر تاریخ ہند کے فارسی ماخذوں کی ایک مفصل ببلوگرافی مرتب کرنے کیلئے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ایک منظم کوشش عمل میں لائی جائے۔ اولاً بہتر یہ ہوگا کہ انفرادی طور سے ہر شخص یا ہر کتب خانہ جہاں تاریخ

ملاحظہ ہوں سر جدوناتھ کی تالیفات۔ ۱۔ ایسیو اجی اینڈ ہز ٹائمز۔ ۲۔ ہسٹری آف اورنگ زیب جلد دوم و سوم پہلا اڈیشن۔ ۳۔ فعل اوتنگرشن ــــ مولوی سید نجیب اشرف صاحب کی کتاب مقدمہ رقعات عالمگیر ...... پروفیسر قانون گو کی "شیر شاہ"۔ ڈاکٹر محمد ناظم کی کتاب محمود غزنوی پر۔

کی فارسی کتابیں موجود ہوں اپنی فہرستیں شایع کرے جیسے کہ ابھی حال میں مہاراج کمار رگھوبیر سنگھا ڈی لٹ۔ ال ال ڈی نے اپنے کتب خانہ کے فارسی مخطوطات کی فہرست مرتب اور شائع کی ہے ساتھ ہی ساتھ صوبہ واری حالات پر روشنی ڈالنے والی کتابوں کی فہرستیں بھی علیحدہ علیحدہ ترتیب دی جانی چاہیئے تا آنکہ بالآخر سارے ہندوستان کی تاریخ کے ہر پہلو اور ہر عہد کی ساری تاریخی تصانیف ارباب تاریخ کے علم میں آجائیں[لہ]۔ اس نقطۂ نظر سے مولوی سید شمس اللہ صاحب قادری کا ایک مختصر رسالہ موسوم بہ "مورخین ہند" اس سلسلہ کی ایک ابتدائی کڑی قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایک مفصل ببلوگرافی کے علاوہ خود ہندوستانی فارسی ادب تاریخ کی ایک تدریجی تاریخ اور اس پر عصری نقطہ ہائے نظر سے تنقیدی جرح و تعدیل کا وقت بھی اب آگیا ہے۔ ہندوستان میں

لہ۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے بھی جو کچھ اس سے بن آیا سعی کی ہے چنانچہ اسکے خاندان میں جو کثیر التعداد مخطوطات موجود ہیں ان کی فہرست مرتب کرنے میں کئی سال سے مصروف ہے۔ اس فہرست سے اہم مخطوطات کا ایک علیحدہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے جسمیں ہندی تاریخ کے سلسلہ میں کام آنے والے مخطوطات بھی بہ تعداد کثیر شامل ہیں، یہ تذکرہ کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ نیز اس نے دفتر دیوانی کے فارسی تاریخی مخطوطات کی فہرست دو جلدوں میں ترتیب دی جو دفتر موصوف میں محفوظ ہے۔ علاوہ ازیں چند دوسرے مضامین مختلف اردو رسایل میں شائع ہوئے مثلاً (۱) "کرناٹک کی دو فارسی تاریخیں" کے عنوان سے توزک والاجاہی اور انور نامہ پر ایک مضمون رسالۂ جامعہ دہلی میں شائع ہوا۔ (۲) "کرناٹک کی تاریخ کے مخطوطات" کے عنوان سے ایک مضمون رسالۂ معارف اعظم گڈھ (فروری ۱۹۳۶ء) میں طبع ہوا۔ (۳) "کتب خانہ دفتر دیوانی" کے عنوان سے ایک مضمون رسالہ معارف اعظم گڈھ (جون ۱۹۳۶ء) میں چھپا (۴) مدراس کے بعض کتب خانے" کے عنوان سے بطور ایک رپورٹ جو تحریر مرتب کی اس میں مدراس کے چند کتب خانوں کے مخزونہ ایک سو سے زیادہ تاریخی کتابوں کی صراحت کی ہے یہ تحریر رسالۂ شہاب حیدرآباد کے تین نمبروں (جنوری، اپریل، اور مئی ۱۹۳۷ء) میں شائع ہوئی۔ (۵) رسالۂ شہاب (فروری ۱۹۳۷ء) میں "حضرت آصفجاہ اول کے احکام" کے عنوان سے مولوی خان جرات کے منشآت کے چار مجموعوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ۱۲

تاریخ کا جو سرمایہ وجود میں آیا وہ اپنی وسعت اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے ہر طرح ممتاز ہے اسکے امتیاز اور اسکی قدر و قیمت سے دنیائے علم ابھی پوری طرح واقف نہیں ہوسکی ہے۔

کتابوں کے متعلق تو خیر تھوڑی بہت توجہ ہوئی لیکن تاریخ ہند کے ایک دوسرے اہم ماخذ فارسی کاغذات کے سلسلہ میں جو توجہ کی گئی وہ بہ مقابل نہ ہونے کے ہے۔ اب تک کاغذات کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں مولوی بشیرالدین احمد مرحوم کی کتاب موسوم بہ "فرامین السلاطین" اے ٹی بہ مشن آفس پونا کے متفرق فارسی کاغذات کا ایک چھوٹا سا رسالہ اور بہارت اتہاسا سنشودک منڈل پونا کا ایک مجموعہ "مجموعہ مکاتیب مجموعہ داد" کے نام سے اور نیز اسی منڈل کی توجہ سے دو ایک اور مجموعے شایع ہوئے ہیں۔ فارسی کتابوں میں جو کاغذات بطور حوالہ نقل کیے گئے ہیں انہیں مراۃ احمدی[1]، تاریخ ظفرہ[2]، توزک والاجاہی[3] اور تحفۃ الاخبار[4] کا نام لیا جاسکتا ہے۔ قصر والاجاہی میں بلا شبہ سرکاری مراسلت کا بکثرت حوالہ دیا گیا ہے لیکن مولف نے مراسلت کے نقل کرنے میں اصلی مراسلت بجنسہ نقل نہیں کردی بلکہ مراسلت کی اصلی عبارت اپنی مسجع و مقفیٰ تحریر میں بدل دی ہے گویا قالب بدل دیا ہے البتہ کرنول کی ایک ضخیم تاریخ میں اصلی مراسلت نہ صرف نہایت کثرت سے نقل کی گئی ہے بلکہ اس میں کوئی تصرف بھی نہیں کیا گیا[6]۔ چند حالیہ مرہٹہ مولفوں نے اپنی بعض مرہٹی تالیفوں میں اصلی کاغذات نقل کیے ہیں۔ انہوں نے بہمنی زمانہ کے کاغذات شائع کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے' دارالمصنفین نے مولوی سید نجیب اشرف صاحب کی تالیف "رقعات عالمگیر" جو شائع کی ہے اوسکی ایک علیحدہ نوعیت قرار دی جانی چاہیے۔

---

[1] گجرات کی تاریخ جسکو بہ دیرنواب علی صاحب نے مرتب کیا اور جو بروڈہ میں سرکاری طور پر چھاپی گئی ہے
[2] خاندان آصفیہ کی تاریخ گردھاری لال کی تالیف جسکو قاضی تلمند حسین صاحب نے مرتب کرکے گورکھپور سے شایع کیا
[3] کرناٹک کی تاریخ برہان خاں ہانڈی کی تالیف جسکے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ مدراس یونیورسٹی نے شائع کیا ہے
[4] کرناٹک کی تاریخ تالیف منشی غلام حسین [5] کرناٹک کی تاریخ تالیف مولوی محمد حسین تمنا
[6] اس تاریخ کی ایک جلد معائنہ میں آئی تھی۔

ان چند کتابوں کے قطع نظر اصلی فارسی کاغذات کے ذخائر کی فہرستیں شائع کرنے پر تو شاذ و نادر ہی توجہ مبذول ہوئی ہوگی۔ البتہ تاریخ ہند کے انگریزی دور کے متعلق امپریل رکارڈ ڈپارٹمنٹ اور دوسرے صوبہ واری رکارڈ آفسوں نے تھوڑی بہت توجہ کی ہے چنانچہ کیلنڈر آف پرشین کارس پانڈنس" کی کئی جلدیں امپریل رکارڈ ڈپارٹمنٹ نے انگریزی میں شائع کی ہیں لیکن انہوں نے بھی اصلی فارسی کاغذات شائع نہیں کئے۔

فارسی کاغذات کو متفرق مقامات اور دوسرے افراد سے بالمعاوضہ یا امانۃً حاصل کرکے کسی مرکزی مقام پر مخزون کرتے جانے پر تو توجہ گویا کچھ بھی نہیں ہوئی بحالیکہ ان کی تاریخی اہمیت دن بدن زیادہ بہ زیادہ محسوس ہوتی جارہی ہے۔ قدیم نظم ونسق اور مختلف حکومتی اداروں کے کاروبار پر روشنی ڈالنے کیلئے ان کاغذات کے علاوہ کسی اور ماخذ سے بمشکل مدد مل سکیگی۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہوگا جہاں فرامین اور پروانوں اور دیگر سرکاری کاغذات کا قابل اعتماد ذخیرہ فراہم نہ ہوسکے۔ پونا کے بھارت اتہاسا سم شودک منڈل کے علاوہ جہاں خاص اہتمام سے کاغذات بالمعاوضہ امانۃً اور عارضی استعمال کیلئے حاصل کئے جاتے ہیں کلکتہ کے وکٹوریہ میموریل اور دہلی کے عجائب خانۂ قلعہ میں اس جانب قدرے توجہ ہوئی ہے۔ حیدرآباد کے عجائب خانہ میں بھی اس جانب توجہ شروع کیگئی ہے۔

بہرحال ان حالات میں مشرقی علوم کے طالب علموں کے لئے حیدرآباد میں تحقیق و کاوش کا سامان بافراط موجود ہے، حیدرآباد کے ذخائر کی تعداد اور قیمت کا حقیقی اندازہ ابھی پورے طور پر ہوا نہیں ہے۔

حیدرآباد میں مخطوطات کے جو ذخائر موجود ہیں وہ یا تو سرکاری ہیں یا خانگی، سرکاری ذخائر میں ایک تو کتب خانہ آصفیہ ہے دوسرے وہ ذخائر ہیں جو دوسرے علمی اداروں کے ساتھ قایم ہیں جیسے کہ جامعہ عثمانیہ کا کتب خانہ اور عجائب خانہ کا کتب خانہ، خانگی ذخائر ایک تو وہ ہیں کہ جو کسی تعلیمی یا ادبی ادارہ کے ساتھ قائم ہیں جیسے کہ مدرسہ نظامیہ کا کتب خانہ اور ادارہ ادبیات اردو کا کتب خانہ دوسرے وہ جو کہ استفادۂ عام کیلئے کھول دیئے گئے ہیں مثلاً کتب خانہ سعیدیہ تیسرے وہ کتب خانے جن سے ابھی بطور عام استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے کتب خانے حیدرآباد میں بے شمار ہیں

امرا، علما اور مشائخین کے ہر قدیم گھرانہ میں قلمی کتابوں کا چھوٹا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ایسے ذخائر میں نواب سالار جنگ بہادر کا ذخیرہ سب میں سرآمد ہے۔ پائیگاہی کتب خانے کتب خانۂ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ، راجہ شام راج راج ونت بہادر کا کتب خانہ، حکیم محمد قاسم مرحوم کا کتب خانہ آغا حیدر حسین صاحب کا کتب خانہ، مولوی عطا حسین صاحب کا کتب خانہ، نواب معشوق یار جنگ بہادر کا کتب خانہ، مولوی احمد خیر الدین صاحب کا کتب خانہ، مرزا نجف علی خاں صاحب کا کتب خانہ، مولوی شمس اللہ قادری صاحب کا کتب خانہ، مولوی مظفر حسین صاحب کا کتب خانہ، محمد اشرف صاحب الخبیر کا کتب خانہ، مفتی محمد سعید خاں مرحوم کے خاندان کے کتب خانے غرض کئی کتب خانے اور ہیں جن میں مخطوطات کے انبار موجود ہیں، ان سب کتب خانوں میں تاریخ کے موضوع کی کتابیں ٹٹولی جائیں تو خاصا دفتر ترتیب پا جائیگا۔

تاریخ کے موضوع کی کتابوں کے متعلق کسی کتب خانہ میں کتابوں کا کھوج لگاتے ہوئے تاریخ کے لفظ کو بہت ہی وسیع مفہوم میں استعمال کرنا چاہیئے۔ سوانح اور تذکرہ کی کتابیں تو دراصل فن تاریخ میں ہی شامل ہیں لیکن بسا اوقات سفرنامے نیز انشا و مکاتیب اور کبھی نہ کبھی ادب کی کتابیں بھی اس لحاظ سے کہ کسی تاریخ کیلیئے اصلی اور کارآمد مواد تاریخ کی کتابوں کے ماسوا دوسرے موضوع کی کتابوں سے فراہم ہوتا ہے۔ تاریخ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اسکی دو ایک مثالیں بے محل نہیں ۔ روضۂ تاج محل کے بنانے والوں کے متعلق مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مقالہ رسالۂ معارف میں بعنوان "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" شائع ہوا ہے یہ مقالہ تلاش اور تفحص کی ایک نادر مثال ہے اس مقالہ کے لیئے مولانا موصوف کو رہبری ہوئی تو ادب کی ایک کتاب سے اور مزید مدد ملی تو اخلاق کی ایک کتاب سے[1]۔ اسی طرح قاضی عبد النبی احمد نگری نے ایک کتاب اسلامی علوم و فنون کے اصطلاحات کی توضیح و تشریح میں دستور العلماء کے نام سے بطور ایک دائرۃ المعارف کے لکھی ہے۔ بظاہر کوئی خیال

---

[1] یہ مقالہ رسالہ معارف اعظم گڈھ جلد ۲۷ میں شائع ہوا ہے۔

پیدا نہیں ہوتا کہ اس کتاب میں تاریخ کا مواد مہیا ہوسکیگا، لیکن مولف نے اس کتاب میں شہر احمد نگر اور نظام شاہی خاندان کے حالات میں کئی صفحات لکھ ڈالے ہیں[۱]۔ جغرافیہ کی کتابیں اس صدی سے قبل جس طرح بھی چاہے لکھی گئی ہوں لیکن تاریخ کے طالب علم کیلئے ان سے کسی طرح مفر نہیں۔

اس نقطۂ نظر سے حیدرآباد میں "تاریخ ہند" کے جو مخطوطات فراہم ہو سکتے ہیں ان کی ایک سرسری مساحت کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے کہ ایک مرتب سلسلہ سے یہ مساحت مناسب ہو گی یہ بہتر ہوگا کہ خان بہادر مولوی ظفر حسن صاحب کی مرتبہ فہرست کو ہی معیار قرار دے کر یہ دیکھا جائے کہ کون کونسی کتابیں حیدرآباد میں فراہم ہوسکینگی۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ گو خان بہادر موصوف نے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے بیس کتب خانوں کے مخطوطات کی فہرستوں سے مدد لی لیکن اپنے کام کی تکمیل میں انہوں نے حیدرآباد کے کتب خانوں کو نظرانداز کردیا بحالیکہ صرف کتب خانہ آصفیہ کے ہی ذخائر کی فہرستیں جو چھپ گئی ہیں ٹٹولی جاتیں تو کافی تھا۔

بہرحال سب سے اول خان بہادر موصوف کی ترتیب کے بموجب مشرق کی عام کتابوں کا جائزہ لیا جائیگا۔ یہاں یہ امر واضح کرنا بے محل نہیں کہ مشرقی تاریخ کی عام کتابوں کا مطالعہ محض اسلئے ضروری نہیں کہ اس میں ہندوستان کے حالات کا بالعموم ضرور تذکرہ آجاتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ہندوستان کے اسلامی دور کی تاریخ کا ہر پہلو خواہ وہ مذہبی ہو یا علمی معاشرتی ہو یا سیاسی ہندوستان سے باہر کی تاریخ سے مربوط ہے۔

خان بہادر مولوی ظفر حسن صاحب نے عام تاریخ کی غیر مطبوعہ کتابوں میں ۳۷، ۴۰ کتابیں شمار کرائی ہیں ان میں بعض تذکرہ کی اور بعض جغرافیہ کی کتابیں بھی شامل ہیں، ان کتابوں کے من جملہ حیدرآباد میں جو کتابیں تاحال دست یاب ہوسکیں ان کا حال ذیل میں قلم بند کیا جاتا ہے۔ پہلے تاریخ کی کتابوں کے متعلق اور بعد ازآں تذکرہ کے متعلق۔ خان بہادر موصوف نے اپنی فہرست مرتب کرنے میں گو عہدداری ایک عام تقسیم ضرور عمل میں لائی ہے لیکن اسکے علاوہ انہوں نے کتابیں نہ تو حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کی ہیں

---

[۱] ۔ یہ کتاب مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد نے طبع اور شائع کردی ہے۔

اور نہ سنہ تالیف کے اعتبار سے۔ ذیل میں یہ کوشش کیجائیگی کہ کتابوں کا تذکرہ سال تالیف کے اعتبار سے کیا جائے

(۱) ـــــ تاریخ بناکتی[۵۱] ۔ اس کتاب کے متعلق پیش نظر نسخہ کے دیباچہ سے جو امور واضح ہوئے وہ یہ ہیں۔

۱۔ کتاب کا پورا نام روضۃ اولی الالباب فی تواریخ والانساب ہے۔

۲۔ مولف کا نام ابوسلیمان داود بن ابوالفضل محمد البناکتی ہے، ان کو نہ صرف تاریخ نویسی بلکہ شعرگوئی میں بھی مہارت حاصل تھی۔

۳۔ یہ کتاب ۷۱۳ھ میں بہ زمانہ سلطان ابوسعید تالیف ہوئی

۴۔ کتاب کا موضوع ممالک مشرق کی تاریخ ہے ملوک روم، ملوک فارس اور سلاطین اسلامی کے حالات قلمبند کیئے گئے ہیں۔

۵۔ ہندوستان کے حالات راجہ باسدیو کے زمانہ سے سلطان علاءالدین کے زمانہ تک بیان کیئے ہیں۔

نام کے سلسلہ میں جیسا کہ ڈاکٹر ریو نے لکھا ہے "اولی الالباب" کے بعد "فی تواریخ الاکابر والانساب" نام کا صحیح جزو ہے۔ سال تالیف کے سلسلہ میں ڈاکٹر ریو نے ۷۱۷ھ میں تالیف قرار دی ہے ممکن ہے کہ ۷۱۳ھ آغاز تالیف کا سال ہو اور ۷۱۷ھ سال اختتام۔

اس ضخیم کتاب کا ایک کامل نسخہ گو اُس کا خط درست نہیں کتب خانۂ آصفیہ میں فراہم ہوچکا ہے[۵۲]

(۲) تاریخ ایلچی نظام شاہ[۵۳]

۱۔ کتاب کا کوئی خاص نام معلوم نہ ہوسکا۔

۲۔ مولف کا نام خورشاہ بن قباد الحسینی ہے۔ برہان نظام شاہ کی جانب سے ان کو شاہ

۵۱۔ ملاحظہ ہو فہرست ظفر حسن صاحب صفحہ ۱۴ نمبر ۱۰۸

۵۲۔ کتب خانہ آصفیہ تاریخ فارسی نمبر ۹۴۴ "برٹش میوزیم" صفحہ ۷۹ جلد اول

۵۳۔ فہرست ظفر حسن صاحب صفحہ ۱۴ نمبر ۱۰۹

طہماسپ والی ایران کے پاس سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ کئی سال تک وہ وہاں مقیم رہے۔ بالآخر ۹۷۲ھ میں بمقام گولکنڈہ وفات پائی[۱]۔

۳۔ ۹۵۲ھ میں اس کتاب کی تالیف ایران میں ہی شروع ہوئی[۲]۔ اور گولکنڈہ میں بہ زمانۂ ابراہیم قطب شاہ تالیف کا اختتام ہوا۔ یہ کتاب ابراہیم قطب شاہ کے نام سے منسوب ہے۔ خطبۂ کتاب میں صراحت سے یہ نام مذکور رہے[۳]۔ ڈاکٹر ریو کے پیش نظر جو نسخہ تھا نہ معلوم کیوں اس میں یہ نام نہیں لکھا گیا، ڈاکٹر موصوف نے مولف کے پہلے تعلق کی بنا پر یہ خیال کر لیا ہے کہ یہ کتاب برہان نظام شاہ[۴] کے نام سے منسوب ہے۔

۴۔ کتاب کا موضوع ممالک مشرق کی عام تاریخ ہے، از زمانۂ آدم علیہ السلام تا زمانۂ تالیف ایران کی معاصرانہ تاریخ پر مولف نے اپنے ذاتی معلومات سے روشنی ڈالی ہے۔

۵۔ کتب خانۂ آصفیہ کا نسخہ خوش خط ہے لیکن صرف حصۂ اول پر مشتمل ہے، اور کتاب کے آخری دو چار صفحات آدھے آدھے ضائع ہو گئے ہیں۔

(۳) تاریخ حقی[۵]

۱۔ اس کتاب کے مولف مولانا شیخ عبدالحق دہلوی ہیں، موصوف نے اپنے زمانہ میں علوم اسلامیہ کی خدمت کے لئے خاص شرف و امتیاز حاصل کیا تھا۔ ایک مستند اور معیاری مولف کی حیثیت سے بھی ان کو درجۂ امتیاز حاصل ہے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو کیٹلاگ برٹش میوزیم ص ۱۰۷ جلد اول [۲] کیٹلاگ برٹش میوزیم ص ۱۰۷ جلد اول [۳] نسخۂ کتب خانۂ آصفیہ، ۱۳۳۰ تاریخ فارسی صفحہ ۶۔ [۴] ابراہیم قطب شاہ کی دفات ۹۸۸ھ میں واقع ہوئی، برہان نظام شاہ کی وفات ۹۶۱ھ میں واقع ہوئی اور خود شاہ نے بمقام گولکنڈہ ۹۷۲ھ میں وفات پائی، معلوم ہوتا ہے کہ برہان نظام شاہ کی وفات کے بعد خود شاہ نے ابراہیم قطب شاہ کا توسل اختیار کر لیا۔ [۵] فہرست ظفر حسن صاحب صفحہ ۱۴ نمبر ۱۱۲

۲۔ ذکرالملوک کتاب کا نام ہے۔ سنہ ۱۰۰۳ھ[۴] جلوس اکبری میں یہ کتاب تالیف ہوئی۔
۳۔ اس کتاب کا موضوع ہندوستان کے اسلامی حکمرانوں کے زمانہ کی تاریخ ہے شہاب الدین غوری کے زمانہ سے ابتدا کی ہے اور اپنے زمانہ پر ختم کیا ہے۔
۴۔ یہ کتاب دراصل بطور ایک یادداشت کے ہے ماسبق مولفوں کے بیانات اختصار کے ساتھ جمع کرلئے ہیں۔ البتہ اپنے ماخذوں کی فہرست گناتے ہوئے کتاب کے دیباچہ میں بیان کیا ہے کہ

"در بادشاہی بہلول لودھی از بہادر شاہی نقل افتادہ واز بدے تا دور سلطنت سلطان عہد و بادشاہ زمان بسماع و مشاہدہ ثبت یافت"

۵۔ بھمنی فرمان رواؤں اور دیگر دکنی حکمرانوں کا بھی احوال قلم بند کیا ہے بنگال وجون پور کا بیان بھی موجود ہے۔
۶۔ کتب خانہ آصفیہ کا نسخہ ۲۹ جلوس عالمگیر ۱۰۹۷ھ کا مکتوبہ ہے۔[۵]

(۴) زبدۃ التواریخ[۶]

۱۔ اس کتاب کے مولف شیخ عبدالحق دہلوی کے فرزند مولانا نورالحق ہیں۔
۲۔ جہانگیر کے زمانہ میں یہ کتاب مرتب ہوئی۔
۳۔ ہندوستان کے مرکزی اسلامی حکمرانوں کی تاریخ ہے۔ دراصل اپنے والد کی کتاب پر اضافہ کرلیا ہے۔ اکبر کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں اور اپنے ذاتی معلومات کا بھی اضافہ کیا ہے۔
۴۔ اکبر کے حالات پر کتاب ختم کردی ہے۔ دکن اور دوسرے صوبوں کے متعلق علیحدہ طور سے کچھ نہیں لکھا۔

---

[۵] کتب خانہ آصفیہ ۶۰۲ تاریخ فارسی
[۶] فہرست ظفر حسن صاحب صفحہ ۱۶ نمبر ۱۲

۵۔ کتب خانۂ آصفیہ کا نسخہ گو شکستہ خط میں لکھا گیا ہے لیکن خوش خط ہے مکمل بھی ہے البتہ سرخیوں کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔[۱]

(۵) مرأت الصفا[۲]

۱۔ ممالک مشرق کی ایک بہت ضخیم تاریخ۔

۲۔ یہ زمانۂ شاہ جہان ۱۰۶۱ھ میں جب کہ دکن میں عبداللہ قطب شاہ کی فرمان فرمائی تھی یہ کتاب تالیف ہوئی۔[۳]

۳۔ کتب خانۂ آصفیہ میں اس نام کے دو مخطوطات مخزون ہیں، ایک نسخہ ایک علیحدہ کتاب ہے جسکے متعلق آگے چلکر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرا نسخہ وہ جو کہ پیش نظر ہے یہ نسخہ اول و آخر ناقص ہے درمیان میں بھی بعض صفحات موجود نہیں ہیں، یہ امر تحقیق نہ ہو سکا کہ آیا یہ وہی کتاب ہے کہ جسکا حوالہ ظفر حسن صاحب نے دیا ہے۔

۴۔ اس کتاب کے مطلع ششم میں "ملوک ہند" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ راجگان ہند کے زمانے سے ابتدا کی ہے اور اکبر کی تخت نشینی پر اپنے بیان کو ختم کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ملوک گجرات شاہان بھمنیہ اور عادل شاہوں اور نیز نظام شاہی خاندان کے حکمرانوں کا احوال بھی قلم بند کیا ہے۔ دوسرے ہندوستانی صوبہ داری حکمرانوں کا تذکرہ بھی نظرانداز نہیں کر دیا ہے۔

(۶) لب التواریخ ہند[۴]

۱۔ اس کتاب کے مولف کا نام رائے بندرابن ہے رائے کا خطاب عالمگیر کی پیشگاہ سے عطا ہوا۔ اس زمانہ میں مولف فوجدار اور امین بھی رہ چکے ہیں۔[۵]

---

[۱] کتب خانۂ آصفیہ، تاریخ فارسی عــ ۱۶۰ [۲] فہرست ظفر حسن صاحب صفحہ ۱۲ نمبر ۶۲۔
[۳] ۔ کتب خانۂ آصفیہ کے نسخہ کا ورق ۱/۶ صفحہ دوم ملاحظہ ہو، تاریخ فارسی عــ ۱۳۰۰
[۴] فہرست ظفر حسن صاحب صفحہ ۷، نمبر ۱ [۵] نسخہ کا ترقیمہ ملاحظہ ہو کتب خانۂ آصفیہ، تاریخ فارسی عــ ۱۰۶

۲۔ یہ کتاب بہ زمانۂ عالمگیر مرتب ہوئی، ڈاکٹر ریو نے بیان کیا ہے کہ ۱۱۰۰ھ سالِ تالیف ہے۔[1]

۳۔ اس کتاب میں ابتدائی عہدِ اسلامی سے واقعات ترتیب دیئے ہیں، دیباچہ کتاب میں لکھا ہے کہ تاریخ فرشتہ میں واقعات کا سلسلہ جہاں ختم ہوگیا اسکو اس کتاب میں زمانہ تالیف تک دراز کیا گیا ہے۔

۴۔ بخط کشن چند، شکستہ خط میں بمقام نرائن کھیڑ از مضافات حیدرآباد ۱۱۰۰ھ میں کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ کی کتابت عمل میں آئی۔ اس وقت خود مولف نرائن کھیڑ میں فوجداری کی خدمت پر مامور تھے۔[2]

(۷) مرأت العالم۔[3]

۱۔ اس کتاب کے مولف کا نام قرار دینے میں بہت اختلاف ہے، ڈاکٹر ریو نے بختاور خاں کو اور ایتھے و سرہنری ایلیٹ نے محمد بقا کو مولف قرار دیا ہے۔[4] فی الوقت بختاور خاں کو ہی مولف قرار دے لیا جاتا ہے۔

۲۔ بختاور خاں عالمگیر کے زمانہ میں داروغہ خواصان تھے۔ تاریخ کا اچھا مذاق اور قلم پر بڑی قدرت پائی تھی۔ کئی اور کتابیں انہوں نے تالیف کیں۔ بختاور خاں کا انتقال ہوا تو خود عالمگیر نے نماز جنازہ پڑھائی۔

۳۔ عالمگیر کے زمانہ میں یہ کتاب ترتیب دی گئی اور مولف کے وفات کے بعد عالمگیر کے حکم سے کتاب عام طور پر متداول ہوئی۔

---

[1] کیٹلاگ برٹش میوزیم صفحہ ۲۲۰ جلد اول۔

[2] سرہنری ریلیٹ نے بھی اس کتاب کا حال قلم بند کیا ہے۔ جلد ۷، صفحہ ۱۶۸

[3]۔ فہرست ظفر حسن صاحب صفحہ ۱۲ نمبر ۸۷

[4]۔ اس اختلاف کی تفصیل کے لئے ایلیٹ کی تاریخ ملاحظہ ہو جلد ۷، صفحہ ۱۵۰ تا ۱۵۷

۴۔ یہ کتاب ممالک مشرق کی عام تاریخ ہے اور تذکرہ مشاہیر۔ ڈاکٹر ریو نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ممالک مشرق کی تاریخی کتابوں میں بہت ہی قابل اعتماد اور بہت مفید تالیف ہے عالمگیر کے حکمرانی کے دس ابتدائی سال کے معاصرانہ حالات بہت اہم ہیں[۱] ۔ سر ہنری ایلیٹ نے بھی یہ امر تسلیم کیا ہے کہ مشرق کی تاریخ پر یہ کتاب بہت ہی کار آمد اور قابل استناد ہے[۲] مولف نے کتاب کے آخر میں بیان کیا ہے کہ بادشاہ کے پاس ان کو جو قرب حاصل تھا اسکی وجہ سے عالمگیر نامہ کے بیانات پر مزید اہم اضافہ عمل میں آیا ہے۔ کتاب کی پانچویں نمایش میں دکنی حکومتوں کا تذکرہ موجود ہے۔

۵۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کتاب کے دو نسخے کامل درسے موجود ہیں[۳] ۔ ایک نسخہ بہت ہی اچھا ہے البتہ قدرے آب خوردگی کا اثر ہوا ہے ناقل کا نام عبدالمجید بن عبداللطیف ہے دوسرے نسخے میں دو ایک ابتدائی اوراق اور آخر میں ایک ورق موجود نہیں ہے۔

(۸) منتخب التواریخ[۴]۔

۱۔ مولف کا نام جگ جیون داس ہے۔ مولف بہ زمانۂ شاہ عالم بہادر شاہ ہرکارگی یا سوانح نویسی کی خدمت پر مامور تھے۔

۲۔ سنہ ۱۱۲۰ھ میں اس کتاب کی ترتیب عمل میں آئی جب کہ شاہ عالم کی شاہی تھی۔

۳۔ شہاب الدین غوری کے زمانہ سے واقعات کے بیان کرنے کی ابتدا کی ہے اور زمانۂ تالیف تک اسکے سلسلہ کو قایم رکھا ہے۔ سلاطین دکن کی بھی تفصیل شامل کی ہے۔ دوسرے صوبوں کے حکمرانوں کا بھی سرسری احوال نظر انداز نہیں کر دیا گیا ہے۔ بعض معاشی اعداد و شمار بھی بیان کئے ہیں۔

۱ھ۔ کیٹلاگ برٹش میوزیم جلد اول ص ۱۲۵ ۔ ۲ھ۔ ایلیٹ جلد ۷ صفحہ ۱۴۵

۳ھ۔ تاریخ فارسی ۵۱۳، ۱۲۶ کتب خانہ آصفیہ ۴ھ۔ فہرست ظفر حسن صاحب صفحہ ۱۲ نمبر ۹۲

۴۔ کتب خانۂ آصفیہ میں دو نسخے محفوظ ہیں دونوں مکمل اور خوش خط، ایک نسخہ ۱۲۱۹ھ کا مکتوبہ ہے اور دوسرا ۱۲۹۵ھ کا۔[1]

(۹) راجاولی[2]

۱۔ مولف کا نام پیش نظر نسخہ سے دلی رام گسائیں واضح ہوا لیکن ڈاکٹر ریو نے بھوانی داس منشی دارا شکوہ لکھا ہے۔[3]

۲۔ شاہ عالم کے زمانہ میں یہ مختصر سا رسالہ تالیف ہوا۔

۳۔ جد ہشتم کے زمانہ سے عالمگیر کے زمانہ تک حالات لکھے ہیں،

۴۔ کتب خانۂ آصفیہ میں اسکے دو خوش خط نسخے مخزون ہیں۔[4]

(۱۰) اخبار النوادر۔[5]

۱۔ اس کتاب کا نام چتر گلشن اور چہار گلشن بھی ہے۔

۲۔ مولف کا نام رائے چتر من ہے

۳۔ ۱۱۷۳ھ میں اس کتاب کو مرتب کیا گیا۔

۴۔ اس کتاب کا موضوع کل ہندوستان کی تاریخ اور ایک حد تک ہندوستان کا جغرافیہ بھی ہے۔ تاریخ کے سلسلہ میں اسلامی اور ماقبل اسلامی زمانہ پر روشنی ڈالی ہے — مشایخ طریقت کا تذکرہ بھی قلم بند کیا ہے۔

---

[1] کتب خانۂ آصفیہ تاریخ فارسی ۱۹۱۱ و ۱۶۴۸، برٹش میوزیم کیٹلاگ جلد اول صفحہ ۲۴۱ ملاحظہ ہو

[2] فہرست ظفر حسن صاحب ص ۱۲ نمبر ۹۹

[3] کیٹلاگ برٹش میوزیم ص ۵۵ جلد اول

[4] کتب خانۂ آصفیہ تاریخ فارسی ۵۱۹ و ۷۷۸

[5] فہرست ظفر حسن صاحب ص ۹ نمبر ۶۵۔

۵۔ کتب خانۂ آصفیہ میں جو نسخہ فراہم کیا گیا ہے وہ ۱۲۹۹ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام قاسم علی ہے۔ حیدرآباد میں ہی کتابت عمل میں آئی۔[۱]

(۱۱) حقیقتہائے ہندوستان[۲]

۱۔ مولف کا نام لچھمی نارائن ہے اور شفیق تخلص۔ اورنگ آباد وطن تھا۔ منسا رام دیوان کے بیٹے اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے۔ شفیق نے ایک اچھے انشا پرداز ادیب اور مورخ کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔[۳]

۲۔ ۱۲۰۱ھ میں یہ کتاب مرتب کی گئی۔

۳۔ اس کتاب کا موضوع کل ہندوستان کا جغرافیہ اور تاریخ ہے تاریخ کے سلسلہ میں اسلامی اور ماقبل اسلامی دونوں عصروں کے متعلق قلم فرسائی کی ہے۔

۴۔ کتب خانۂ آصفیہ میں اس کتاب کے دو نسخے حاصل کئے گئے ہیں۔ ایک نسخہ کامل اور ۱۲۵۲ھ میں منقول ہوا ہے۔ دوسرا نسخہ نامکمل ہے۔[۴] ایک دوسرا کامل نسخہ گو اس کا خط درست نہیں ہے ملو کہ مولوی عبدالسلام مرحوم کتب خانہ سعیدیہ میں بطور امانت موجود ہے۔[۵]

(باقی)

---

[۱] کتب خانۂ آصفیہ، تاریخ فارسی نمبر ۲۵۰۔ ملاحظہ ہو مورخین ہند تالیف مولوی سید شمس اللہ صاحب قادری صفحہ ۲۲۔ کیٹلاگ برٹش میوزیم ص ۹۰۹۔ ایلیٹ جلد ۸ صفحہ ۲۵۵۔

[۲] فہرست ظفر حسن صاحب صفحہ ۱۷۰ نمبر ۱۷

[۳] ان کے تفصیلی حالات کے لئے مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا مقدمہ ملاحظہ ہو جو چمنستان شعراء پر لکھا گیا ہے یہ کتاب انجمن ترقی اردو نے طبع و شائع کی ہے۔

[۴] کتب خانۂ آصفیہ تاریخ فارسی نمبر ۷۰۵ و ۱۰۶۶۔ نمبر ۷۰۵ پر جو نسخہ ہے اس کا نام غلطی سے خلاصۃ الھند لکھا ہے۔

[۵] کیٹلاگ برٹش میوزیم صفحہ ۲۳۸ جلد اول۔ مورخین ہند، صفحہ ۲۴۔

ہندوستان کی تعلیمی ترقی

(از جناب شنکر موہن لعل صاحب ماتھر بی۔ اے (عثمانیہ)

ہندوستان میں تعلیم کی ترقی یا پستی جن قوتوں اور موانع کے تحت ہے ان پر ہم کو بہت کم اختیار حاصل ہے۔ سب سے پہلے افلاس کو لیجئے جو مختلف صورتوں میں پھیلا ہوا ہے ایک طرف مقامی حکومتوں کا افلاس ہے تو دوسری طرف عوام کا افلاس کہ جنکے پاس جسم وجان کے رشتہ کو قائم رکھنے کا سامان تک میسر نہیں۔ ایسی پریشان حالی میں اگر والدین اپنے بچوں کو تعلیم دینے کی بجائے محنت اعد مزدوری کیلئے بھیجدیتے ہیں تو بیچاروں کو کون مورد الزام قرار دیسکتا ہے؟ اس ہمہ گیر افلاس کے علاوہ وبائی امراض کے حملے اور ملیریا کی تباہ کاریاں بھی ہیں جو طلباء کی حاضری کو بُری طرح متاثر کرکے تعلیمی پستی اور تنزل میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں۔

ایک اور چیز جو تعلیمی خرابیوں کا باعث ہے وہ رسل ورسائل اور عبور ومرور کی تام وقت ہے جسکی وجہہ سے ایک طرف تو معائنہ کنندہ عہدہ داروں کا قیمتی وقت رائیگاں ہوتا ہے اور دوسری طرف مدارس کی تعداد میں غیر ضروری اضافہ کرنا پڑتا ہے۔

ایک تیسری چیز جو تعلیمی پستی کو دور ہونے نہیں دیتی وہ ہندوستان کے سماجی رسوم ہیں جو بُری طرح جڑ پکڑ گئے ہیں اور جنکا نسوانی تعلیم پر نہایت ہی مضر اثر پڑ رہا ہے بعض ماہران تعلیم ہندوستان کی نسوانی تعلیم کا ممالک غیر کی نسوانی تعلیم سے مقابلہ کرکے سخت مایوسی کا اظہار کرتے ہیں مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان دونوں کے حالات مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر انگلستان کو لیجئے کہ اگر وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم حکماً روک دی جائے تو وہاں کی پبلک اسکی سخت مخالفت کریگی لیکن ہندوستان کے لوگ تو اس علیحدگی کے عادی ہیں اور اتنے عادی ہیں کہ لڑکوں کے مدرسوں میں لڑکیوں کا نظر آنا تو ایک طرف کوئی اُستانی بھی شاید مشکل ہی سے نظر آئے۔

میرے اس بیان سے میرا مطلب کسی کی شکایت کرنا یا کسی کی جانب سے معذرت کرنا نہیں ہے میری غرض تو صرف اتنی ہی ہے کہ زندگی میں تعلیم کی اہمیت پر زور دوں چاہے حالات یہاں کے ہوں یا کہیں اور کے تعلیم اپنی ذات سے نہ تو افلاس کی بیخ کنی کر سکتی ہے اور نہ امراض کے ازالہ کا باعث ہے اس سے نہ تو عبور و مرور کے وسائل درست ہو سکتے ہیں اور نہ رسوم و قیود کی پابندیوں کو دور کیا جا سکتا ہے اسکے باوجود بھی یہی وہ واحد چیز ہے جو ہر قسم کی اصلاح و فلاح کی اساس و بنیاد بن سکتی ہے۔ مذکورہ صدر حالات سے واقعی بڑی پستی اور شرمندگی کا احساس ہوتا ہے لیکن ہمیں بہت زیادہ مایوس ہونیکی ضرورت نہیں امید کہ روشنی آہستہ آہستہ اپنا جلوہ دکھا رہی ہے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ امید افزا چیز برطانوی ہند میں سالہائے گذشتہ کی کمیتی ترقی ہے۔

مدارس میں داخل ہونیوالوں کی تعداد جو ۱۹۱۷ میں صرف آٹھ لاکھ تھی ۱۹۳۳ میں ۱۳ لاکھ تک پہونچ گئی اور ۱۹۳۰ میں ۱۹ لاکھ ہو گئی یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ تعلیم کا شوق بہ سرعت بڑھ رہا ہے اسی طرح لڑکیوں کی تعداد میں بھی معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ میٹرکیولیشن کے نتائج جو ۱۹۲۷ میں ۱۰۰۲ تھے ۱۹۳۲ میں ۲۱۳۰ ہو گئے اور ۱۹۳۳ اور ۱۹۳۴ میں تو یہ تعداد ۲۷۰۰ بلکہ ۳۲۲۵ کے لگ بھگ آگئی اور ۱۹۳۰ میں (۵۰۰۰) کے قریب ہو گئی اس ترقی کو پیش نظر رکھکر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ صوبہ جاتی حکومتوں نے زنانہ اور مردانہ تعلیم کے اخراجات کے غلط تناسب کی اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تو بہت افسوس ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام کسادبازاری اور مالی پستی کے زمانہ میں جو چیز سب سے پہلے تخفیف کی زد میں آتی ہے وہ تعلیم نسواں کا موازنہ ہے۔

امید افزا حالات کے سلسلے میں دوسری دل خوش کن تبدیلی یہ ہے کہ اچھوت اقوام کے بچوں کے متعلق اب زاویہ نگاہ بدل رہا ہے چند سال پہلے ان بیچاروں کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ سمجھی جاتی تھی کہ اُن کے لئے چند مخصوص مدارس قائم کر دیئے جاتے تھے جہاں اُن کی ذلت اور پستی پر مزید استحکام کی مہر لگ جاتی تھی مگر اب کوشش ہو رہی ہے کہ اُن کو بھی سب کی طرح تمام مدارس میں برابر کی جگہ حاصل ہو جائے یہ کوشش اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ ذات پات کی تفریق بہ سرعت تمام مٹنے لگی ہے میں نے ابھی ابھی اچھوت اقوام کے لئے مخصوص مدارس کے قیام کا ذکر کیا ہے میری رائے میں

یہ ادائے۔ مدارس کی تعداد میں غیر ضروری اضافے اور نامناسب مسابقت کے میلان کی ترقی کے علاوہ اتحاد و ہند کی راہ میں بہت بڑی رکاٹ ہیں اس کم عمری میں جبکہ بچوں کے دماغ ہر قسم کے اثرات کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں ایسی تنگ اور محدود فضا میں انکو تعلیم دلانا سخت مضرت رساں ہے ضرورت ہے کہ تمام فرقوں کے لڑکے ایک ہی جگہ مل جل کر تعلیم پائیں اور ان میں مروت اور رواداری کی روح پرورش پائے۔

میں نے جن امید افزا حالات کا ذکر کیا ہے اور ترقی کے جن علامات کی تفصیل بیان کی ہے ان میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ کھیلوں کے انتظام۔ تفریحی مشاغل اور جسمانی تربیت کا خیال عام طور پر بہت ترقی کر گیا ہے اب اکثر مدارس وہ مدارس نہیں ہے کہ جن کے نام ہی سے طلبا کے دلوں میں سخت درجہ کا تنفر پیدا ہو جاتا تھا۔

ورزش جسمانی کے سلسلے میں میں چند خاص امور کی جانب آپکی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں میرے خیال میں ماہران ورزش جسمانی کا تعلق زیادہ تر ٹرینگ کالجوں سے ہونا چاہیئے اور ان کا زیادہ وقت بجائے انفرادی مدارس میں تعلیم دینے کے دوروں اور معائنوں اور اپنے علاقہ کے عام مدرسوں کی رہنمائی میں صرف ہونا چاہیئے۔ اگر ٹرینگ کالج میں اس قسم کے ماہر فراہم ہو گئے تو مدرسین کی کثیر تعداد کو بآسانی ٹرینڈ کرنا ممکن ہو جائیگا اور اسطرح تربیت جسمانی کا کام جاہل ڈرل ماسٹروں کے ہاتھوں سے نکل کر تعلیمیافتہ اساتذہ کے ہاتھوں میں آجائے گا۔ میرے خیال میں جبتک اس اصول پر عمل نہ کیا جائے تربیت جسمانی کے کام کو وسیع پیمانہ پر نہیں چلایا جا سکتا۔ جب ہم اپنے تعلیمی نظام کے مذکورہ صدر امید افزا آثار پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک گونہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ کچھ ترقی ضرور ہو رہی ہے لیکن اس نظام کے تحت اپنی کوششوں اور کاوشوں کے نتائج کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ تحتانی مدارس ہم نے اسلئے قایم کئے کہ اُن سے جہالت دور ہو مگر ان مدارس میں طلبا کی قلیل تعداد اس مقصد کو پورا نہیں ہونے دیتی۔ جتنا اضافہ لکھے پڑھے لوگوں میں ان مدارس کی وجہ سے ہوتا ہے اتنا ہی اضافہ آبادی کے بڑھنے سے بے لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد میں ہو جاتا ہے اسی طرح تعلیمیافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ عمر بھر سر کھپانے کے باوجود ذرائع معاش سے محروم اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے غرض یہ حالات سخت پریشان کن ہیں اور ان ہی کو

ملحوظ رکھکر ہارٹاگ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے اور بالکل درست لکھا ہے کہ:-

"ہر پیشے اور طبقہ کی معاشی ضرورتوں کے مطابق مدارس موجود نہیں ہیں اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ موجودہ قسم کے مدارس فوقانیہ و وسطانیہ - بُری طرح جم گئے ہیں اور پبلک ان کے سوا کسی اور قسم کے مدارس پر قطعاً اعتماد نہیں کرتی اور عام طور پر یہ خیال دلوں میں بیٹھ گیا ہے کہ مدارس تحتانیہ سے وسطانیہ اور فوقانیہ تک ترقی کرنا ہی گویا تعلیم کا معتدل اور اصلی طریقہ ہے"

اس بے راہ روی کا عام نتیجہ یہ ہے کہ اکثر طلبا ادنی قسم کی تعلیم کا اس بُری طرح پیچھا کرتے ہیں کہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے اور اسطرح فوقانی اور وسطانی مدارس پر ضرورت سے زیادہ بار ڈالنے کے علاوہ خود بھی آئندہ زندگی میں کسی عملی کام یا پیشے کے قابل نہیں رہتے۔

ہماری تعلیم کی دوسری تحتانیہ صورت یہ ہے کہ اس میں از ابتدا تا انتہا امتحانوں کی بھرمار ہوتی ہے اور مدت تعلیم کا بیشتر حصہ بجائے کچھ سیکھنے کے امتحانوں کے لئے رٹنے میں صرف ہوجاتا ہے امتحان ہمیشہ اس غرض کے پیش نظر لیا جانا چاہیئے کہ اس سے طلبا کی قابلیت اور استفادہ کی حقیقی جانچ ہو سکے لیکن ہمارے مدارس میں تو امتحان بغیر کسی مقصد کے جاری رہتے ہیں اور بجز اسکے کہ تعلیم کی کسی خاص منزل کے ختم ہونے کا نشان نہیں اور کوئی مفید مقصد ان سے حاصل نہیں ہوتا۔

ان خرابیوں کے ارتفاع کے لئے ہمیں چاہیئے کہ سلسلۂ تعلیم کو چند مختلف منزلوں میں اسطرح تقسیم کردیں کہ ہر منزل ایک خاص مقصد کی تکمیل کیلئے مخصوص ہو اور اسکے اختتام پر طلبا کو پیشہ ورانہ یا فنی اداروں کی جانب مائل کیا جائے اسکے ساتھ ہی یہ خیال بھی رہے کہ اس سلسلہ میں جامعاتی قواعد وضوابط کا غیر ضروری بار نہ ڈالا جائے ۱۹۳۴ء کی جامعاتی کانفرنس کی رائے بھی تجدید نظام تعلیم کے متعلق یہی ہے اور مرکزی مجلس تعلیم کے مشاورتی بورڈ نے بھی اسکو بیحد پسند کیا ہے میں ذیل میں ان ہی امور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرونگا۔

مرکزی بورڈ کی مذکورہ بالا رائے کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ تعلیمی سہولتیں دور کرکے طلبا پر ہر قسم کی پابندیاں عاید کردی جائینگی تعلیم کے فوائد سے مستفید ہونیکا ہر شخص کو مساوی طور پر حق حاصل ہے

اگرکسی کی فطرت اور افتادِ طبع ادبی تعلیم کے خلاف ہے تو اسکی پاداش میں اسکو ادبی تعلیم سے بالکلیہ محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اسلئے مذکورہ مشورہ کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ طلباء کو ادنیٰ اور عام مضامین کی تعلیم بقدر ضرورت دینے کے بعد عملی تربیت پانے کے مواقع ان کی طبیعت کی لگاؤ کے مطابق فراہم کئے جائیں۔

اس سلسلے میں مرکزی بورڈ کی رائے ہے کہ سب سے پہلے تحتانی تعلیم کی منزل میں ایسے انتظامات کئے جائیں کہ طلباء مستقل طور پر خواندہ اور پڑھے لکھے بن جائیں آج کل کی تحتانی تعلیم سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اوّل تو دیہات کے تحتانی مدارس میں طلباء کی تعداد بھی بہت کم ہوتی ہے اور جو کچھ رہتی ہے اسکا یہ حال ہے کہ طلبا لکھنا پڑھنا سیکھنے کے بعد چند دنوں میں اسکو بھول کر جیسے کے ویسے رہ جاتے ہیں۔

تحتانی تعلیم کے متعلق اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسکو عام طور پر جبری اور لازمی کردیا جائے لیکن افسوس ہے کہ عام جبری تعلیم ایسی چیز نہیں کہ اسکو بہ یک جنبش قلم نافذ کردیا جائے۔ اسکے لئے بڑی زبردست تیاریوں کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے مالی مشکلات ہیں جن پر عبور حاصل کرنا آسان بات نہیں اسکے بعد ایک زبردست اور دشوار گذار مرحلہ پبلک کے قلوب کو اسکے لئے تیار کرنیکا ہے اسلئے کہ جبری تعلیم کے نفاذ کے بعد طلباء کی عدم حاضری پر انکے والدین کو جرمانے کی سزا دینا اُس وقت تک اخلاقاً جائز نہ ہوگا جبتک کہ اُن کے دلوں میں یہ بات نہ بٹھادی جائے کہ اس جبر میں اُن کی اولاد کی آئندہ فلاح و بہبود مضمر ہے۔

ان دقتوں کا لحاظ کرکے بعض ماہرانِ تعلیم نے یہ رائے دی ہے کہ جبری تعلیم کا نفاذ صرف چند مخصوص رقبوں اور حلقوں میں کیا جائے۔ میری رائے میں جبری تعلیم کا یہ جزوی نفاذ بھی کچھ زیادہ مفید اور مناسب نہیں کیونکہ تحتانی تعلیم کا موازنہ بہت قلیل ہے اگر ہم اس قلیل موازنہ میں سے ایک قابل لحاظ مقدار کو صرف چند مخصوص حلقوں پر صرف کردیں تو دوسرے پست حلقوں پر صرف نیکے لئے ہمارے پاس کیا رہ جائیگا اسی طرح اس قسم کے جزوی نفاذ سے زنانہ اور مردانہ تعلیم کے اخراجات میں جو غلط تناسب قائم ہے وہ اور بڑھ جائیگا۔ کیا یہ بات قرینِ انصاف ہے کہ مردوں کی تعلیم میں پوری ترقی ہونے تک عورتیں جاہل کی جاہل بیٹھی رہیں؟ اسلئے میری رائے یہ ہے کہ جبری تعلیم کا نفاذ صرف ان حلقوں اور رقبوں میں کیا جائے

جہاں تحتانی تعلیم بہت کم خرچ اور بڑی حد تک کامیاب ثابت ہو چکی ہو اور جہاں کی پبلک کی رائے اس جبر و لزوم کے موافق ہو۔ بالفاظ دیگر جبری تعلیم اچھے کام اور عمدہ انتظام کے لئے بطور انعام یا صلے کے نافذ کی جایا کرے۔

اسی طرح جبری تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں نئے طلباء کو بھرتی کرنے کی بجائے صرف اس امر پر اکتفا کیجائے کہ پرانے طلباء کی تعداد میں کمی نہ ہونے پائے اس طرح جبری تعلیم کے قانون کے تحت صرف کم عمر طلباء کو شریک مدرسہ ہونے پر مجبور کیا جائے ورنہ بڑی عمر کے طلباء سے مدارس کو بھر دینے کا بجز اس کے کوئی نتیجہ نہ ہوگا کہ انکے ساتھ کم عمر طلباء کی تعلیم بھی تباہ ہو جائے۔

ان امور کی تکمیل کے دوران میں عام جبری تعلیم کا تخیل بھی ہر وقت پیش نظر رہے اور اس تخیل کو بروئے کار لانے کیلئے چند خاص امور پر ابھی سے عمل شروع کر دیا جائے تاکہ آئندہ اسکی تکمیل کی راہ میں کسی قسم کے موانع باقی نہ رہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس امر کے تعین کی ضرورت آپڑتی ہے کہ اوسط درجہ کے طلباء کو مستقل طور پر خواندہ بنانے کے لئے کم از کم کتنی مدت درکار ہوگی؟ اسکے متعلق مختلف خیالات ہیں مگر میری رائے اس مدت کو زیادہ طویل نہیں بنانا چاہیئے اسلئے کہ اس سے ایک طرف تو تعلیمی موازنہ پر زیادہ بار پڑیگا اور دوسری طرف طلباء کے والدین میں بےچینی پیدا ہو جائے گی جو ہمیشہ اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ انکے بچے جلد از جلد کام پر لگ کر کمانے کے قابل بن جائیں ان تمام مشکلوں کو پیش نظر رکھکر میری رائے ہے کہ تحتانی تعلیم کی مدت صرف پانچ سال کی ہو۔

تحتانی تعلیم کو کامیاب بنانے کے سلسلہ میں دوسری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اعلیٰ قسم کی تدریس اور اساتذہ کی عمدہ کارکردگی کے ذریعہ نصاب تعلیم کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کامیاب بنایا جائے اسکے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ ایک مدرس سے وقت واحد میں ایک سے زیادہ جماعتوں کی تدریس کا کام نہ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں بنظر کفایت اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ایک ہی رقبہ میں مختلف قسم کے جو تحتانی مدارس ہیں ان کو توڑ دیا جائے اور لڑکوں و لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کو بتدریج رائج کیا جائے۔

اسکے بعد نصاب تعلیم کا مسئلہ ہے اکثر لوگ اس مسئلہ کو اتنا پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ نصاب تعلیم کا اصل مقصد کہ طلبا اس سے مستقل طور پر خواندہ بن جائیں، فوت ہو جاتا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ نصاب تعلیم حد درجہ ثقیل اور گراں بار ہو جائے۔ مگر اس بات کو نہیں سمجھتے کہ چھوٹی عمر کے لڑکوں کو اگر کم سے کم مدت میں خواندہ بنانا ہو تو نصاب تعلیم کو بہت ہی مختصر و مفید رکھنا ضروری ہے۔ نصاب تعلیم کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے لئے مزید کتابوں کی نہیں بلکہ عمدہ اور تربیت یافتہ مدرسین کی زیادہ ضرورت ہے۔ جبتک مدرسین ٹرینڈ نہ ہوں اُن سے یہ امید رکھنا کہ وہ کامیابی سے تعلیم دینگے بالکل بیکار ہے افسوس ہے کہ ٹرینڈ اساتذہ کی تعداد عام طور پر بہت کم ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور ضروری امر کی طرف کافی طور پر توجہ کرنیکی ضرورت ہے دیہات کے اساتذہ میں وہاں کے ماحول سے قطعاً ہمدردی نہیں ہوتی ہے حالانکہ انکے کام کی کامیابی کے لئے انکو اپنے ماحول سے پوری طرح وابستہ رہنا چاہیئے اور وہاں کی زبان اور حالات پر پوری طرح عبور حاصل کرنا چاہیئے تاکہ مرکزی بورڈ کی اس سفارش پر عمل ہو سکے کہ "دیہات کا نصاب تعلیم دیہی ضروریات کے مطابق ہو"۔ اسکی تکمیل کیلئے صرف دو چار ایسی کتابیں شریک نصاب کر دینا جن میں دیہی مشاغل کا تذکرہ ہو قطعاً ناکافی ہے اسکے لئے تو اس امر کی ضرورت ہے کہ دیہی اساتذہ میں طلبا کو وہاں کی ضرورتوں اور حالات کے مطابق رہنمائی کرنیکی قابلیت موجود ہو۔

میں نے ابتدا میں نظام تعلیم کی تجدید کے سلسلہ میں یہ بیان کیا تھا کہ تعلیم کے الگ الگ منفرد منازل مقرر ہوں اور ان کے اختتام پر طلبا کو پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم کی طرف مائل کیا جائے مگر یہاں سب سے مشکل مسئلہ یہ آ پڑتا ہے کہ آخر کس منزل کے اختتام پر فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کا آغاز ہو؟ میرے خیال میں ثانوی تعلیم کا اختتام فنی تعلیم کے آغاز کے لئے نہایت مناسب ہے اسلئے کہ میٹریکیولیشن کے امتحان کی کامیابی تک طلبا میں خالص ادبی قسم کی تعلیم کا خبط بُری طرح جڑ پکڑ لیتا ہے۔ اسلئے فنی تعلیم کو کامیاب بنانا ہے تو اسکو طلبا میں اس کی طرف سے تنفر پیدا ہونے کے قبل ہی شروع کر دینا چاہیئے۔

مرکزی بورڈ کی رائے میں ثانوی تعلیم اس قسم کی ہونی چاہیئے کہ طالبعلم اسکے بعد خالص ادبی قسم کی تعلیم جاری رکھنا چاہے تو اسکو کوئی دقت نہ ہو یا اسکی بجائے وہ پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف متوجہ ہونا چاہے تو یہ تعلیم اسکے لئے بنیاد کا کام دے سکے۔ اس لئے ثانوی تعلیم کی مدت کو مختصر کردینا چاہیئے تاکہ اسکے اختتام کے وقت طلبا کی عمر تقریباً پندرہ سال کی ہو۔

اسکے بعد پیشہ ورانہ یا فنی تعلیم کا مسئلہ باقی رہجاتا ہے جسکا آغاز ثانوی تعلیم کی منزل کے اختتام پر ہوگا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ فنی تعلیم کو ادبی تعلیم کے ساتھ ساتھ بطور اختیاری مضمون کے رکھا جائے مگر عام مدارس میں اس قسم کا انتظام بہت دشوار ہے اور اگر انتظام ہو بھی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ میری رائے میں سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ اس قسم کی تعلیم کیلئے علیحدہ فنی ادارے قائم کئے جائیں۔

اس پر یہ اعتراض ہے کہ خرچ بہت ہوگا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ یہاں خرچ سے بحث نہیں کیونکہ خرچ تو ہر قسم کی تعلیم پر بہت ہوا کرتا ہے یہاں اصل بحث یہ ہے کہ اس وقت جو بڑی بڑی رقمیں آجکل کی بے نتیجہ اور نقصان رساں تعلیم پر صرف ہورہی ہیں کیا ان کا سلسلہ جاری رہے یا ان کا کوئی جزو زیادہ نفع بخش اور عملی تعلیم پر بھی صرف ہوا کرے؟ میں سمجھتا ہوں کہ آخر الذکر صورت ہر نقطۂ نظر سے بیحد مناسب ہے۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ پر بحث و تمحیص کا ابھی موقع موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تمام ماہران تعلیم ایک خاص مقصد کو مطمح نظر بنا کر اپنا کام جاری رکھیں تو کم از کم اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل میں پیچھے نہیں رہینگے۔

اس شمارہ کے ساتھ ۱۳۴۸ف کا چندہ ختم ہوجاتا ہے اسلئے خریداران کرام براہ کرم ۱۳۴۹ف کے چندہ سال کی ادائی توجہ مبذول فرمائیں۔

الٹی گنگا

ایک ایکٹ کا مزاحیہ

از جناب صاحبزادہ محمد علی خاں صاحب میکش (عثمانیہ)

افراد :-

ڈاکٹر — ایک نوجوان۔

وکیل — ڈاکٹر کا نوجوان دوست۔

لیڈر — ڈاکٹر کا دوست — عمر کوئی چالیس سال ہوگی۔

شاعر — پینتالیس سال کا ایک تیسرے درجہ کا شاعر جس نے اپنی حیثیت عجیب بنا رکھی ہے۔

اڈیٹر — مغربی لباس میں مشرقی خیالات رکھنے والا نوجوان۔

زمانہ موجودہ

مقام حیدرآباد

منظر

ڈاکٹر کا گھر۔ ایک بڑے ہال میں بید کی کرسیاں — درمیان میں ایک میز دروازوں پہ ریشمی پردے اور دو دیواروں پہ تصویریں

[اڈیٹر داخل ہوتا ہے]

اڈیٹر۔ تسلیمات۔

شاعر۔ تشریف رکھئے قبلہ۔ تو عرض کیا ہے۔ ذرا قافیہ بلاحظہ ہو اور پھر ردیف کو کس طرح نبھایا ہے۔
رگوں میں خون کو گرما کے برق کرتا ہے
اتر کے حلق سے فوراً شراب کا پانی

ڈاکٹر۔ واہ کیا کہنے چیز ہی ایسی ہے۔

وکیل۔ واللہ۔ کیا کہنے۔ مکرر ارشاد۔

لیڈر۔ واہ واہ۔

شاعر۔ رگوں میں خون کو گرما کے برق کرتا ہے۔

اڈیٹر۔ رگوں میں خون کو گرما کے برق کرتا ہے۔

شاعر۔ اتر کے حلق سے فوراً

لیڈر۔ شراب کا پانی۔ واہ سبحان اللہ

شاعر۔ آخری شعر ہے۔ میں غرور نہیں کرتا لیکن
مقطع پر تو مجھے ناز ہے۔ پرسوں والے
مشاعرہ میں تو بس یہی شعر حاصل مشاعرہ
بن گیا تھا۔ عرض کرتا ہوں

یہ آسمان سے شبنم نہیں برستی ہے
سحر پلاتی ہے خود کو گلاب کا پانی

سب مل کر۔۔ واہ واہ۔ کیا کہنے۔ چشم بد دور

اڈیٹر۔ شاید شبنم تخلص فرماتے ہیں آپ۔

شاعر۔ جی نہیں۔

لیڈر۔ غالباً آسمان۔

شاعر۔ جی نہیں۔

وکیل۔ گلاب۔

شاعر۔ جی۔ نہیں بات یہ ہے کہ تخلص کا انتخاب
بہت مشکل کام ہے۔ کوئی تخلص نہیں۔
میں نے خود تخلص رکھ لیا۔ جی بندہ نوازی
ہے آپ کی۔

وکیل۔ تو آپ نے خود کیا تخلص رکھ لیا

شاعر۔ کہہ تو دیا کہ خادم کو خود کہتے ہیں

وکیل۔ اچھا خود ہے آپ کا تخلص۔ بہت اچھا۔

ڈاکٹر۔ (اڈیٹر سے) فرمائیے جناب میرے لایق کوئی
خدمت۔ تضیع اوقات سے بچنے کے لیے یہ کہہ دوں
تو مناسب کہ میں پہلے ہی سے کئی اخباروں کا
خریدار ہوں۔ اب فی الحال تو گنجایش نہیں۔

اڈیٹر۔ جی۔ نہیں میں اس غرض سے حاضر نہیں ہوا۔

ڈاکٹر۔ اوہ معاف کیجیے۔ تو پھر۔ گھر میں خدانخواستہ کوئی

اڈیٹر۔ جی نہیں کوئی بیمار نہیں۔

ڈاکٹر۔ تو پھر

شاعر۔ قطع کلام معاف۔ بہت دنوں کے بعد شرف نیاز
حاصل ہوا ہے۔ آہ کیا زمانہ تھا وہ جب آپ لکھنؤ تشریف
لائے تھے۔ بس بندہ تو دن دن بھر شعر سناتا تھا اور آپ بندہ پرور
جھومتے تھے۔ آپ جس دن لکھنؤ سے واپس ہوئے
ہیں، بس اسی رات بڑا شاندار مشاعرہ
ہوا تھا۔ غزل عرض کی تھی۔

ڈاکٹر۔ ذرا ٹھہریے۔ خود صاحب میں اڈیٹر صاحب سے
گفتگو تو کر لوں۔

وکیل۔ اچھا آپ اڈیٹر ہیں۔ کونسے اخبار کے

اڈیٹر۔ میں "جہاں خراب" کا اڈیٹر ہوں

شاعر۔ واللہ کیا شاعرانہ نام ہے۔ جہاں خراب میں
آفتاب میں۔ بڑی معرکہ کی غزل کہی
تھی میں نے بھرے مشاعرے میں
اچھے اچھوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔

سن لیجئے آپ بھی۔

وکیل ۔ اچھا آپ ہی ہیں "جہاں خراب" کے
اڈیٹر۔ بڑی مسرت ہوئی آپ سے ملکر

شاعر۔ تو ہاں مطلع تھا

لیڈر۔ بھئی بڑا مشہور اخبار ہے۔ خوب لکھتے ہیں
صاحب آپ۔ ماشاءاللہ۔

شاعر۔ تو عرض کیا ہے۔

ڈاکٹر۔ تو پھر اشتہار چاہیئے آپ کو۔ ٹھیک۔
میں سمجھ گیا۔ ہاں جب تک کسی اخبار کو
زیادہ اشتہارات نہ ملیں، چلنا مشکل ہے۔
لیکن مجھے افسوس ہے کہ فی الحال میں
کوئی اشتہار نہ دے سکوں گا۔

اڈیٹر۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ آپ کو ایک
زحمت دینے کیلئے حاضر ہوا ہوں۔

ڈاکٹر۔ فرمائیے۔

اڈیٹر۔ "جہاں خراب" کا ایک خاص نمبر نکل رہا ہے

ڈاکٹر۔ ہاں صرف اس نمبر کی حد تک آپ
وی پی کر دے سکتے ہیں۔

اڈیٹر۔ جی نہیں۔

شاعر۔ تو بھئی۔ خوب یاد آیا۔ ہماری غزل ہمیں
ضرور چھاپیے۔ آپکے ناظرین بہت خوش ہونگے
عرض کرتا ہوں۔

گھنگھور گھٹائیں اٹھیں ساقی میخانے میں دھوم مچا
رندوں کو پینے کی پڑی ہے خوب پلا، بے باک پلا

اڈیٹر۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ غزل شائع نہ ہوسکے گی
اسلئے کہ یہ نمبر "ترک مسکرات" سے متعلق ہے۔
میں ڈاکٹر صاحب سے ایک مضمون مانگنے کیلئے آیا
ہوں جس کا عنوان ہوگا۔ "شراب کے
نقصانات طبی نقطۂ نظر سے" کہیئے ڈاکٹر
صاحب سرفراز فرمائینگے آپ۔

ڈاکٹر۔ آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی — میں
مضمون نگار تھوڑا ہی ہوں بس آپ نے تو
کمال کر دیا۔

مدیر۔ کیا فرما رہے ہیں آپ۔ ماشاءاللہ آپکے
خیالات تو سارے ملک میں قدر کی نگاہوں
سے دیکھے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن آپنے ایک ایسے
اچھے مقصد کو پیش کر دیا کہ لامحالہ قلم اٹھانا ہی پڑا۔
میں ضرور لکھوں گا۔ وکیل صاحب۔ شراب تو
آجکل سب ہی پیتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں
پوچھتا کہ یہ کافر اندر ہی اندر نسل انسانی کو

تباہ کر رہی ہے۔ صحتیں برباد ہو رہی ہیں
جگر کے امراض بڑھتے جا رہے ہیں۔
لیڈر - اجی صاحب - مغرب سے آئی ہوئی لعنتوں
میں سب سے بڑی لعنت یہی تو ہے۔ میں نے
دیکھا ہے کہ اس کے لئے کئی گھر تباہ ہوگئے۔
اسلئے ضرورت ہے کہ اس کے خلاف جہاد کیا جائے
نوجوانوں کو چاہیئے کہ منظم جد وجہد کریں۔
معاشی، جسمانی، معاشرتی تباہی کو بچائیں۔
پس "جہاں خراب" کا ترک مسکرات نمبر قابل
ستائش ہے اور اس کے اڈیٹر قابل مبارکباد۔
میرا ارادہ اس موضوع پر ایک تفصیلی تقریر
کرنے کا ہے۔ انشا اللہ بہت جلد میں بہ
بانگ دہل اعلان کروں گا کہ شراب کا
مقاطعہ کیا جائے۔
وکیل - جب تک شراب پینے والوں کے خلاف
کوئی قانون مدون نہ ہوگا۔ یہ بلا دور
نہ ہوسکے گی ہمیشہ قانون صحیح راستہ
دکھلاتا ہے۔ اس لئے قانون سے اس معاملہ میں
مدد لینی چاہیئے۔
مدیر - شکریہ تو کب ملے گا ڈاکٹر صاحب مضمون۔
ڈاکٹر - میں چار دن کے اندر ہی بھیج دوں گا۔
اڈیٹر - شکریہ - خدا حافظ
لیڈر - اجی جناب ابتک آپنے ہماری تصویر نہیں
چھاپی - یوں تو ہر اخبار کا تقاضہ رہتا ہے کہ
تصویر بھیجو - لیکن میں شہرت سے کوسوں دور
بھاگتا ہوں - لیکن آپ سے چونکہ نیاز حاصل
ہوگیا ہے اسلئے اب غیریت کی کوئی بات نہیں
بھیج دوں ایک تصویر آپکے پاس۔
اڈیٹر - شکریہ - ضرور بھیج دیجیے - ہاں خوب یاد آیا
وکیل صاحب - آپکو بھی ایک زحمت دینی ہے۔
وکیل - میں ضرور مضمون لکھ بھیجوں گا - بھلا اسمیں
خواہش کرنے کی کیا بات ہے۔
اڈیٹر - خیر مضمون تو ل ہی جائے گا لیکن
وکیل - چندہ لیجیے حاضر ہے ذرا نام کے آگے "بدیسی"
ضرور لکھیے گا - یہ پانچ روپیہ حاضر ہیں۔
اڈیٹر - اسم شریف جناب کا۔
وکیل - خاکسار کو عبدالقادر کہتے ہیں۔
ڈاکٹر - "بدیسی" کا دم چھلا وکیل ہونیکے بعد بڑھا لیا ہے
لیڈر - کتنا موزوں ہوگیا نام - "بدیسی" کے بغیر تو
بس یوں ہی تھا۔
وکیل - لکھتے ہیں خیر تو اڈیٹر صاحب ذرا نمایاں
جگہ چھاپیے "اور وکیل ہائیکورٹ" ذرا جلی

حروف میں لکھوائیے۔
اڈیٹر۔ ضرور۔ ضرور۔ بات یہ ہے وکیل صاحب
خادم کے ذمہ سیٹھ ابو طیب کا دو ہزار قرض
واجب الادا ہے۔ کاغذ کے سلسلے میں۔ مطبع کے
کوئی پانسو باقی ہے سُنا ہے لوگ مقدمہ
چلانے والے ہیں۔ ذرا خیال رکھیے گا۔
وکیل۔ ضرور۔ آپ کی خدمت نہ کریں تو کس کی
کریں۔ اور ہاں مضمون کے نیچے میرا
پتہ بھی ضرور لکھ دیجیے گا۔
اڈیٹر۔ خدا حافظ۔
شاعر۔ یہ لیجیے صاحب تیار ہو گئی نظم لیتے
جائیے۔ سرورق پر چھپ جائے تو اچھا
ہے۔ صرف پندرہ شعر ہیں۔ ذرا جھجھکے نا
سنا ہی دوں سب کچھ۔
اڈیٹر۔ چھپنے کے بعد سب ہی پڑھ لیں گے۔
ورنہ مزا جاتا رہے گا۔
ڈاکٹر۔ ہاں ٹھیک ہے۔
اڈیٹر۔ خدا حافظ۔
سب کہتے ہیں خدا حافظ۔
(اڈیٹر چلا جاتا ہے)
شاعر۔ طبیعت بڑی موزوں تھی۔ کیا روانی تھی
اللہ اکبر دس منٹ میں پندرہ شعر کہہ دیے
خیر۔ ایک غزل تو سن لیجیے۔
محتسب روک رہا ہے مجھے پھر پینے سے
اس کو کیوں آگ سی لگتی ہے میرے جینے سے
لیڈر۔ خوب بھئی واہ
ڈاکٹر۔ ارے کوئی ہے۔ ادھر آؤ۔ ارے
مدار صاحب۔ امام علی۔ کہاں ہیں تم لوگ۔
نوکر۔ جی صاحب۔
ڈاکٹر۔ مغرب ہو گئی۔ کچھ خیال بھی ہے
صاب لوگ بیٹھے ہیں۔ خود صاحب
بھی تشریف لائے ہیں۔ الماری کھولو
اور ہاں نرگس سے کہہ دو گوشت تلنے کیلئے
وکیل۔ کیا اچھی بات کہی بھئی میں تو تھک گیا
اب ایک ترک مسکرات پر مضمون بھی لکھنا ہے
پئے بغیر تو دماغ کام نہ کر سکے گا۔
لیڈر۔ مجھے تو معاف ہی رکھو تو بھئی ایک جلسے میں تقریر کرنا ہوگا
ڈاکٹر۔ اصاحب۔ آپکے بغیر تو کوئی نہیں پئے گا۔
لیڈر۔ اچھا بھئی تھوڑی سی تمہاری خاطر۔
شاعر۔ اب سنا سکوں گا کچھ میں بھی۔
وکیل۔ خدا خیر کرے۔
(پردہ گرتا ہے)

ہندوستانی صنعتِ فلم سازی کی معاشی اہمیت

از جناب سید محمد تقی ہاشمی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

ہندوستانی صنعت فلم سازی کی تاریخی سرگذشت کو نظر انداز کرکے اجمالاً یہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ متکلم فلموں کی ابتدا کے بعد سے مذکورہ صنعت کی رفتار ترقی سال بسال تیز ہوتی گئی۔ چنانچہ وسعت اور پیمانۂ کاروبار کے لحاظ سے ہندوستان کی تمام صنعتوں میں اسی کا آٹھواں درجہ ہے۔ صنعت مذکور بذاتہ ایک منفعت بخش کاروبار ہونے کے علاوہ ریلوے، ٹپہ، اور ٹیلیگراف وغیرہ جیسے قومی کاروبار کے فروغ و ترقی میں بھی ممد و معاون رہی ہے۔ خام مواد جیسے فلمیں اور دیگر لوازمات الگ ہیں۔ اسکی وجہ سے سرکاری مالیہ میں چاہے وہ مرکزی ہو یا صوبہ جاتی کافی اضافہ ہوتا رہا ہے۔

صنعت مذکور کے مسائل پر مسٹر ہر لیکر نے اپنے مقالہ بعنوان (THE PLACE OF THE FILIM IN NATIONAL PLANNING) میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ میں صنعت مذکور سے متعلقہ یا دلچسپی رکھنے والے حضرات سے اس مقالہ کے غایر مطالعہ کی سفارش کرتا ہوں۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ صنعت فلم سازی کی پیدائش، تقسیم اور نمائش کی شاخوں میں جملہ سترہ کروڑ روپے کی رقم لگائی گئی ہے۔ یہ صنعت تقریباً چالیس ہزار اشخاص کو براہ راست پرورش کرتی ہے۔ فلم ساز کمپنیوں کی جملہ تعداد ۷۵ ہے اور اوسطاً ۱۴ ہزار فٹ لمبے فیچر فلم جو اب تک تیار کئے گئے، تقریباً دو سو کی تعداد میں ہیں۔ مذکورہ تعداد گزشتہ ۵ سال کے اعداد کی بنا پر نکالی گئی ہے۔ ایک فیچر فلم کی تیاری کی اوسط لاگت ایک لاکھ روپے ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر فلموں کی تیاری میں تقریباً دو کروڑ روپے سالانہ صرف کئے جاتے ہیں۔ ہندوستانی فلموں کی تیاری کے خاص مرکز: بمبئی، پونا، کولھاپور، کلکتہ، مدراس اور

کوئمبٹور وغیرہ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی فیچر فلموں کی تعداد میں واجبی اضافہ ہوا ہے لیکن ہندوستانی شارٹ فلموں کی پیدائش اطمینان بخش نہیں ہے۔ بمبئی، کلکتہ، مدراس اور لاہور کی مجالس احتساب فلم کی رو‌ئدادوں کے مطالعہ سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ ۱۹۲۴ء میں ۵۹ ہندوستانی فیچر فلموں کے مقابلہ میں صرف ۲۶ ہندوستانی شارٹ فلم اور ۱۹۲۷ء میں ۱۰۸ ہندوستانی فیچر فلموں کے مقابلہ میں صرف ۶۴ ہندوستانی شارٹ فلم تیار کیے گئے۔ اس کے بالکل برعکس غیر ہندوستانی فیچر فلم غیر ہندوستانی شارٹ فلموں کے مقابلہ میں یہ تعداد قلیل تیار کیے گئے اور کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں غیر ہندوستانی فیچر فلم ۴۰۵ اور غیر ہندوستانی شارٹ فلم ۹۰۳ اور ۱۹۲۷ء میں علی الترتیب ۳۹۵ اور ۱۱۸۱ تیار کیے گئے۔ ان اعداد سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ غیر ہندوستانی فیچر فلموں کی مانگ گھٹ اور شارٹ فلموں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ تعداد کے لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر ہندوستانی فلمیں چاہے وہ فیچر ہوں یا شارٹ، ہندوستانی فلموں کے مقابلہ میں زیادہ تیار کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں ہندوستانی فیچر اور شارٹ فلموں کی جملہ تعداد ۸۵ اور غیر ہندوستانی فلموں کی ۱۳۰۸ اور ۱۹۲۷ء میں علی الترتیب ۲۴۴ اور ۱۵۷۶ رہی لیکن تناسب کے لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی فلمیں غیر ہندوستانی فلموں کے مقابلہ میں زیادہ تعداد میں تیار کی گئیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں اگر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی فلموں کی تعدادوں میں ۱ اور ۱۷ کی نسبت تھی تو وہ ۱۹۲۷ء میں ۱ اور ۷ ہو گئی۔ گویا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی غیر ہندوستانی فلموں کے مقابلہ میں ہندوستانی فلموں کی مانگ میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔

پورے ملک میں سیناؤں کو نمائش کیلئے فلمیں مہیا کرنے والے منقسمین (DISTRI BUTORS) کی تعداد (۲۵۰) ہے جو بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس، لاہور، بنگلور، کراچی اور بھساول میں متعین ہیں۔

سیناؤں کی تعداد میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ فی الحال انکی تعداد تقریباً ۹۹۶ ہے جس میں سے ۵۳۲ ہندوستانی، ۲۶۶ ہندوستانی اور بیرونی اور ۱۹۰ صرف بیرونی فلموں کی نمائش کرتے ہیں مزید برآں تقریباً پانچ سو گشتی سینما پائے جاتے ہیں۔

بیرونی فلمیں بتلانے والے ۴۲۴ سیتاؤں کو تقریباً ایک درجن منقسمین فلمیں مہیا کرتے ہیں جنکی اکثریت امریکی اور انگریزی پیدا کنندوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مذکورہ منقسمین ہر سال اوسطاً ۴۰۰ فیچر فلم اور ۱۲۰۰ شارٹ فلم درآمد کرتے ہیں۔

اکثر حضرات کیلئے یہ امر واقعہ آگاہی کا باعث ہوگا کہ ۱۹۳۱ء سے لیکر اب تک ہندوستانی صنعت فلم سازی نے مرکزی حکومت کو خام اور کھلے ہوئے (EXPOSED) فلموں کے محصولات درآمد کے سلسلہ میں ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ ادا کئے ہیں۔ گزشتہ سالوں کے اعداد دستیاب نہ ہوسکے بہرحال ۱۷ سال کے عرصہ میں حکومت کو صنعت فلم سازی سے ۲ لاکھ سے ۱۵ لاکھ تک آمدنی حاصل ہوئی ہے۔

صنعت فلم سازی نے ریلوں کے ذریعہ مرکزی مالیہ کو جو رقم ادا کی ہے اسکی مقدار تقریباً ۱۵ لاکھ بتلائی جاتی ہے۔ مزید برآں مرکزی حکومت صنعت فلم سازی سے محصول آمدنی کی شکل میں کافی مقدار میں آمدنی حاصل کرتی ہے جو محصول درآمد اور ریلوں کی آمدنی سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ صنعت مذکور کی پیدائش تقسیم اور نمائش کی شاخوں، خام فلم اور مشنری فروخت کرنے والے فرموں اور ان کے کارندوں سے کئی لاکھ روپے کی رقم بطور محصول آمدنی الگ وصول کی جاتی ہے۔

مسٹر ہرلیکر نے اندازہ لگایا ہے کہ مرکزی حکومت صنعت فلم سازی سے سالانہ تقریباً پچاس لاکھ روپے کی رقم وصول کرتی ہے اور یہ کہ اس آمدنی میں سال بسال اضافہ ہو رہا ہے اسلئے کہ صنعت مذکور نے بڑی سرعت کے ساتھ وسعت حاصل کی ہے۔

یہ امر قابل یادداشت ہے کہ صنعت مذکور سے چند ایک بڑی اور چھوٹی صنعتیں امداد و اعانت حاصل کرتی ہیں اور یہ کہ مطابع اور اخبارات اس سے کافی مقدار میں آمدنی حاصل کرتے ہیں۔

موجودہ صورت میں جس امر کی سخت ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ صنعت فلم سازی کے ایک زبردست ادارہ کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ وہ اس کے ذریعہ اپنے مطالبات حکومت کے سامنے موثر طور پر پیش کرسکے۔

حیوانات اور نباتات کا ارضیاتی عمل

از جناب سید محمد احمد الدین صاحب بی۔اے۔(عثمانیہ) بی ایس سی بیالوجی
امپائرچیٹر) ایف۔آر۔جی۔ایس۔(انگلینڈ) بی ایس۔ایف۔یل۔ایس (لندن)

حیوانات اور نباتات کے ارضیاتی عمل کو عالم ارضیات تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) حفاظتی عمل (PROTECTIVE)

کرۂ زمین کا جو حصہ گھنے نباتات سے ڈھکا رہتا ہے وہاں کی زمین اور زیر زمینی حصے بارش کے اثر سے محفوظ رہتے ہیں یعنے اسپر تصرفی عمل ہوکر مادہ پانی کے ذریعہ دوسرے مقام پر منتقل نہیں ہوتا بلکہ یہاں دوسرے مقامات سے پانی اور ہوا کے ذریعہ کئی قسم کے مادے مثلاً مٹی، ریت اور چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑے آکر جمع ہوتے ہیں۔یہ امر مسلمہ ہے کہ بہاؤ کے سلسلہ میں اگر کہیں کوئی روک نہ ہو تو مادہ بہتا رہیگا۔اگر اسکے برخلاف راستے میں پتھر، درخت یا گھانس کے ذریعہ کوئی رکاوٹ پیدا ہوجائے تو وہ تمام مادہ اس مقام پر جمع ہوجائیگا۔یہی وجہ ہے کہ جس زمین پر گھانس یا گھنے درخت اُگے ہوئے ہوتے ہیں وہ خطہ پانی کے ذریعہ گھسنے کی بجائے وہاں دوسرے مقامات سے مادہ آکر جمع ہوتا ہے جسکی وجہ وہ خطہ تصرفی عمل سے محفوظ رہتا ہے۔

(۲) تخریبی عمل۔(DESTRUCTIVE)

یہ ایک کیمیائی عمل ہے۔نباتات ہوا میں کی کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کو توڑ کر کاربن اپنے لئے بطور غذا کے لے لیتے ہیں جب نباتات مرجاتے ہیں تو انکے کاربن کی تکسید عمل میں آتی ہے یعنے وہ آکسیجن کے ساتھ ملکر پھر کاربن ڈائی آکسائیڈ کی صورت اختیار کرتی ہے۔پانی اس کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دیگر نامیاتی ترشوں کو جو مردہ نباتات میں موجود رہتے ہیں اپنے میں حل کرکے حجرات کے تجزیہ

اور تحلیل کا ایک زبردست حربہ بن جاتا ہے۔ اس کیمیائی عمل کے علاوہ درخت اپنی جڑوں کے ذریعہ حجرات کو توڑتے چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی مہین شگاف میں کوئی پودا اُگ آئے تو جیسے جیسے یہ پودا بڑھتا جاتا ہے اسکی جڑیں شگاف کو بڑھاتی اور حجر کو توڑتی چلی جاتی ہیں۔

(۳) تعمیری عمل (CONSTRUCTIVE)

چھوٹے چھوٹے حیوانات سمندری پانی پیتے ہیں اور اسمیں جو کیلسیم کاربونیٹ اور سیلیکا حل رہتا ہے اس سے انکے سخت اعضاء بننے کے علاوہ انکا حفاظتی خول بھی بنتا ہے۔ ان حیوانات کے مرجانے پر خول اور انکے سخت اعضاء تہ نشین ہوتے ہیں۔ حرارت اور پانی کے دباؤ سے ایک جسم ہوکر چونے کا پتھر تیار کرتے ہیں۔ یہ پتھر نامیاتی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آبی نباتات مرکر پانی میں مختلف اثرات کے تحت دلدل کا کوئلہ (PEAT) اور کوئلہ وغیرہ میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

بیاکٹیریا بہت ہی چھوٹی جسامت کے نباتات ہیں جنکی ساخت اگرچیکہ بالکل سادہ ہوتی ہے اور انمیں سبزی نہیں ہوتی لیکن انمیں کیلسیم کاربونیٹ موجود ہوتا ہے۔ اس قسم کی چھوٹی جسامت کے نباتات عموماً ایک کثیر تعداد میں اکٹھا پائے جاتے ہیں۔ کیالکیریس الگی میں بھی کیلسیم کاربونیٹ خاصی مقدار میں ہوتا ہے جسکے مرجانے پر ایک حجر ساز مادہ جسکو نولیپور (NULLIPORE) کہتے ہیں تیار ہوتا ہے۔ جب نباتات گول وانہ دار کیلسیم کاربونیٹ تیار کرتے ہیں تو اسکو اولائیٹ (OOLITE) کہتے ہیں اور اس سے تیار شدہ چونا پتھر کو اولائیٹ کا چونا پتھر کہتے ہیں۔ اکثر چونا پتھر اُن حیوانات اور نباتات کے نام کے ساتھ موسوم کئے جاتے ہیں جنکے ذریعہ وہ تیار ہوتے ہیں۔

آبی مردہ نباتات سخت کوئلہ تیار کرنیکے قبل مختلف درجوں کے کوئلے تیار کرتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) دلدل کا کوئلہ (PEAT)

یہ آبی مردہ نباتات کے تنوں، پتوں اور جڑوں کا پہلا حاصل ہے جسمیں سے آکسیجن اور ہائیڈروجن خارج ہوکر کاربن کی ایک معتدبہ مقدار باقی رہ جاتی ہے۔ جب کسی چھوٹے تالاب میں کا پانی اسقدر کم ہوجاتا ہے کہ وہ اسمیں کے اُگے ہوئے نباتات کو زندہ نہیں رکھ سکتا تو وہاں کے درخت آہستہ آہستہ مرکر

زمین پر گر جاتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد ان پر نئے درخت پیدا ہوتے ہیں اور جب یہ درخت بڑے ہوجاتے ہیں تو انکے نیچے کے مردہ درخت آہستہ آہستہ "پیٹ" میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ یہ نرم یا اسفنجی ہوتا ہے اور ایندھن کے کام آتا ہے اسمیں جسقدر مٹی اور ریت کی مقدار کم ہوگی اتنا ہی یہ خالص ہوگا۔ خالص، خشک اور پیوستہ دلدل کی ترکیب تقریباً حسب ذیل ہوتی ہے:۔

کاربن	ہائیڈروجن	اکسیجن	نائیٹروجن	راکھ	جملہ
۵۵٫۹	۵٫۸	۳۶٫۴	۱٫۰	۰٫۹	۱۰۰

اسکی ترکیب میں جو ۹٫ فیصد راکھ پائی جاتی ہے اسمیں وہ جمادات پائے جاتے ہیں جو نباتات میں زندگی کیوقت موجود تھے۔

(۲) بادامی کوئلہ (LIGNITE)

جب دلدل کا کوئلہ پرانا ہوجاتا ہے اور اسپر ایک موٹی مٹی یا نئے درختوں کی پرت جمع ہوجاتی ہے تو اسکے وزن اور دباؤ سے یہ ایک سربستہ اور ٹھوس شکل اختیار کرتا ہے اور ساخت بالکل ایک ہی ہوجاتی ہے یعنی دوسرا حاصل رکاوی نباتات کی شکل اختیار کرتا ہے جسکو بادامی کوئلہ یا لگنائیٹ کہتے ہیں۔ اسکو جب جلاتے ہیں تو یہ نیلے رنگ کا شعلہ اور دھواں دیتا ہے اور اسمیں سے ایک قسم کی بو بھی آتی ہے۔ اسکی تقریباً ترکیب حسب ذیل ہے:۔

کاربن	ہائیڈروجن	آکسیجن	نائٹروجن	راکھ	جملہ
۵۷٫۲	۴٫۶	۳۶٫۰	٫۲	۲٫۰	۱۰۰

اسمیں کاربن کی مقدار ۵۵ تا ۵۷ فیصد تک ہوتی ہے۔

(۳) نرم کوئلہ (BITUMINONS)

جب دوسرے حاصل یعنے بادامی کوئلہ پر وزن اور دباؤ زائد پڑتا ہے تو ایک تیسری چیز حاصل ہوتی ہے جسکو نرم کوئلہ کہتے ہیں۔ یہ سربستہ بھورے سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور یہ بھی ایک قسم کی بو اور نیلا شعلہ دیتا ہے اسمیں نباتی ساخت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ جلنے کے بعد ایک قسم کا سخت ٹھوس مادہ

تیار ہوتا ہے جسکو کوک (COKE) کہتے ہیں اور یہ لوہے کے پگھلانے میں کام آتا ہے۔ اسمیں کاربن کی مقدار ۸۵ تا ۹۰ فیصد ہوتی ہے۔ اس قسم کے "کوکنگ کوئلہ" کی ترکیب حسب ذیل ہوتی ہے:-

کاربن	ہائیڈروجن	آکسیجن	نائٹروجن	گندک	راکھ	جملہ
۷۸٫۷	۶٫۰	۱۰٫۰	۲٫۲	۱٫۵	۱٫۴	۱۰۰

(۴) سخت کوئلہ (ANTHRACITE)

اخیر اور بہت ہی اہم حاصل جسمیں نباتی ساخت بالکل معدوم ہو جاتی ہے اور جسمیں کاربن کی مقدار ۸۰ تا ۹۵ فیصد ہوتی ہے اور کسی طرح ۹۰ فیصد سے کم نہیں ہوتی اسکو کوئلہ یا سخت کوئلہ کہتے ہیں۔ ہوا میں یہ ہلکے نیلے رنگ کا شعلہ دیتا ہے اس سے نہ دھواں نکلتا ہے اور نہ بو لیکن بہت گرمی دیتا ہے اسی وجہ سے یہ یورپ میں گھروں میں جلانے کے کام آتا ہے۔ اسکی ترکیب حسب ذیل ہے:-

کاربن	ہائیڈروجن	آکسیجن	نائٹروجن	گندک	راکھ	جملہ
۹۰٫۴	۳٫۳	۳٫۰	٫۸	٫۹	۱٫۶	۱۰۰

کوئلہ کا شمار رسوبی حجرات میں کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے حجر یعنے کوئلہ تقریباً ہر ملک میں پایا جاتا ہے کہیں اسکی مقدار بہت زیادہ ہے اور کہیں کم۔ نباتات ایسے اہم حجر تیار کرتے ہیں جسپر یورپ کے باشندوں کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ اگر نباتات سے کوئلہ تیار نہ ہوتا تو یورپ کے باشندونکو سردی کے زمانے میں سخت سے سخت تکلیف کا سامنا ہوتا۔

جسطرح نباتات ایک کارآمد حجر کوئلہ تیار کرتے ہیں اسیطرح حیوانات بھی مساوی کارآمد حجر یعنے چونا پتھر تیار کرتے ہیں۔

چونا سمندر میں اور سمندر کے کنارے مختلف چھوٹے جانوروں کے ذریعہ جمع ہوتا ہے جو اتھل پانی میں اپنی زندگی گذارتے ہیں مثلاً فورامینیفرا (FORAMINIFERA)۔ انکے علاوہ نظام حیوانات میں اور کئی جانور ہیں جنکے ڈھانچے میں چونا ہوتا ہے جسکا پتہ کیمیائی تشریح سے چلایا جاتا ہے۔ بحیرۂ روم میں کئی ہزار فٹ موٹے ایسے پہاڑ موجود ہیں جو ایسے چھوٹے چھوٹے جانوروں سے بنے ہوئے ہیں جنکی

شکل پیسے کی سی ہوتی ہے اور جو مختلف اشکال ہوتے ہیں جنکو نومولائیٹ یا سکوی کہتے ہیں۔ اس کی موجودگی کیوجہ اس قسم کے حجرات کو سکوی چونا پتھر کہتے ہیں۔ بحیرہ روم میں جو پہاڑ سطح آب کے اوپر ہیں انکا امتحان کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سکوی چونا پتھر سمندر کی تہہ میں تیار ہوئے ہیں کیونکہ اکثر اوقات ان پہاڑوں میں سکوی کے علاوہ مختلف سمندری جانوروں کے رکازات دستیاب ہوتے ہیں پہاڑوں کے سلسلہ کا سطح آب کے پرے دکھائی دینا اس بات کیطرف اشارہ کرتا ہے کہ اس مقام پر سمندری زلزلے واقع ہوئے ہیں جسکی وجہہ سمندر کی تہہ کا کچھ حصہ اوپر اٹھ آیا اور کچھ اپنی اصلی مقام پر قایم رہ گیا۔ اسی طریقہ پر تیار شدہ کئی ہزار فٹ پہاڑ ہمالیہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اس کرۂ زمین پر مختلف مقامات میں مختلف اونچائی اور موٹائی کے پہاڑ ایسے ہیں جو سمندر یا پانی کے ذریعہ تیار ہوئے ہیں انکی تیاری میں سمندری مادہ مثلاً ریت اور سمندری جانور حصہ لیتے ہیں۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو عالم ارضیات نہو وہ یہ کیسے جان یا پہچان سکتا ہے کہ فلاں پہاڑ سمندر کے ذریعہ تیار ہوا ہے اور فلاں کسی اور ذریعہ سے انکا جواب صرف یہی ہے کہ جو پہاڑ سمندر کے ذریعہ تیار ہوئے ہیں وہ عموماً پرتیلے ہوتے ہیں اور ان میں سمندری جانوروں کی ہڈیاں جنکو ارضیات کی زبان میں رکازات کہتے ہیں کثرت سے ملتے ہیں۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زیر بحث پہاڑ سمندر کے ذریعہ تیار ہوا ہے ورنہ دھات پانی کے جانوروں کے رکازات موجود نہوتے۔ اس قسم کے پانی کے ذریعہ تیار شدہ حجرات کو رسوبی حجرات کہتے ہیں اور عموماً اپنے منھ سے بھاپ دینے سے مٹی کی بو آتی ہے۔

شمالی امریکہ اور ایشیا میں ایک خاص قسم کا چونا پتھر پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے چھوٹے جانوروں کے ذریعہ تیار ہوا ہے جنکو فسولینا کہتے ہیں۔ اور اس تیار شدہ پتھر کو فسولینا چونا پتھر کہتے ہیں۔ مرجان سب سے زاید چونا پتھر تیار کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس قسم کے پتھر کو مرجان چونا پتھر کہتے ہیں جو ہر ملک میں تھوڑا بہت پایا جاتا ہے۔ دوسرے سمندری جانور جنکو کائی حیوانیہ کہتے ہیں انمیں بھی کیلسیم کاربونیٹ ہوتا ہے۔ یہ جب پہاڑ کے تیار کرنے میں مدد دیتے ہیں تو اور

جانوروں کی طرح یہ ادھر اُدھر بکھرے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ اپنی ایک علیحدہ پتلی پرت تیار کرتے ہیں جو دو دوسرے قسم کے پرتوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جب کسی چونا پتھر میں صرف جانوروں کے حفاظتی خول کے ناقابل شناخت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پائے جائیں تو اسوقت اس پتھر کو "شلی چونا پتھر" کہتے ہیں۔

نام کوئلہ سے تقریباً ہر شخص واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ یہ ریل۔ کارخانوں اور یورپ میں عام طور پر مکانوں میں بھی جلایا جاتا ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ قدرت نے کوئلہ کسطرح تیار کیا اور وہ کانوں میں کسطرح پایا جاتا ہے۔ کوئلہ کے تیار ہونے کا طریقہ تو اوپر بیان کر دیا گیا اب یہ بتایا جائیگا کہ یہ کانوں میں اور سطح زمین کے نیچے کسطرح پایا جاتا ہے۔

کوئلہ پرتوں میں پایا جاتا ہے اور پرتوں کی موٹائی ایک انچ سے کئی فٹ تک ہوتی ہے ان پرتوں کو ارضیاتی زبان میں "کولسیم" یا زغالی سلوٹ کہتے ہیں۔ اور یہ مختلف قسم کی مٹی اور پتھروں سے محصور ہوتی ہے اور یہ سطح زمین سے مختلف ترتیب پر پائی جاتی ہے۔ مٹی اور پتھروں سے محصور کول سیم تقریباً ہر کوئلہ کی کان میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ہر ایک کوئلہ کی پرت یا زغالی سلوٹ کے نیچے ایک موٹی یا پتلی مٹی کی پرت پائیجاتی ہے اور زغالی سلوٹ کے اوپر مٹی۔ ریت پتھر یا چھوٹے چھوٹے پتھروں کی پرت ہوتی ہے۔ اسطریقے کا سلسلہ یعنے نیچے مٹی کی پرت، درمیان میں کوئلہ کی پرت اور اوپر مٹی، ریت پتھر یا چھوٹے چھوٹے پتھروں کی پرت کئی ہزار فٹ تک جاری رہتا ہے۔ اور ایک کان میں کئی "کول سیمس" پائے جاتے ہیں مختلف زمانے میں کئی دفعہ زمین کے نیچے اور اوپر ہونیکی حرکات کیوجہہ کئی کول سیمس تیار ہوتے ہیں۔ کوئلے کی پرت کے نیچے کی مٹی کی پرت کا امتحان کرنے پر ماہرین ارضیات کو یہ پتہ چلا کہ یہ پرت کسی زمانے میں سطح زمین تھی جو پانی کے نیچے یا پانی کے قریب تھی جسپر درخت اُگے ہوئے تھے۔ درختوں کی موجودگی کا ثبوت ہمکو اسطرح ملتا ہے کہ کوئلہ کی کان میں ہمکو اکثر اوقات بڑے بڑے درختوں کے جڑ، تنے، پتے، پھل اور بیجوں کے کامل نشانات ملتے ہیں۔

کوئلہ کی اہمیت یورپ کے باشندوں سے پوچھئے اگر یہ چیز وہاں دستیاب نہ ہوتی تو انکی زندگی دشوار ہوجاتی کیونکہ انکو سرما میں چوبیس گھنٹے اسکی ضرورت پڑتی ہے۔ ریل اور کارخانے اسی کی بدولت چل رہے اور لاکھوں انسان پرورش پارہے ہیں۔

تاریخ طب پر ایک سرسری نظر

از جناب ڈاکٹر سید نظام الدین احمد صاحب سیول سرجن دواخانۂ عثمانیہ

فن طب اور علاج کے طریقوں کا علم اسی قدر قدیم ہے جتنا کہ خود انسان ابتدائے آفرینش سے لیکر اس وقت تک جب کبھی لوگ درد و مصیبت کا شکار ہوئے تو علاج کی تدابیر اختیار کرنا بالکل فطری اقتضاء تھا۔ چنانچہ ان اقوام میں جو اب بھی بالکل قدیم ابتدائی زندگی بسر کرتی ہیں۔ علاج کے طریقے بھی ویسے ہی بالکل سادہ پائے جاتے ہیں۔

یونان قدیم عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ تاریخ طب کا آغاز یونان میں زمانہ ہرقلیطوس یعنی تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح سے ہوتا ہے۔ ہرقلیطوس یا بقراط جزیرہ کاس کا باشندہ تھا۔ اسکی عمر کا بیشتر حصہ سیاحت اور تحقیق میں گذرا یہ نہایت ہی تجربہ کار اور حاذق طبیب تھا یہی پہلا شخص تھا۔ جس نے علم طب کو مذبذب حالت سے نکالکر اسکو پایۂ علم تک پہنچایا۔ اسلئے اسکو موجد و امام علم طب کہنا مناسب ہوگا۔ اسکی وفات کے بعد افادات بقراط (کارپس ہپوکے ٹی کس) کو مدون کیا گیا جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بقراط سے پہلے بھی طب ایک فن خیال کیا جاتا تھا اور مبادیات سائنس بھی موجود تھے۔ لیکن بے قاعدہ شکل میں۔

صدیوں تک علم طب میں بقراط کے نصائح۔ اصول اور طریقۂ علاج کی تقلید کی گئی۔ اس زمانہ میں بھی علاج کے لئے ادویات سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن زیادہ تر صاف پانی، آفتاب کی روشنی، تازہ اور کھلی ہوا۔ موزوں غذا۔ اور دیگر اصول حفظان صحت کو ترجیح دی جاتی تھی۔

ارسطو، ۳۸۴ قبل مسیح میں بمقام یونان پیدا ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں افلاطون کے حلقۂ درس میں شریک ہوا اور طب اور فلسفہ میں مہارت حاصل کی۔ ۳۴۲ ق۔م میں سکندر اعظم کا اتالیق مقرر ہوا اس نے حیاتیات پر معرکتہ الآرا تحقیقاتی مقالے لکھے اور ارتقاء عالم کا تخیل سب سے پہلے اسی نے ظاہر کیا

جسکے بعد ڈارون اور دیگر علماء نے اسکو مسلمہ نظریۂ ارتقاء کی شکل میں پیش کیا۔ اخلاط اربعہ (یعنی سودا صفرا۔ بلغم اور خون) کی سب سے پہلے توضیح اسی نے کی اور عناصر مثلاً آب، آتش، خاک و باد کے وجود اور خشک و تر اور گرم و سرد پر بحث شروع کی یہ الفاظ اس وقت تک مشرقی شاعری اور قدیم یونانی طب میں اصطلاحات کے طور پر مستعمل ہیں۔

سکندر اعظم کی وفات اور سلطنت یونان کے زوال کے بعد جب مصر و اسکندریہ علمی ترقی کے مرکز بنے تو فلسفہ کے ساتھ ساتھ علم طب نے بھی کچھ ترقی کی۔

جالینوس۔ دوسری صدی عیسوی میں روما میں طبی مشق کرتا تھا۔ اس نے بقراط سے زیادہ طبی ذخیرہ چھوڑا ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال تک طبی پیشہ ور اصولِ جالینوس ہی پر عمل پیرا رہے اور اصل علم میں مقابلتہً بہت کم اضافہ ہوا۔ کیونکہ عوام ان اصول کو مستند خیال کرتے تھے۔ جس سے تشکیک تحقیق کی کسی کو جرأت نہ تھی اسلئے لوگ اُن کو سولھویں صدی عیسوی کے علمی انقلاب تک جو نشاۃ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے روایتی طور پر مانتے رہے۔

عربوں کی فتوحات اور علم طب کی اشاعت۔ تاریخ طب کے وہ ابواب نہایت ہی دلچسپ ہیں جن میں یونانی طب کی عالمگیری کے واقعات مندرج ہیں۔ یونان سے بقراط اور جالینوس کے تلامذہ اور متبعین نے علم طب کو مندرجہ ذیل مقامات تک پہنچایا۔

(۱) سسلی اور اٹلی کے جنوبی حصص ۔

(۲) ایشیائے کوچک۔ شام سے عراق اور عرب

(۳) بحیرۂ روم کو عبور کرکے راستے اسکندریہ جہاں سے مصر اور آفریقہ کے دوسرے حصوں میں یونانی طب نے شہرت پائی۔

عربوں نے علم طب کی سب سے زیادہ خدمت کی۔ دنیا میں سب سے پہلے عربوں ہی نے دواخانے قائم کئے۔ مہاجرین علم طب اور نجوم اپنے ساتھ لیتے گئے۔ عرب فاتحین نے یونانی طب کو ساتویں صدی عیسوی میں۔ عرب اور آفریقہ کے شمالی ساحل سے لیکر جبل الطارق اور اسپین تک پہنچایا۔

جہاں مشہور عالم جامعہ قرطبہ کی بنیاد ڈالی اس قسم کی اور درسگاہیں دمشق، بغداد، کوفہ اصفہان اور سمرقند میں قائم ہوگئیں جہاں بلا امتیاز قوم و ملت مختلف ممالک کے طلبا تحصیل علم کی غرض سے شریک تھے۔ فارغ التحصیل ہونے پر جب یہ اصحاب اپنے وطن لوٹتے تو ان کے توسط سے علم کی خاصی تشہیر ہوتی تھی۔

مندرجۂ ذیل اطبا خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

محمد ذکریا رازی، امراض متعدیہ کے اولین محقق تھے۔ سب سے پہلے انہوں ہی نے چیچک اور کنکر تھر کو مفصل طور پر بیان کیا۔ طب منصوری ان کی ایک مشہور عالم تصنیف ہے۔ عورتوں اور بچوں کے امراض میں اور اعمال جراحی میں انکو خاص مہارت تھی۔ 'الحاوی' کی تدوین انکی وفات کے بعد عمل میں آئی۔

ابوالقاسم ۔ انکو موجد آلات جراحی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے آلات جراحی کے چند ایسے نایاب نمونے ایجاد کئے کہ جنکی نظیر اس ترقی یافتہ زمانہ میں بھی نہیں ملتی۔ جریان خون کو روکنے کے چار طریقے جنکا انہوں نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے ابھی تک مستند مانے جاتے ہیں۔

حکیم بوعلی سینا، ۹۸۰ء میں بمقام افشانہ علاقہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ ۱۷ سال کی عمر میں ادبیات طب، فلسفہ اور جملہ علوم متداولہ پر عبور حاصل کیا تھا۔ یہ ایک نہایت ہی صاحب کمال اور عجوبۂ روزگار علامہ گزرے ہیں۔ انکی بے شمار تصانیف میں سے قانون الشفا۔ التنبیہات۔ عیون الحکم زیادہ مشہور ہیں بلا مبالغہ مروجہ طب یونانی کی جملہ کتابیں یا تو قانون بوعلی کی نقل ہیں یا اس کی شرح سے اخذ کی گئی ہیں۔

بغداد ہسپتال نے اس زمانہ میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ موجودہ دواخانوں کی طرح وہ بھی ہر حیثیت سے مکمل سمجھا جاتا تھا۔ باوجود اسکے کہ کلوروفام معلوم نہ تھا اور طہارت جراحی اور دافع عفونت ادویہ وغیرہ کو کوئی جانتا تک بھی نہ تھا، اسوقت بھی بڑے بڑے آپریشن کئے جاتے تھے جنکی دہشت انگیز تصاویر اب تک محفوظ ہیں۔ ان سے طب کے ارتقا پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ تاریخ عالم میں بلا اشتباہ یہ ایک نہایت ہی حیرت انگیز واقعہ ہے کہ عرب کے وحشی صحرانورد اور جاہل مطلق ساربان برقی سرعت سے نہ صرف بحیثیت فاتحین بلکہ بحیثیت علم بردارانِ علم و تہذیب تمام دنیا پر

چھا گئے اور اپنے شمع علم۔ عدل اور مساوات سے مشرق اور مغرب سکو منور کر دیا۔

جدید علم طب ۔ جسکو عام طور پر طب مغربی کہا جاتا ہے کوئی علیحدہ علم نہیں بلکہ قدیم یونانی علم طب کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں جو نیا علمی انقلاب پیدا ہوا۔ اُسوقت ویسالیس نے انسانی تشریح پر ایک کتاب تصنیف کی جسکی بنیاد حقیقی علم پر رکھی گئی جو انسانی اجسام پر عمل تقطیع سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ولیم ہاروے نے (۱۶۲۸ء) میں دوران خون کو سائنٹفک طریقہ پر ثابت کرکے طب جدید کا سنگ بنیاد رکھا۔

گذشتہ سو سال کا ہی وہ زمانہ ہے جس میں علم کیمیا، حیاتیات اور دیگر علوم جدیدہ کی تحقیقات اور انکشافات نے طب کے مردہ قالب میں روح پھونک دی ہے۔ خلوی نظریہ (سلولر تھیوری) اور جرثومیات نے علم طب میں ایک نئی تنظیم پیدا کر دی ہے۔ اور سابق کی طرح اسباب مرض کی بنیاد غلط فہمی اور توہمات پر نہیں رکھی گئی۔

امنیت کی تحقیق نے علاج اور حفظان صحت کے طریقوں میں انقلاب پیدا کر دیا ہے عرصہ دراز سے لوگ اس سے واقف تھے کہ خسرہ (Measles) کا حملہ بچہ کو ہمیشہ کیلئے مامون کر دیتا ہے اور مکرر مرض کا خوف باقی نہیں رہتا۔ کم و بیش یہی حال چیچک کا ہے۔

سو سال قبل انگلستان میں مرض چیچک بہت عام تھا۔ ایڈورڈ جینر نے مشاہدہ کیا کہ اکثر گوالی چیچک سے محفوظ رہتے ہیں۔ اگر اُن پر حملہ ہوتا بھی ہے تو خفیف قسم کا۔ تحقیق اور متعدد تجربات کے بعد اُس نے یہ ثابت کیا کہ چیچک گاؤ کی سرایت کی وجہ سے اُن میں امنیت پیدا ہوتی ہے۔ اس مشاہدے سے فائدہ اٹھا کر اس نے تجربتہً بچوں میں اس طریقہ سے چیچک کے خلاف امنیت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی اُسوقت سے لیکر دور حاضر تک امنیت سے اہم اور عجیب موضوع کا مطالعہ نہایت عرق ریزی سے کیا جا رہا ہے اسکے ذریعہ ہم آج اس قابل بنے ہیں کہ بڑی حد تک امراض ساریہ مثلاً چیچک، ہیضہ، ٹائیفائیڈ اور پلیگ وغیرہ کو حکمی طور پر روک سکیں۔ اور بعض امراض کا علاج انٹی سیرا (anti sera) کے ذریعہ قطعی طور پر کر سکیں۔

تخدیر۔ انیسویں صدی عیسوی میں امریکہ میں ڈاکٹر مارٹن نے عمل جراحی کے دوران میں بیہوشی طاری کرنے کے لئے ایتھر کا استعمال کیا۔ اسکے کچھ عرصہ بعد اڈنبرا میں سر جیمس سمپسن نے کلوروفام کی قوت تخدیر کا پتہ چلایا جو ایک قوی بیہوشی پیدا کرنے والی دوا ہے۔ آج کل نائٹرس اکسائیڈ وغیرہ عام بیہوشی پیدا کرنے کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کی جاتی ہیں۔ انکے علاوہ مقامی اور نخاعی بے حسی پیدا کرنے کیلئے متعدد ادویہ استعمال کی جاتی ہیں۔ جن کے ذریعہ ایک مخصوص حصۂ جسم جس پر عمل جراحی کرنا ہو بے حس کیا جاسکتا ہے ان طریقوں کی تحقیق کی بدولت نہ صرف مریض تکلیف سے نجات پاتا ہے بلکہ سرجن کے لئے پیچیدہ اور طویل اعمال جراحی میں سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے دواخانوں میں ہر سال ہزارہا آپریشن بلا تکلیف تکمیل پاتے ہیں۔ عفونت کو روکنے کے ذرائع کا انکشاف موجودہ سرجری کی ترقی کا ایک بڑا سبب ہے۔ گذشتہ صدی کے وسط میں پاسچر نے ثابت کیا کہ عمل تخمیر جراثیم کی وجہ سے ہوتا ہے نیز یہ کہ جراثیم ہی عفونت کا باعث ہیں۔ لارڈ لسٹر نے زخموں کے علاج میں دافع عفونت مثلاً کاربالک لوشن اور مرکیورک لوشن استعمال کئے جن سے زخموں کو صاف کرنے اور انکے اندمال میں بے حد سہولت حاصل ہوئی۔ جنگ کریمیا کی بہ نسبت جنگ عظیم میں زخموں کی عفونت کی وجہ سے بہت کم سپاہی خارج ہوئے۔ گذشتہ پچاس سال کے مسلسل تجربے نے ان ادویہ کے بیجا استعمال کی اصلاح کر دی ہے۔ اور ہر عمل جراحی میں ان ادویہ کو مفید طریقہ پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

آجکل عمل جراحی میں ایسے طریقے ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ جن سے جراحی زخموں کو جراثیم سے پاک رکھا جاسکتا ہے تاکہ زخم قدرتی طور پر مندمل ہو اور دافع عفونت ادویہ کے استعمال کی ضرورت نہ رہے۔

صدری جراحی۔ سینہ اور شش کی جراحی نے گذشتہ تیس سال کے عرصے میں بے حد ترقی کی ہے۔ اولاً (اپی کوتیسس) کو مرض دق میں شش کے بالائی حصہ کے کھفوں کو بند کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اب تو سینہ چاک کر کے جملہ پسلیاں تکوین الصدر آپریشن کے ذریعہ کاٹکر نکالدیجاتی ہیں تو شش ہمیشہ کیلئے دبی ہوئی حالت میں رہتا ہے۔ اور مرض مندمل ہو جاتا ہے۔ برانکئیس جیسے تکلیف دہ اور ناقابل علاج مرض میں متاثرہ شش کا ٹکڑا نکالدینے سے مرض کا قطعی ازالہ ہو جاتا ہے

حال ہی میں یورپ اور امریکہ کے بعض سرجنوں نے بعض جاں بلب مدقوق مریضوں پر نازک آپریشن کرکے قلب کے اطراف کا غلاف نکالدیا جسکے بعد مریض تندرست ہوگئے۔

علیٰ ہذا القیاس اعضا کے نقائص اور بدوضعگی کے ارتفاع اور دماغ کے جراحی طریقوں میں ایسے طریقے اختیار کئے جارہے ہیں جن پر بغیر دیکھے یقین کرنا بھی مشکل ہے۔

ریڈیو گرافی ۔ لا شعاع کے ذریعہ اعضا کا فوٹو لیکر انکے مختلف عکسوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے امراض کی تشخیص میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ معمولی طریقے کے علاوہ کثیف ادویہ جسم میں داخل کرکے شش۔ گردے ہثانہ اور مرارہ وغیرہ کی تصویریں حاصل کی جاتی ہیں۔ ہوا داخل کرکے دماغ کے کہفوں کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ چند سال سے آلات لا شعاع کے ذریعہ جسم کے اعضا کا نقشہ دیکھکر ناقص اور متاثرہ اعضا کا عکس لینے کا طریقہ رائج ہورہا ہے۔ اسمیں کسی عضو کی ایک مقررہ گہرائی تک کا فوٹو لیا جاسکتا ہے۔ اور باقی حصہ فلم میں نظر نہیں آتا۔

طب منعیہ یا حفظان صحت " حفظ ماتقدم علاج سے بہتر ہوتا ہے" اس شعبہ کا مقصد امراض ساریہ کا سدباب اور عوام کے خارجی ماحول کی اصلاح ہے تاکہ ہر وقت حیویہ جسمانیہ (Vital Forces) اسقدر قوی ہے کہ وہ بخوبی امراض کا مقابلہ کرسکے۔

اس کے لئے خاص ادارے قائم ہیں جو عوام کی مقررہ پیش بندیوں اور احتیاط کو ملحوظ رکھنے کی ہدایات کرتے ہیں۔ قندیلی مناظر۔ سینما فلمس اور پمفلٹوں کے ذریعہ انہیں تفہیم دی جاتی ہے کہ کسطرح سرایت سے محفوظ رہیں۔ اور اگر خدانخواستہ متاثر ہوجائیں تو کسطرح علاج کرایا جائے۔ اسی طریقے کے منعی اصول دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں طاعون ہیضہ۔ دق اور دیگر متعدی امراض کو روکنے کے لئے اختیار کئے جارہے ہیں۔

بحمد اللہ ہماری فیاض حکومت حیدرآباد بھی اب اسطرف اپنی خاص توجہ مبذول کررہی ہے اور ہمیں توقع ہے کہ اگر پبلک بھی اس میں دلچسپی لے تو ایک دن وہ آئیگا جبکہ ہم فخر کیساتھ مثل دیگر ممالک کے یہ کہہ سکینگے کہ ہم نے بھی فلاں فلاں امراض کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔

بہبودی اطفال۔ کسی مرض کے قطعی ازالہ کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ ممکنہ طریقے سے ابتدائی مرحلے میں اسکو روکا جائے۔ جیسے بچپن۔ ملکۂ وکٹوریہ کا دور حکومت اس لحاظ سے خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ حکومت اور پبلک دونوں نے زندگی اطفال میں خاص دلچسپی سے کام لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ صدی میں بہبودی اطفال اور طلبا، مدارس کے لئے خاص محکمہ جات حفظان صحت کا افتتاح عمل میں آیا۔ نابینا، بہرے اور گونگے طلبا کے لئے خاص مدارس، جسمانی یا دماغی حیثیت سے کمزور بچوں کے لئے خاص انتظام کیا جانے لگا۔ اسطرح امراض کو انکے ابتدائی مرحلۂ زندگی میں ہی روکا اور علاج کیا جاتا ہے۔

مدارسی طبی محکموں کے مماثل ایک اور نظام ہے جسکو نظام بیمہ صحت کہتے ہیں۔ جسکا انحصار اس اصول پر ہے کہ حکومت عوام اور بالخصوص دولتمند اشخاص کا بوقت ضرورت طبی محکمے کے اخراجات میں ہاتھ بٹائیں۔ اس غرض سے انگلستان میں ایک کروڑ چالیس لاکھ نفوس مذکورالصدر نظام میں شریک کئے گئے ہیں۔

اسی قسم کی ایک اور تنظیم عورتوں کے لئے زچگی وغیرہ کی سہولتیں بہم پہنچاتی ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک دوراندیش کہلانے کی مستحق نہیں جب تک کہ وہ عورتوں کے زمانۂ حمل، اسقاط حمل اور زچگی کے وقت انکی صحت کو برقرار رکھنے کا باقاعدہ انتظام نہ رکھے۔ کیونکہ وہ بنی نوع انسان کے لئے منبع تولید اور افزائش نسل کا مخرج ہیں۔ زچگی کو محفوظ، بے ضرر، اور سہل بنانا ہمارا فرض اولین ہے یہ واقعہ موجودہ تہذیب کے لئے باعث ننگ ہے کہ صرف سلطنت متحدہ امریکہ میں ہر سال تین ہزار سے زائد مستورات زچگی سے ضائع ہوتی ہیں۔ اور اس سے کہیں زیادہ اس "فعلیاتی عمل" کیوجہ سے ہمیشہ کیلئے ناکارہ ہو جاتی ہیں۔

ہندوستان تو اس معاملے میں ابھی منزلوں پیچھے ہے۔ اسکا صحیح اندازہ مشکل ہے کہ یہاں ہر سال کتنی بے کس مائیں زچگی کے باعث اپنی پیاری زندگی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہتی ہیں۔ کوئی زچگی کو "پیغام اجل" خیال کرتا ہے تو کوئی اسکو بربادی صحت کی ابتدا تصور کرتا ہے۔ یہ سب ہماری غفلت شعاری

اور تساہل کے نتائج ہیں۔ ورنہ طب اسقدر ترقی کرچکی ہے کہ اس قسم کی واردات کو اقل ترین تعداد تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

حیات انسانی پر موجودہ علم طب کی نوازشات کی یہ چند مثالیں ہیں۔ نتیجتہً یہ کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اب زندگی پہلے سے زیادہ محفوظ و مامون ہوچکی ہے۔ ایک انگریز۔ جاپانی۔ یا امریکن لڑکا جو آج تولد ہوتا ہے اس کے توئی سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے دادا سے کم از کم بارہ سال زیادہ عمر پائیگا۔ ان ممالک میں وبائی اور کمسنی کی ادویات کا ایک حد تک انسداد ہوچکا ہے۔ کیا اطفال اور کیا بالغ آدمی ہر ایک صحت سے مالامال نظر آتا ہے۔ جسکی مثال ان ملکوں کی گذشتہ تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ بخلاف اسکے ہمارا قومی انحطاط، ہماری افراط پسندگی۔ امراض ساریہ کی کثرت، اصول حفظان صحت سے انحراف ہماری نسلوں کو دن بدن زیادہ کمزور بنا رہے ہیں۔

ع ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

مستقبل - ابھی علم طب کو بہت کچھ کرنا ہے۔ اسوقت تک ایسے امراض موجود ہیں جنپر علم طب نے پورا یا مطلقاً قابو نہیں پایا۔ ہر سال سرطان سے ہزاروں نفوس داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ اور ہم اس میدان میں بے معنی سے نظر آنے لگتے ہیں۔ انفلوئنزا کی بعض غیر واضح اور نزلہ زکام کی کیفیتیں ابھی محتاج تحقیق ہیں۔ وجع مفاصل کی جانفشانی نے ابھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ سالانہ ساٹھ ہزار اموات جو قلبی امراض سے منسوب کی جاتی ہیں ان میں سے نصف سے زائد کی محرک غالباً یہی ہے۔

انکے علاوہ عالمگیر عصبی امراض کی بڑی جماعت میں تحقیق کی گنجایش ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مستقبل حفظان صحت کا کام اونچا معیار اپنے ساتھ لائیگا۔ ہماری تہذیب کا یہ غم انگیز واقعہ ہے کہ ہر سال مجنونوں میں بیس ہزار سے زیادہ اضافہ ہورہا ہے۔ ہم نے انکی ہمدردانہ حراست کیلئے ادارے قائم کئے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس مرض کی اصلی وجہ ہمیں معلوم نہوسکی۔ جنون کے ابتدائی اسباب محرکہ موروثی خباثت ناحول کے نقائص طبعی اور معاشرتی خرابیاں، اور غیر معمولی دماغی محنت ہیں جن میں سے اکثر بلاواسطہ انسان کے اختیار میں ہیں۔ ہمیں صرف مخبوط الحواسی کا علاج ہی کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے

زیادہ اہم ان وسائل کی دریافت ہے۔ جن سے ہم انسانی دماغ کی قوت اور استعداد کو بڑھا سکیں کیونکہ دنیا کا شاندار مستقبل صرف تندرست اجسام رکھنے والی قوموں پر نہیں بلکہ ان پر ہے جو صحیح اور ذکی دماغ بھی رکھتے ہیں۔

میں اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر یہ کہدینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہ علم طب کی ترقی کا سب سے اہم جزو ہے کہ لوگ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی روزمرہ زندگی میں قوانین صحت کو ملحوظ رکھیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہمارے علم الصحت نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی جتنی علم الادویہ نے بعض اوقات انسان کو اپنی نادانی کے سبب ادویہ کے غلط استعمال کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ لیکن اکثر زندگی میں صحت بخش طریقوں کا عدم امتیاز اور ان پر عمل پیرا نہ ہونا زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جسطرح زندگی کے لئے غذا لازمی ہے اسیطرح ہوا اور روشنی بھی اہم ہیں جن کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔ اچھی غذا، تازہ ہوا، موزوں روشنی ہی صحت مندی کا راز ہیں۔

رباعی

بے جرم کوئی دہر میں رہ سکتا ہے
کس کا ہے یہ منہ، کون یہ کہہ سکتا ہے
میں جرم کروں اور تو سزا دے مالک
کچھ فرق بھی پھر دونوں میں رہ سکتا ہے

(ترجمہ)

حکیم رائے ست گرو پرشاد رہبر

تجلیات

از شنکر موہن لعل صاحب ماتھر بی۔اے (عثمانیہ)

تم جو آئے دل ہوا آباد ویرانے کے بعد
جاگ اٹھے تقدیر سے قسمت کے سو جانے کے بعد

جاذبیت کچھ تو ہے آخر گداز شمع میں
خود فدا ہو جاتا ہے پروانہ پروانے کے بعد

ان کی محفل میں کسی نے میری چھیڑی داستان
غیر بھی سنتا رہا افسانہ افسانے کے بعد

واں سے آتی ہے خبر مجھکو وجود یار کی
جس جگہ کچھ بھی نہیں معلوم ہو جانے کے بعد

کون کہتا ہے مری حالت میں تبدیلی ہوئی
تھی وہی جانے سے پہلے ہے وہی آنیکے بعد

یوں تو سب ہی آتے جاتے ہیں سرائے دہر میں
ہے وہی اک مرد جو جی جائے مر جانیکے بعد

جب ہوا بیدل تو پردہ غیریت کا اٹھ گیا
سوز میں بھی ساز آجاتا ہے دل جانیکے بعد

جس کا جام دل نہ ہو لبریز از درد جگر
عشق کو کیا خاک سمجھیگا وہ سمجھانے کے بعد

یہ جہان ارمان کبھی منزل گہہ عشرت نہیں
بس کھلا ہے راز ہم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد

ایجادات کے دور (سلسلہ گذشتہ)

جدید کارگاہ ہم نے اس سے پہلے بتایا ہے کہ قدیم زمانے کے کاریگروں کو بھدّے اور غیر معیاری آلوں سے کام لینا پڑتا تھا۔ اس نقص کی وجہ سے انھوں نے خاطر خواہ رفتار سے ترقی نہیں کی۔ موجودہ میکانی ترقی کا ایک بڑا راز جدید کارگاہ ہے جہاں جدید آلے خالص دھاتیں اور معیاری پرزے استعمال کئے جاتے ہیں۔

ہنری ماڈسلے معیاری آلوں کا موجد ہے۔ اس نے ایسے معینہ ناپ کے پیچ اور نٹ بنائے کہ ایک ہی نمبر کے مختلف پیچوں اور نٹوں میں بال برابر فرق نہ رہا۔ پہلے یہ حال تھا کہ ہر طرح ایک سے معلوم ہونے والے پیچ اور نٹ بھی ایک دوسرے پر نہ آسکتے تھے۔ ہر نٹ اور پیچ کو کھولنے سے پہلے شناخت کے لئے ایک سے نشان ڈالدئے جاتے تھے تاکہ پھر دوبارہ لگانے میں دقت نہ ہو۔ اب معیاری پرزوں کے باعث یہ دقت رفع ہوگئی ہے جس سے وقت اور محنت کی بڑی کفایت ہوئی۔ یہ امور بظاہر بہت معمولی نظر آتے ہیں مگر درحقیقت انکا کارکردگی پر ضرور مفید اثر پڑتا ہے۔ اس طرح ہماری میکانی ترقی بڑی حد تک ماڈسلے کی رہین منت ہے جس نے آج سے سو سال پہلے معیاری پرزے بنائے۔

دھات کو چھیل کر گول بنانے یا اسکی سطح صاف کرنے کے لئے صدیوں سے خراد استعمال کی جاتی رہی ہے۔ ماڈسلے نے خراد میں متحرک ٹیکن کا اضافہ کیا۔ اس آرام دہ اور مفید اضافے نے خراد جیسی قدیم چیز کو ایک عصری آلہ بنادیا۔ اب اسکے ذریعے نہایت صحیح قطر کے استوانے بنائے جاسکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر خراد سے اس انتہائی صحت کے ساتھ استوانے نہ بنائے جاسکتے تو دخانی انجن کے سارے تجربے ناکام ہوتے۔

سنہ ۱۸۳۰ء میں روبرٹ ورتھ نے دھات کی سطح صاف کرنے کا میکانی رندہ ایجاد کیا۔ کوئی نو سال بعد نیازمتھ نے دخانی ہتوڑا پیش کیا۔ اس ہتوڑے کے ذریعہ ایک آدمی ہزاروں من وزن کے لوہے کو ٹھوک کر مطلوبہ شکل کا بنالیتا ہے۔ بڑے بڑے لوہے کے ٹکڑے اس ہتوڑے کی ایک ضرب سے پتلی ناٹوں یا تختیوں کی شکل میں بدل جاتے ہیں۔ اس طرح ان نامور موجدوں نے جدید کارگاہ کو تین مفید آلے دئے۔ جدید خراد، میکانی رندہ اور دخانی ہتوڑا۔

کل بنانے والی کلیں اس سو سال کے عرصے میں مختلف کل بنانے والی کلیں اتنی تعداد میں بنائی گئی ہیں کہ

انکی تفصیل ممکن ہی نہیں۔ البتہ ان کا سرسری ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں اس سے ان کے تنوع اور میدان عمل کی وسعت کا اندازہ بھی ہو جائیگا۔

فرض کیجئے آپ کو ریلوے انجن کا نور بنانا مقصود ہے۔ فولاد کے ایک بے ڈول کڑے کو دابوں اور دخانی ہتوڑوں کے ذریعہ منٹوں میں استوانی شکل کا بنالیا جاسکتا ہے۔ پھر اسکو خراد پہ چڑھا کر اس طرح چھیلا جاتا ہے کہ اس کی سطح صاف ہو جائے۔ بعد ازاں اسکو تیز گھومنے والے ایمری کے پہیوں سے لگا کر گذارا جاتا ہے۔ اب اسکی ساری بیرونی سطح صاف چکنی اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ پیمائش کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسکا قطر مطلوبہ قطر کے عین برابر ہے۔

آپ کو دندانے دار پہیے تیار کرنے ہیں۔ دھاتوں کے بڑے بڑے مدور قرص لیجئے اور مشین میں رکھئے یہ مشین دندانے کاٹ دیگی۔ پھر ان پہیوں کے مرکزی حصے میں سوراخ ڈالدینے کے لئے ایک دوسرے مشین کی مددلینی ہوگی۔ اس سوراخ میں سے وہ محور گزریگا جسپر یہ دندانے دار پہیہ قائم رہیگا۔ موٹر کے گیر اسی طریقے سے تیار کئے جاتے ہیں۔

ہمیں کارخانوں میں ہزارہا کلوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ مختلف مشین اپنے اپنے خاص کام خوبی سے انجام دیتی ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز انھیں کلوں کی رہین منت ہے۔ بوتل پر لگانے کے ڈھکن سے لیکر بڑی بڑی نالیں تک یہیں تیار ہوتی ہیں۔ دھات کی تختیوں کو برقی رو گذار کر جوڑا جاتا ہے جن سے بڑے بڑے جہاز بنتے ہیں۔ گھڑیال کی بال برابر باریک کمان بھی یہیں بنتی ہے اور بڑے بڑے صدہا من کے انجن بھی یہیں تیار ہوتے ہیں۔

جنگ عظیم کا ایک اثر یہ ہوا کہ بڑھتی ہوئی مانگ کے لحاظ سے مصنوعات بڑے پیمانے پر تیار ہونے لگے جنگ کے زمانے میں سامان حرب تیزی سے تیار ہوا اور صلح کے بعد بھی مصنوعات تیزی کے ساتھ بنائی جانے لگیں۔ بعض وقت اس کا اندیشہ ہوتا تھا کہ اس عجلت اور تیز رفتاری کے باعث پیداوار کی خوبی متاثر ہوگی۔ پھر مزدوروں کے مطالبات کیوجہ سے اوقات کار کو کم کرنا اور اجرتوں کو بڑھانا بھی پڑا۔ مگر صنعتی انجنیروں نے ان تمام مشکلات پر غلبہ حاصل کیا۔ انہوں نے ایسے عمدہ مشین ایجاد کیں جن کی وجہ سے مصنوعات کی خوبی کا معیار بلند رہا۔

ماہرین سائنس کا تعاون فولاد کی صنعت کو باوجود ان ناموافق حالات کے جو فروغ ہوا اسکی وجہ سائنس والوں کا تعاون ہے۔ مختلف قوموں کے فرمیں موجدوں اور سائنس والوں نے اپنی بیش بہا تحقیقات سے اسکو فروغ دیا۔ ماہرین طبیعات و کیمیا نے فولاد کے متعلق دور رس اور مفید تحقیقات کی ہیں اس تعاون کی وجہہ سے اشیاء کی ساخت اور انکی مضبوطی کا اندازہ لگانے کے مختلف طریقے معلوم کئے گئے۔ فولاد کے ہر نمونہ پر پہلے کیمیائی اور طبیعی آزمایشات ہوتی ہیں۔ اس امر کا تعین کرلیا جاتا ہے کہ فولاد کی ہر قسم اس مخصوص کام کیلئے موزوں ہے۔ فولاد کی ہر تختی ہر پیچ اور ہر پرزے کی ضروری مضبوطی کی آزمایش کرلی جاتی ہے۔ پھر خوردبین کے ذریعے فولاد کے ہر نمونے کی ساخت کا امتحان کیا جاتا ہے۔ ہر نمونے کو ٹھوک کر، کھینچ کر، اور مروڑ کر اسکے لوچ اور مضبوطی کی آزمایش کیجاتی ہے۔ پھر یہ بھی نہیں ہوتا کہ ضرورت سے بہت زیادہ مضبوط قسم کا فولاد کسی معمولی ضرورت کے لئے استعمال کیا جائے کیونکہ اس سے مصنوعات گراں ہو جائینگی۔

مثال کے لئے موٹر ہی کو لے لیجئے۔ کسی موٹر کے محور کی تیاری کے وقت اسپر ایسی آزمایش کیجاتی ہے جس سے اطمینان ہوجائے کہ معمولی حالات میں محور پر جو بار ہوسکتا ہے اسکا وہ آسانی سے مقابلہ کرسکتا ہے پھر یہ بھی کہ اسپر صرف ضرورت کے عین برابر فولاد صرف کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ احتیاط کے خاطر محور ضرورت سے زیادہ موٹا بنادیا جائے۔ سائنس دانوں کے تعاون سے ہر چیز اسقدر معیاری ہوگئی ہے کہ محض حفاظت کے خیال سے بیرجہ فولاد بھی زیادہ استعمال کرنا فضول خرچی ہے۔

تیز رفتاری مختلف قسم کی ہزارہا مشینیں دن رات پیداوار میں اضافہ کرنے میں مصروف ہیں۔ انکی رفتار بھی تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ تجارتی مقابلوں کی وجہہ سے مشینوں کی رفتار میں تیزی پیدا کرنا ناگزیر ہوگیا ہے آج سے دس سال پہلے کی مشین جس رفتار سے کام کرتی تھی آج وہ بالکل ناکافی ہے۔ سال بہ سال تیز رفتار مشینوں کے لئے جگہ پیدا کی جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں انگلستان کی ایک نمایش میں لکڑی صاف کرنے کی ایک مشین پیش کی گئی تھی۔ اس مشین میں لکڑی کی تختیاں ڈالی جاتی تھیں۔ یہ مشین ان تختیوں کی سطح پر رندہ پھیرتی اور کناروں کو گول بنادیتی تھی۔ اسکی رفتار اتنی تھی کہ ہر منٹ میں ۳۰۰ فٹ لمبے تختے تیار ہوجاتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں بھی اس قسم کی

مشین پیش کیگئی مگر اب اسکی رفتار ۵۰۰ فٹ فی منٹ تھی یعنی کارکردگی میں ۵۰۰ فیصدی اضافہ ہوا صرف چار سال میں رفتار اتنی بڑھ گئی کہ انسانی ہاتھ اسکا ساتھ دینے سے قاصر ہوگئے۔ پہلے کھُردرے تختے مشین میں ڈالنے کا کام ایک مزدور انجام دیا کرتا تھا۔ مگر اب اس مشین میں تختے ڈالنے کے لئے بھی ایک دوسری مشین بنانی پڑی۔

بے زنگ فولاد فولاد کی صنعت کے سلسلے میں ایک دلچسپ اور قابل ذکر کارنامہ بے زنگ فولاد نئی ایجاد ہے۔ فارا ڈے ایسے فولاد کا متلاشی تھا جو زنگ آلود نہ ہوتا ہو۔ اس نے بہت سے تجربے کئے اور آخر کار ایک حد تک کامیاب بھی ہوا۔ اس نے فولاد کی ایک ایسی قسم معلوم کی جو زنگ آلود نہ ہو سکتی تھی مگر یہ اسقدر نرم اور بے لچک تھی کہ کسی صنعت میں اسکا استعمال ممکن نہ تھا۔

معمولی فولاد کے بنے ہوئے چاقو اور چھُریاں بہت جلد زنگ آلودہ ہوجاتی ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ معمولی فولاد کا لوہا پانی میں نسبتاً زیادہ حل پذیر ہے۔ معمولی فولاد کے ذرے متجانس نہیں ہوتے۔ اسوجہ سے اس کے سالمے ہوا کی آکسیجن سے بہ آسانی مل جاتے ہیں۔ اس طرح لوہے کا آکسائڈ حاصل ہوتا ہے جسکو ہم زنگ کہتے ہیں۔ بے زنگ فولاد کے فوائد اس قدر واضح ہیں کہ انکی تفصیل غیر ضروری ہے۔

کرومیم نامی دھات کی آمیزش سے بے زنگ فولاد تیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح حاصل کیا ہوا کروم فولاد بہت پھوٹک ہوتا ہے۔ اور اسمیں لوچ بھی بہت کم ہوتا ہے۔ مگر چھری چاقو ہماری روزمرہ زندگی میں جس مقصد کے لئے استعمال ہوتے ہیں اسکے لئے انکا زیادہ لوچدار یا مضبوط ہونا ضروری بھی نہیں ہے۔ اس قسم کا فولاد تیار کرنے کیلئے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ کاربن پوری طرح خارج کردیا جائے۔ یہ بہت ہی مشکل اور نہایت ہی گراں عمل ہے ۲۰۰ روپیہ کے فولاد سے کاربن پوری طرح خارج کرنے میں کوئی ہزار روپیہ خرچ ہوتے ہیں۔ اگرچہ کہ جدید ترمیمات اس عمل کی گرانی کو گھٹانے کی طرف مائل ہیں مگر پھر بھی عمل تخلیص پر فولاد کی قیمت کا کم از کم چہار چند ضرور صرف کرنا پڑیگا۔

فولاد میں کرومیم کے ساتھ نکل اور کوبالٹ کو ملا کر عجیب وغریب فلزات تیار کی جارہی ہیں۔ اس قسم کی نئی فلزات کے استعمال سے پرواز زیادہ قابل اعتماد ہوتی جارہی ہے۔ ہوائی جہاز کے حمام ایسے ہی فلزات سے تیار کئے جارہے ہیں کیونکہ یہ بہت سبک، بے زنگ اور نہایت ہی مضبوط ہوتے ہیں۔

(۳)

کرگے کا دور

تمہید تہذیب کے ابتدائی مدارج میں جب انسان کو کھانے پینے اور محفوظ مقامات میں رات بسر کرنے کا اطمینان ہو لیا تو جسم ڈھانکنے کی فکر ہوئی۔ پہلے درختوں کے پتوں سے ستر پوشی کا کام لیا گیا اور پھر مردہ جانوروں کی کھال سے۔ جب سادہ ترین ضروریات زندگی سے اطمینان حاصل ہوا تو اظہار ذات کے جذبے نے نمایش کا تخیل پیدا کیا۔ قدیم زمانے کے برتنوں پر جو بھدی تصاویر اور نقوش نظر آتے ہیں وہ سب اسی جبلت کا مظاہرہ ہیں۔ کرگا تہذیب انسانی کی ان ابتدائی ایجادوں میں سے ایک ہے جو انسان نے اپنی فن کاری اور کمال کے اظہار کے لئے پیش کئے۔ دوسرے قبیلوں پر فوقیت جتانے کے لئے اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا کہ قبیلے کے تمام آدمی عمدہ کپڑا پہنیں۔ اسوجہ سے ہی انسان نے کپڑا بُننے کی طرف بہت پہلے ہی سے توجہ کی ہوگی۔ اگرچہ کہ کرگا بہت ہی قدیم ایجاد ہے، مگر تعجب اسکا ہے کہ کئی صدیوں کے گذر جانے پر بھی یہ اپنی ابتدائی حالت ہی میں رہا۔ غلہ پیسنے کے لئے پن چکیاں اور ہوا چکیاں قایم ہوئیں مگر کرگے کے لئے دستی قوت ہی کافی سمجھی گئی۔ ہوا اور پانی کی قوت سے کرگا چلانے کا خیال تک نہ آیا۔ ٹول، کشمیرے، مخمل، ساٹن چھینٹ اور ململ سب قدیم دستی کرگے پر ہی بنے جاتے تھے۔

ریشے ہمارا لباس دو قسم کے ریشوں سے بنتا ہے، حیوانی اور نباتی۔ روئی، کتان، اور سن نباتی ریشے ہیں۔ اُون اور ریشم حیوانی ریشے۔

روئی ان تمام ریشوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اسکا استعمال اسقدر وسیع ہے اور اسکا کپڑا عام طور پر اسقدر مقبول ہوا ہے کہ اسکو ریشوں کی ملکہ کہتے ہیں۔ یہ معلوم نہ کیا جا سکا کہ دراصل اسکی صنعت کس وقت سے شروع ہوئی، مگر اتنا یقین ہے کہ بہت ہی قدیم چیز ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہمارے ملک ہندوستان میں ۸۰۰ ق م سے اسکا استعمال ہو رہا ہے۔ سکندر اعظم نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تھا تو اُسنے ہندوستانیوں کو روئی کا کپڑا پہنا ہوا دیکھا۔ کولمبس ۱۴۹۲ء میں جب امریکہ پہنچا تو وہاں بھی باشندوں کو روئی کے لباس میں ملبوس پایا۔ یوں تو روئی کے کئی قسمیں ہیں مگر اسکی بہترین قسم باربادوس کہلاتی ہے۔ امریکہ میں یہ زیادہ ہوتی ہے۔ اسکے ریشے اتنے بڑے اور مضبوط ہوتے ہیں کہ

یسر بھر روئی سے ۳۰۰ میل لمبا تاگہ حاصل کیا جاتا ہے۔

کتان السی کے پودے سے حاصل ہوتا ہے۔ السی کا پودا ہر سال بویا جاتا ہے یہ کوئی دو تین فٹ اونچا ہوتا ہے۔ اسکے تنے کے ریشوں سے کتان حاصل ہوتا ہے اور اسکے بیج سے تیل اور کھلی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی کاشت آفریقہ کے بعض حصوں میں روس اور اکثر یورپی ممالک میں ہوتی ہے۔

اسکے بیج ہموار زمین پر بوئے جاتے ہیں۔ جب وہ کافی اونچے ہوجاتے ہیں تو انہیں جڑ سمیت اکھاڑ لیا جاتا ہے۔ پودوں پر کنگھی پھیر کر بیج علیحدہ کر لیتے ہیں اور تنوں کو پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ ان میں ایک قسم کا تخمیری عمل ہوتا ہے جسکے بعد ریشے بہ آسانی علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ ان ریشوں کو خوب پھٹکا جاتا ہے تاکہ اندرونی باریک ریزے علیحدہ ہوجائیں۔ پھر اچھے اور لمبے ریشے چھانٹ کر یکجا کر لئے جاتے ہیں پہلے کتانی کپڑا زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ مگر اب سوتی کپڑے نے اسقدر مقبولیت پائی کہ کتانی کپڑے کا استعمال نسبتاً کم ہوتا چلا ہے۔

سن بھی ایک نباتی ریشہ ہے۔ اسکی مختلف قسمیں ہیں جو دنیا کے مختلف ممالک میں اگتی ہیں۔ بنگال میں اسکی کاشت زیادہ ہوتی ہے۔ کلکتہ میں سن کے بڑے بڑے کارخانے ہیں جہاں اس سن کے تھیلے بنائے جاتے ہیں۔ اس صنعت کے لئے کلکتہ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ روس میں بھی سن کی ایک قسم پیدا ہوتی ہے وہاں اسکے تھیلے بنائے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ وہاں کے سن کا کپڑا بھی بنایا جاتا ہے۔ یہ بہت بھدا ہوتا ہے مگر غریب لوگ اسکو استعمال کر لیتے ہیں۔

ریشم کا کپڑا اولاً ہمالیہ میں پایا گیا تھا۔ پھر یہ کسطرح ملک چین میں منتقل کیا گیا ۲۶۴۰ ق م میں ملکہ سی لن شی نے اوقات فرصت میں تفریحی مشغلے کی حیثیت سے ریشم کے کیڑوں کی پرداخت شروع کی۔ چنانچہ اب بھی شہر پیکن کی معزز خواتین کا تفریحی مشغلہ یہی ہے۔ کہتے ہیں ملکہ نے اس زمانہ میں ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ ریشم کے کیڑے کو ضائع کئے بغیر پورا تار حاصل کر لیا جاسکتا تھا۔ یہ تار اپنی چمک اور مضبوطی کی وجہ سے اسقدر مقبول ہوا کہ خود شاہ چین نے اپنی ملکہ سے خواہش کی کہ اسکے لئے ریشم کا لباس تیار کرائے۔ اسطرح ریشم اور اسکی صنعت کو ابتدا ہی سے شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ ایک

عرصۂ دراز تک یہ صنعت ملک چین تک محدود رہی۔ دوسرے ممالک میں تشویش شروع ہوئی۔ مخاطرہ پسند طبیعتوں نے چین کے سفر اختیار کئے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالکر اس قومی صنعتی راز کا پتہ چلانے کی بہتیری کوششیں کیں مگر چھٹی صدی عیسوی تک یورپ اس راز سے واقف نہو سکا۔ فرانس اور ایطالیہ بارہویں اور تیرہویں صدی میں ریشم کی صنعت کے لیے مشہور تھے۔ انگلستان میں اسوقت تک یہ صنعت معمولی حالت میں تھی۔ جان لامب نے محسوس کیا کہ انگلستان اس صنعت میں بہت پیچھے ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسیطرح یہ صنعت انگلستان میں ترقی کرے۔ اس نے اطالیہ کا سفر کیا۔ بڑی مشکل سے ریشم کے ایک کارخانے میں معمولی مزدور کی حیثیت سے مامور ہوا۔ اس صنعت کے سارے گاڑھے راز معلوم کرلیے اور خفیہ طور پر انگلستان کو فرار ہوگیا۔ اسکی واپسی کے چندہی ماہ بعد انگلستان میں اعلیٰ درجے کا ریشم پیدا ہونے لگا۔ اطالوی نمائندے نے اس غیر معمولی ترقی پر اظہار حیرت کیا۔ جب اطالیہ کو یہ خبر پہنچی اور کارخانے کو اطلاع ملی تو سب سہم کر رہ گئے۔ اب انھیں معلوم ہوا کہ مفرور مزدور دراصل ایک بڑا صناع تھا جو اس بھیس میں انکے صنعتی راز لے اڑا۔ رنج اور غصّے سے مغلوب ہوکر اطالویوں نے انتقام کے لئے ایک آدمی انگلستان روانہ کیا۔ اس نے کسی طرح لامب سے گہری دوستی پیدا کی اور ایک مرتبہ اسکے کھانے میں زہر ملادیا۔ لمب جانبر نہو سکا مگر ریشم کی صنعت کے تمام رموز سے انگلستان واقف ہوچکا تھا۔

پارچہ بافی پارچہ بافی کے دو اہم شعبے ہیں۔ ریشوں سے تاگہ حاصل کرنے کو کاتنا کہتے ہیں پھر ان تاگوں سے کپڑا حاصل کرنے کے عمل کو بننا کہتے ہیں۔

ریشوں کو پہلے دھنک لیتے ہیں اسکے بعد انکی پونیاں بنائی جاتی ہیں۔ ان پونیوں سے ریشوں کو آہستہ آہستہ کھینچ کر بل دیتے جاتے ہیں۔ اس طرح تاگہ کاتا جاتا ہے۔

ابتدائی دور میں کپڑا بننے کا عمل سادہ مگر محنت طلب تھا۔ پہلے تاگے کے کھڑے تار تان دیئے جاتے تھے۔ آڑے تاروں کا ایک سلسلہ ان میں سے نیچے اوپر گذارا جاتا تھا۔ اس طرح تاگے کو دو متوازی آڑے کھڑے سلسلوں میں مربوط کرکے کپڑا حاصل کیا جاتا تھا۔ کھڑے تاروں کو تانا اور آڑے تاروں کو

بانا کہتے ہیں۔

مذکورۂ بالا عمل نہ صرف مشقت طلب تھا بلکہ اسمیں وقت بھی بہت ضائع ہوتا تھا۔ پھر کپڑے کی بڑھتی ہوئی مانگ کیلئے اس طریقے سے پوری رسد مہیا نہ ہوسکتی تھی۔ حالات متقاضی تھے کہ کوئی آسان عمل معلوم کیا جائے۔ یہی ضرورت دستی کرگے کی ایجاد کا باعث ہوئی۔

دستی کرگہ دستی کرگے میں تانے کے تاروں کو ایک چوکھٹے میں اسطرح تان دیتے ہیں کہ کرگے کے پائیدان کو دبانے سے متبادل تاگوں کا ایک سلسلہ اوپر اٹھ جاتا ہے۔ یعنی پہلا، تیسرا، پانچواں اور دیگر طاق تاگے اوپر اٹھ جاتے ہیں اور بقیہ نصف تاگے نیچے ہی رہتے ہیں۔ درمیان میں جو جگہ پیدا ہوجاتی ہے اس میں سے نال پھینک کر بانا ڈالا جاتا ہے۔ اب پائیدان کو اٹھانے سے تاگوں کا طاق سلسلہ نیچے اور دوسرا سلسلہ اوپر ہوجاتا ہے۔ نال کو جسپر بانے کا تاگہ ہوتا ہے درمیانی جگہ میں سے مخالف سمت میں پھینکا جاتا ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھکر پورا بانا ڈالدیا جاتا ہے۔ اس ایجاد سے یہ فائدہ ہوا کہ کُلا چھے کو تانے کے ہر تار کے اوپر نیچے سے نال گذارنے کی دقت باقی نہ رہی۔ تانے کو چوکھٹوں میں مرتب کرنے کی وجہ سے بانا ڈالنا بہت سادہ اور تیز تر عمل کی صورت اختیار کرسکا۔

جان کے اس قدیم کرگے میں جو قدیم نال استعمال ہوتی تھی اسکے لئے جلاہے کے دونوں ہاتھ مصروف رہتے تھے ایکمرتبہ اسکو سیدھی جانب سے بائیں جانب نال پھینکنی ہوتی تھی اور دوسری مرتبہ بائیں جانب سے سیدھی طرف۔ ۱۷۳۳ء میں ایک انگریز موجد جان کے نے اڑان نالی ایجاد کی۔ اسکے ذریعے جلاہا صرف ایک ہاتھ کے ذریعے نال دان کو جھٹکا دیکر نالی کو دونوں سمتوں میں پھینک سکتا ہے۔ اس سہولت کی وجہ سے کارکردگی میں اضافہ ہوا اور کپڑا زیادہ مقدار میں پیدا ہونے لگا۔ اسکا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ کپڑا سستا ہوگیا۔ اس پر جان کے کے ہم وطن اسقدر برہم ہوئے کہ اسکے مکان پر حملہ آور ہوئے۔ بیچارہ جان کے ایک روئی کے تھیلے میں جا چھپا ورنہ شاید اسکا خاتمہ ہی ہوجاتا۔ بعض دوستوں نے دشمنوں کی نظر بچا کر اس تھیلے کو اپنے مکان میں منتقل کیا۔ کچھ دنوں بعد اسکو اپنا وطن چھوڑ کر فرانس جانے کا موقع ملا۔ وہاں اس نے غریب کی حالت میں اپنی زندگی کے باقی دن گذارے اور آخرکار گمنامی کی حالت میں انتقال کیا۔ مرنے کے بعد قدر ہوا کرتی ہے۔ انتقال کی خبر پانے کے بعد لنکا شائر کے ان غضبناک محسن کشوں نے محسوس کیا کہ جسکو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے وہ دراصل ان کا دوست اور بہی خواہ تھا۔ (باقی)

دوسری فصل

زرعی آبادی (بہ سلسلۂ سابق)

ادنیٰ معیار زندگی اور اس کا مفہوم

سابقہ فصل کے آخری پارے میں لکھا گیا ہے کہ موضع ہذا کے باشندوں کا معیار زندگی بحیثیت مجموعی ادنیٰ ہے لیکن اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس ادنیٰ معیار زندگی سے کیا مراد ہے اور اس کو جانچنے کا ہمارے ہاں کیا معیار ہے۔

ادنیٰ معیار زندگی سے ہماری مراد ایسا معیار زندگی ہے جو کہ ایک کارگذار متمدن اور مہذب جماعت یا قوم کے شایانِ شان نہو۔ پھر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ وہ کونسا معیار زندگی ہے جو کہ کارگذار، متمدن اور مہذب جماعت یا قوم کے شایان شان ہوسکتا ہے اس قسم کے معیار سے ہماری مراد ایسا معیار رہایش ہے جس پر زندگی بسر کرنے سے وہ تمام ضروریات اور چند واجبی تعیشات پوری ہوتی ہیں جو کسی جماعت یا قوم کی قوت کارگذاری، معیار تہذیب، معیار تمدن اور معیار آرام کو بڑھانے یا برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اسی معیار رہایش کو ایک "کارگذار معیار زندگی" کے نام سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ موضع ہذا کے باشندوں کا معیار زندگی بحیثیت مجموعی ادنیٰ ہے تو اس وقت ہمارا یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندے ایک "کارگذار معیار رہایش" (جس کی ہم نے ابھی تعریف کی ہے) کے مقابل بہت ہی گرے ہوئے معیار پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

رمی آبادی

معیارِ زندگی کو جانچنے کے ذرایع

ذیل میں ہم موضع زیر بحث کے باشندوں کی (الف) غذا (ب) لباس (ج) مکان اور (د) نوعیت تعلیم کے حالات دریافت کریں گے کیونکہ یہی چار اہم ذرایع ہیں جن کی بدولت کسی جماعت یا قوم کے معیارِ زندگی کو جانچا جا سکتا ہے۔

(الف) غذا :۔ صحت اور قوت کارگذاری کو بڑھانے یا برقرار رکھنے کے لئے متوازن قسم کی غذا کا استعمال ضروری ہے۔ "متوازن غذا" سے روزمرہ کی وہ مستعملہ غذا مراد ہے جس میں صحت اور قوت کارگذاری کو بڑھانے یا برقرار رکھنے والے جملہ اجزائے غذائیت ایک موزوں تناسب میں پائے جاتے ہیں۔ "پریسیڈنسی بے بی اینڈ ہلت ویک اسیوسیئیشن" نے اپنے جاری کردہ پمفلٹ[1] میں بتلایا ہے کہ کمترین[2] مصارف کے ساتھ ایک شخص کی ماہانہ یا روزانہ غذا حسب ذیل جدول کے مطابق ہوسکتی ہے :۔

نمبر شمار	نام اجناس	تفصیل اجناس	ایک شخص کی ماہانہ مقدار خوراک: پونڈ	ایک شخص کی ماہانہ مقدار خوراک: اونس	ایک شخص کی روزانہ غذا کا حساب: فی کس روزانہ مقدار خوراک (اونس)	پروٹینس (گراموں میں): اچھا	پروٹینس (گراموں میں): ٹھیک	پروٹینس (گراموں میں): کم	چربی (گراموں میں): اچھا	چربی (گراموں میں): کم	کاربوہیڈریٹ (گرامس)	حرارے
۱	چاول	صاف چاول	۳	۱۲	۲	-	۳٫۵۸	-	۰٫۲۶	-	۵۲٫۱۸	۲۲۶
		زیرصاف چاول	۷	۸	۴	-	۹٫۲۰	-	-	٫۳۴	۸۹٫۲۰	۳۹۶
		رائس پالشنگس	۱	۶	۰٫۷۵	-	۳٫۹۷	-	۴٫۲۰	-	-	۵۱
۲	دیگر	گیہوں، باجرا، جوار	۲۱	۴	۱۱	-	-	۳۵٫۱۱	-	۴٫۸۸	۲۳۲٫۳۷	۱۱۴۴
۳	دالیں	مسور، تور وغیرہ	۲	۴	۲٫۱	-	۲۳٫۵۰	-	-	۲٫۰۰	۳۲٫۴۰	۲۰۰
		ثابت چنے	۱	۸	۰٫۸	-	-	-	-	-	-	-
۴		سویا بینس	-	۱۵	۰٫۵	-	-	-	-	۴٫۰۰	-	۱۲۶
۵	نباتیاتی تیل	. . . . .	۱	۱۴	۱	-	۹٫۲۰	-	۴٫۶۰	-	۹٫۵۰	۱۱۲
۶	چربی جانور	. . . .	۱	۱۴	۱	-	-	-	۲۸	-	-	۲۵۲

[1] ۔ پمفلٹ نمبر ۸ صفحہ ۱۶ ۔ [2] ۔ پانچ روپیہ کلدار

زرعی آبادی

نمبر شمار	اجناس	نام اجناس	ایک شخص کی ماہانہ مقدار خوراک: پونڈ	اونس	فی کس روزانہ مقدار خوراک (اونس)	ایک شخص کی روزانہ غذا کا حساب — پروٹینس (گراموں میں): اچھا	ٹھیک	کم	چربی (گراموں میں): اچھا	کم	کاربوہیڈریٹ (گراموں)	کیلوریز
		گھی یا مسکہ	–	۱۵	۰٫۵	–	–	–	۱۴٫۰۰	–	–	۱۲۶
۷	دودھ	......	۷	۸	۴	۴٫۵	–	–	۸٫۷	–	۴٫۹۰	۱۲۰
۸	کھلّی	ولایتی مونگ	۱۵	۰٫۵	٫۵	–	۶٫۶۰	–	–	۵٫۸۰	۶٫۶۰	۶۰
		ملک پوڈر	–	۱۵	۰٫۵	۴٫۸۰	–	–	۰٫۷۵	–	۷٫۲۵	۵۵
۹	غذا از قسم گوشت	گوشت مچھلی	۳	۱۲	۳٫۰	۱۶٫۹۱	–	–	۶٫۰۰	–	–	۱۲۵
۱۰	شکر	شکر یا گڑ	۲	۱۲	۱٫۵	–	–	–	–	–	۳۸٫۲۵	۱۵۰
۱۱	غذا جو کہ جڑوں یا میوے کی قسم سے ہوں	پیاز یا آلو یا گاجر	۱۱	۴	۶٫۰	۱٫۹۵	–	–	۰٫۱۹	–	۱۸٫۹۰	۲
۱۲	پتے دار سبزیاں	پالک۔ گوبی	۱۱	۴	۶٫۰	۲٫۴۰	–	–	۰٫۱۹	–	۷٫۲۰	۴۲
۱۳	مسالہ جات	مرچ۔ ادرک۔ لہسن	–	–	–	–	–	–	–	–	–	–
۱۴	نمک	......	–	–	–	–	–	–	–	–	–	–

جملہ – – ۴۸٫۷۵ (۲۲٫۴۶ ۷٫۴۵ ۳۵٫۱۱) (۶۶٫۸۹ ۲۵) ۴۹۸٫۷۵ ۳۲۶۱

زیر فی صد تخفیف برائے خرابی ۴٫۸۷ ۱۱٫۱۵ ۹٫۱۹ ۴۹٫۸۵ ۳۲۶

باقی ...... ۴۳٫۸۸ ۱۰۳٫۵۲ ۸۲٫۴۲ ۴۴۸٫۸۸ ۲۹۳۵

مندرجہ صدر تختہ سے واضح ہو رہا ہے کہ اگر حسب صراحت روزانہ مختلف قسم کی اشیا بطور غذا استعمال کی جائیں تو ۱۰۳٫۵۲ گرام پروٹینس۔ ۸۲٫۴۲ گرام چربی۔ ۴۴۸٫۸۸ گرام کاربوہیڈریٹ اور ۲۹۳۵ کیلوریز حاصل ہوسکتے ہیں جن کی بدولت ضروری گرمی اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موضع ہذا کے باشندوں کو اس نوعیت کی غذا دستیاب نہیں ہوتی۔

رد عی آبادی

عام طور پر چاول استعمال کئے جاتے ہیں، اس لئے کہ چاول یہاں کی سب سے اہم پیداوار ہے۔ جوار بھی استعمال کی جاتی ہے لیکن محدود مقدار میں۔ البتہ خستہ حال خاندان بیشتر جوار اور کمتر چاول استعمال کرتے ہیں۔ گیہوں کا استعمال صرف عیدین کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ گیہوں ایک قیمتی پیداوار ہے۔

دالوں میں سب سے زیادہ عمومیت اڑد کو حاصل ہے کیونکہ اور دالوں کے مقابل یہی ارزاں دال ہے۔ مونگ، چنے اور تور کا استعمال صرف چند خاندانوں تک محدود ہے۔ اس لئے کہ یہ دالیں نسبتاً گراں ہوتی ہیں۔

چاول اور جوار کی طرح یہاں کی عام استعمال کی اشیاء نمک، مرچ، پیاز اور املی ہیں انھیں اشیاء کے ذریعہ معمولی قسم کے ساگ سالن تیار کئے جاتے ہیں ادرک اور لہسن جس کو شہری آبادی کی اکثریت ذائقہ کی افزائش کے لئے نا گزیر طور پر استعمال کرتی ہے، دیہاتی افراد کی اکثریت عیدین کے موقع پر بھی ان کا استعمال نہیں کر سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں گراں ہوتی ہیں۔ مزید برآں دیہاتی ان کے استعمال کے عادی بھی نہیں ہوتے۔

سبزیوں میں جنگلی بھاجیوں کا استعمال عام ہے خصوصاً موسم باراں میں اس قسم کی سبزیاں زیادہ مقدار میں استعمال کی جاتی ہیں (واضح رہے کہ یہ سبزیاں مفت حاصل کی جاتی ہیں)، دیگر قسم کی سبزیوں (مثلاً پالک وغیرہ) کا استعمال بالکل مفقود ہے۔ اول تو یہ سبزیاں بہت کم دستیاب ہوتی ہیں۔ دوسرے ان کی قیمت بھی گراں ہوتی ہے۔ خوش حال طبقہ میں بیگن، تر ئی، آلو وغیرہ کی ایک محدود مقدار استعمال کی جاتی ہے۔

انڈے۔ مرغی اور گوشت کا روزمرہ استعمال بالکل مفقود ہے۔ انڈے عام طور پر فروخت کر لئے جاتے ہیں۔ گوشت عموماً عیدین کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خوش حال افراد ہر آٹھویں دن (جبکہ بازار لگتا ہے) گوشت کا استعمال کرتے ہیں مچھلی کا استعمال عام ہے کیونکہ مچھلی مقامی طور پر ارزاں دستیاب ہو سکتی ہے۔

روغنیات میں صرف تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ روزمرہ کی غذا میں گھی کا استعمال بالکل مفقود ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ گھی بہت ہی گراں شے ہے۔ جن لوگوں کے ہاں دودھ دینے والے جانور ہیں وہ بھی گھی فروخت کر دیتے ہیں۔ چونکہ دودھ عام طور پر گھی بنانے کی خاطر دہی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے

اس لئے دودھ کا استعمال بھی محدود ہے۔ البتہ چھاچ ضرور استعمال کی جاتی ہے۔ دیہات کے خستہ حال زرعی آبادی خاندانوں کو دہی تو کجا چھاچ بھی استعمال کے لئے نہیں ملتی حالانکہ دیہات میں دودھ اور دہی کی بہتات ہونی چاہئے تھی۔

میٹھے کھانے عام طور پر عیدین کے وقت استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ کھانے عموماً گڑ سے تیار کئے جاتے ہیں۔ ذیل میں ہم اس موضع کے ایک متوسط الحال دیہاتی کی غذا کا جدول پیش کریں گے جس میں بتلایا گیا ہے کہ فی ماہ مختلف قسم کے اشیا کن مقداروں میں صرف کی جاتی ہیں۔ ان اشیا کا روزانہ اوسط کیا ہے اس اوسط کا لحاظ کرتے ہوئے ایک متوسط الحال شخص کو روزانہ اوسطاً کس قدر اجزائے غذایت حاصل ہوتے ہیں:۔

نمبر شمار	نام جنس	ماہانہ مقدار: سیر	ماہانہ مقدار: چھٹانک	اوسط مقدار روزانہ: چھٹانک	اوسط مقدار روزانہ: تولہ	اوسط مقدار روزانہ: ماشہ	ایک متوسط الحال دیہاتی کی روزانہ غذا اور ان کے اجزائے غذایت: مقدار روزانہ (اونس)	پروٹینس (گرامس)	چربی (گرامس)	کاربوہائیڈریٹ (گرامس)	کیلوریز
۱	چاول	۳۰	-	۱	۱۴	-	۱۶	۳۱٫۵۵	۲٫۶۶	۳۵۲٫۰۸	۱۵۷۶٫۵۲
۲	جوار	۱۵	-	-	۹	۳	۸	۲۳٫۵۶	۹٫۲۹	۱۱۰٫۲۰	۸۰۸٫۷۰
۳	دال اڑد	۱	۱۴	-	۲	-	۱	۰۶٫۸۲	۰٫۳۶	۱۷٫۱۵	۱۱۸٫۱۷
۴	دہی	-	۱۵	-	-	۸	۰٫۵	۰٫۱۱	۰٫۱۵	۰٫۱۹	۲٫۶۵
۵	چھاچ	۱	۱۴	-	-	۲	۱٫۰	۰٫۶۹	۰٫۸۳	۱٫۵۰	۱۲٫۷۸
۶	مچھلی	۱	۱۴	-	۱	۱۰	۱٫۰	۶٫۱۰	۰٫۲۶	-	۲۸٫۵۷
۷	سبزیاں	۱	۱۴	مقدار			۱٫۰	۱٫۷۳	۰٫۲۹	۴٫۵۴	۲۷٫۰۷
۸	مرچ	۱	۱۴	-	۵	۴	۱٫۰	۴٫۵۴	۱٫۷۶	۸٫۹۴	۶۹٫۵۹
۹	املی	۱	۱۴	-	۱	۷	۱٫۰	۰٫۸۵	۰٫۰۷	۱۹٫۱۷	۸۰٫۳۷
۱۰	پیاز	۳	۱۲	-	۲	۴	۲٫۰	۱٫۱۰	۰٫۰۴	۷٫۵۲	۳۴٫۵۰
۱۱	تیل	۱	۱۴	-	۵	۴	۱٫۰	-	-	-	-
۱۲	نمک	۱	۱۴	-	۲	-	۱٫۰	-	-	-	-
	جملہ	۶۲	۱۳	۲	۱۲	۹	۳۳٫۵	۸۴٫۰۷	۱۶٫۹۱	۵۹۱٫۳۹	۲۷۶۴٫۹۲
	دس فی صد کمی برائے خرابی	. . .	. . .	. . .	. . .	. . .	۳٫۵	۸٫۴۱	۱٫۷۰	۵۹٫۱۴	۲۷۶٫۵۰
	باقی	. . .	. . .	. . .	. . .	. . .	۳۰٫۰	۷۵٫۶۶	۱۵٫۲۱	۵۳۲٫۲۵	۲۴۸۸٫۴۲

زرعی آبادی

مندرجہ بالا تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ توازنی نقطۂ نظر سے ایک شخص کو جس قدر مقدار غذا ملنی چاہیئے وہ موضع ہذا کے متوسط الحال افراد کو نہیں ملتی چنانچہ ذیل کے تقابلی مطالعہ سے یہ امر بخوبی واضح ہو جائے گا:۔

تفصیل	مقدار غذا	پروٹینس	چربی	کاربوہیڈریٹ	کیلوریز
معیاری غذا جو کہ روزانہ ملنی چاہیئے	۴۳٫۸۸	۱۰۳٫۵۲	۸۲٫۷۲	۴۴۸٫۸۸	۲۹۲۵
وہ غذا جو روزانہ ملتی ہے	۳۰٫۰۰	۷۶٫۷۰	۱۵٫۲۱	۵۳۲٫۲۵	۲۴۸۸
معیاری غذا کے مقابل مستعملہ غذا کی کمی	(–)	(–)	(–)	(+)	(–)
(–) یا زیادتی (+)	۱۳٫۸۸	۲۶٫۸۲	۶۷٫۵۱	۸۳٫۳۷	۴۳۷

ان اعداد کے دیکھنے سے واضح ہے کہ ایک شخص کی روزانہ معیاری غذا کی مقدار ۴۳٫۸۸ اونس قرار دی گئی ہے لیکن وہ صرف ۳۰٫۰۰ اونس یا تقریباً ۳۲ فی صد کم ہے اسی طرح کاربوہیڈریٹ کے سوائے دیگر تمام اجزائے غذائیت کم مقداروں میں حاصل ہوتے ہیں۔

پروٹینس جس کو غالباً تمام اجزائے غذائیت میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے تقریباً ۲۷ فی صد کم ملتی ہے۔ چربی جس میں اہم حیاتین (وٹامنس) پائے جاتے ہیں تقریباً ۸۲ فی صد کم ملتی ہے۔ مانا کہ مستعملہ تیل کا حساب (اعداد نہ ملنے کی وجہ سے) نہیں لگایا گیا ہے لیکن اس کے باوجود چربی کی غیر معمولی کمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کاربوہیڈریٹ (جس کی وجہ سے جسم کو قوت حاصل ہوتی ہے) اس میں شک نہیں کہ تقریباً ۱۹ فی صد زاید مقدار میں ملتا ہے لیکن زیادتی کی بنا پر غذا غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ جہاں تک کہ کیلوریز کا تعلق ہے وہ بھی معیاری مقدار کے مقابل ۱۵ فی صد کم ملتے ہیں۔ کیلوریز کی کمی سے جسم کو کافی گرمی نہیں ملتی اور انسان سست و کاہل رہتا ہے۔

اس تشریح کے بعد اب ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ موضع ہذا کے متوسط الحال خاندانوں (جو کہ جملہ خاندانوں کا لحاظ کرتے ہوئے ۷۵ فی صد ہیں) کے افراد کو اس میں شک نہیں کہ پیٹ بھر غذا

ضرور ملتی ہے لیکن معیاری نقطہ نظر سے وہ ایک صحت بخش غذا نہیں۔

متوسط الحال خاندانوں کے علاوہ ۶ فی صد خاندان ایسے ہیں جن کو مقامی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے خوش حال کہا جا سکتا ہے۔ باقی ۳۰ فی صد خاندان خستہ حال ہیں۔ یعنے یہ کہ ان کی معاشی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہے۔

خوش حال خاندانوں میں متوسط الحال خاندانوں کے مقابل کسی قدر اچھی غذا استعمال کی جاتی ہے۔ مچھلی زائد مقدار میں صرف کی جاتی ہے۔ دہی کا استعمال بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہر آٹھویں دن (جبکہ بازار لگتا ہے) عموماً گوشت بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اڑد کے علاوہ دال مونگ اور تور بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ ذیل کی جدول میں ایک خوش حال شخص کی غذا کا ماہانہ حساب پیش کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ روزآنہ مقدار غذا کا اوسط کیا ہے۔ معیاری غذا کے مقابل اس غذا کا کیا حال ہے:۔

نمبر	اجناس	ماہانہ مقداریں: پونڈ	اونس	قیمت: روپیہ	آنے	پائی	ایک خوش حال دیہاتی کی روزانہ غذا اور اس کے اجزائے غذایت: فی کس روزانہ اوسط مقدار غذا	پروٹینس (گرامس)	چربی (گرامس)	کاربوہیڈریٹ (گرامس)	کیلوریز
۱	چاول	۳۰	-	۱	۱۳	-	۱۶	۳۸٫۵۵	۳٫۶۹	۳۵۲٫۰۸	۱۵۷۸٫۵۲
۲	جوار	۱۵	-	-	۹	۳	۸	۲۳٫۵۶	۹٫۲۹	۱۸۰٫۳۰	۸۰۸٫۰۰
۳	دال اڑد وغیرہ	۳	۱۲	-	۴	-	۲	۱۳٫۶۴	۰٫۷۲	۳۴٫۳۰	۲۳۶٫۳۴
۴	دہی	۳	۱۲	-	۲	۸	۲	۰۰٫۴۴	۰٫۶۰	۰۰٫۷۶	۱۰٫۶۰
۵	چھاچھ	۱	۱۴	-	-	۴	۱٫۰	۰۰٫۷۹	۰٫۸۳	۰۱٫۵۰	۱۶٫۷۸
۶	مچھلی	۳	۱۲	-	۲	۸	۲	۱۲٫۲۰	۰٫۹۲	-	۵۷٫۱۴
۷	گوشت	-	۸	-	۱	۸	٫۲۶	۸٫۲۳	۷٫۳۸	-	۸٫۵۸
۸	سبزیاں	۱	۱۴	-	۱	-	۱٫۰۰	۱٫۷۳	۰٫۲۹	۴٫۵۴	۲۷٫۷۷
۹	مرچ	۱	۱۴	-	۵	۴	۱٫۰	۴٫۵۴	۱٫۷۶	۸٫۹۴	۶۹٫۵۹
۱۰	املی	۱	۱۴	-	۱	۷	۱٫۰	۰٫۸۵	۰٫۰۴	۱۹٫۱۷	۸۰٫۳۷
۱۱	پیاز	۳	۱۲	-	۲	۴	۲٫۰	۱٫۲۰	۰٫۰۴	۷٫۵۲	۳۴٫۵۰
۱۲	تیل	۱	۱۴	-	۵	۴	۱٫۰				
۱۳	نمک	۱	۱۴	-	۲	-	۱٫۰	=	=	=	=
	جملہ	۷۱	۱۲	۴	۴	۲	۳۸٫۲۲	۱۰۵٫۷۳	۲۵٫۵۶	۶۰۹٫۱۱	۲۹۳۶٫۷۷
	دس فی صد کمی برائے خرابی						۳٫۸۳	۱۰٫۵۸	۲٫۵۶	۶۰٫۹۲	۲۹۳٫۶۸
	وہ غذا جو روزانہ ملنی چاہیئے						۳۴٫۴۳	۹۵٫۱۵	۲۳٫۰۰	۵۴۸٫۱۹	۲۶۴۳٫۰۹
	معیاری غذا جو ملنی چاہئے						۴۳٫۸۸	۱۰۳٫۵۲	۸۲٫۷۲	۲۴۸٫۸۸	۲۹۳۵٫۰۰
	مستعملہ غذا کی کمی (-) یا زیادتی (+)						۹٫۴۵ (-)	۸٫۳۷ (-)	۵۹٫۷۲ (+)	۹۹٫۳۱ (+)	۲۹۱٫۹۱ (-)

(زرعی آبادی) مندرجہ بالا اعداد سے ظاہر ہو رہا ہے کہ خوش حال خاندانوں کی غذا بھی معیاری غذا کے مطابق نہیں۔ ہمارے معیار کے مطابق فی کس روزانہ تقریباً (۴۳٫۸۸) اونس غذا ملنی چاہئے لیکن صرف (۴۳٫۳۴) اونس ملتی ہے۔ گویا روزانہ تقریباً (۱۰) اونس کم غذا ملتی ہے۔ اس لحاظ سے پروٹینس، چربی اور کیلوریز کی مقداریں بھی کم ہیں۔ مانا کہ کاربوہیڈریٹ معیار سے زائد مقدار میں ملتا ہے لیکن اس کی وجہ سے غذا کی نوعیت اور زیادہ غیر متوازن ہو جاتی ہے۔

متوسط الحال اور خوش حال اشخاص کی غذا کا حساب پیش کرنے کے بعد اب ہم ایک خستہ حال شخص کی غذا کا حال معلوم کریں گے:۔

نمبر	نام جنس	ماہانہ مقداریں		قیمت			روزانہ مقدار				
		پونڈ	اونس	روپیہ	آنے	پائی	فی کس روزانہ اوسط مقدار خوراک	پروٹینس (گرامس)	چربی (گرامس)	کاربوہیڈریٹ (گرامس)	کیلوریز
۱	چاول	۷	۸	-	۷	۶	۴	۹٫۶۲	۰٫۹۳	۸۸٫۰۲	۳۹۴٫۶۵
۲	جوار	۳۰	-	۱	۲	۵	۱۶	۴۷٫۱۲	۱۸٫۵۸	۳۶۰٫۶۰	۱۶۱۶٫۰۰
۳	دال	-	۱۵	-	۱	-	۰٫۵	۳٫۴۱	۰٫۱۸	۸٫۵۷	۵۴٫۰۸
۴	مچھلی[۱]	۳	۱۲	-	۱	۶	۲٫۰	۱۲٫۲۰	۰٫۹۲	-	۵۷٫۱۴
۵	سبزیاں[۲]	۱	۱۴	مفت			۱٫۰	۱٫۷۳	٫۲۹	۴٫۵۴	۲۷٫۷۷
۶	مرچ	۱	۱۴	-	۵	۴	۱	۴٫۵۴	۱٫۷۶	۸٫۹۴	۶۹٫۵۹
۷	املی	۱	۱۴	-	۱	۷	۱	۰٫۸۵	۰٫۰۴	۱۹٫۱۷	۸۰٫۳۷
۸	پیاز	۳	۱۲	-	۲	۴	۲	۱٫۲۰	۰٫۰۴	۷٫۵۲	۳۴٫۵۰
۹	تیل	۱	۱۴	-	۵	۴	۱	-	-	-	-
۱۰	نمک	۱	۱۴	-	۲	-	۱	-	-	-	-
	جملہ			۲	۱۳٫۰		۲۹٫۵	۸۰٫۶۸	۲۲٫۷۳	۴۹۷٫۳۶	۲۳۳۴٫۱۰
	دس فی صد کمی برائے خرابی						۳٫۰	۸٫۰۷	۲٫۲۸	۴۹٫۷۴	۲۳۳٫۴۱
	وہ غذا جو روزانہ ملتی ہے						۲۶٫۵	۷۲٫۶۱	۲۰٫۴۵	۴۴۷٫۶۲	۲۱۰۰٫۶۹
	معیاری غذا جو ملنی چاہئے						۴۳٫۸۸	۱۰۳٫۵۲	۸۲٫۷۲	۴۴۸٫۸۸	۲۹۳۵٫۰۰
	مستعملہ غذا کی کمی (-) یا زیادتی (+)						۱۷٫۳۸ (-)	۳۰٫۹۱ (-)	۶۲٫۲۷ (-)	۰٫۶۵ (-)	۸۳۴٫۳۱ (-)

[۱] مچھلی ہاتھ سے پکڑ کر بھی صرف کی جاتی ہے۔

[۲] جنگلی سبزیاں مثلاً لوٹی۔ ماٹ۔ پن گنٹہ وغیرہ مفت حاصل ہوتی ہیں۔ (نوٹ: مختلف اجناس مستعملہ میں اجزائے غذائیت پروٹینس وغیرہ کو معلوم کرنے کے لئے ان فی صدوں سے مدد لی گئی ہے جو کہ پمفلٹ ۸ جاری کردہ "بی اینڈ ہلتھ وبک اسوسیشن" اور "ہلتھ بلوٹن" ۲۳ گورنمنٹ آف انڈیا پریس میں دئے گئے ہیں۔

سابقہ صفحہ کے دیے ہوئے اعداد کے دیکھنے سے واضح ہے کہ چاول کے مقابل جوار کا صرفہ زیادہ ہے۔ زرعی آبادی وجہ یہ ہے کہ غریب افراد کے ہاں اگر چاول ہوں تو وہ انھیں فروخت کرکے جوار خریدتے ہیں کیونکہ جوار نسبتاً ارزاں ہوتی ہے۔ قوت خرید کی کمی کی وجہ سے دال بھی نسبتاً کم صرف کی جاتی ہے۔ البتہ مچھلی زیادہ استعمال کی جاتی ہے۔ یہ مچھلی زیادہ تر لوگ خود ندی نالابوں سے پکڑ لاتے ہیں۔

جہاں تک کہ مقدار غذا کا تعلق ہے وہ معیاری غذا کے مقابل (۷۔۳۲ء۱۱) اونس کم ہے۔ اسی لحاظ سے مختلف اجزائے غذائیت بھی کم پائے جاتے ہیں۔ متوسط الحال اور خوش حال اشخاص کی غذاؤں کے جدول میں ہم نے یہ دیکھا تھا کہ معیاری مقدار کے مقابل کاربوہیڈریت کی مقدار زیادہ تھی لیکن یہاں کاربوہیڈریٹ کی مقدار بھی معیاری مقدار کے مقابل ۶۵ گرام کم ہے۔

جب ہم بحیثیت مجموعی خوش حال، متوسط الحال اور خستہ حال افراد کی غذاؤں کی نوعیت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ متذکرہ تین طبقوں کے افراد میں سے ایک کی غذا بھی ہمارے معیار کے مطابق نہیں۔ سب کی غذا غیر متوازن ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کسی کی کم غیر متوازن، کسی کی زیادہ غیر متوازن تو کسی کی بہت غیر متوازن ہے۔ ذیل کے اعداد کے ذریعہ بتلایا گیا ہے کہ ایک خوش حال، متوسط الحال اور خستہ حال شخص کی غذا معیاری غذا کے مقابل کتنے فی صد کم ہے:۔

مراعت اشخاص	معیاری غذا کی مقدار کے مقابل روزآنہ مستعملہ اوسط غذا کی کمی (-) یا زیادتی (+)	روزانہ اوسط غذا میں پروٹینس کی کمی (-) یا زیادتی (+)	روزانہ اوسط غذا میں چربی کی کمی (-) یا زیادتی (+)	روزانہ اوسط غذا میں کاربوہیڈریٹ کی کمی (-) یا زیادتی (+)	روزانہ اوسط غذا میں کیلوریز کی کمی (-) یا زیادتی (+)
خوش حال	۲۰ فی صد (-)	۸ فی صد (-)	۱۷ فی صد (-)	۲۲ فی صد (+)	۱۰ فی صد (-)
متوسط الحال	۳۲ // (-)	۲۷ // (-)	۸۱ // (-)	۱۸ // (+)	۱۵ // (-)
خستہ حال	۳۶ // (-)	۳۰ // (-)	۷.۵ // (-)	۱۴ // (-)	۲۸ // (-)

مندرجہ بالا اعداد کا بغور مطالعہ کرنے سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:۔

جہاں تک کہ اقسام لباس کا تعلق ہے مرد عام طور پر دھوتی قمیص۔ نیم آستین۔ شملہ اور کمبل زرعی آبادی استعمال کرتے ہیں۔ چپل کا استعمال بہت محدود ہے۔ عورتیں سوائے ساڑی اور چولی کے کوئی دوسرا لباس استعمال نہیں کرتیں ۔

خوش حال خاندانوں (جوکہ ۶ فی صد ہیں) کے مرد اور عورت حسب صراحت ذیل سالانہ لباس استعمال کرتے ہیں :۔

نمبر	مرد: قسم لباس	تعداد	قیمت فی عدد: روپیہ	قیمت فی عدد: آنے	جملہ قیمت: روپیہ	جملہ قیمت: آنے	نمبر	عورت: قسم لباس	تعداد	قیمت فی عدد: روپیہ	قیمت فی عدد: آنے	جملہ قیمت: روپیہ	جملہ قیمت: آنے	کیفیت
۱	دھوتی	۳	۲	۸	۳	-	۱	ساڑی	۲	۲	۸	۵	-	
۲	قمیص	۲	-	۱۰	۱	۴	۲	چولی	۴	-	۴	۱	-	
۳	کپچہ	۱	۱	۸	۱	۸								
۴	شملہ	۱	۱	۱۲	۱	۱۲								
۵	کمبل[1]	۱	۳	-	۱	۸								
۶	چپل[2]	۱	۱	-	-	۸								
جملہ					۹	۸	جملہ					۶	-	

جب کہ دیہات کے خوش حال مرد اور عورت اپنے لباس پر سالانہ ۹ روپیہ آٹھ آنے اور

[1] ۔ ایک کمبل عام طور پر ۲ سال استعمال کی جاتی ہے ۔

[2] چپل عموماً ۲ سال پہنی جاتی ہے، یہ دو سال اس لئے چلتی ہے کہ اُس کو صرف بیرون دیہات دیگر مقامات کو جاتے وقت استعمال کیا جاتا ہے اس لحاظ سے کمبل اور چپل کے ایک سالہ استعمال کا معاوضہ علی الترتیب ایک روپیہ آٹھ آنے اور آٹھ آنے رکھا گیا ہے ۔

جہاں تک کہ اقسام لباس کا تعلق ہے مرد عام طور پر دھوتی قمیص ۔ نیم آستین شملہ اور کمبل زرعی آبادی استعمال کرتے ہیں ۔ چپل کا استعمال بہت محدود ہے ۔ عورتیں سوائے ساڑی اور چولی کے کوئی دوسرا لباس استعمال نہیں کرتیں ۔

خوش حال خاندانوں (جو کہ ۲ فی صد ہیں) کے مرد اور عورت حسب صراحت ذیل سالانہ لباس استعمال کرتے ہیں :-

	مرد							عورت						
نمبر	قسم لباس	تعداد	قیمت فی عدد		جملہ قیمت		نمبر	قسم لباس	تعداد	قیمت فی عدد		جملہ قیمت		کیفیت
			روپیہ	آنے	روپیہ	آنے				روپیہ	آنے	روپیہ	آنے	
۱	دھوتی	۲	۲	۸	۳	-	۱	ساڑی	۲	۲	۸	۵	-	
۲	قمیص	۲	-	۱۰	۱	۴	۲	چولی	۴	-	۴	۱	-	
۳	کپچہ	۱	۱	۸	۱	۸								
۴	شملہ	۱	۱	۱۲	۱	۱۲								
۵	کمبل [۱]	۱	۳	-	۱	۸								
۶	چپل [۲]	۱	۱	-	-	۸								
جملہ					۹	۸	جملہ					۶	-	

جب کہ دیہات کے خوش حال مرد اور عورت اپنے لباس پر سالانہ ۹ روپیہ آٹھ آنے اور

---

[۱] ۔ ایک کمبل عام طور پر ۲ سال استعمال کی جاتی ہے ۔

[۲] چپل عموماً ۲ سال پہنی جاتی ہے ۔ یہ دو سال اس لئے چلتی ہے کہ اُس کو صرف بیرون دیہات دیگر مقامات کو جاتے وقت استعمال کیا جاتا ہے اس لحاظ سے کمبل اور چپل کے ایک سالہ استعمال کا معاوضہ علی الترتیب ایک روپیہ آٹھ آنے اور آٹھ آنے رکھا گیا ہے ۔

زرعی آبادی

۶ روپیہ سے زائد نہیں صرف کر سکتے تو اس سے متوسط اور خستہ حال افراد کے سالانہ اخراجات لباس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ذیل میں بتلایا گیا ہے کہ خستہ حال اور متوسط الحال خاندانوں میں مرد اور عورت اپنے لباس پر سالانہ کس قدر روپیہ صرف کرتے ہیں :-

۱۔ متوسط الحال خاندان	مرد	۷ روپیہ ۸ آنے
	عورت	۴ " ۱۲ "
۲۔ خستہ حال خاندان	مرد	۵ " -
	عورت	۳ " ۱۲ "

خوش حال اور متوسط الحال افراد کے اخراجات لباس میں فرق صرف اس لئے ہے کہ اول الذکر خاندانوں کے افراد نسبتاً بڑھیا قسم کا کپڑا استعمال کرتے ہیں۔ مزید برآں متوسط الحال خاندانوں کے مرد افراد نہ تو کچھ استعمال کرتے ہیں اور نہ چپل۔ یہ لوگ قمیص کی بجائے نیم آستین استعمال کرتے ہیں جو کہ نسبتاً کم قیمت میں ملتی ہے۔ متوسط الحال اور خستہ حال افراد کے اخراجات لباس میں فرق کا ایک سبب قیمتوں کی زیادتی اور کمی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ خستہ حال خاندانوں کے مذکر افراد عام طور پر نیم پوش زندگی گذارتے ہیں[1]۔ یعنے یہ لوگ صرف دھوتی۔ شملہ اور کمبل کا استعمال کرتے ہیں ان کے اخراجات لباس میں نیم آستین کی قیمت درج نہیں۔

بہ حیثیت مجموعی یہاں کے باشندوں کے لباس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۳۱ فی صد خاندانوں کے افراد کو نہایت ہی ادنیٰ معیار پر تن بھر کپڑا میسر ہے۔ باقی ۶۹ فی صد خاندانوں کے افراد نیم پوش زندگی بسر کرتے ہیں جس کو ایک مہذب اور متمدن جماعت یا قوم کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔

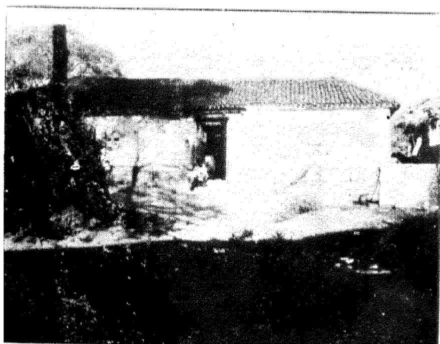
(ج) مکان :- کسی جماعت یا قوم کے معیار زندگی کو اگر ایک طرف غذا اور لباس کے ذریعہ جانچا جا سکتا ہے تو دوسری طرف اس کو جانچنے کا ایک اہم ذریعہ مکان بھی ہے چنانچہ اب ہم باشندگان موضع ہذا کے مکانات کی نوعیت پر مفصل روشنی ڈالیں گے۔

---

[1] ۷۵ فی صد متوسط الحال خاندانوں کے منجملہ ۳۲ فی صد خاندان ایسے ہیں جنھیں پیٹ بھر غذا تو میسر ہے لیکن تن بھر لباس میسر نہیں۔ لہذا یہ لوگ خستہ حال کی طرح نیم پوش زندگی بسر کرتے ہیں۔



(۳) دو منزلہ مکان



(۴) ایک منزلہ مکان



(۵) ایک کمرہ والا مکان



(۶) جھونپڑا

دیہات کے بعض (۳ فی صد) خوش حال خاندان دو منزلہ سفالی مکانات میں رہتے ہیں اور ندمی آبادی بعض (۳ فی صد) یک منزلہ سفالی مکانات[1] میں رہتے ہیں جملہ متوسط الحال خاندان (جو مجموعی خاندانوں کا لحاظ کرتے ہوئے ۷۵ فی صد ہیں) یک منزلہ سفالی مکانات میں اور خستہ حال خاندان (۳۷ فی صد) زیادہ تر جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جن کو گھاس پوش مکانوں کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بلحاظ ساخت موضع زیر بحث کے جملہ مکانات کا تجزیہ درج ذیل ہے:۔

نوعیت مکان	تعداد		فی صد بلحاظ مجموعی مکانات
۱۔ گھاس پوش مکانات (جھونپڑیاں)	۸۳		۳۴
۲۔ یک منزلہ سفالی مکانات ۔			
(الف) ایک کمرے والے "	۷۳		۳۰
(ب) ایک سے زائد کمرے والے "	۷۹	(تقریباً)	۳۴
۳۔ دو منزلہ سفالی مکانات	۷		۲
جملہ	۲۴۲[2]		۱۰۰

باشندگان موضع ہذا کی غربت اور ان کے ادنیٰ معیار رہائش کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں ۶۴ فی صد (۳۴ فی صد جمع ۳۰ فی صد) مکانات صرف ایک ایک کمرے پر مشتمل ہیں۔ جملہ (صرف ایک استثناء کے ساتھ) مکانات خواہ وہ ایک منزلہ ہوں یا دو منزلہ سفال پوش ہوں یا گھاس پوش مٹی سے بنے ہوئے ہیں مستعملہ چوبینہ بھی بہت ادنیٰ اور معمولی ہوتا ہے۔ ذاتی مشاہدے اور مقدمانِ دیہی کی مدد سے ہم نے موضع ہذا کے جملہ مکانات کی قیمتوں کا ایک جدول مرتب کیا ہے جو کہ درج ذیل ہے:۔

نوعیت مکان	تعداد	فی صد
۱۔ وہ مکانات جن کی قیمت ۱۵/ اور ۱۰۰ روپیہ کے درمیان ہے	۱۵۶	۶۴

---

[1] ۔ یک منزلہ سفالی مکانات دو طرح پر تقسیم کئے گئے ہیں۔ ایک وہ جو صرف ایک کمرے پر مشتمل ہیں۔ دوسرے وہ جن میں ایک سے زائد کمرے ہیں۔ دیکھئے تصاویر ۲، ۴، ۵ اور ۹۔

[2] ۔ ۲۴۲ مکانات میں سے ۸ مکانات خالی ہیں اس طرح ۲۳۴ مکانات ۲۴۶ خاندان بستے ہیں۔

آبادی	نوعیت مکان	تعداد	فی صد
	۲۔ وہ مکانات جن کی قیمت ۱۰۱ اور ۵۰۰ روپیہ کے درمیان ہے۔	۷۹	۳۲
	۳۔ وہ مکانات جن کی قیمت ۵۰۱ اور ۱۰۰۰ روپیہ کے درمیان ہے۔	۵	۲
	۴۔ وہ مکانات جن کی قیمت ۱۰۰۰ سے زائد ہے۔	۲	تقریباً ۱
	جملہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۲۴۲	۱۰۰

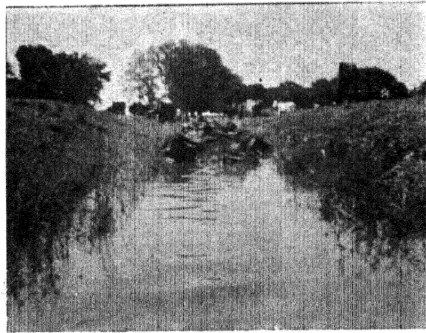
مندرجہ بالا اعداد سے بھی موضع ہذا کے باشندوں کی غربت کا ثبوت ملتا ہے۔ ۶۴ فی صد مکانات کی قیمت (۱۵) اور ۱۰۰ روپیہ کے درمیان ہے۔ ۳۲ فی صد کی قیمت (۱۰۰) اور ۵۰۰ کے درمیان ہے۔ صرف ۲ فی صد مکانات کی قیمت (۵۰۰) اور ۱۰۰۰ کے درمیان ہے۔ ایک فی صد مکانات زائد از ہزار قیمت والے ہیں۔ زائد از ہزار قیمت والے مکانات میں ایک مکان کی قیمت تقریباً ڈھائی ہزار ہے، اور دوسرے کی پانچ ہزار ہ۔

مکانات کی قیمتوں سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ ان کی صفائی اور حفظانی حالت کا ہے۔ جس طرح صحت بخش غذا اور ضروری لباس کارگذاری کو بڑھانے یا برقرار رکھنے کے لئے ناگزیر ہیں اسی طرح صاف اور صحت بخش مکانات کے بغیر بھی معیار کارگذاری برقرار نہیں رہ سکتا۔ صحت بخش مکانات سے ہماری مراد ایسے مکانات ہیں جن میں ہوا، روشنی اور صفائی کا باضابطہ انتظام ہو اور جو اس قدر وسیع ہوں کہ ان میں جملہ اراکین خاندان اپنی خاص خاص احتیاجات کا لحاظ کرتے ہوئے آرام کے ساتھ رہ سکیں۔

جب ہم موضع ہذا کے مکانات کو متذکرہ معیار پر جانچتے ہیں تو ایک بھی مکان ایسا نظر نہیں آتا جس میں مذکورہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ صرف ۴ فی صد مکانات میں برائے نام روشن دان ہیں۔ باقی ۹۶ فی صد مکانات میں ایک بھی روشن دان نہیں۔ صحن عام طور پر متناسب نہیں ہوتے۔ بعض مکانات کے صحن تو اس قدر مختصر ہوتے ہیں کہ اندرونی حصہ سے سورج کو بہ مشکل دیکھا جا سکتا ہے۔ موضع کے کسی مکان میں رفع حاجت کا کوئی انتظام نہیں۔ دن کے وقت تو لوگ دُور دُور تک نکل جاتے ہیں لیکن رات میں مکانات کے اردگرد ہی حاجت رفع کر لی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص علی الصباح آبادی کا چکر لگائے تو اس کو تقریباً ہر گلی میں جا بجا غلاظت نظر آئے گی جو کہ پست معیار زندگی کی



مکان کی پشت پر اپلیاں تھپی ہیں
سامنے کھاد کا گڑھا بھی ہے



نالے میں مویشی بیٹھے ہیں۔ اس نالے کا پانی
پینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے

ایک نمایاں علامت ہے۔ تقریباً تمام مکانات میں کھلی موریاں ہیں جن میں عام طور پر کیچڑ بھرا رہتا ہے۔ خصوصاً موسم باراں میں صحنوں کی حالت بہت ہی خراب ہو جاتی ہے! اکثر کسان اپنے مویشیوں کو مکانات کے اندر باندھتے ہیں جس کی وجہ سے مکانات بہت ہی بدبودار رہتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ عام طور پر مکانات کی پشت پر اُپلے تھوپے جاتے ہیں۔ کھاد بھی مکانات کے سامنے جمع کی جاتی ہے۔[۱] اور عام طور پر اس نالے کا پانی استعمال کیا جاتا ہے جس میں مویشی بیٹھتے ہیں[۲]

(د) تعلیم:۔ مکانات کی تفصیلی کیفیت دریافت کرنے کے بعد اب ہم یہاں کے معیار تعلیم کا حال بیان کریں گے۔ تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر جس قدر زور دیا جائے کم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحت بخش غذا، لباس اور مکان کارکردگی کے ناگزیر لوازم ہیں لیکن یہ امر بخوبی واضح رہنا چاہیئے کہ کارکردگی کے لئے تعلیم بھی ایسی ہی اہم اور ضروری ہے جیسے کہ صحت بخش غذا، لباس اور مکان۔ بالخصوص تہذیب و شائستگی کے نقطہ نظر سے تعلیم کی اہمیت بہت ہی نمایاں ہے۔

اس اہمیت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیمی نقطہ نظر سے موضع زیر بحث کی حالت بہت ہی خراب ہے۔ صرف ۲ فی صد افراد تھوڑا بہت پڑھ لکھ سکتے ہیں۔ نیز ضروری حساب و کتاب اور سرکاری مراسلت بھی کر سکتے ہیں۔ دیگر ۳ فی صد افراد خانگی طور پر زیر تعلیم ہیں۔ جہاں تک کہ حرفتی تعلیم کا تعلق ہے وہ بالکل ہی مفقود ہے۔ کاشتکاری کا کام لڑکے اپنے بزرگوں سے سیکھ لیتے ہیں۔

جس مقام کے باشندے غذا، لباس، مکان اور تعلیم جیسی اہم اور شدید ضروریات کو (جو کسی جماعت کی کارگذاری کو بڑھانے اور برقرار رکھنے کے لئے لازم و ملزوم ہیں) بھی ایک معقول معیار پر پورا نہیں کر سکتے ہوں تو پھر ان کو دیگر ضروریات مثلاً ضروریات رسمی اور تخانی احتیاجات کی پابجائی کا کیا ذکر!

احتیاجات کی تحدید، تعلیم کا فقدان، بچپن کی شادی اور اولاد کا بہت جلد کمانے کے قابل بنانا، ادنیٰ معیار زندگی کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ چونکہ یہ خصوصیات موضع ہذا کے باشندوں میں

---

[۱] ۔ دیکھئے تصویر نمبر (۷) مکانات کی پشت پر اُپلے تھپے ہیں۔ گوبر اور دیگر قسم کی غلاظت مکان کے سامنے ہے۔

[۲] ۔ دیکھئے تصویر نمبر (۱۸) مویشی نالے میں بیٹھے ہیں۔

می آبادی بلطور اتم پائی جاتی ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کے باشندے ایک کارگذار معیار، رہائش کے مقابل (جس کی تعریف ہم اس فصل کی ابتدا میں کر آئے ہیں)، بہت ہی ادنیٰ معیار پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس ادنیٰ معیار زندگی کے کیا وجوہ ہیں؟

ادنیٰ معیار زندگی اور اس کے وجوہ | اس ادنیٰ معیار زندگی کی سب سے اہم اور بنیادی وجہ ادنیٰ آمدنی ہے۔ اور ادنیٰ آمدنی حسب ذیل (۳) اہم اسباب کا نتیجہ ہے:۔

۱۔ آبادی اور ذرایع معاش کی غیر متناسب رفتار ترقی۔

۲۔ پیشوں کا فقدان اور زراعت پر زائد از ضرورت بار۔

۳۔ زرعی نظام کے گوناگوں نقائص، مثلاً زرعی عوامل پیدائش (زرعی زمین، زرعی محنت اور زرعی اصل، مویشی اور آلات زراعت وغیرہ) کی غیر متناسب حالت، زرعی طریقہ ہائے کاشت، طریقہ ہائے فروخت اور طریقہ ہائے لین دین کے گوناگوں نقائص۔

اضافہ آبادی، پیشوں کے فقدان اور زراعت پر زائد از ضرورت بار کی مفصل کیفیت پہلی فصل میں بیان کی جا چکی ہے۔ آیندہ فصلوں میں ہم زرعی عوامل پیدائش، طریقہ ہائے کاشت، طریقہ ہائے فروخت اور طریقہ ہائے لین دین کے گوناگوں نقائص کا ذکر کرتے ہوئے بتلائیں گے کہ ان نقائص کی بنا پر آمدنی میں کیونکر تخفیف ہو جاتی ہے۔ آمدنی کی کمی کی وجہ سے کس طرح معیار زندگی گر جاتا ہے۔ بعد ازاں ہم ان تدابیر پر غور کریں گے جن کے ذریعہ موجودہ معیار زندگی کو کسطرح بلند کیا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

کا

بارھواں اجلاس

کانفرنس کے سالانہ جلسے حیدرآباد میں سات مرتبہ اور اورنگ آباد، لاتور و پربھنی میں تین ہو چکے تھے ۹ سال کے طویل عرصہ کے بعد کانفرنس کا گیارھواں سالانہ اجلاس گزشتہ سال بلدۂ حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ سال حال بھی بلدۂ حیدرآباد میں کانفرنس کا بارھواں سالانہ اجلاس ۲۱ و ۲۲ آبان ۱۳۴۷ف کو منعقد ہوا، ہر چند گزشتہ دور کے جمود کی وجہ سے کانفرنس کے کام اور اس کے وقار کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ بریں ہم گزشتہ سال اور نیز سال حال یہ ثابت ہو گیا کہ کانفرنس پر عامۃ الناس کا پورا اعتماد قایم ہے اور اس کے غیر فرقہ وارانہ پلیٹ فارم پر بلا امتیاز مذہب و ملت ملک کے اکابر اور اہل الرائے جوش و خروش و دلی سے جمع ہیں، ٹاؤن ہال کی گنجایش معمور اور ہر طرف ایک خاص چہل پہل نمایاں تھی۔

وقت مقررہ پر کم سن طلبہ نے مناجات پڑھی اور بعد ازاں مولوی مرزا محمد بیگ صاحب اول تعلقدار باغات نے بہ حیثیت صدر مجلس استقبالیہ ایک مختصر خطبہ پڑھا جس میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی اجمالاً توضیح کی گئی تھی، بعد ازاں موصوف نے تحریک کی کہ جناب ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر کانفرنس کے اجلاس کی صدارت فرمائیں۔

ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر کا خطبۂ صدارت عام طور سے پسند کیا گیا موجودہ جنگ کے پیش نظر ملک کے تعلیمی نظام کی ناکامی پر انھوں نے جو خیالات ظاہر کئے وہ درحقیقت بہت غور و توجہ کے مستحق ہیں۔

کانفرنس کے کل چھ اجلاس منعقد ہوئے جن میں سے دو اجلاس شب میں منعقد ہوئے۔ ایک اجلاس میں ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب نے ایران جدید کے موضوع پر قندیلی مناظر کے ساتھ ایک مقالہ پڑھا۔ دوسرے اجلاس میں مولوی خواجہ محمد احمد صاحب مہتمم عجائب خانہ حیدرآباد نے "مسکی ضلع رائچور کے قدیم آثار" کے موضوع پر تقریر کی اور قندیلی مناظر کے ذریعہ بعض دلچسپ چیزیں دکھائیں، اسی اجلاس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے عہد نبویؐ کے میدان جنگ کے متعلق قندیلی مناظر کے ذریعہ چند نقشے اور تصاویر دکھائیں۔

دن کے اجلاسوں میں جو مقالے پڑھے گئے یا تقریریں ہوئیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ مقالہ۔ "عالم کی سیرت کا اثر متعلم پر"۔ مولوی محمد اکبر علی صاحب مدیر "صحیفہ"

۲۔ " ۔"زندگی کے مصائب کا کس طرح مقابلہ کرنا چاہیئے"۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب۔ ہرچند یہ مقالہ بہت مختصر تھا لیکن جس جامعیت کے ساتھ خیالات قلم بند کئے گئے تھے وہ بہت اثر انگیز تھے۔

۳۔ "یورپ کی بعض جامعات" کے عنوان سے پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی نے ترکی، ریاستہائے بلقان اور سوئٹزرلینڈ کی جامعات کے متعلق اپنے بعض مبنی مشاہدات کا اظہار کیا۔

۴۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر نے تعلیم کے صحیح مطمح نظر کے متعلق ایک تقریر میں اپنے خیالات کا جوش و قوت کے ساتھ اظہار کیا۔

۵۔ "فرائض اولیائے اطفال" پر منشی فاضل محمد سلطان صاحب نے ایک مقالہ پڑھا۔

۶۔ "سائنس کی تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں" کے موضوع پر آر۔ سنیا ناراین صاحب نے مقالہ پڑھا اور اپنے ذاتی تجربے وضاحت کے ساتھ بیان کئے اور چند مفید مشورے دئے۔

۷۔ پنڈت سری پت راؤ صاحب اڈوکیٹ نے "تعلیم شہریت اور امتناع مسکرات" کے متعلق ایک تقریر کی اور مسکرات جیسی بلا کے انسداد کے متعلق کافی وضاحت سے اپنے خیالات ظاہر کئے۔

۸۔ "مسلمانان ہند کا تعلیمی مستقبل" کے عنوان سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے ایک مقالہ پڑھا اور گزشتہ تاریخ پر مساحت کرتے ہوئے موجودہ حالت اور آیندہ ترقی کے لئے تجاویز اور مشورے پیش کئے۔ ان کی افادیت کے متعلق ظاہر ہے کہ ابھی کافی غور و خوص کی ضرورت ہے۔

۹۔ ناخواندگی دُور کرنے کے طریقوں پر مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ نے اپنے دیرینہ تجربہ کے لحاظ سے اپنے مقالہ میں ایسی تجاویز پیش کیں کہ جن پر عمل آسان ہے اور جن کے نتائج دور رس ہوں گے۔

۱۰۔ ارتقائے تمدن کے فواید اور نقصانات کی پیش بندی پر ڈاکٹر برج موہن لال صاحب صدر کلیہ طبیہ جامعہ عثمانیہ نے تقریر فرمائی۔ تنگیِ وقت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی بسیط اور معلومات آفریں تقریر پوری طرح ختم نہ ہوسکی۔

۱۱۔ مسز سروجنی نائڈو نے اپنے عادتی طریقہ پر ایک فصیح و بلیغ تقریر کی۔ ابتدا میں موصوفہ نے اُردو میں چند الفاظ کہے بعد ازاں انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۲۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات نے بھی ایک تقریر کی اور کانفرنس کی تحریکوں کے متعلق اپنے خیالات اور سررشتۂ تعلیمات کے کاروبار کے متعلق چند معلومات ظاہر فرمائے۔

کانفرنس میں جو تحریکات منظور ہوئیں ان کے متعلق ذیل میں صراحت کی جاتی ہے:۔

۱۔ تحریک اظہار عقیدت۔

۲۔ نواب رفعت یار جنگ مرحوم، مولوی سید محمد حیات الحسن مرحوم اور مولوی احمد محی الدین صاحب مرحوم کی وفات پر اظہار تعزیت۔

۳۔ یہ کانفرنس سررشتۂ تعلیم صنعت و حرفت کے ذریعے حرفتی تعلیم کے آغاز پر اظہار اطمینان کرتی اور امید کرتی ہے کہ اس میں توسیع عمل میں آئے گی اور اس کے ساتھ ساتھ مُلک کے حرفتی اور معاشی ذرایع کو کافی وسعت دینے کے لئے حکومت اور اہلِ مُلک سے اشتراکِ عمل کی توقع کرتی ہے۔

۴۔ یہ کانفرنس سرکار عالی کی توجہ مکرر اس امر کی طرف منعطف کراتی ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں زرعی مدارس اور خاص کر زرعی کالج کا قیام نہایت ضروری ہے۔

۵۔ اس کانفرنس کی رائے میں مُلک کے موجودہ معاشی حالات کے مدنظر مدارس سرکاری میں معافیِ فیس کا جو تناسب مقرر ہے اس میں معتد بہ اضافہ عمل میں لانا ضروری ہے۔

۶۔ اس کانفرنس کی رائے میں درسی کتابوں اور سامان تعلیم کی ارزانی اور بار بار نصابی کتابوں کے نہ بدلنے کے لئے خاص توجہ کی ضرورت ہے اور اس مسئلہ پر اصولی طور سے غور کرکے تجاویز

پیش کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا قیام سررشتۂ تعلیمات کی جانب سے ضروری ہے۔

۷۔ اس کانفرنس کی رائے میں سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ترجمہ کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف کی طرف بھی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

۸۔ یہ کانفرنس سرکار عالی کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتی ہے کہ ملک کی بہترین تصانیف پر مناسب صلے عطا کئے جائیں۔

۹۔ اس کانفرنس کی رائے میں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ تاریخ دکن کی خاص اہمیت کے لحاظ سے اس پر تحقیقاتی کام جامعہ عثمانیہ میں زیادہ وسیع پیمانہ پر عمل میں لایا جائے۔

۱۰۔ اس کانفرنس کی رائے میں یہ امر ضروری ہے کہ تمام مدارس کے لئے بالعموم اور مدارس نسواں کے لئے بالخصوص ایسے کشادہ مکانات مہیا کئے جائیں جن میں کھانے کے علحدہ کمرے اور وسیع صحن موجود ہوں تاکہ صفائی اور حفظ صحت کے اصول ملحوظ رہ سکیں۔

۱۱۔ یہ کانفرنس سرکار عالی کی توجہ اس امر کی طرف مکرر مبذول کراتی ہے کہ تعلیم نسواں میں ضروریات نسواں کو زیادہ ملحوظ رکھا جائے اور نصاب اور طریقۂ تعلیم پر تفصیلی غور کرکے تجاویز مرتب کرنے کے لئے ماہرین فن کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔

۱۲۔ یہ کانفرنس محسوس کرتی ہے کہ بلدۂ حیدرآباد میں وسطانی اور تحتانی مدارس نسواں کی تعداد ناکافی اور ان کا محل وقوع مرکزی نہیں ہے اور امید کرتی ہے کہ ان کی تعداد میں اضافہ عمل میں لایا جائے گا اور ان کو مرکزی مقامات پر منتقل کیا جائے گا۔

۱۳۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ تاریخ اسلام کے مضمون کو ہائر سکنڈری (اعلیٰ ثانوی) جماعتوں کے جدید نصاب میں بطور مضمون اختیاری ضرور شامل رکھا جائے۔

۱۴۔ یہ کانفرنس سررشتۂ تعلیمات سرکار عالی کی توجہ مکرر اس جانب مبذول کراتی ہے کہ خوش نویسی کی تعلیم کے لئے ڈرائنگ کے ساتھ ساتھ انتظام عمل میں لایا جائے۔

۱۵۔ اس کانفرنس کی رائے میں مناسب ہے کہ تمام دفاتر سرکاری میں انگریزی زبان کا غیر ضروری استعمال مسدود کردیا جائے اور اس کی بجائے سرکاری زبان میں کاروبار انجام دئے جائیں۔

۱۶۔ یہ کانفرنس اہلِ ملک سے درخواست کرتی ہے کہ وہ کانفرنس کے وظائف فنڈ کو اپنے

فیاضانہ عطیوں سے مستحکم کریں۔

کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں جناب محمد علی صاحب جناح نے بھی شرکت فرمائی تھی۔

محمد غوث ام اے۔ ال ال بی

تنقید و تبصرہ

محکومیت نسواں - کراؤن سائز ۲۴۴ صفحے، طباعت اچھی، مطبوعہ جید برقی پریس۔ دہلی، شائع کردہ مکتبۂ پنجاب لاہور۔ قیمت عہ/۔

یہ انگلستان کے مشہور فلسفی، جان اسٹیوارٹ مل، کے رسالے "دی سبجکشن آف ومین" کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب انگلستان میں، عورتیں اپنے آپ کو مردوں کے "ظلم و استبداد" سے آزاد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔ عورتوں کے حقوقِ آزادی کو عملی طور پر تسلیم کرانے میں، اس کتاب کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے۔ مل نے اس رسالے میں علمی، عقلی اور فلسفیانہ دلیلوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرد کی، عورت پر فوقیت کا دعوٰی کوئی علمی اور عقلی بنیاد نہیں رکھتا۔ وہ یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ جسمانی حیثیت سے، عورت مرد کے مقابلے میں کمزور ہے، لیکن محض اس بنا پر وہ، عورت میں کسی ذہنی یا روحانی کمزوری کو تسلیم نہیں کرتے۔ دنیا میں عورت کی محکومیت کو وہ قدیم رواج غلامی کی ایک شرمناک یادگار سمجھتے ہیں۔ غرض ایک پُرجوش وکیل کی طرح انھوں نے اپنے خود تفویض کردہ مقدمے کو کامیاب بنانے کی امکان بھر کوشش کی ہے۔ دنیا کے آزاد خیالانہ ادب میں اس کتاب کی جو وقعت ہونی چاہیئے وہ ظاہر ہے۔

اس زمانے میں، مل کے اس رسالے کا اُردو میں ترجمہ، ایک ضرورت تھی کیونکہ ہندوستان میں عورتوں کی آزادی کا مسئلہ بھی کچھ اسی طرح کے مراحل سے گذر رہا ہے، جیسا کہ مل سے پہلے انگلستان میں تھا۔ امید ہے کہ اس کے مطالعہ سے ان تمام حضرات کے لئے ایک مزید عقلی سہارا مہیا ہو جائے گا جو عورتوں کی آزادی کے حامی تو تھے، لیکن اس کے لئے ان کے پاس کوئی عقلی یا کم سے کم یا کسی یورپی

مصنف کی تعمیر کی ہوئی مستند بنیاد موجود نہ تھی۔ اور ہماری یہ توقع بھی بے جا نہیں کہ اس کے مطالعہ سے، اس ابد کے محکوم طبقے کی حقیقی مظلومیت کا صحیح احساس ہمارے دلوں میں پیدا ہو سکے گا۔

ترجمہ نہایت واضح، صاف اور ستھرا ہے۔ اس طرح کی علمی کتابوں کی اردو کو جس قدر شدید ضرورت ہے، اس پر زور دینا تحصیل حاصل ہے۔ مولوی معین الدین صاحب انصاری کی "یہ قومی خدمت" یقیناً استحسان کی نظروں سے دیکھی جائے گی۔

س

قتیل اور غالب۔ از سید اسد علی انوری فرید آبادی۔ کراؤن سائز، ۱۲۰ صفحے، لکھائی چھپائی متوسط، مطبوعہ مکتبہ جامعہ۔

قیمت درج نہیں ہے، مکتبہ جامعہ، دہلی سے مل سکتی ہے۔

یہ رسالہ مرزا غالب اور قتیل کے معرکے کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اور نہایت عمدگی سے لکھا گیا ہے۔ مرزا غالب کی زندگی کے ایک آدھ اور واقعہ کی طرح، یہ ہنگامہ بھی، ایک ناخوشگوار واقعہ ہے۔ اس کا سبب کچھ تو غالب کے مخالفین کا جوش و خروش اور کچھ غالب کی نازک مزاجی تھی۔ غالب کو جس چیز پر سب سے زیادہ ناز تھا، وہ ان کی فارسی دانی تھی، اس کی نفسیاتی بنیاد یہ بھی تھی کہ وہ دہلی کے ذوق سخن کے مقابلے میں، کسی دوسرے مقام کے، صاحبان علم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ کلکتہ میں، جب ان کے اشعار پر قتیل کا نام لے کر حملے کئے گئے تو وہ ایسے جز بز ہوئے کہ، ایک پورا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ یہ تمام واقعات رسالے میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ غالب کی زندگی اور ان کی تحریروں پر، پچھلے چند دنوں میں جو مختلف کتابیں شایع ہوئی ہیں، ان میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے۔ آئندہ عظیم تر اور مکمل تر حالات غالب کے لئے یہ اچھا مسالہ ثابت ہوگا۔

س

دنیا کی کہانی ۔ از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) چھوٹی تقطیع قیمت (۸ٓ) ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی

جب کبھی کسی اونچے درجہ کی زبان میں ہم دنیا کی یا تمدن کی، یا ادب کی مختصر اور جامع تواریخ پڑھتے ہیں تو دل میں بے چینی کے ساتھ یہ اشتیاق پیدا ہوتا ہے کہ کاش ہماری زبان بھی ایسی کتابوں سے مالامال ہوتی۔

پیش نظر کتاب تاریخی ادب کے ایک خاص باب میں یہ شوق نہایت حسن اور خوبی سے پورا کرتی ہے۔

دنیا میں انسان کی تاریخ صرف لڑائیوں اور جنگوں کی تاریخ نہیں ہے۔ نہ کارل مارکس ہی کا یہ عقیدہ صحیح ہے کہ وہ صرف اور صرف پیٹ کے کشمکش کی کہانی ہے۔ یہ انسانی تاریخی کل کے نمایاں اجزاء ہیں۔

مجیب صاحب نے اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ انسانی زندگی اور تمدن کے مختلف محرکات اور عناصر کے ترکیبی آثار کو تاریخ میں ظاہر کیا جائے۔

یہ مضامین بڑی سلاست، نزاکت اور فصاحت سے لکھے گئے ہیں۔

تاریخ لکھنے میں تعصب کا خواہ سیاسی ہو یا مذہبی، بڑا دخل ہو جاتا ہے! اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے احوال تو بڑھا چڑھا کر لکھے جاتے ہیں لیکن اوروں کی نمایاں خوبیوں پر بھی کمزور تعبیر سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مجیب صاحب کی یہ کتاب اس عیب سے پاک ہے۔ ساری قوموں کے محاسن انھوں نے دل کھول کر لکھے ہیں خوبیوں کی خوب داد دی ہے حسن بیان سے پڑھنے والے کا جی چاہتا ہے کہ ان خوبیوں کو جہاں تک ہو سکے اپنی زندگی میں بھی سمو لینا چاہیئے۔ چین کا ذکر ہے:۔

"یہ تھے چینیوں کے اخلاق، اور اس مشرقی تہذیب کا آپ موجودہ مغرب سے مقابلہ کرنا چاہتے ہوں تو کر لیجئے۔ اصل چیز حکومت یا دولت اور آرام کا سامان نہیں۔ آدمی اور ان کے اخلاق ہوتے ہیں . . . . . وقت ہوتا تو میں حسن کے اس معیار کا کچھ ذکر کرتا جس نے آرٹسٹ کا یہ فرض قرار دیا کہ شکل کو نہیں بلکہ کیفیت اور فضا کا مظہر بنا کر دکھائے۔"

مہاتما بدھ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"یونانی سمجھتے تھے کہ غلام اور غیر نسلوں کے لوگ مہذب شہری زندگی کے حقدار نہیں ہوسکتے ۔ آریوں نے غیر آریوں کو اپنی سماج سے بھی خارج کردیا۔ ان کا مذہب اور ان کی مقدس کتابیں، ان کا شاعرانہ فلسفہ اور ان کے رشیوں اور بن باسیوں کی نیک اور پاک زندگی اور عملاً نہیں تو اصولاً ان کی حکومت اور تجارت صرف ان کے اپنے لئے تھی (صہ ۸۹) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر ایک وقت آیا جب ان کے فلسفے اور اعلیٰ اخلاقی تعلیم کے خلاف تو نہیں مگر ان کے نسلی گھمنڈ اور ان کے دھرم کے خلاف (بدھ مت کی صورت میں) بڑی سخت بغاوت ہوئی ۔ (صہ ۸۹)"

حیدرآباد میں حال ہی میں نصاب کے لئے چند تاریخی کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ ان میں تعصب کے برخلاف بے حمیتی کا روگ ظاہر کیا گیا ہے ۔ یعنے اپنی اچھی اور دوسروں کے لئے مفید تاریخی واقعات اور حقیقتوں کو لکھنے سے عمداً گریز کیا گیا۔ اخلاقی احساس پستی کا شکار ہوگئے عجیب میں یہ بات نہیں۔ ایک موقع ملاحظہ ہو ۔ مسلمانوں کی تہذیب کا ذکر ہے :۔

"ہر طرح کا تہذیبی شوق رکھنے کے باوجود یہ عورتیں، عورتیں رہیں۔ اگر آپ ان کا ان عیسائی عورتوں سے مقابلہ کیجئے جو صلیبی جنگوں میں اپنے شوہروں کے ساتھ گئی تھیں، مردوں میں بیٹھ کر شراب پیتی تھیں اور مست ہوکر زمین پر لوٹتی تھیں اور بیہودہ گیت سنتی اور فحش گفتگو کرتی تھیں تو آپ کو اس کی شکایت نہ ہوگی کہ مسلمان عورتیں گھر کے الگ حصے میں رہتی تھیں اور مردانی صحبتوں میں ان کا بیٹھنا عام رواج نہ تھا۔

. . . .

مسلمانوں کی درسگاہوں نے یوروپی قوموں کا علوم وفنون سے تعارف کرایا، یونانی تہذیب کا ورثہ ان تک پہنچایا اور علم حاصل کرنے کا ایک شوق پیدا کیا جس نے بڑھتے بڑھتے نشاۃ ثانیہ کا نام پایا (صہ ۱۳۶)۔"

یہ تاریخ صرف کل (ماضی) کی نہیں ہے "آج کی دنیا" پر بھی اخیر میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نظر افروز ہے۔ دنیا میں آج کے معاملات اور مسائل کو سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ دراصل یہ دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر تیار کی ہوئی تقریریں ہیں! ان کی تشنگی اور کوتاہی کا بڑا راز ریڈیو کے وقت کی "تنگ دامنی" ہے۔ اس لئے مجیب صاحب بعض شکایتوں پر فوراً عذر لائیں گے۔ بہرحال وہ قابل مبارک باد ہیں۔ یہ کتاب ہر خوش ذوق اور خوش فہم تعلیم یافتہ نوجوان طالب علموں، عورتوں، بڑے فاضلوں، جگادھری پنڈتوں، سب کے پڑھنے کے لائق ہے۔

"س"

روح غالب - مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ ضخامت ۱۷۵ صفحے۔ کاغذ، کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت عاں۔ ناشر ادارۂ ادبیات اردو رفعت منزل حیدرآباد دکن۔

ترقی یافتہ زبانوں میں عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ قدیم ضخیم ادبی "شاہکاروں" سے "شہ پارے" الگ کر لئے جاتے ہیں تاکہ ادب اور زبان کے جاندار حصوں کا مطالعہ کم فرصت رکھنے والے اہل ذوق اور طالب علم بھی کر سکیں۔ لوگ بکثرت ان غیر فانی تحریروں سے مانوس اور مستفید ہوں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اردو ادب کے پرجوش خدمت کرنے والوں نے بھی اب اس طرف آہستہ آہستہ توجہ شروع کی ہے۔ اردو مرکز لاہور نے تو اس نوع کا ایک پورا سلسلہ شایع کیا ہے۔

اردو کے پرزور اہل قلم ڈاکٹر "زور" صاحب نے غالب کے خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا ایک مرقع پیش کیا ہے۔ اردو نثر کی یہ ایک بڑی خدمت ہے۔ غالب کے خطوط کے متعلق کچھ لکھنا بڑی حد تک تحصیل حاصل ہے۔ خود بقول غالب:-

"بھائی مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے مکالمہ ہے۔" ص۲۴

اور پھر یہ مکالمے "اردوئے معلی" میں۔ یہ اردو نثر کی ایک خوش نصیبی ہے۔

مرزا صاحب کے ہاں ان کی اہمیت کیا تھی!

"میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنے جس کا خط آیا میں نے

جاناکہ وہ تشریف لایا۔" ص۴۹۔

یہ خطوط ادبی دلکشی اور حسن کے علاوہ مرزا صاحب کی شخصیت کا بے داغ آئینہ ہیں۔ ان میں ان کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ ان کا میلان اور ان کے خیال کا رخ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے شوق ذوق کا پتہ لگتا ہے۔ مثلاً حسن طباعت کا مرزا صاحب کو بڑا خیال تھا:۔

"بہرحال اس نمونہ کی تقطیع اور حاشیہ مطبوع ہے۔ لغایت کے معنے حاشیہ پر چڑھیں۔ اس کی روش دلآویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔" ص۴۷۔

مرزا صاحب "مرقع چغتائی" یا "مکاتیب غالب" کو دیکھ نہ معلوم کس قدر خوش ہوتے۔

"روح غالب" کی کتابت اور طباعت بھی صاف ستھری ہے۔ اردو زبان کی چاہت رکھنے والوں کو چاہیئے کہ بکثرت یہ کتاب خریدیں اور پڑھیں اور ادارۂ ادبیات اردو کے کارکنوں کی ہمت بڑھائیں۔ کتاب کے ابتدائی ابواب اور تمہیدی بیانات بھی معلومات افزا ہیں۔

"س"

الخیام ۔ از راجہ گورسرن بلی آزاد توکلی۔ سائز ڈیمی قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ، ۱۱ل والا ڈیوڑھی، چوک میدان خاں چار مینار حیدرآباد دکن۔

یہ عمر خیام کی ۲۰۷ منتخب رباعیات کا اردو رباعی میں ترجمہ ہے۔ ڈبلیو ییٹس W. Yeats نے ادب کے متعلق کہا تھا:۔

"جو ادب بغیر مفہوم اور ادبی شان کے نقصان کے دوسری زبان میں ترجمہ ہو جائے وہ خراب ہے۔"

غور سے دیکھا جائے تو فارسی اور اردو شاعری میں ایسی مغائرت نہیں جو مثلاً سنسکرت یا انگریزی، عربی یا جرمنی میں ہے۔ یوں بھی مشرقی شعر خصوصاً فارسی رباعی کا ترجمہ اردو جیسی قریبی زبان میں اصولاً ایک سعی لاحاصل ہے کیونکہ وجدان اور بے ساختگی جو رباعی کی جان ہے ترجمہ کے ذریعہ کبھی منتقل نہیں ہو سکتے۔ خیام کی مشہور رباعی ہے ؎

ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگو	واں کس کہ گناہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد بہ مکافات دہی	پس فرق میان من و تو چیست بگو

راجہ گورسرن بلی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے ؎

کس نے نہیں عیب یاں کیا ہے بتلا	بے عیب کئے کوئی جیا ہے بتلا
دی بد کی سزا جو تو نے بد اے مالک	مجھ میں تجھ میں فرق کیا ہے بتلا

اہل ذوق غور کریں کہ اس ترجمہ میں محنت اور زبان کی صفائی کے باوجود رباعی کا کیا لطف پیدا ہوا۔ کیا رباعی کا جو تھا مصرعہ کسی طرح دوسری زبان میں آسکتا ہے؟

ان حالات کے تحت ہم کو مترجم صاحب سے اس امر میں اصولی اختلاف ہے لیکن جو محنت انھوں نے اس میں کی ہے وہ قابل داد ہے بعض رباعیاں بجائے خود بری نہیں۔

ع۔ ق۔ ب

تاریخ ہندوستان کی تمہید - از پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) تقطیع چھوٹی۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ قیمت مرقوم نہیں۔

تمہید پر اور وہ بھی تاریخ ہندوستان کی تمہید پر تبصرہ لکھنا ہمارے نزدیک بالکل ایسا ہی ہے جیسا مکان کے صرف داغ بیل دیکھ کر آیندہ بننے والی عمارت کی شان وشوکت خوبصورتی اور موزونیت کی داد دینا۔

پروفیسر مجیب صاحب نے جدت کے ساتھ تاریخ کے مقصد، مورخ کی ذمہ داری پر کچھ غور و فکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جدتِ فکر میں اختلاف رائے کا ہونا ضروری ہے۔ ممکن ہے پروفیسر صاحب کی رائے سے ان کے استدلال میں جو ایک حد تک اصولی ہے کچھ اختلاف ہوسکے۔

تمہید کا دوسرا حصہ قدیم ہندوستان کی تاریخ، آریا قوم کی تہذیب، بدھ مذہب کے اثرات، اتحاد اور شیرازہ بندی کے واقعات پر مشتمل ہے۔ یہاں بھی آپ نے اپنی رائے سے کام لینے کی کوشش کی ہے اور فلسفیانہ استدلال پیش کیا ہے۔ ہم اس موقع پر پروفیسر صاحب کی اس اصولی طرز فکر کی داد

دیتے ہیں۔ البتہ جس طرح ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اپنے دیباچہ میں یہ دعا کی ہے کہ:۔

"حق کی محبت مجیب صاحب کو تاریخ کی راہ میں (جو بال سے زیادہ باریک ہے)
ثابت قدم رکھے گی"

ہم بھی یہ کہیں گے کہ پروفیسر مجیب صاحب بحیثیت مورخ کے زیادہ ٹھنڈی تحقیق اور قدرے مطمئن تحریر سے کام لیں تو مناسب ہے۔

ع۔ ق۔ ب

الشمس مصنفہ رائے گوردھرن بلی آزاد توکلی۔ سائز ڈیمی، حجم ۲۰ صفحے قیمت ۴ر، طلباء کے لئے ۲ر غالباً مصنف سے مال والا دیوڑھی چوک میدان خاں چار مینار حیدر آباد دکن کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک سیدھی سادی نظم ہے جس میں آفتاب سے متعلق پوتے کے چند سوالات کا جواب دادا نے دیا ہے سلاست اور روانی قابل داد ہے بعض علمی مسائل کو سادگی سے نظم کرنے میں گوردھرن صاحب نے قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ صلا۱۳ پر ازل سے قبل سورج چمکنے کے سوال کا جواب شاید پوتے کی سمجھ میں نہ آیا ہو کیونکہ اس میں بعض ایسے مصرعے ہیں:۔

"عنصر تھے، نہ نو نیں، نہ دنیا"

تاہم پوری نظم جو کم قیمت بھی ہے اور صاف بھی چھپی ہے اس قابل ہے کہ والدین اس کو خریدیں اور اپنے بچوں کو پڑھائیں۔

ع۔ ق۔ ب

تبسم پارے ۔ از حبیب احمد فاروقی بی اے۔ ڈپ، ایڈ (عثمانیہ) تقطیع چھوٹی، حجم ۳۲ صفحے قیمت ۱ر ملنے کے پتے: (۱) مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن (۲) از مصنف اقبال منزل، کاچیگوڑہ حیدر آباد دکن۔

اب تک جناب حبیب احمد صاحب فاروقی نے سائنس، لاسلکی وغیرہ جیسے سنجیدہ مضامین پر اپنی مفید کتابیں پیش کی تھیں۔ "تبسم پارے" میں (ہمیں اس لفظ کی ترکیب سے اتفاق نہیں ہے) آپ کے تین مزاحیہ مضامین ہیں جو پہلے "المعلم" میں شایع ہو چکے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم مصنف کو مزاح نویسی کے میدان میں پہلی دفعہ آتے ہوئے

دیکھ رہے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ مزاح بجائے خود ایک اعلیٰ فن ہے اور اس کے لئے بھی فطری صلاحیت کی شدید ضرورت ہے۔ "تبسم پارے" میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک سنجیدہ مزاج آدمی کے چہرے پر باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی تبسم کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے چند علمی باتیں ہیں اور ان میں کہیں کہیں شوخی کی جھلک بھی ہے۔

ع۔ ق۔ ب

مجلۂ نظامیہ شمارۂ خودمختاری وتاریخ دستور آصفی } تذکار مجلہ نظامیہ حیدر آباد کے ان چند خاموش رسالوں میں سے ہے، جو خود رانفصیحت دیگراں رانصیحت کی جگہ پہلے بساط بھر خود عمل کر کے دوسروں کے سامنے مجسم نمونہ وترغیب بن کر آتے ہیں۔ چنانچہ اپنی آغاز زندگی سے اب تک برابر ہر سال وہ ۲۹ رجب کو اپنا ایک خصوصی شمارہ شایع کر کے اس فرمان خسروی کی تعمیل کرتا رہتا ہے کہ :۔

"اس عظیم الشان واقعہ کی یاد اس قابل ہے کہ اسے دائماً تازہ رکھیں اور قومی زندگی کے اظہار کے لئے مزید کوششیں عمل میں لائیں" (جریدۂ غیر معمولی یکم رجب ۱۳۴۲ف)

ایک قعر مذلت میں گری ہوئی قوم اپنی خودمختاری کی قدر کرنا تو کیا خود خودمختاری کے معنوں سے بھی ناواقف ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی ابھرتی ہوئی نئی اور نوجوان نسل اپنے اس ورثے پر متوجہ ہو رہی ہے تو ان کے اجتماعات میں معمر طبقے کے "بزرگ" اکثر اس یادگار اعلان خودمختاری پر تاویل بازیوں اور موشگافیوں میں وقت ضائع کرتے ہیں کہ آصف جاہ اول کا عمل کہیں غداری تو نہ تھا۔ اول تو اب یہ سوال ہی لغو ہے۔ یہ دن اب محض اس غرض سے منانا ہے کہ بہ فضل خدا ہمیں خودمختار قوموں کے زمرے میں شرکت حاصل ہے۔ اب اس خودمختاری کی حفاظت اور اس سے بہتر حالت میں آیندہ نسل کے سپرد کرنے کی تدبیریں سوچیں اور ان پر عمل کریں۔ دوسرے یوں بھی ہمارے محبوب بادشاہ جلالت مآب سلطان دکن نے اس کے لئے تاریخ بھی وہ مقرر فرمائی ہے جس سے زمانہ ماضی کی بعض تلخ حقیقتیں تازہ نہ ہوں۔ آصف جاہ اول نے مدافعت ذاتی ہی میں سہی، ایک مرتبہ دہلی کی فوجوں سے مقابلہ کیا تھا اور ان لوگوں کو مار بھگایا تھا جنھیں بادل نخواستہ ہی سہی مغل شہنشاہ نے بھیجا تھا۔ مگر اس معرکے کی تاریخ ۲۹ رجب نہیں ہے۔ اسی لئے آیندہ ہمیں آصف جاہ کی کارگزاریاں یعنی ان کا مغلیہ سلطنت کے "جلتے گھر کا بھانسا بچانا" بیان کرنا ہو تو حضرت مغفرت مآب کی فاتحہ کے دن بیان کر سکتے ہیں، ۲۹ رجب کے جلسوں میں صرف یہ بیان کرنا چاہئے کہ

ہم اس وقت جس خود مختاری سے متمتع ہیں اس میں اضافہ و ترقی کے کیا وسائل ہیں خود مختاری کی اہل قوموں کے کیا اخلاق ہوتے ہیں نئی اور آیندہ نسلوں کو کن بچھلی برائیوں سے بچنے کی ضرورت ہے، وغیرہ۔

مجلۂ نظامیہ کے اس خصوصی شمارے میں حالیہ معلنہ اصلاحات کے جریدے بھی نقل کردئے گئے ہیں اور یوم خود مختاری سے متعلق بعض مفید مضامین بھی ہیں اور دو صد سالہ دربار جشن خود مختاری کی تقریب شاہی اور شاہی تہنیتی رباعی بھی باعث زینت و سبق ہیں تصور خود مختاری پر ایک علمی مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ بڑی سے بڑی اور قوی سے قوی شہنشاہتوں کی خود مختاری پر کیا پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ زمانۂ حال کے اہم معیار یعنے انگلستانی عدالتوں کے نظائر نے کن پابندیوں کو خود مختاری کے منافی نہیں خیال کیا ہے! اور ان سب کی روشنی میں حیدرآباد کی موجودہ حالت سے مختصر بحث کی گئی ہے۔ حالیہ دستوری تبدیلیوں میں شاہی اقتدار سے متعلق بعض تازہ فرامین کی دلچسپ توضیح بھی قابل ذکر ہے۔

خریداران بلدہ کے لئے سہولت ہے کہ انجمن و اڑہ احاطۂ ترک سکرات میں مجلۂ نظامیہ کا بھی دفتر قائم ہے جہاں سے اتنی بڑے صفحوں کا یہ خصوصی نمبر ۱۲ ار میں مل سکتا ہے۔

"ح"

سیاسیات کی پہلی کتاب ۔ مرتبہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ام اے چھوٹی تقطیع حجم ۹۰ صفحے کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، لاہور لکھنؤ۔ قیمت ۴؍ر۔

ملک کے ایک نوجوان اور کثیر نویس پروفیسر نے یہ چھوٹا سا رسالہ اپنے زمانۂ تعلیم کے لکچروں کے خلاصے کے طور پر مرتب کیا ہے۔ اس میں ریاست (مراد مملکت؟) کی تعریف، اس کا آغاز و تاریخ، اقتدار اعلیٰ اور رعایا کی آزادی تین باب ہیں۔ ضمناً قومیت، قانون، ملی حقوق کی فہرست، انجمن اقوام وغیرہ سے بھی بحث کی گئی ہے۔

ہم اصولاً اس طرح کی کوششوں کی ہمیشہ تائید اور حوصلہ افزائی کریں گے۔ مگر یہ قصور مولف کا نہیں ان کے طرز تعلم کا ہے کہ مغربی مولفوں کے ہاں کے مروجہ ہر بیان کو بلا تنقید مان لیں اور جدت اور

اپج کی کمی ہو کس قدر افسوس ہوتا ہے جب ہم اس طرح کے جملے پڑھتے ہیں :۔

"سلطنت روما کے زمانہ میں کسی بین الاقوامی قانون کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی کیونکہ سلطنت روما یورپ کی تمام صوبائی سلطنتوں کی سردار سمجھی جاتی تھی ..... حتیٰ کہ سولھویں صدی کے آغاز میں حالات ایسے پیدا ہوئے جن سے بین الاقوامی قوانین کا امکان پیدا ہوگیا۔"

"بین الاقوامی" قانون ــــ جو اصل میں مختلف قوموں کے نہیں بلکہ مملکتوں اور سلطنتوں کے تعلقات میں ملحوظ رہتا ہے ــ نہ تو یورپ کی پیداوار ہے اور نہ یورپ کا ورثہ۔ ان قوانین کو جو "یورپ کی تمام صوبائی سلطنتوں" کے مسائل کو طے کرنے میں سلطنت روما برتتی تھی، قانون ملک اور قانون انتظامی کہا جائے گا۔ بین الممالک قانون سے مراد رومی دور میں وہ قاعدے ہوں گے جو رومی اور غیر رومی خود مختار سلطنتوں کے جنگ وصلاح کے تعلقات میں ملحوظ رکھے جاتے تھے چاہے وہ کتنے ہی سخت یا غیر معین کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح قرون متوسطہ کا بین الممالک قانون وہ تھا جو نصرانی اور اسلامی ممالک کے مابین ملحوظ رہتا تھا۔ سولھویں صدی میں جس قانون کے پیدا ہونے کا مولف نے ذکر کیا ہے، وہ "بین الاقوامی" قانون نہ تھا بلکہ صرف "اقوام نصرانی" کا قانون تھا۔ اسلامی، بدھ اور دیگر خود مختار معصر ممالک اس سے مستفید ہونے کے مستحق نہ تھے۔ تنگدل یورپ نے مجبوراً ۱۸۵۶ء میں ترکی کو اس اپنے قانون کے حقوق کا اہل تسلیم کیا۔ پھر جاپان وغیرہ کی باری آئی۔ اگرچہ قوانین بین الممالک بہت قدیم ہیں اور ہمارے مولف ہی کے الفاظ میں "ہر عہد میں بدلتے رہتے ہیں" لیکن اس وقت دنیا کے بڑے حصے میں ان کا جو نظام (سسٹم) رائج ہے وہ ۱۸۵۶ء سے شروع ہوتا ہے، اس سے پہلے نہیں۔

محترم مولف نے "بین الاقوامی" قانون کی سرسری تاریخ بھی لکھ دی ہے لیکن شاید "القاسم محروم" کے مصداق اپنے آپ کو بھول گئے کہ اس میں خود ان کی بدنام مسلمان قوم نے کیا حصہ لیا ہے۔ "بین الاقوامی" قانون کو ایک مستقل فن سب سے پہلے انھیں عربوں نے بنایا اور اسے سیر دینے حکمرانوں کے طرز عمل کا

نام دیا۔ اس پر امام ابو یوسف کی ایک تالیف سیرنامی ابھی گزشتہ ماہ حیدرآباد کی "احیاء المعارف النعمانیہ" نے شائع کی ہے۔ اس سے پہلے انھیں کے ہمعصر امام محمد کی کتاب السیر مع شرح، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے چار جلدوں میں شائع کی ہے۔ کاش ہمارے مولف کم از کم "قانون بین الممالک" مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد ہی دیکھ لیتے تو انھیں بہت سی باتیں معلوم ہو جاتیں۔

بہرحال ہم اپنے ملک کے نوجوان اہل قلم کو مشورہ دیں گے کہ یورپ کے پس خوردے پر اکتفا کا اب زمانہ نہیں رہا۔ انھیں اپنی ذاتی کمائی کی عزت کرنی سیکھنی چاہیئے۔

"ح"

اجتماعی زندگی کی ابتدا مصنفہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے استاد معاشیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی، لاہور، لکھنو۔

ایک سو بارہ صفحوں کا یہ چھوٹی تقطیع کا رسالہ جو اشاریہ (انڈکس) تو کیا فہرست مضامین سے تک خالی ہے، اپنے موضوع پر سرسری اور ابتدائی معلومات، جو یوروپی مولفوں کے ہاں مروج ہیں، پیش کرتا ہے۔ کاش ایسی صورتوں میں عنوان کو مقید کر دیا جایا کرے مثلاً "مغربی مولفوں کی آراء کے مطابق" وغیرہ تاکہ پڑھنے والے کو دھوکہ نہ ہو کہ تمام دنیا انھیں چیزوں کو مانتی ہے۔

علم اجتماع یوروپ کے لئے ایک نیا فن کیا، ایک نیا کھلونا ملا ہے۔ کھدائیوں اور دیگر آثار قدیمہ کے معاینے سے وہاں ہر شخص توجیہ کے لئے پرواز ذہن میں مسابقت دکھاتا ہے اور نتیجہ موٹی موٹی اثر انداز کتابیں ہوتی ہیں جن کی قصہ گوئیاں چشم دید واقعات کے انداز میں پیش ہوتی ہیں۔

زیر تنقید رسالے میں حال کی جگہ نہیں ہے صرف ماضی کا ذکر ہے کہ انسان نے مل کر رہنا کس طرح سیکھا ہوگا۔ اور ہمارے جد الاجداد ایپ (بندر) سے کہانی کا آغاز کیا گیا ہے۔ اور انسانوں میں بادشاہت کے نمودار ہونے پر اسے ختم کیا گیا ہے۔ ضمناً انسانوں کی ابتدائی

ایجادوں زراعت آگ وغیرہ سے بھی بحث ہوئی ہے اور مختلف ممالک کے مختلف ادوار کے واقعات کو ایک لڑی میں پرو کر یہ تاثر پیدا کیا گیا ہے کہ انسان کی تاریخ وہی ہے۔

"ح"

رسید کتب

۱۔ **ہندوستانی**: مرتبہ انجمن بزم ادب عثمان شاہی حیدرآباد قیمت ا ر
۲۔ **الخیام**: عمر خیام کی منتخب رباعیات کا اردو منظوم ترجمہ از رائے گورسرن بلی آزاد توکلی قیمت ۱۲ ر
۳۔ **الشمس** (نظم) از رائے گورسرن بلی آزاد توکلی قیمت ۴ ر
۴۔ **تجرباتی تعلیم** قیمت ے
۵۔ **لاسلکی نشر** قیمت عصہ — از حبیب احمد فاروقی بی اے ڈپ ایڈ۔ مددگار سنٹرل ٹکنیکل کالج حیدرآباد دکن۔
۶۔ **تبسم پارے** قیمت ۶ ر
۷۔ **مقالات ہاشمی**: از نصیر الدین ہاشمی صاحب قیمت ۸ر/ ۱ کلدار
۸۔ **انتظام کتب خانہ**: نوشتہ شیخ محبوب صاحب قریشی مہتمم محبوبیہ کارخانہ جلد سازی قیمت ۴ ر
۹۔ **تاریخ دستور آصفی**: مجلۂ نظامیہ حیدرآباد دکن کا خصوصی شمارہ بیادگار اعلان خود مختاری دولت آصفیہ قیمت ۱۲ ر
۱۰۔ **شیطان کا انتقام**: از جلال الدین صاحب اشک بی اے ال ال بی (عثمانیہ) قیمت عصہ
۱۱۔ **معارف جمیل**: از حکیم آزاد انصاری قیمت مجلد ۸/ ۱ غیر مجلد ۱
۱۲۔ **روئداد اجلاس یازدہم حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس**

رفتارِ زمانہ

مجلہ کی پچھلی اشاعت میں ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد کے حالات سرسری طور پر بیان کئے گئے تھے اور معاہدہ ورسائے کو موجودہ سیاسی بے چینی کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اب وہ بے چینی ایک اور عالمگیر جنگ کی شکل میں ظاہر ہوگئی۔ یورپ کی سیاست نے ایک نیا جون بدلا اور تاریخ یورپ کا ایک نیا خونیں باب کھل گیا۔ پچھلی جنگ کی ایک اور بڑی یادگار سیاسی فرقہ بندی تھی اور سیاست داں یہ سمجھتے تھے کہ اگر آئندہ کوئی جنگ ہو تو وہ محض سیاسی نظریوں کی بنا پر لڑی جائے گی۔ یعنے اشتمالیت، نازیت اور جمہوریت کے جو تین سیاسی فرقے بن گئے تھے اور جو بنیادی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے، آپس میں لڑ پڑیں گے۔ لیکن سیاست دانوں کو اپنا خیال بدلنا پڑا اور موجودہ جنگ نے سیاست یورپ کی کایا پلٹ دی۔ چنانچہ اس جنگ کی محرک بھی وہی ملک گیری کی ہوس اور اپنی طاقت بڑھانے کا جذبہ ہے۔

روس اور جرمنی کا معاہدہ عدم اقدام جو ابھی جنگ سے پہلے طے پایا، یورپی سیاست کی ایک انوکھی چال تھی۔ ماسکو میں برطانیہ اور فرانس کے نمائندے ایک عرصے سے بات چیت کر رہے تھے اور دنیا حیران تھی کہ روسیوں کے ساتھ ان کا معاہدہ کس دن طے پائے گا لیکن سیاست نے ایک نازک پلٹا کھایا اور "امن پسند برادری" یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ روس اور جرمنی نے راز میں ایک دوسری ہی کارروائی طے کر لی۔ ایک طرح سے اس نئے معاہدے کو ہٹلر کی بڑی کامیابی

سمجھنا چاہیئے کیونکہ اس سے برطانیہ اور فرانس کی امیدیں خاک میں مل گئیں مگر دنیا کی سیاست پر اس کے کچھ ایسے اثرات پڑے ہیں کہ اس معاہدے سے تاریخ یورپ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اشتمالی روس اور نازی جرمنی کا اتحاد بظاہر ایک اچنبھا معلوم ہوتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پچھلے چند سال سے روس اور جرمنی دونوں ملکوں میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں۔ ہٹلر نے جرمنی میں کوئی نئی اصلاح کی تو وہ روس میں بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہو جاتی اور اسٹالن نے روس میں کوئی نیا قدم اٹھایا تو جرمنی میں اس کا چربہ اتار لیا جاتا۔ ان باتوں کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روس اور جرمنی میں عرصے سے پوشیدہ تعلقات تھے جو معاہدہ عدم اقدام، اور جنگ چھڑ جانے بعد فوجی تحالف کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ لیکن روس اور جرمنی کا یہ اتحاد ہٹلر کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہوا اگرچہ جرمنی نے روس کو امن پسند برادری میں شریک ہونے سے روکا اور اپنا ہمنوا بنا لیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے پرانے ساتھیوں سے بھی بگاڑ مول لی چنانچہ اس کے پرانے ساتھی ایک ایک کرکے الگ ہوتے گئے۔ ایک طرف جاپان جس نے اشتمالیت کے خلاف فاشلی ملکوں سے اتحاد عمل کیا تھا اور جس نے جرمنی کے بل بوتے پر انگریزوں سے پرخاش مول لی تھی اب وہ اپنے آپ کو تن تنہا سمجھنے پر مجبور ہوگیا۔ جاپان کے وزیر اعظم ہیرانا جدید صورت حال کا مقابلہ نہ کرسکے چنانچہ جاپانی وزارت مستعفی ہوگئی اور ایک نئی کابینہ کی تشکیل عمل میں آئی جس نے جاپانی مسلک کی تجدید کی چند دنوں کے بعد جاپان اور روس کے مابین التوائے جنگ کے متعلق ایک راضی نامہ بھی طے پایا جس کا مقصد شاید یہ تھا کہ مشرق بعید میں انگریزوں کے خلاف محاذ برابر قایم رہے اور روس کو مشرق سے چھٹکارا ہو جائے۔ لیکن جرمنی کو اس سے کچھ زیادہ فایدہ نہیں ہوا بلکہ حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاپان نے جرمن دوستی کے مسلک کو چھوڑ دیا۔ دوسری طرف اسپین کی سرزمین بھی جہاں پر ہٹلر نے اشتمالیت کے خلاف جنگ کی تھی اب جرمن دوستی کے مسلک سے دامن جھٹک کر الگ ہوگئی اور حکومت نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ پھر اطالیہ نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ جنگ میں غیر جانبدار رہے گا۔ اطالیہ کا یہ طرز عمل بظاہر بہت تعجب خیز ہے اور مسولینی کی روش کو دنیا حیرت سے دیکھ رہی ہے کہ جرمنی اور اطالیہ جو تقریباً ایک جان و دو قالب

ہوچکے تھے اور جنھوں نے روم برلن محور کو پیدا کر کے سارے یورپ بلکہ ساری دنیا میں تہلکہ ڈال دیا تھا،
اب کس طرح جدا ہوسکتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ بھی ہٹلر کا ایک حربہ ہو اور کسی مناسب موقعہ پر اٹلی چپکے سے
میدان میں آجائے اور جرمنی کا ساتھ دے، مگر حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسولینی واقعی الگ رہنا
چاہتا ہے اور وہ روس و جرمنی کی دوستی سے خوش نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ مسولینی ہٹلر کی بڑھتی ہوئی
طاقت کا روادار نہیں۔ اس نے ہٹلر سے ایسے وقت اتحاد کیا تھا جب اس کو اس کی سخت ضرورت تھی۔
اب روس اور جرمنی کے سمجھوتے سے مسولینی کو ایک بہانہ مل گیا اور اس نے ہٹلر کی دوستی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ روس اور جرمنی کے معاہدے کا ترکی پر کیا اثر پڑا اور اس جنگ میں ترکی کا
کیا مسلک ہے؟ ترکی یوں بھی اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بہت زیادہ اہم ہے لیکن بڑی بات یہ ہے کہ
ترکی کے پیچھے پوری دنیائے اسلام ہے یعنے ترکی کسی فریق کا ساتھ دے تو اس کو ساری دنیائے
اسلام کی بھی تائید حاصل ہوگی چند مہینے پہلے ترکی نے برطانیہ کے ساتھ اشتراک عمل کا وعدہ کیا تھا،
لیکن جب روس نے امن پسندوں کا ساتھ نہیں دیا تو ترک عرصے تک خاموش تھے اور ان کا مسلک
واضح نہیں ہوا تھا۔ دنیائے اسلام کی رائے تھی کہ ترکی کو اب الگ ہوجانا چاہیئے کیونکہ انگریزی سمجھوتے
کے وقت ترکی نے یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے بگاڑنا نہیں چاہتا مسلمانوں کا خیال تھا کہ
روس اور جرمنی کے اتحاد کے بعد ترک غیر جانبدار رہ جائیں گے کیونکہ روس کے ساتھ جو اس کا
پڑوسی ہے، ترکی کو دوستی قایم رکھنے ہی میں فایدہ ہے لیکن ترکی کے صدر اینونو نے ۲ ستمبر کو اعلان
کیا کہ ترکی اپنے وعدے کے مطابق برطانیہ کے ساتھ ہے۔ برطانیہ کا ساتھ دینے کے یہ معنے تھے کہ
ممکن ہے ترکی کو روس سے بگاڑنی پڑے اور یہ بگاڑ ترکوں کے لئے مفید نہیں تھی اگر اس دار وگیر میں
روس، جرمنی یا اطالیہ ترکی پر حملہ کر بیٹھے تو برطانیہ کے ایسے ذرائع نہیں کہ وہ ترکی کی مدد کو دوڑے
پھر ترکوں کے اس تصفیہ سے دنیا کے مسلمانوں کو بھی اتفاق نہ تھا کیونکہ پچھلے کئی سال سے انگریزوں نے
مسلمانوں کو اپنا دشمن بنالیا ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلے میں ان کو نیچا دکھانے کی کوشش
کی تو فلسطین میں عربوں پر انتہائی ظلم کئے۔ اس کے علاوہ ساری عرب دنیا کو بہت سے دھوکے دئے۔

ان وجوہات کی بنا پر مسلمان انگریزوں کا ساتھ نہیں دینا چاہتے تھے۔ شاید انھی وجوہات کی بنا پر ترکوں نے روس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہا تھا اور ابھی حال میں سراج اوغلو ماسکو گئے تھے تاکہ روس کے ساتھ ایک معاہدہ طے ہو جائے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روس کی شرطیں ترکوں کے لئے ناقابل قبول تھیں چنانچہ سراج اوغلو ماسکو سے واپس ہوگئے۔ اب ترک جغرافی اعتبار سے غیر جانبدار بھی نہیں رہ سکتے تھے اور ادھر انگریز اس بات کے خواہاں تھے کہ کسی طرح ترکوں کو ہموار کر لیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں نے انگریزوں اور فرانسیسوں کے ساتھ ایک نیا معاہدہ کر لیا جو دونوں کے لئے مفید ہے۔ انگریزوں نے ترکی سے معاہدہ کر کے بڑی دانائی کی کیونکہ ترکی کے ساتھ ان کو ساری دنیائے اسلام کی تائید بھی حاصل ہوگئی۔ ممکن ہے کہ عرب اب بھی انگریزوں کی مخالفت کریں لیکن ترکی کے سبب اب ساری اسلامی دنیا انگریزوں کی مدد کرے گی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ترکی، فرانس اور برطانیہ کے معاہدہ پر انگریزوں نے خوب خوشیاں منائیں۔ تاہم یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اس معاہدے سے ترکی اور روس کے قدیم تعلقات پر، جیساکہ ترکی نے اعلان کیا ہے، کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

مختصر یہ کہ روس اور جرمنی کے اتحاد نے یورپی سیاست میں بہت سی گتھیاں پیدا کیں۔ شاید جنگ ہی ان تمام گتھیوں کا واحد حل تھی چنانچہ بہتیری مزاحمتوں کے باوجود ہٹلر نے پہلی ستمبر کو جارحانہ قدم اٹھا ہی دیا اور پولستان پر حملہ کر دیا۔ ایک طرف ڈانزگ سے ہر فورسٹر نے یہ اعلان کیا کہ اب ڈانزگ رائش میں شامل ہوگیا ہے اور ہٹلر نے اس تحویل کی توثیق بھی کر دی اور فورسٹر کو ڈانزگ سینٹ کا صدر بنا دیا، دوسری طرف جرمن فوجوں نے، جو پہلے سے فوجی مشقوں کے بہانے پولستان کی سرحد پر جمع کر دی گئی تھیں، پولستان کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کو اپنے پرانے دوستوں کے چھوٹ جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ صرف روس کا ساتھ اس نے کافی سمجھا، اور فوراً پولینڈ پر سلوا کیا، سیلیشیا اور مشرقی پرشیا تین طرف سے حملہ کیا اور پولستان کے ایک اہم شہر روڈوم پر خوب بم گرائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈانزگ کے ہائی کمشنر جو مجلس اقوام کی طرف سے

مقرر تھے اپنا دفتر چھوڑ کر بھاگ گئے اور ڈانزگ کے دفاتر پر سواستک جھنڈا لہرانے لگا۔ پولستان نے برطانیہ سے مدد چاہی لیکن دور روز تک برطانیہ اور فرانس کے مدبر اس کشمش و پیچ میں تھے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ وہ اپنے ایفائے عہد کے لئے مجبور تھے۔ بالآخر انھوں نے ہٹلر کو ایک آخری الٹیمیٹم دیا کہ وہ پولستان سے اپنی فوجوں کو واپس بلالے۔ اب ہٹلر پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنی کارروائی برابر جاری رکھی۔ ادھر انگریز ۳ رجولائی کے گیارہ بجے تک جرمنی کے وزیر خارجہ رِبن ٹراپ کے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ جب ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا تو برطانیہ نے بھی اعلان جنگ کر دیا۔ شام تک فرانس کی طرف سے بھی اعلان جنگ کر دیا گیا اور اب یورپ کی فضا جنگ کے گھٹا ٹوپ ابروں سے گھر گئی۔

برطانیہ اور فرانس کے اعلان جنگ کی وجہ بظاہر خود غرضی نہ تھی، اور مسٹر چرچل کے الفاظ میں "ہم تفوق حاصل کرنے کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں اور نہ ہم کو مادی منفعت کا خیال ہے" بلکہ مسٹر چیمبرلین کے بیان کے مطابق "وہ لڑ رہے ہیں نازی بربریت سے دنیا کو بچانے کے لئے اور ان اعلیٰ مقاصد اور نظریوں کی حفاظت کی خاطر جنھیں ایک انسان بہت مقدس تصور کرتا ہے"۔ آئرستان کو چھوڑ کر پوری سلطنت برطانیہ جنگ کے لئے متحد ہے۔ جنوبی افریقہ، کناڈا، آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ سب برطانیہ کے ساتھ ہیں۔ سلطنت برطانیہ کی ہر وحدت کا ساتھ دینے کے یہ معنے ہیں کہ ہر قلمرو یا ڈومینین کی نظر میں سلطنت اور خود ان کی بقا کے لئے متحد ہو کر لڑنا ضروری ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہاں ملک کا ایک طبقہ جسے اب تک انگریزوں نے بہت بڑھا دیا تھا برطانیہ کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ دوسرا طبقہ برطانیہ کی مدد کرے گا اور انگریز اسی طبقہ کو اپنے مخالف طبقے کے مقابلہ میں استعمال کریں گے۔

اس جنگ کو شروع ہوئے دو مہینے ہو گئے اور ابھی اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ جاری رہے گی۔ اب تک جنگ کے دو محاذ بنے ہیں جن میں سے ایک محاذ پر جرمنی کی مراد پوری ہو گئی

دوسرے محاذ پر نازیوں اور جمہوریت کے علم برداروں میں خوب جنگ ہو رہی ہے۔ اور اسی محاذ پر دنیا کی آیندہ قسمت کا فیصلہ منحصر ہے۔ اس موقعہ پر پھر محاذ جنگ کا علٰحدہ علٰحدہ مطالعہ کیا جائے تو مناسب ہوگا۔

مشرقی محاذ یعنے پولستان کی جنگ

جنگ کی ابتدا میں نازیوں کا مسلک یہ تھا کہ پولستان پر اپنی پوری توجہ صرف کردیں اور مغرب میں انگریزی و فرانسیسی رفیقوں کو زیگفریڈ لائن روکتی رہے۔ پولستان ختم ہو جائے تو یورپ میں امن کی تحریک شروع کردی جائے اور اطالیہ، اسپین اور روس اس کی پُرزور تائید کریں۔ ان ارادوں کے ساتھ جرمنی نے جنگ کے محاذ میں قدم رکھا۔ کوئی ایک ہفتہ کی لڑائی کے بعد ڈانزگ اور "گذرگاہ" نازیوں کے قبضہ میں آگیا اور اس کے ساتھ بعض دوسرے اہم علاقے بھی آئے جن میں سیلیشیا کی کوئلہ کی کانیں بھی تھیں۔ دوسری طرف جرمنی کے ساتھی روس نے اپنی مغربی سرحد پر فوجیں جمع کرنی شروع کردیں اور روس میں خوب فوجی تیاریاں ہونے لگیں۔

پولستان کے متعلق جرمنی کا منصوبہ یہ تھا کہ چار فوجیں مختلف مقامات سے حملہ کریں تاکہ وارسا اور مغربی پولستان ان کے قبضے میں آجائے۔ پہلی فوج کو ہدایت تھی کہ موریویا سے نکل کر بالائی سیلیشیا کے راستے کراکو پر حملہ کردے۔ دوسری فوج برسلاؤ سے نکل کر لوڈز پر پہنچ جائے، تیسری فرانک فرٹ سے چل کر پوزن کی طرف پیش قدمی کرے اور چوتھی فوج مشرقی پرشیا کی طرف سے وارسا پر چڑھ دوڑے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لائحہ عمل پر پوری پابندی کی گئی لیکن فرانک فرٹ کی فوج پوزن پر حملہ کرنے کی بجائے اوپر شمال کی طرف دھنستی چلی گئی تاکہ "گذرگاہ" کو کاٹ کر مشرقی پرشیا کی فوج سے جا ملے۔ نازیوں کا خیال تھا کہ اگر ان کا حملہ دوسرے تمام علاقوں پر کامیاب ہو جائے تو پولستانی فوج پوزن کی حفاظت نہ کرسکے گی۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ جب وارسا پر شمال اور جنوب دونوں طرف سے جرمن فوجیں بڑھنے لگیں تو جرمنوں کو کامیابی کی بہت توقع تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ پوزن خالی کردیا گیا اور جرمن فوجوں

کے لئے وہاں کوئی مزاحمت نہیں رہی۔

پولستان کی حیثیت ایک جزیرہ کی ہے جو مختلف قوموں کے سمندر میں واقع ہے اور غور سے دیکھا جائے تو مشرقی حصے کو چھوڑ کر پولستان ہر طرف جرمنی سے گھرا ہوا تھا۔ پولستان کی وسیع سرحد بالکل غیر محفوظ تھی اور پولستانی فوج صرف بالائی سیلیشیا میں مدافعت کے لئے تیار تھی جہاں کوئلہ اور لوہے کی کانوں کو بچانے کے لئے قلعہ بندی کی جا چکی تھی۔ مگر صرف سیلیشیا کی حفاظت پولستان کے لئے کافی نہیں تھی۔ سیلیشیا جرمنوں کے لئے ضرور مفید مطلب تھا چنانچہ وہ نازیوں کے ہاتھ میں آگیا۔ بالآخر نازی فوجیں آگے بڑھتی گئیں اور مغربی پولستان پر چھا گئیں۔

چونکہ پولستان کی مغربی سرحد پر جرمنوں کا مقابلہ مشکل تھا اس لئے مارشل اسمگلی رڈز کا خیال تھا کہ مغربی پولستان کو چھوڑ دیا جائے اور وسطی پولستان پر جمے رہیں۔ مگر اس کی وجہ سے مغربی پولستان غیر محفوظ سا ہو گیا۔ وہاں کی سڑکوں اور ریلوں کی وجہ حمل و نقل میں سہولت تھی اس لئے جرمن فوجوں نے موقعہ سے فایدہ اٹھایا جب پولستان کی سب سے بڑی مدافعت پر قابو حاصل ہو گیا تو جرمن فوج اپنی مشینوں کے ساتھ ہر طرف پھیلتی گئی اور اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ نازیوں نے اس بات کو بھی ملحوظ رکھا کہ پولستان کی فوج منتشر رہے، اس کو رسد نہ پہنچ سکے اور دوسرے ممالک سے اس کے تعلقات منقطع ہو جائیں جرمنی نے اپنی مشینوں کے علاوہ ہوائی قوت سے بھی بہت کام لیا۔ لیکن وسطی پولستان پر پولستانی فوج نے بڑی جانبازی سے مقابلہ کیا اور جرمن فوجیں وارسا تک نہ پہنچ سکیں۔

پولستان اپنی انتھک کوششوں کے باوجود ظاہر ہے کہ جرمنی کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وارسا پر قبضہ کرنے کی مہم ناکام ہوئی تو حملہ آوروں نے دوبارہ اس کی کوشش کی۔ جرمن فوجیں پومیرانیا اور مشرقی پرشیا کی طرف سے بڑھیں، دریائے نیریو اور بگ کو پار کیا اور اس خط تک پہنچ گئیں جو وارسا سے پسک تک جاتا ہے! دراس طرح پیچھے سے وارسا پر ٹکٹکی باندھے بیٹھی رہیں۔ پھر حملہ آوروں نے جنوب کی طرف سے اس بات کی بھی کوشش کی کہ رومانیہ اور پولستان کا تعلق ختم ہو جائے۔ لبلن کی طرف بھی جرمن فوج دباؤ ڈالنے لگی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دریائے وسٹولا اور

سان کے درمیان کا علاقہ، جہاں پولستانی نوجوان کو بہت سی توقعات تھیں، نازیوں کے زیرِ اثر آگیا۔ پھر مشینوں اور ہوائی قوت کے استعمال نے بھی نازیوں کے لئے بہت سی سہولتیں فراہم کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولستان رومانیہ سے منقطع کر دیا گیا اور لوو دیا لمبرگ، کے زرخیز علاقوں پر جہاں تیل کے چشمے واقع ہیں، جرمنی نے قبضہ کر لیا۔

نازیوں کی بلا ہی پولستان کے لئے کیا کم تباہ کن تھی کہ ادھر مشرق سے "سرخ" سیلاب بھی آیا۔ یعنے ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں روسی فوجیں پولستان میں گھس آئیں۔ اس کا مطلب صاف طور پر یہ تھا کہ جرمنی اور روس نے پولستان کی تقسیم کے متعلق پہلے سے کوئی سمجھوتہ کر رکھا تھا۔ ماسکو نے اس حملہ کی جو توجیہ کی وہ یہ ہے کہ "پولستان کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا اور روس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پولستان میں اپنی اقلیتوں کی حفاظت کرے۔" لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ روسی فوجیں بہت پہلے سے تیار ہو چکی تھیں اور جاپان کے ساتھ چین کی حکومت کو ختم کر دینے کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ روس کو مشرق سے چھٹکارا نصیب ہوا اور روسی فوجیں پولستان میں اپنا نصف حصہ لینے کے لئے چلی آئیں۔

اس طرح پولستان پر دو طرف سے دباؤ پڑا۔ جرمن فوجیں شمال مشرق اور جنوب مشرق دونوں طرف سے وارسا کی طرف بڑھتی گئیں اور مشرق سے سرخ فوج دریائے نیر یکو سٹولا ورسان کی طرف بڑھی۔ دونوں طرف سے پولستانی فوج دشمنوں کے نرغے میں آگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولستان ختم ہو گیا اور اس کی تاریخ میں چوتھی مرتبہ پولستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس سے پہلے بھی تین مرتبہ یعنے ۱۷۷۲، ۱۷۹۳ اور ۹۶-۱۷۹۵ء میں پولستان کی تقسیم ہوئی تھی۔ اس مرتبہ روس اور جرمنی نے آدھا آدھا حصہ لے کر پولستان کو بالکل ختم کر دیا۔

مغربی محاذ جنگ

پولستان کی جنگ میں جرمنی کو اطمینان سے لڑنے کا موقعہ نہیں ملا کیونکہ اسے مغرب میں اتحادیوں کا مقابلہ کرنا تھا چنانچہ ہٹلر کو بہت جلد زگفریڈ لائن کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فرانس اور جرمنی کی سرحد

پولستانی سرحد کے جیسی نہیں ہے بلکہ یہاں ہر فریق مستحکم ہے۔ جرمنی اور فرانس دونوں نے قدم قدم پر جدید قسم کے مدافعتی آلات حرب سے اپنے کو محفوظ کرلیا ہے۔ فرانسیسی کہتے ہیں کہ ان کی مژینو لائن ناقابل فتح ہے۔ جرمنی کی زیگفریڈ لائن بھی ناقابل تسخیر سمجھی جاتی ہے لیکن فرانسیسیوں کو حملہ کا سب سے اچھا موقعہ زیگفریڈ لائن کے اس حصہ پر ملا جو شمال میں دریائے موزیل اور رہائن کے درمیان ہے۔ مگر دقت یہ تھی کہ فرانسیسی اس حصہ میں آنکھ بند کرکے داخل نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ گزشتہ جنگ میں انھیں اس کا تجربہ ہوچکا تھا اس لئے فرانسیسیوں نے سار میں زیگفریڈ لائن کا باقاعدہ معاینہ شروع کیا اور برطانوی فوج کے ساتھ اس دشوار گذار جرمن لائن کو پار کرنے کے لئے راستہ ڈھونڈتے رہے اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ اس طرف سے جرمنی کو پریشان کیا جائے تاکہ پولستان پر جرمنی کا دباؤ کم ہوجائے اس کے علاوہ برطانیہ نے ان سمندروں کو بھی بند کردیا جہاں سے جرمنی کے جہاز گزرسکتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک لحاظ سے جرمنی کو گھیر لیا گیا مگر برطانیہ کو جرمنی کی آبدوزوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کے اہم تجارتی راستوں پر جرمنی نے آبدوز کشتیاں بہت پہلے سے جمع کررکھی تھیں اور ان کو تیل وغیرہ کی رسد دوسرے جہازوں سے پہنچتی تھی۔

اسی کشمکش میں جنگ کا تیسرا ہفتہ شروع ہوا۔ علاقہ سار میں فرانسیسی آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے گئے اور اب انھوں نے دعوی کیا کہ جرمنی کی سرحد پر ۵۰۰ مربع میل کا علاقہ ان کے قبضہ میں آگیا اور مشرق کی طرف ان کو زیگفریڈ لائن نظر آنے لگی۔ مگر فرانسیسیوں کے لئے آگے بڑھنا آسان نہیں تھا کیونکہ ان کے سامنے پہاڑی علاقہ تھا جہاں بارود کی کانیں تھیں اور دوسرے مدافعتی اسلحہ جمع تھے۔ ادھر جرمنی نے بھی اپنی کارروائی شروع کی۔ چنانچہ فرانسیسی فوجوں پر حملے ہونے لگے۔ سار برکن اور دوسرے شہر جو جرمنی کی سرحد کے اندر موجودہ محاذ سے کافی دور تھے، خالی کردئے گئے اور پولستان کی جرمن فوجیں مغربی محاذ جنگ کی طرف آنے لگیں مگر دوسری طرف برطانیہ کی فوجیں بھی فرانس پہنچنے لگیں۔

لیکن اس صورت حال کے درمیان ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ امن کا سوال اٹھایا گیا جیسا کہ جنگ کی ابتدا میں سمجھا جاتا تھا، ہٹلر نے پولستان کو فتح کرنے کے بعد امن کی تحریک شروع کی۔ یہ ہٹلریت کی ایک بوالعجبی تھی کیونکہ جس شخص پر جنگ کی ذمہ داری تھی اب اسی نے قومی معاشی اصلاح

اور تقلیل اسلحہ کا بیڑا اٹھایا۔اس کے ساتھ ہی ہٹلر نے یہ بانگ دہل یہ اعلان کیا کہ پولستان اور بلقان کے معاملات میں روس اور جرمنی کے سوا کوئی دخل نہیں دے سکتا ممکن ہے کہ اتحادی ان شرائط پر بھی امن کو خرید لیتے مگر اب ان کو ہٹلر کی باتوں پر اعتماد نہیں رہا چنانچہ مغربی محاذ پر فرانسیسی اپنی مدھم رفتار کے ساتھ آگے بڑھتے گئے اور رہائن اور سرحد لکسمبرگ کے درمیانی علاقے پر فرانسیسی فوجوں نے حملہ کردیا۔اس سے اتحادیوں کو دو فایدے ہوئے ایک تو یہ کہ خود دشمن کے ملک میں میدان جنگ قایم ہوگیا اور دوسرے یہ کہ وادی سار سے جو فرانس کی سرحد پر واقع ہے جرمنوں کو کوئی فایدہ اٹھانے کا موقعہ نہ مل سکا۔مگر زیگفریڈ کی صورت حال یہ ہے کہ اس پر کوئی بڑا حملہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ بہت مستحکم ہے اور جرمنوں کو دوبارہ حملہ کرنے کے بہت سے مواقع حاصل ہیں۔البتہ زیگفریڈ پر احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم بڑھایا جا سکتا ہے فرانسیسیوں نے ایسا ہی کیا۔وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے اور آگے بڑھتے گئے اور یہی ان کے لئے موزوں تھا۔

اب جنگ کو شروع ہوئے چھ ہفتے گذر چکے تھے اور چونکہ ہٹلر کو اس کی امن کی تحریک کا ٹکا سا جواب ملا تھا اس لئے اس نے مغربی محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔مگر مشکل یہ تھی کہ ہٹلر کا ساتھی استالن بالٹک میں خود اپنے ارادوں کی تکمیل میں لگا ہوا تھا اور اس نے جرمنی کی کوئی خاص مدد نہیں کی۔ مگر اس کے باوجود ہٹلر تنہا کھڑا ہوگیا اور جرمن فوجیں اپنے تمام نئے آلات حرب اور مشینوں کے ساتھ اتحادیوں کے مقابلہ کے لئے آگئیں۔فرانسیسیوں نے پہلے سے بسلے اور لوٹربرگ کے درمیان رہائن کے تمام پلوں کو اڑا دیا تھا۔لیکن پھر بھی نازیوں کی یہ کوشش تھی کہ فرانسیسیوں کو رہائن اور موزیل کی جرمن سرحد سے اور خصوصاً علاقہ سار سے باہر نکال دیا جائے۔اس کے لئے نازیوں نے اپنی ہوائی طاقت کو استعمال کرنا چاہا۔ہٹلر نے اعلان کیا کہ مغربی محاذ پر بڑا سخت حملہ کیا جائے گا اور ایک "پوشیدہ ہتھیار" استعمال کیا جائے گا۔اس ہتھیار کے متعلق اتحادیوں کا خیال تھا کہ یہ گیسی بم کی کوئی نئی شکل ہوگی کیونکہ جرمنی نے یہ پروپگنڈا ابھی شروع کیا تھا کہ برطانیہ نے پولستان کو گیسی بم بھجوائے تھے۔مگر دوسری طرف اتحادیوں کے مفید مطلب تین باتیں ہوئیں۔ایک تو یہ کہ برطانیہ نے اعلان کیا کہ جنگ کے ابتدائی پانچ ہفتوں کے اندر ... ۱۵۸۰۰۰ برطانوی سپاہ فرانس پہنچ گئی جس کے ساتھ ۲۵۰۰۰ مشینیں تھیں۔

(بقیہ مضمون صفحۂ ۱۱۱ پر ملاحظہ ہو)

بزم طیلسانین

اطلاعات متعلق انجمن طیلسانین عثمانیہ

انجمن اور اس کی ملحقہ جماعتوں کے سالانہ انتخابات

اواخر آبان ۱۳۴۸ ف میں سال آیندہ کے لیے انجمن اور اس کی ملحقہ جماعتوں کے سالانہ انتخابات عمل میں آئے ہیں۔ سال حال انجمن کے انتخابات میں بخلاف سال ہائے گزشتہ بہت سرگرمی کا اظہار ہوا۔ (۷۲۶) اصحاب نے رائے دہی میں حصہ لیا۔ نتیجہ کے طور پر حسب ذیل اصحاب کا انتخاب عمل میں آیا:-

۱۔ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے۔ ال ال بی .... صدر
۲۔ مولوی عبدالرؤف صاحب بی۔ اے۔ ال ال بی وکیل ہائیکورٹ ...... نائب صدر
۳۔ مولوی محمد غوث صاحب ام اے۔ ال ال بی .... معتمد
۴۔ مولوی بدرالدین خاں صاحب شکیبؔ بی اے ال ال بی وکیل ہائیکورٹ۔ نائب معتمد
۵۔ مولوی محمد علی صاحب بی ایس سی۔ ام اے .... خازن
۶۔ مولوی کلیم الدین صاحب انصاری بی۔ اے ال ال بی وکیل ہائیکورٹ ...... رکن کابینہ
۷۔ مولوی سید محمد اکبر صاحب وفاقانی بی۔ اے۔ ال ال بی وکیل ہائیکورٹ ... ؍؍ ؍؍
۸۔ مولوی محمد فاروق صاحب بی اے۔ یچ۔ سی۔ یس .... ؍؍ ؍؍
۹۔ مولوی سید محمد صاحب ام اے .... ؍؍ ؍؍
۱۰۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب ام اے۔ ال ال بی رکن مجلس بلدیہ ...... ؍؍ ؍؍

۱۱۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا رکن مجلس بلدیہ .... رکن کابینہ

۱۲۔ مولوی محمد یامین صاحب زبیری بی اے۔ ال ال بی وکیل ہائیکورٹ ... ״ ״

کابینہ انجمن نے بموجب ف ۱۵ ضمن ج دستور انجمن مجلہ طیلسانیین کی مجلس ادارت کی نمایندگی کی غرض سے رائے مہندر راج صاحب سکسینہ ام یس سی کو رکن کابینہ منتخب کیا۔

عثمانیہ بلدی جماعت | سال حال بلا اختلاف جو انتخاب عمل میں آیا وہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ سیٹھ پریم جی لال جی صاحب .... صدر

۲۔ مولوی ابو الخیر صاحب صدیقی بی یس سی .... معتمد

۳۔ مولوی عبد السمیع احمد صاحب .... شریک معتمد

۴۔ نواب میر اکبر علیخاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا رکن بلدیہ .... رکن مجلس عاملہ

۵۔ نواب میر احمد علیخاں صاحب ام اے۔ ال ال بی رکن مجلس بلدیہ ״ ״

۶۔ پنڈت حکیم نارایَن داس صاحب رکن بلدیہ .... ״ ״

۷۔ پنڈت جے۔ پرکاش راؤ صاحب .... ״ ״

۸۔ مولوی سید محمد علی صاحب موسوی رکن بلدیہ .... ״ ״

۹۔ پنڈت سری دہر نایک صاحب بیرسٹر ایٹ لا رکن بلدیہ ...... ״ ״

۱۰۔ نواب خواجہ سردار اللہ خاں صاحب جاگیردار .... ״ ״

۱۱۔ راجہ رائے گرو داس صاحب بی اے۔ ال ال بی، میر محلہ .... ״ ״

۱۲۔ مولوی میر محمود علی خاں صاحب، میر محلہ .... ״ ״

۱۳۔ مولوی غلام مصطفیٰ صاحب، صدر سال گذشتہ .... ״ ״

کابینہ انجمن طیلسانیین عثمانیہ نے بموجب ف ۱۰ ضمن ب قواعد عثمانیہ بلدی جماعت، حسب ذیل اصحاب کا انتخاب مجلس عاملہ کی رکنیت پر کیا ہے:۔

۱۔ رائے مدن موہن لال صاحب بی اے۔ ال ال بی وکیل ہائیکورٹ

۲۔ صاحبزادہ میروزیر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی۔

۳۔ مولوی معین الدین صاحب ام۔ یس سی۔

۴۔ ملک شبیر حسین صاحب بی اے۔

۵۔ جی۔ یچ ہٹ صاحب بی اے۔

معاشی کمیٹی | معاشی کمیٹی کے سالانہ انتخابات بھی بلا مقابلہ عمل میں آئے۔ نتیجہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ مولوی محمد فاروق صاحب بی اے۔ یچ سی یس . . . . صدر

۲۔ مولوی شرف الدین صاحب بی اے . . . . معتمد

۳۔ مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے . . . . نائب معتمد

۴۔ مولوی مشتاق احمد خاں صاحب ام اے (کنٹب) رجنل کمرشل منیجر ریلوے رکن مجلس عاملہ

۵۔ ال، ان گپتا صاحب، یچ سی یس . . . . " "

۶۔ سیٹھ پریم جی لال جی صاحب . . . . " "

۷۔ مولوی محمد علی صاحب ام اے۔ بی یس سی . . . . " "

کابینۂ انجمن نے بموجب ف ۶ ضمن الف قواعد معاشی کمیٹی مجلس عاملہ کی رکنیت پر اصحاب ذیل کا انتخاب کیا ہے:۔

۱۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔

۲۔ پنڈت شنکر جی صاحب بی۔ اے۔ ال ال بی۔

۳۔ مولوی کلیم الدین صاحب انصاری بی اے۔ ال ال بی وکیل ہائیکورٹ۔

۴۔ مولوی ناصر علی صاحب ام اے۔

جماعت اتحاد و ترقی | جماعت اتحاد و ترقی کے سالانہ انتخاب میں بھی کوئی مقابلہ نہیں ہوا۔ بالاتفاق حسب ذیل انتخابات عمل میں آئے۔

۱۔ نواب میر اکبر علیخاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا . . . . صدر

۲۔ رائے ست گرو پرشاد صاحب وکیل ہائیکورٹ .... نائب صدر

۳۔ مولوی میرزا احمد علی صاحب کامل بی اے۔ ال۔ ال بی وکیل ہائیکورٹ .... معتمد

۴۔ حکیم نارائن داس صاحب ویدیا ن وید .... شریک معتمد

۵۔ سیٹھ پریم جی لال جی صاحب .... خازن

۶۔ مسٹر ڈونشاہ ڈی اٹالیہ .... رکن مجلس عاملہ

۷۔ مولوی سید محمد علی صاحب موسوی .... " "

۸۔ مولوی محمد صدیق صاحب .... " "

۹۔ مولوی میر حسن الدین صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال بی وکیل ہائیکورٹ .... " "

۱۰۔ ڈاکٹر لطیف سعید صاحب .... " "

۱۱۔ نواب میر احمد علیخاں صاحب ام اے۔ ال۔ ال بی .... " "

۱۲۔ مولوی عبداللہ پاشاہ صاحب بی اے۔ ال۔ ال بی وکیل ہائیکورٹ ... " "

۱۳۔ نواب خواجہ سردار اللہ خاں صاحب .... " "

کابینۂ انجمن نے بموجب فقرہ ا ضمن ب قواعد جماعت، مجلس عاملہ جماعت کی رکنیت پر حسب ذیل اصحاب کا انتخاب کیا ہے:۔

۱۔ مولوی غلام محمد خاں صاحب رم۔ اے۔

۲۔ بی۔ ان چوبے صاحب بی اے۔ ال ال بی وکیل ہائیکورٹ۔

۳۔ مولوی محمد داؤد حسین صاحب بی اے۔ ال۔ ال بی وکیل ہائیکورٹ۔

۴۔ مولوی محمد علی خاں صاحب بی اے۔

کتب خانۂ انجمن سررشتۂ معلومات عامہ سے سرکاری مطبوعات اور سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سے اس کے مطبوعات برابر وصول ہو رہی ہیں۔ نیز مجلس طیلسانیین میں تنقید و تبصرہ کی غرض سے کئی گراں قدر کتابیں مسلسل وصول ہو رہی ہیں۔ نیز تبادلہ میں حیدرآباد و بیرون حیدرآباد کے

کئی رسائل آ رہے ہیں۔ آیندہ کے لئے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کتب خانہ میں جو اضافہ ہو اس کی تفصیل مجلۂ طیلسانیین کے ہر نئے شمارہ میں درج کی جائے۔

کواپریٹو انشورنس سوسائٹی کی ایجنسی انجمن کو اس سوسائٹی کی جو ایجنسی حاصل ہے اس کی کمیشن میں ۱۳۴۸ف کی بابت ۲۴۶ روپے ۱۱ آنے ۱۱ پائی وصول ہوں گے، ضرورت ہے کہ جو ارکان انجمن اس سوسائٹی میں بیمہ کرائیں وہ انجمن کا توسط اختیار فرمائیں کہ اس سلسلہ میں خود انجمن کو مالی فایدہ حاصل ہو جاتا ہے۔

ارکان انجمن ۱۳۴۸ف میں (۲۰۲) نئے ارکان نے انجمن میں شرکت کی، فی الوقت انجمن کے ارکان کی جملہ تعداد (۳۴۷) ہے، ۱۳۴۷ف کے اختتام پر ارکان انجمن کی تعداد (۱۸۵) تھی۔

آمد و خرچ ۱۳۴۸ف میں انجمن میں جو آمدنی ہوئی اور جو خرچ عاید ہوا اس کے اعداد ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ مکمل گوشوارہ بعد تنقیح حسابات شایع کیا جائے گا۔

آمدنی	روپیے		
		۴۔ صادر	۴۰ روپیے ۸ / ۲ /
۱۔ چندہ ارکان	۸۰۶ ″	۵۔ ٹکٹ ٹپہ	۸۳ روپیے ۹ / ۱۰ /
۲۔ کانفرنس طیلسانیین ...	۱۸ ″	۶۔ کانفرنس طیلسانیین ۱۳۴۸ف	۱۷۶ ″ ۹ / ۸ /
۳۔ رکنیت دوامی ...	۵۰ ″	۷۔ فرنیچر	۲۷ ″ ۱ / ۶ /
۴۔ عطیہ	۱۲۹ ″	۸۔ متفرق	۴۹ ″ ۱۵ / ۱۰ /
۵۔ مجلۂ طیلسانیین ...	۶۷۲ روپیے ۴ / ۱ /	۹۔ طباعت	۳۰ ″ ۱ / ۴ /
خرچ	روپیے	۱۰۔ جلد سازی	۱۴ ″
۱۔ تنخواہ ملازمین	۳۰۷ ″ ۲ / ۴ /	۱۱۔ درستی سیکل	۸ ″ ۸ /
۲۔ عثمانیہ بلدی جماعت	—	۱۲۔ ٹائپ رائیٹر	۴ ″ ۲ /
۳۔ معاشی کمیٹی	—	۱۳۔ مجلۂ طیلسانیین	۳۱۹ ″ ۱۳ /

ختم سال پر ۱۲۸ روپیہ ۶ آنے ۴ پائی [illegible] سلک تھی۔

تحریکات از سرکار

۱۔ کابینۂ انجمن کی جانب سے سرکار میں یہ تحریک کی گئی تھی کہ سررشتۂ عدالت میں منصفی سے قطع نظر باقی ماتحت جایدادوں کو منصفی کی سررشتہ داریوں تک ال۔ ال بی کامیاب اصحاب کے لئے محفوظ کردیا جائے۔

اس سلسلہ میں جناب میر مجلس صاحب عدالت العالیہ سے کابینہ کے ایک وفد نے بھی ملاقات کی تھی۔

اب حسب الحکم اجلاس انتظامی، مجلس عالیہ عدالت سے یہ جواب ملا کہ :۔

"سررشتہ عدالت کے جو قواعد ہیں اور فی الوقت جو مستحقین موجود ہیں ان کے حقوق کا لحاظ کرکے اگر بی اے۔ ال۔ ال بی کامیاب شدہ اشخاص کا تقرر کیا جاسکتا ہے تو اس پر بلحاظ ان کی قابلیت کے لحاظ کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ایسے اشخاص سررشتہ داری کے کام سے واقف ہوں اور مستحق بھی ہوں۔"

۲۔ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ ۱۳۴۸ف میں کتب خانۂ آصفیہ کی اصلاح تنظیم تفصیلی فہرست، مخطوطات کی ترتیب، اوقات کی وسعت اور تعطیلات کم کرنے کے متعلق ایک تحریک منظور ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں معتمدی عدالت سے اطلاع ملی ہے کہ کتب خانہ کے اوقات میں تبدیلی کرکے ناظرین کے لئے خاص سہولت فراہم کردی گئی ہے۔ باقی امور کے متعلق توجہ دہانی کا سلسلہ جاری ہے۔

۳۔ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ ۱۳۴۸ف میں اس امر پر سرکار کو توجہ دلائی گئی تھی کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد قانون کی تعلیم کا تین سالہ نصاب قرار دے کر دو سال نظری تعلیم کے لئے اور ایک سال عملی تعلیم کے لئے مقرر کیا جائے اور نیز لا کلاس کو بند کردیا جائے۔

مجلس شعبۂ قانون نے کانفرنس کی تحریک کے بموجب نصاب مرتب کرکے مجلس رفقاء جامعہ عثمانیہ میں تحرکنسل کی تھی، معتمدی عدالت سے اب یہ اطلاع ملی ہے کہ :۔

"مجلس رفقاء نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۵ امرداد ۱۳۴۸ف میں بہ غلبہ آرا

یہ تصفیہ فرمایا ہے کہ بی اے کی کامیابی کے بعد قانون میں داخلہ ہو"۔

۴۔ کابینہ انجمن نے توجہ دلائی تھی کہ ال ال بی کے امتحان میں اول آنے والے طالب علم کے لئے منصفی کی ایک خدمت محفوظ رکھی جائے۔ اس سلسلہ میں مراسلت ہونے پر اب جو جواب مجلس عالیہ عدالت سے وصول ہوا ہے یہ ہے :۔

"تحریک زیر بحث قواعد تقرر عہدہ داران عدالتی کے خلاف ہے۔ تقررات صرف ان قواعد کے تحت بعد امتحان مقابلہ ہو سکتے ہیں۔ ایسی جایداد کسی اول آنے والے علمی امتحان کے کامیاب شدہ شخص کے لئے مخصوص نہیں کی جا سکتی ہے"۔

۵۔ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ ۱۳۴۸ف میں یہ تحریک منظور ہوئی تھی کہ کتب خانہ آصفیہ میں تلنگی، مرہٹی اور کنڑی کتب واخبارات کا انتظام کیا جائے۔ معتمدی عدالت سے اطلاع ملی ہے کہ کتب خانہ آصفیہ میں تلنگی، مرہٹی اور کنڑی کتابوں کی خریداری کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

۶۔ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ ۱۳۴۶ف میں سرکار عالی کو اس امر پر توجہ دلائی گئی تھی کہ بمبئی کے ڈرائنگ کے امتحانات مسدود کر کے خود سررشتہ تعلیمات امتحانات لیا کرے۔ اب آخری اطلاع کمشنر صاحب امتحانات نے یہ دی ہے کہ :۔

"امتحانات ڈرائنگ کا نصاب مرتب ہو چکا ہے اس کی منظوری محکمہ سرکار سے حاصل کر کے اس کو رائج کیا جائے گا"۔

۷۔ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ ۱۳۴۸ف میں یہ تحریک منظور ہوئی تھی کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں اعلیٰ جامعاتی تعلیم کی دوعملی دور کر دی جائے۔ اس کے متعلق سررشتہ تعلیمات نے مطلع کیا ہے کہ :۔

"میکنزی اسکیم میں جامعۂ مدراس کے تعلق کو ختم کر دیا گیا تھا لیکن حسب فرمان خسروی اس تعلق کو باقی رکھا گیا ہے لہذا اس بارے میں دفتر ہذا سے کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی"۔

۸۔ کابینہ نے سررشتہ تعلیمات کو متوجہ کیا تھا کہ ایسے مد ...... میں جہاں شعبہ دینیات کی

جماعتیں قایم نہیں ہیں وہاں ایسا انتظام عمل میں لایا جائے کہ اس سلسلہ نصاب کے خواہش مند طلبا کو سہولت حاصل ہو۔ سررشتۂ تعلیمات نے مطلع کیا ہے کہ جن مدارس میں طلبہ اس تعلیم کے خواہاں ہوتے ہیں وہاں اس کا انتظام کردیا جاتا ہے۔

۹۔ ۱۳۴۶ف کی کانفرنس طیلسانیین میں سررشتۂ تعلیمات سے یہ استدعا کی گئی تھی کہ تاریخ دکن، جغرافیہ دکن اور معاشیات دکن پر مستند و عام فہم کتابیں تیار کرائے اور انھیں شریک نصاب کرائے۔ سررشتۂ تعلیمات سے اب یہ اطلاع آئی ہے کہ :-

"نصاب تاریخ کی کمیٹی کی تشکیل ہوچکی ہے، ایک کتاب زیر طباعت اور ایک کتاب زیر ترتیب ہے"

۱۰۔ کانفرنس طیلسانیین ۱۳۴۷ف میں ابتدائی تعلیم کو جلد از جلد عام اور جبری کرنے اور قانون تعلیم جبری کو جلد تر نافذ کرنے کے لئے سرکار عالی کو توجہ دلائی گئی تھی۔ سررشتۂ تعلیمات نے جواب دیا ہے کہ اس کے لئے کارروائی جاری ہے۔

۱۱۔ کانفرنس طیلسانیین ۱۳۴۷ف میں انکم ٹکس کے رائج کرنے کے لئے سرکار عالی کو توجہ دلائی گئی تھی۔ سررشتۂ فینانس کی اطلاع سے واضح ہے کہ اس سلسلہ میں کارروائی جاری ہے۔

۱۲۔ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ ۱۳۴۷ف میں تحریک منظور کی گئی تھی کہ حیدرآباد سول سروس کے امتحان مقابلہ میں انڈین سول سروس کے اصول پر مضامین اختیاری کا طریقہ رائج ہونا مناسب ہے۔ معتمد صاحب حیدرآباد سول سروس بورڈ نے مطلع کیا ہے کہ :-

"امتحان مضامین سول سروس کے مضامین پر نظر ثانی کا مسئلہ سرکار عالی کے زیر غور ہے۔ انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی تحریک کا داخلہ دفتر ہذا میں رکھ لیا گیا ہے اور مناسب وقت پر اس پر ضروری لحاظ کیا جائے گا"

۱۳۔ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ ۱۳۴۷ف میں تحریک منظور ہوئی تھی کہ لڑکیوں کے لئے مزید مدارس کا قیام ضروری ہے۔ سررشتۂ تعـ[illegible] دیا ہے کہ جیسے جیسے گنجایش برآمد ہو رہی ہے

مدارس وسطانیہ نسواں قایم ہو رہے ہیں ۔

۱۴۔ کابینہ انجمن نے یہ تحریک کی تھی کہ من جانب جامعۂ عثمانیہ ال ال بی کلاس میں کافی وظائف کے رعایتی فیس کا انتظام عمل میں لایا جائے ۔ اس کے متعلق جواب ملا کہ ال ال بی ابتدائی کے سالانہ نتیجہ کی بنا پر ال ال بی آخری کی جماعت کے طلبہ کے لئے ایک تیس روپیے ماہانہ اور دو پچیس روپیے ماہانہ کے انعامی وظیفے منظور ہوئے ہیں ۔

مکرر اس امر پر ارباب جامعہ کو توجہ دلائی گئی ہے کہ معافی فیس اور رعایتی وظائف سے بھی ال ال بی کے طلبہ کو محروم نہ رکھنا چاہیئے ۔

۱۵۔ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ نے اپنے گذشتہ اجلاسوں میں یہ طے کیا تھا کہ دفاتر سرکاری میں انگریزی کے دخل کو کم کیا جائے ۔ خدمات پر ماموری میں طلبائے جامعۂ عثمانیہ کو ترجیح دی جائے اور ۵۵ سالہ عمر کے بعد توسیع مزید کا سلسلہ بند کر دیا جائے ۔ ان تینوں تحریکوں کو اکثر دفاتر سرکاری میں توجہ کے لئے بھیجا گیا ہے اور آیندہ بھی اس کا سلسلہ جاری رہے گا ۔ اس سلسلہ میں ناظم صاحب تعمیرات عامہ سمت میدک نے مطلع کیا ہے کہ ان امور کا ان کی سمت میں کافی لحاظ کیا جا رہا ہے ۔ مولوی سید ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج نے لکھا ہے کہ :۔

”آپ اصحاب کی جدوجہد بلاشبہہ قابل تحسین ہے ۔ مجھے آپ کی مرسلہ تحریکات سے دلی اتفاق ہے اور میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ سوائے ناگزیر سرکاری مجبوریوں کے میں ان پر عمل پیرا ہوں اور آیندہ بھی رہوں گا اور آپ کے توجہ دلانے سے اور بھی زیادہ دلچسپی لوں گا ۔“

ناظم صاحب بلدیہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے لکھا ہے کہ :۔

”انگریزی کے دخل کو کم کرنے کے لئے نگہداشت کی جا رہی ہے بلکہ انگریزی مراسلوں کے آنے پر بھی ان پر اردو ہی میں کارروائی ہوتی ہے ۔ مورنوں کے عام طور پر اردو محکمہ ہذا میں رائج ہے ۔“

اب اس کی بھی نگرانی کی جاتی ہے۔"

علاوہ اس کے ۵۵ سالہ عمر کے بعد توسیع مزید نہ دینے کے متعلق بھی ناظم صاحب بلدیہ نے اپنے اتفاق کا اظہار کیا ہے۔

ناظم صاحب ٹپہ مولوی محمد احمد صاحب نے لکھا ہے کہ :-

"ان امور کی پابندی پہلے ہی سے ہو رہی ہے اور ان امور کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔"

اول تعلقدار صاحب بیڑ (مولوی سید ابو الحسن صاحب رضوی) اور اول تعلقدار صاحب باغات مولوی مرزا محمد بیگ صاحب نے بھی ہمدردانہ جواب دیا ہے۔

۱۶۔ ۱۳۴۷ف کی کانفرنس طیلسانین عثمانیہ میں یہ تحریک منظوری ہوئی تھی کہ شہر حیدرآباد کے نشہیری اپیل کا ٹھیکہ ایک خاص کمپنی کو دے رکھنا نامناسب ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ بلدیہ کی جانب سے اب یہ ٹھیکہ ختم کر دیا گیا ہے۔

۱۷۔ کابینۂ انجمن نے مجلس عالیہ عدالت کو اس امر پر متوجہ کیا تھا کہ جونیر وکلاء کی بہتر تربیت کی ضرورت ہے۔ جواب وصول ہوا ہے کہ یہ کارروائی زیر غور ہے۔

۱۸۔ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ ۱۳۴۷ف میں تحریک منظور ہوئی تھی کہ جب تک ہر ضلع میں عورتوں کے لئے مدرسۂ وسطانیہ نہ قایم ہو جائے تحتانیہ کا امتحان لڑکیوں کے لئے اٹھایا نہ جائے۔ اس کے متعلق سررشتۂ تعلیمات سے جواب ملا ہے کہ تعلیم نسواں کی جانب سررشتہ خاص توجہ کر رہا ہے۔ لڑکیوں کے لئے مزید مدارس کے قیام تا حد گنجایش کوشش کی جا رہی ہے اور ان کی شرکت مدارس میں ہر قسم کی سہولتیں پیدا کی گئی ہیں۔

۱۹۔ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ ۱۳۴۸ف میں مدارس ثانویہ کے لئے بازی گاہوں کی ضرورت کے سلسلہ میں ایک [illegible] تھی، اس کے متعلق نظامت تعلیمات سے جواب ملا ہے کہ بازی گاہوں کا

۲۰۔ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ ۱۳۴۸ف میں یہ تحریک منظور ہوئی تھی کہ لوئر پرائمری درجوں میں لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم کا مشترکہ انتظام عمل میں لایا جائے اس کے متعلق نظامت تعلیمات نے مطلع کیا ہے کہ آٹھ سال تک کی عمر کی لڑکیوں کو مدارس ذکور میں داخل کرنے کے متعلق گشتی جاری کی جا چکی ہے۔

۲۱۔ کابینۂ انجمن نے اس جانب سرکار عالی کو متوجہ کیا تھا کہ عدالتی تقررات کے سلسلہ میں سیولینس کی بجائے قانونی ڈگری یافتہ اصحاب کا ہی لحاظ فرمایا جائے اس کے متعلق مجلس عالیہ عدالت سے جواب ملا ہے کہ بپابندی قواعد تقرر طیلسانین جامعہ عثمانیہ کا لحاظ رکھا جائے۔

۲۲۔ ایک سرکاری بنک کے قیام کی نسبت کانفرنس طیلسانین عثمانیہ ۱۳۴۵ف میں ایک تحریک منظور ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں تا حال سلسلۂ توجہ دہانی برابر قایم ہے۔ آخری جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ سرکار عالی کے زیر غور ہے۔

۲۳۔ ۱۳۴۸ف کی کانفرنس طیلسانین عثمانیہ میں اس امر پر توجہ دلائی گئی تھی کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے نظام مالگزاری میں اس طرح سے ترمیم ہونی مناسب ہے کہ حقیقی کاشت کاروں اور قابضان اراضی کی معاشی پستی دور ہو سکے۔ محکمۂ مالگزاری کی مراسلت سے واضح ہے کہ یہ مسئلہ زیر توجہ ہے۔

۲۴۔ ورنگل انٹرمیڈیٹ کالج میں اردو و فارسی کی تعلیم کے سلسلہ میں عرصہ سے کارروائی کیجا رہی ہے ۱۳۴۸ف کی کانفرنس میں بھی اس کے متعلق ایک تحریک منظور ہوئی۔ مسجل صاحب جامعہ عثمانیہ نے مطلع کیا ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالجوں کا تعلق اب جامعہ سے نہیں رہے گا اس لئے ان کی جانب سے کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔ اب اس سلسلہ میں سررشتۂ تعلیمات کو توجہ دلائی گئی ہے۔

۲۵۔ طیلسانین عثمانیہ کی پہلی کانفرنس د ۱۳۴۳ف میں یہ تحریک منظور ہوئی تھی کہ طیلسانین عثمانیہ کو مجلس رفقائے جامعۂ عثمانیہ کے لئے کم از کم دس اراکین کے انتخاب کا حق عطا ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں برابر مراسلت جاری ہے۔ آخری جواب یہ ہے کہ جا [illegible] منشا حاصل کیا جا رہا ہے اس کے حصول کے بعد اس خصوص میں عمل ہوگا۔

۲۶ طلبائے جامعۂ عثمانیہ کے لئے من جانب سرکار ایک مجلس فراہمی روزگار کے قیام کے لئے انجمن لپنے زمانۂ قیام سے توجہ دلاتی آرہی تھی، اب ایک محکمہ تحصیل معیشت سرکار نے قایم فرمایا ہے۔

محمد غوث، معتمد انجمن

بقیہ صفحہ ۱۰۵

یہ بجائے خود اتحادیوں کی بڑی کامیابی تھی کیونکہ برطانیہ کے سواحل پر دشمن کے ہوائی حملہ کا خطرہ تھا۔ اس نوید کے علاوہ یہ بات بھی قابل لحاظ تھی کہ برطانیہ اور فرانس فوجوں کی کمان میں متحد ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم میں اس چیز کی کمی تھی اور اسی بنا پر اتحادیوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ برطانوی فوج جنرل گیملن پر، جو برطانیہ و فرانس دونوں کی فوجوں کے اعلیٰ کمان دار ہیں، پورا بھروسہ رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ برطانوی فوج کے جنرل لارڈ گورٹ بھی جنرل گیملن کے بہت دوست ہیں۔ ان باتوں سے اتحادیوں کے حوصلے بڑھتے تھے۔ دوسری چیز یہ ہوئی کہ برطانیہ نے آبدوز کے خلاف جو مہم شروع کی تھی وہ بڑی حد تک کامیاب رہی۔ اور جنگی جہاز رایل اوک اور دوسرے چند جہازوں کی تباہی کے علاوہ کوئی اہم حادثہ نہیں ہوا۔ تیسری حوصلہ افزا بات یہ ہوئی کہ برطانوی جنگی جہازوں پر جرمنی کے حملے تقریباً ناکام رہے۔

لیکن جنگ کا ساتواں ہفتہ اتحادیوں اور خصوصاً انگریزوں کے لئے اپنے ساتھ ایک پیام مسرت لایا۔ اس ہفتہ میں ترکی فرانس اور برطانیہ کے مابین ایک معاہدہ طے پاگیا اور انگریزوں کی منہ مانگی مراد پوری ہوئی۔ یہ اتحادیوں کی سب سے بڑی اور شاندار کامیابی تھی۔ اس سمجھوتہ کی اہم شرطیں جنگ چھوٹ پڑنے سے پہلے ہی طے ہوچکی تھیں لیکن چونکہ اطالیہ نے جنگ سے اپنے آپ کو الگ رکھا۔ اس وجہ سے بہت سے نئے مسائل پیدا ہوگئے تھے اور اسی لئے معاہدہ طے نہ ہوسکا۔ نئے مسائل جو پیدا ہوئے تھے ان میں ترکی اور روس کے تعلقات بھی تھے۔ ترکی اور روس ہمیشہ بہت دوست رہے ہیں مگر جب روس نے پولستان پر پیش قدمی کی اور اس کے بعد اپنے ہمسایوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا تو نئی صورت حال کے متعلق ترکی کو بھی تشویش ہوئی چنانچہ ترکی کے وزیر خارجہ سراج اوغلو بات چیت کی غرض سے ماسکو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ روس کی شرطیں بہت سخت تھیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کے بیچ میں پڑنے سے معاملہ طے نہ ہوسکا۔ چونکہ جرمنی روس کے اشتراک عمل سے اپنی امن کی تحریک کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اس [illegible] انے کی کوشش کی۔ یعنے کوشش یہ کی گئی کہ ترکی غیر [illegible] [illegible] ونوں مل کر

رومانیہ پر حملہ کریں تو وہ درِ دانیال کو بند کردے۔ اس تجویز سے روس کو اس لئے اتفاق تھا کہ وہ بسارابیا پر قبضہ اور بلقان میں اپنا اثر بڑھانا چاہتا تھا۔ اس سازش کا انحصار ترکی کے تصفیہ پر تھا۔ ترک پیش کردہ تجویزوں پر راضی نہیں ہوئے کیونکہ بلقان اور بحر اسود اور خصوصاً درِ دانیال ترکی کے لئے بہت اہم ہے۔ اور یہاں ترک، روس، اطالیہ یا جرمنی کسی کے اثر کو گوارا نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سراج اوغلو ماسکو سے واپس آگئے اور بہت جلد فرانس اور برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ طے پا گیا۔ اس معاہدے کے تین بڑے اثرات مرتب ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اب اطالیہ جرمنی کا ساتھ بالکل نہیں دے گا۔ دوسرے یہ ممکن ہے کہ روس اب جرمنی کی مدد سے ہاتھ اٹھالے۔ اور تیسرے یہ کہ اسلامی مملکتوں خصوصاً عرب مملکتوں عراق، ایران اور افغانستان سے ایک ہی آواز اٹھے گی اور بہت جلد بحر اسود سے لے کر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد تک متحد اسلامی مملکتوں کا ایک خطہ بن جائے گا۔

اب مغربی محاذ کو دیکھا جائے تو ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہٹلر نے اپنے اعلان کے مطابق برطانوی اور فرانسیسی فوجوں پر اپنے شاندار حملے شروع نہیں کئے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بہت سے پیچیدہ اور ناگوار حالات کے علاوہ جرمنی کو خراب موسم کا بھی مقابلہ کرنا تھا۔ بہرحال اس کا بڑا فایدہ یہ ہوا کہ فرانسیسیوں کو مدافعتی تیاری کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا لیکن نازیوں کی نقل وحرکت برابر جاری رہی چنانچہ آبدوزوں کے علاوہ طیاروں سے بھی کام لیا گیا۔ برطانیہ کے بحری مرکزوں پر حملے شروع ہوئے اور رفرتھ آف فورتھ اور اسکیپا فلو پر جرمن طیارے منڈلانے لگے۔ مگر اس سے برطانیہ کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ خود جرمنی کو الٹے نقصان اٹھانا پڑا کیونکہ حملہ آور طیاروں کی کم از کم ایک تہائی تعداد یا تو برطانوی توپوں کا نشانہ بنی یا پھر برطانوی طیاروں نے پیچھا کرکے ان کو گرادیا۔

ح۔ ص